قیدی

ڈاکٹر عبدالرّب بھٹی

PDFBOOKSFREE.PK

1

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس عورت کے انداز میں آج بھی ویسا ہی والہانہ پن تھا۔ وہی بے تابانہ شدت .....اور ایک زخمی سی بے نام تڑپ تھی، جو میں آج سے نہیں بلکہ اپنے بچپن سے ہی محسوس کرتا اور دیکھتا آیا تھا۔

یہ عورت کون تھی؟ اور اس کے والہانہ پن میں، اس کی بے تابانہ شدت اور تڑپ میں میرے لئے کوٹ کوٹ کر ممتا جیسی محبت کیوں بھری رہتی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

جب میں چھوٹا تھا تو ماموں حیدر گل مجھے اپنی گود میں یہاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت میں بالکل معصوم بچہ تھا مگر آج جبکہ میں گیارہ بارہ سال کا ہونے کو تھا تو مجھے اب بھی دھندلا دھندلا سا یاد تھا کہ میں اس عورت کا غمگسار چہرہ اپنے بچپنے سے ہی دیکھتا آ رہا تھا۔ اسی طرح .....آنسوؤں سے تر، بجھا ہوا، غمگین چہرہ اور جسے میں ہوش سنبھالتے ہی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھتا آیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے ماموں حیدر گل کی انگلی پکڑ کر یہاں آنے لگا تو میرے معصوم ذہن میں اس دکھی دکھی سی عورت کے متعلق کئی سوال اُبھرتے تھے مگر وہ معصومانہ سوال میرے ننھے ذہن تک ہی محدود رہتے تھے۔ ابھی شاید میں ان کا اظہار کرنے کی عمر تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہی سوال میرے معصوم ذہن میں حیرت بن کر اُبھرتے اور پھر جلد ہی محو بھی ہو جاتے۔ کیونکہ میرا اس عورت کے ساتھ ملاقات کا عرصہ بہت محدود رہتا تھا۔ اس کے بعد ماموں حیدر گل اس عجیب گھٹن زدہ، خاموش، بے کیف اور اُداس ماحول سے دوبارہ واپس گھر لے آتے تھے۔

اس عمر میں ماموں حیدر گل سے میں نے اس سیلن زدہ ماحول سے متعلق جو پہلا سوال پوچھا تھا، وہ یہ تھا۔

''ماموں!..... یہ کون سی جگہ ہے؟''

ماموں نے مجھے اس سوال کا جتنا مختصر جواب دیا تھا، وہ اتنا ہی مشکل تھا، جو میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔ ہاں البتہ اب مجھے اس عجیب و غریب جگہ پر آنے سے وحشت سی ضرور ہونے لگی تھی۔ اس جگہ ایک جیسا ہی ماحول .....جیسے وقت کو موت آ گئی ہو۔

سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے اب اس اجنبی عورت سے بھی حد درجہ بیزاری اور کوفت ہونے لگی تھی اور اس بیزاری نے ازخود اس فطری سوال کو جنم دیا تھا جو میں نے چڑ کر ماموں سے پوچھا تھا۔

''ماموں!..... یہ عورت کون ہے؟''

''یہ عورت تمہاری ماں ہے۔'' حسب عادت ماموں نے مجھے مختصر جواب دیا۔

''ماں .....وہ کیا ہوتی ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ ماموں نے ایک سسکاری بھری اور گھائل لہجے میں بولے۔

''ماں .....اس کو کہتے ہیں جس نے تمہیں جنم دیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مگر ماموں! ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ میاں نے پیدا کیا ہے؟''

''ہاں ..... تمہارے ماسٹر صاحب صحیح کہتے ہیں ..... ہمیں اللہ میاں نے ہی پیدا کیا ہے ہم سب کو..... مگر ایک ماں کے ذریعے.....''

تب اچانک مجھے ماں کے عنوان سے کچھ یاد آیا اور میں چمک کر بولا۔

''اچھا..... ماموں! جیسے عبداللہ کی ماں ہے اور ..... اور جیسے نومی اور عالی کی ماں ہے؟''

''ہاں بیٹا! یہی ماں ہوتی ہے۔''

''لیکن ماموں! عبداللہ، نومی اور عالی کی مائیں تو ہر وقت ان کے پاس، ان کے ساتھ رہتی ہیں، ان کے گھروں میں رہتی ہیں، انہیں نہلاتی ہیں، انہیں کپڑے پہناتی ہیں، ان کے بالوں میں کنگھا کرتی ہیں، انہیں اپنے ساتھ سلاتی ہیں اور روتی بھی ..... اپنے ساتھ .....''

''بس..... بس کر میرا بچہ! بس کر۔'' ماموں میرے سوالات کی بوچھاڑ سے یکدم گھبرا جاتے۔ ان کا گلا شدتِ جذبات سے رندھ جاتا اور میں سہم کر خاموش ہو رہتا۔

پھر وقت گزرنے لگا تو مجھے ماموں سے تو نہیں البتہ گاؤں میں اپنے ساتھ کھیلتے کودتے بچوں سے رفتہ رفتہ پتہ چلنے لگا کہ میری ماں جس سلاخوں والی جگہ میں رہتی ہے، اسے جیل کہا جاتا ہے۔

''ماموں!..... جیل کیا ہوتی ہے؟'' ماموں خاموش رہتے تو میں اپنے ہم جولیوں سے سنا ہوا جواب دہرا کر پوچھتا۔ ''ماموں! جیل ایک گندی جگہ ہوتی ہے نا، جہاں گندے اور برے لوگوں کو بند کر دیا جاتا ہے..... تو کیا میری ماں بھی گندی ہے؟''

''نہیں بیٹا! تمہاری ماں گندی نہیں ہے۔ گندی نہیں ہے وہ۔ اسے گندا کہنے والے خود گندے ہیں۔'' ماموں غم سے چور لہجے میں بولتے۔

''تو پھر..... تو پھر..... عبداللہ اور نومی مجھ سے یہ کیوں کہتے ہیں کہ تمہاری ماں گندی ہے اسی لئے تو اسے جیل میں بند کر دیا ہے۔''

''جھوٹ بولتے ہیں وہ..... تم ان کی باتیں نہیں سنا کرو۔''

ماموں کی طرف سے میں بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے تھے۔ پھر میں نے ہی چپ سادھ لی تھی اور میری زندگی کا یہی وہ دور تھا جب میری نفسیات، میرا دل میرا ذہن اور تمام احساسات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے۔ میں حد درجہ حساس ہوتا چلا گیا اور چپ چاپ سا رہنے لگا۔ یہاں تک کہ میں اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا۔

ماموں حیدر گل مجھے تقریباً ہر تیسرے چوتھے روز جیل میں اس عورت سے ملوانے کے لئے لے جاتے رہتے تھے۔ ایک تنگ و تاریک، گھٹن آمیز اور ننگی اینٹوں والے کمرے میں مجھے اور ماموں کو اس عورت سے ملوایا جاتا تھا۔ دو پولیس والے میری ماں کو لے کر آتے تھے۔ اب میں اس کو ایک بے نام سی حیرت سے نہیں بلکہ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک گورے چٹے رنگ اور تیکھے نقوش والی بڑی دبنگ عورت نظر آتی تھی۔ قد بھی اس کا نکلتا ہوا تھا۔ بال بھی لمبے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مجھ سے تو وہ ممتا بھرے لہجے میں بولتی تھی مگر میں نے اکثر دیکھا اور محسوس کیا کہ جب وہ ماموں حیدر گل سے بات کرتی تو اس کے لہجے کی ممتا بھری گرمی جلتی سلگتی آگ میں بدل جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ ماموں حیدر گل سے اس قدر غضب ناک لہجے میں عجیب و غریب گفتگو کرتی تھی کہ خود میں سہم جایا کرتا تھا۔

''گل!..... میرا نادراب بڑا ہو گیا ہے ..... اسے حقیقت بتا دو تو اچھا ہے۔'' ایک روز اس عورت

نے بڑے پیار سے میرے سر کے بال اپنی نرم انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ماموں سے کہا۔

''ابھی اس کا ذہن کچا ہے شبینہ!..... یہ بچہ ہے ابھی۔'' ماموں ہولے سے میری طرف ایک نظر ڈال کر اس عورت سے کہتے۔ مجھے اس عورت کا نام ذہن نشین ہو گیا۔

''نہیں گل!.....'' وہ عورت ماموں کو دیکھ کر تیز لہجے میں کہتی۔ ''یہی وہ عمر ہوتی ہے جب دھیرے دھیرے کوئی بات اندر پروان چڑھتی ہے اور بعد میں ایک عزمِ صمیم کا تناور درخت اُگاتی ہے۔ ورنہ جب اِدھر اُدھر سے اس کو حقیقت کا علم ہو گا تو ہو سکتا ہے اس کا دل میری طرف سے خراب ہو جائے۔''

اس عورت کی بات پر ایک بار پھر میرے چھوٹے سے ذہن میں سوالوں کے تھوہر اُگ آئے اور میں حیرت سے سوچتا۔

'آخر وہ کیا حقیقت تھی، جو اس عورت کی طرف سے میرا دل خراب کرنے کا باعث بنتی؟'

اس طرح مجھے مزید کریدلگ گئی۔ میں نے اب ماموں سے سوالات پوچھنا ترک کر دیا تھا مگر یہ سن کر مجھے مزید شہ مل گئی تھی کہ مجھے ہم جولیوں سے اپنے سوالات کے جوابات مل سکتے تھے۔ ماموں خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ مجھے واپس گھر لے آئے۔

ماں کے خلا کے ساتھ ساتھ میرے ننھے دل و دماغ میں باپ سے متعلق بھی سوال ابھرتا کہ میرا باپ کون تھا؟ کہاں تھا؟ مگر ماموں حیدر گل نے تو حسب دستور چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ وہ شاید میرے بڑے ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں خود ہی اس عورت ''شبینہ'' سے پوچھ لوں۔ آخر وہ کون تھی؟ اگر وہ میری ماں تھی تو میرے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟ یہاں جیل کے سیلن زدہ ماحول میں آہنی سلاخوں کے پیچھے کیوں قید تھی؟ ..... اور ..... اور وہ کیا حقیقت تھی، جو اب تک مجھ سے چھپائی جا رہی تھی۔ مگر باوجود کوشش کے میں اس عورت سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔

❋ ❋ ❋

ماموں حیدر گل نے میری پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے مجھے شہر کے ایک اچھے اسکول میں داخل کروا رکھا تھا۔ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرا اسکول ہمارے گاؤں سے تقریباً آٹھ، دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ فضل چاچو جو ہمارا پرانا خدمت گار تھا، وہ مجھے روزانہ ایک سفید رنگ کی جیپ میں اسکول لے جایا کرتا تھا اور ٹھیک دو بجے چھٹی کے وقت دوبارہ لینے آ جاتا۔

صغراں..... چاچا فضل کی بیوی تھی اور میں نے شروع ہی سے خود کو اس کی گود میں پایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں پہلے پہل اسے ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تھی۔ میری ماں سے بھی بڑی عمر کی تھی۔ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔ فضل چاچا بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے باری باری ان دونوں سے بھی اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر جواب ندارد..... وہ مجھے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ یقیناً ماموں نے ہی انہیں مجھے کچھ بتانے سے منع کر رکھا تھا۔

ہمارا گاؤں ڈونگا گلی اور نتھیا گلی کے وسط میں ایک خوب صورت اور سرسبز وادی میں تھا جس کے چہار اطراف چیڑ اور صنوبر کے لانبے لانبے درختوں کا گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ زرد آلو، ناشپاتی اور آلوچے کے پیڑوں کا سلسلہ بھی دور تک چلا جاتا تھا۔ ان کے عقب میں دور سر بفلک پہاڑی چوٹیاں، پُرغرور شہزادیوں کی طرح برف کا تاج سجائے نظر آتیں۔ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ بھی لگا رہتا تھا۔ عموماً یہاں دسمبر میں برف باری ہوتی تھی۔ گنگناتی آبشاریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلترنگ بجاتے جھرنے اس وادی کا قدرتی حُسن دوبالا کیے دیتے تھے۔ بارشوں کے بعد تو یہ حُسن مزید نکھر جاتا۔ جنگلی گلاب، خوشنما پھول سب مہک اٹھتے۔ کشمیر کی وادیوں سے آنے والے ہمالیائی سنہولے (سنہرے مرغ) اپنے نیلے، سنہرے اور سرخ پنکھ نما پر پھیلائے ترائیوں میں اپنی کلغیوں والے خوبصورت سر اٹھائے سرمستی کے عالم میں گنگناتے، اُڑتے رہتے تھے۔ پھر جب سنہرا سورج پہاڑیوں کی سرپھلک چوٹیوں پر آن ٹکتا تو جیسے ہرسُو نارنجی، نیلے، پیلے، سرخ اور جامنی رنگوں کی خوب صورت قوسِ قزح بکھرنے لگتی۔ غرض فطری حُسن سے مالا مال ہمارا گاؤں قدرت کی صناعی کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

ہمارا پختہ اینٹوں والا مکان، گاؤں کی آبادی سے ذرا ہٹ کر خاصی بلندی پر واقع تھا۔ یہاں سے یہ سب نظارے اور بھی دلفریب نظر آتے تھے۔ ہمارا قرمزی اینٹوں والا مکان بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ ایک باغیچہ بھی تھا جس میں چنبیلی کے پودے اور بوگن ویلیا کی خوش رنگ پھولوں والی بیلیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بید مشک اور شاہ بلوط کے پیڑ بھی تھے۔ دیواروں سے ملحقہ آئیوری کی بیلیں بھی جڑی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ہمارے پہاڑی مکان کے سامنے ذرا دور ڈھلوان چھتوں والے ریسٹ ہاؤس کی جھونپڑی نما خوبصورت عمارتیں چیڑ کے درختوں کے عقب سے جھلکتی صاف نظر آتی تھیں۔

ماموں حیدر گل کے پاس بارہ بور کی دو عدد بندوقیں بھی تھیں۔ وہ شکار کے بھی رسیا تھے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھار میں بھی چلا جاتا تھا۔ اس موقع پر فضل چاچا ہمیشہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ ماموں ایک بندوق ان کے حوالے بھی کر دیتے۔ چھرے والے کارتوسوں کے علاوہ سکے کی گولیاں بھی رکھتے تھے۔ ان کی بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق کی ایک نال میں چھروں والا کارتوس ڈلتا تھا جبکہ دوسری نال میں سکے والی گولی۔ یہ اس احتیاط کے پیشِ نظر ڈالی جاتی تھی کہ کبھی کبھار چھوٹے شکار جانوروں اور پرندوں کے علاوہ بھیڑیئے، ریچھ اور تیندوے جیسے خونخوار جانوروں سے بھی پالا پڑ جایا کرتا تھا۔ ماموں حیدر گل عموماً جنگلی خرگوشوں، بکروں (آئی بیکس) اور سنہرے مرغوں کا شکار کرتے تھے۔ سنہرے مرغ (سنہولے) کا گوشت کم از کم تین کلو کے قریب نکلتا تھا۔ ماموں بڑی احتیاط سے ان کی کھالیں اتار کر چاچا فضل کو دے دیتے۔ وہ انہیں مری یا ایبٹ آباد لے جا کر کاریگر کو دے دیتے جو ان میں مصالحہ لگا کر بھس بھر دیتا اور دوبارہ انہیں ٹانگوں پر کھڑا کر دیتا۔ بعد میں شوقین اسے کمروں کے کارنس پر سجاتے۔

میرے ماموں لکڑی کی ایک بہت بڑی ٹال کے مالک تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی مگر مجھے اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اگر میرا باپ ہوتا تو وہ بھی ایسی ہی محبت کرتا۔

❄❄❄

ایک روز جب حسبِ معمول ماموں حیدر گل مجھے جیپ میں بٹھا کر شہر لائے۔ میں نے تھوڑی بہت شاپنگ کی۔ وہاں سے انہوں نے جیپ گاؤں کی طرف موڑنے کی بجائے جب جیل جانے والی سڑک پر ڈالی تو میں نے ماموں حیدر گل سے جیپ روکنے کو کہا۔

وہ سمجھے شاید میں نے پیشاب وغیرہ کرنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ جب انہوں نے سڑک کے کنارے چیڑ کے صف بستہ ایستادہ درختوں کی چھاؤں میں جیپ روکی تو میں نے پوچھا۔

"ماموں! آپ جیل جا رہے ہیں؟"

انہیں میرے سوال پر حیرت تو ہوئی تاہم انہوں نے حسبِ عادت اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔ "ہاں۔"

"مگر میں اب وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

ماموں کو شاید مجھ سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔

"کیوں بیٹا؟..... کیا تم اپنی ماں سے ملنے نہیں جاؤ گے؟" پہلی بار ماموں نے جرح کی۔

"نہیں ماموں! وہ میری ماں نہیں ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ماموں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا مگر ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جیپ خاموشی سے واپس موڑ لی۔

میرا خیال تھا کہ ماموں اس بارے میں گھر جا کر مجھ سے خوب جرح کریں گے۔ مگر وہ مجھ سے کچھ بھی نہ بولے۔ مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں بھی چپ رہا۔

پھر یوں ہوتا رہا کہ ماموں مجھے ساتھ لے جانے کو کہتے تو میں انکار کر دیتا اور وہ خاموشی سے خود ہی چلے جاتے۔

ایک روز وہ ماں سے مل کر شام گئے لوٹے۔ وادی میں اندھیارے اُترنے لگے تھے۔ ماحول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز پہچان کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جی ماموں.....!" دروازہ کھلا اور ماموں حیدر گل اندر داخل ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر گہری متانت طاری تھی۔ مگر آج ان کا چہرہ قدرے مختلف تاثرات کی غمازی کر رہا تھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے سامنے بچھے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

وہ چند ثانیے میرے چہرے کو تکتے رہے، اس کے بعد بولے۔

"نادر بیٹے! تم اپنی ماں سے اب کیوں نہیں ملنا چاہتے؟"

"ماموں! میرے اس سوال کا جواب آپ کے پاس ہی ہے۔" میں نے اپنی ذہنی وسعت کے اعتبار سے کہا۔

وہ خاموش رہے جیسے مزید وضاحت چاہتے ہوں۔ میں نے دوبارہ ذرا واضح لفظوں میں کہا۔

"ماموں! کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں اپنی ماں کے متعلق آپ سے جان سکوں؟ وہ جیل میں کیوں ہے؟..... میری ماں جیل میں آخر کون سی سزا بھگت رہی ہے؟ اور..... اور مزید یہ کہ میرا باپ کون ہے؟ وہ کہاں ہے؟ مجھے جب تک اس بارے میں تسلی بخش جوابات نہیں مل جاتے، میں اب اس عورت سے ملنے نہیں جاؤں گا۔"

میرا ہٹیلا پن اب پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ماموں مجبور ہو کر مجھے ان سارے سوالوں کے جوابات ضرور دیں گے۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر برف جمی رہی۔ وہ نہیں پگھلی تھی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔ میرے اندر بھی اب اس راکھ کو کریدنے کی ایک ضد سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسی راکھ جس کے نیچے مجھے کسی اندر ہی اندر سلگتی ہوئی چنگاری کی تپش سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور میں اس دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں اس کی تپش کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ کون سی آگ کی پیدا کردہ خاکستر راکھ تھی؟ یہ جاننا میرا حق تھا اور جب تک مجھے میرا یہ حق نہیں مل جاتا، میں اس عورت کو اپنی ماں تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

❄❄❄

کئی موسم بدلے، پہاڑوں پر برف پگھلتی رہی۔ درختوں نے نئے پیرہن اوڑھے مگر میرے اندر کا خلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پُر نہ ہو سکا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ میں اپنے آپ میں ہی گم رہنے لگا اس طرح زندگی کے مزید کئی سال بیت گئے اور میں ایک کڑیل جوان کے روپ میں اُبھرا۔ سرخ و سپید رنگت، دراز قد، چوڑے شانے، وجیہہ صورت۔ دل میں نئے نئے جہان کھوجنے کی تمنا، والہانہ جذبوں ترنگ۔ مگر گاؤں کے دیگر نوجوانوں کے برعکس میری آنکھیں نہ صرف خوف سے عاری تھیں بلکہ ان م ہر سمے ایک اُداسی سی ہلکورے لیتی رہتی۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو پھانس کی صورت اٹک کر رہ گیا تھا۔ م خواب دیکھنے والا نوجوان نہ تھا۔ میں حقیقت پسند تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد ماموں نے مجھے پنڈی کے ایک گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخل کروا دیا تھا وہیں میں ہاسٹل میں رہنے لگا۔ میرا ایک روم میٹ جو میرا ہم عمر تھا، میرا گہرا دوست بن گیا۔ اس کا نا کبیر احمد تھا۔

وہ ایک سرکاری ٹھیکے دار، نظر حیات کا بیٹا تھا۔ کبیر احمد کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ وہ آٹھویں م پڑھتی تھی۔ کبیر احمد میرے برعکس ذرا لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ میں جتنا سنجیدہ اور خاموش خاموش رہ تھا، وہ اتنا ہی چلبلا اور شوخ و شنگ تھا۔ پھر بھی ہمارے درمیان کوئی ایسی قدر مشترک تھی جو ہمیں دوستی ک ڈور میں باندھے ہوئے تھی۔ میری طرح وہ بھی خوبرو نوجوان تھا۔

ہم دونوں ابھی ایف۔ ایس۔ سی کے پہلے سال میں تھے کہ ان دنوں کالج میں سالانہ اسپورٹس ڈیک کا انعقاد کیا گیا اور ایک ہفتہ پہلے ہی گراؤنڈ میں مختلف ٹولیوں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے ریہرسل شروع کر دی۔ ہمارے کالج میں ٹیبل ٹینس اور اسکواش کے لئے جمنازیم بھی تھا۔ مجھے ٹیبل ٹینس کا شوق تھا اس لئے میں نے ٹیبل ٹینس میں اپنا نام درج کروالیا تھا۔ جبکہ کبیر احمد نے اسکواش کا انتخاب کیا ہم اپنی پریکٹس مکمل کر چکے تھے۔ اگلے ہفتے کے پہلے دن سے باقاعدہ میچوں کا انعقاد شروع ہو گیا۔ ان میچز میں دیگر کالجز اور یونیورسٹیوں کی ٹیموں نے بھی حصہ لیا۔

ہمارے پول کے ابتدائی دو میچ سینٹ جانز اور سینئر کیمبرج والوں سے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہ نے انہی سے اگلے میچ کھیلے اور پے در پے شکست سے دوچار کر کے نہ صرف اپنے پوائنٹ برابر کر لئے بلکہ ہم نے دو پوائنٹ فائن آؤٹ کروا ڈالے۔ اب میری حکمت عملی انہی اضافی پوائنٹس کو برقرار رکھنے کی حد تک تھی اور اسی لئے ہماری ٹیم نے دفاعی کھیل کھیلتے رہنے کو آخر تک ترجیح دی۔ آخری یا فائنل میچ میں ہماری مدمقابل ٹیم میں لڑکے کے علاوہ جو لڑکی شامل تھی اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہو گی۔ بہت طرح دار، حسین اور پُرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ الٹرا ماڈرن اور شوخ و شنگ دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ملائم جلد، صنوبر کے درخت کی طرح دراز قد، جسم بھی متناسب اور گداز تھا۔ بال شہد رنگ کے بوائے کٹ تھے۔ نچلا ہونٹ بہت ہی گداز تھا مگر اس کے حُسنِ دل آرا اور بے داغ میں جو شے سب سے زیادہ پُرکشش تھی وہ اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہرا نشہ ہلکورے لیتا محسوس ہوتا تھا اور بے اختیار ان میں ڈوب کر کھو جانے کو دل کرتا۔

"واہ .... واہ ...." میری نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں اور دلِ بے اختیار نے اسے داد دے ڈالی۔ وہ بہت بولڈ اور الٹرا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس نے سرخ ربن سے اپنے ریشمی بال باندھ رکھے تھے۔ پیروں میں سفید اور نیلی لکیروں والے اسپورٹس شوز تھے، بیش قیمت مائیکل پیٹر کا نیلا ٹراؤزر اور اوپر زپ والی فل آستین کی شرٹ تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ایک لمحے کو مبہوت رہ گیا۔ پل بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے جھیل سیف الملوک سے کوئی اپسرا بھٹک کر ادھر آ نکلی ہو۔

ٹاس میں نے جیت لیا۔ سروس شروع کی۔ اور پھر تو جیسے اس نازک اندام دوشیزہ نے ایسے ایسے شاٹس کھیلے کہ مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ اب میں اس کے ملکوتی حُسن کے ٹرانس سے نکل آیا اور جم کر کھیلنے لگا۔ جب اس نے مجھے جم کر کھیلتے دیکھا تو میری حکمت عملی کو فوراً سمجھ گئی کہ میں پوائنٹ لینے کے چکروں میں نہیں تھا۔ اب اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کی اپنی جستجو کو میری ساتھی کی طرف موڑا اور اگلے راؤنڈ میں اس نے اپنے ساتھی کو میرے مقابل چھوڑ کر سختی سے یہ ہدایت کر دی کہ وہ میری دفاعی چال کی نہ تک کھیلے اور خود اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کے لئے تابڑ توڑ میری ساتھی کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری دو ایک حملوں میں ہی چاروں شانے چت ہو گئی اور یوں اس نے اپنے پوائنٹ نہ صرف برابر کر لئے بلکہ اوپر تلے پورے چار اضافی پوائنٹ لے کر ہمیں بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے مثال حُسن کے ساتھ ساتھ ایک زرخیز ذہن کی بھی مالک تھی۔

آخری راؤنڈ شروع ہوا تو میں نے پوری ذمے داری کے ساتھ کھیلنا شروع کیا اور اس کی چال کو کور کرتے ہوئے اس پر ہی الٹ دیا۔ یعنی اب وہ جس طرح میری نسبتاً کمزور ساتھی سے پوائنٹ لینے کی کوشش کر رہی تھی، اسی طرح میں نے پوائنٹ کے لئے اس کے ساتھی کے خلاف تابڑ توڑ شاٹس کھیلنے شروع کر دیئے۔ ادھر جب اس طرح دار اپسرا نے یہ دیکھا کہ میں اب دفاعی کھیل کو ترک کر کے باقاعدہ حملوں پر اتر آیا ہوں تو وہ میرے مدمقابل آ گئی۔

اب ہمارے درمیان کانٹے کا سنسنی خیز مقابلہ شروع ہو گیا۔ میری نظریں اس کے شہابی رنگ والے رخِ روشن کے بجائے بال اور نیٹ پر تھیں۔

بالآخر بڑی مشکلوں سے ہمیں محض ایک پوائنٹ کی برتری حاصل ہوئی اور یوں ہم یہ میچ بڑے سخت مقابلے کے بعد جیت گئے۔ میں میچ تو جیت گیا تھا مگر اپنا دل ہار بیٹھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے جیت کی مبارک باد دیتے ہوئے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا روئی جیسا نرم ہاتھ تھامتے ہی میرا اندر تہہ و بالا ہونے لگا۔

"بہت اچھا کھیلے ہیں آپ۔" اس نے آہستگی سے ہاتھ واپس کھینچا۔

"آپ نے بھی خوب شاٹس کھیلے ہیں۔ محض ایک پوائنٹ کی برتری کو میں جیت نہیں سمجھتا۔ یہ بہت کم لیڈ ہے۔" میں نے اس کی سیاہ جھیل جیسی گہری آنکھوں میں گویا ڈوب کر اُبھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"نہیں .... فتح بہرحال فتح ہے۔ آپ جیت چکے ہیں۔ اور میں ہار چکی ہوں۔"

اس کی آواز ایسے تھی جیسے دور کہیں مرغزاروں میں کوئل کوک رہی ہو۔

"ہار تو میری ہوئی ہے۔" میں نے کھوئے کھوئے گہرے لہجے میں کہا۔

"جی.......؟" اس کے چونکنے کی ادا بھی کیا تھی۔ دلِ بے چین کو گرماتی ہوئی ادا۔

"آں .... ہاں، پپ....... پتہ نہیں .... میں کیا کہہ گیا۔" میں جھینپ کر بولا۔ میں نے اس کے گداز ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور پھر وہ اپنی اسپورٹس کٹ کندھے پر ڈالے چلی گئی۔

❄❄❄

مجھے اس اپسرا کا نام نگینہ معلوم ہوا تھا۔ وہ واقعی ایک خوب صورت اور جگمگاتا ہوا نگینہ تھی۔ ایسا انمول نگینہ جس کی کوئی قیمت نہ تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس روز کے بعد میرے دل کا چین غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود حیران تھا حالانکہ جس کالج میں، میں پڑھتا تھا وہ کو ایجوکیشن تھا۔ پھر اپنے گاؤں کی الہڑ پہاڑی لڑکیوں کو بھی میں نے دیکھا تھا لیکن کسی مہ جبین کے چہرے نے میرے دل کے اک تارے کو ابھی تک نہیں چھیڑا تھا۔ نگینہ نے تو جیسے میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا ڈالا تھا۔

پہلی بار میرے جذبات پر چھائی ہوئی برف محبت کی شدت سے پگھلنے لگی۔ ہاں، پہلی بار ..... رنگوں کی اس خوب صورت قوسِ قزح سے آشنا ہونے لگا۔ مجھے آج پتہ چلا، دل کیا ہے؟ یہاں کون ہے؟ کون گھر کرتا ہے؟ اور یہ دل جسے ہم اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں شاید یہ غلط ہے۔ یہ دل تو اپنا ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کسی اور کی امانت ہوتا ہے۔ اس کا مالک تو کوئی اور ہوتا ہے۔ کنواری لڑکی کی طرح، ادھر جوان ہوا اور ادھر وداع ہو گیا۔ ہاں، میرا دل بھی جیسے آج وداع ہو گیا تھا۔ مگر نہیں، میرا دل کو تو کوئی چرا لے گیا تھا اور چور ایک حسین اور پری وش اپسرا..... نگینہ تھی۔ اس روز کے بعد سے جیسے میرے اندر کا چھایا ہوا غبار کافور ہونے لگا۔ سنجیدگی اور قنوطیت کا وہ خول اس دن کے بعد بالکل تڑ کر رہ گیا۔ میٹھی میٹھی محبت کی نرم نرم دھوپ نے جیسے میرے دل پر چھائے ہوئے گلیشیر کو پگھلا دیا تھا بہار کے ایک ہی معطر، خوشگوار جھونکے نے میرے اندر کے خزاں رسیدہ سناٹے کو گلزار بنا دیا تھا۔ ایکا ایک مناظر فطرت کے حسین نظارے مجھے دلفریب محسوس ہونے لگے تھے۔ میرا چہرہ کھویا کھویا ضرور رہنے لگا لیکن اس خاموشی کے اندر سرخوشی کا عالم تھا۔

سب سے پہلے ماموں حیدر گل نے میرے اندر کی اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر حسب عادت انہوں نے مجھے کریدا نہیں تھا۔ میرے انکار کے بعد اب وہ اکیلے جیل جایا کرتے تھے۔ میری ماں ان کی بہن تھی، بھائی کی حیثیت سے ان سے ملنے جاتے اور اپنا بھائی ہونے کا فرض ادا کرتے۔

میں تقریباً ہر ویک اینڈ پر گاؤں آتا تھا۔ چاچا فضل جیپ لے کر شہر پہنچ جاتے تھے۔ گاؤں میں ا میرا دل نہیں لگتا تھا۔ جب سے نگینہ کو میں نے دیکھا تھا، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے کے مصداق اس پھر دیدار کرنے کو دل بے چین رہنے لگا تھا۔ مگر ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔

بہر طور اس بار میں پورے بیس روز بعد گاؤں آیا۔ وہ بھی محض دو دنوں کے لئے۔ ایک بار رات ماموں حیدر گل میرے کمرے میں آئے۔

''نادر! تمہیں بہت روز ہو چکے ہیں اپنی ماں سے ملے ہوئے..... کم از کم ایک بار ان سے مل پھر نہ جانے کب تم گاؤں لوٹو۔'' انہوں نے گہری متانت سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بار ان کے لہجے میں ایک موہوم سی التجا تھی۔

جواباً میں ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔

''ماموں! پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جس عورت کو آپ میری ماں کہتے ہیں.....''

''نادر.....!'' اچانک ماموں حیدر گل نے ذرا تیز لہجے میں میری بات کاٹی اور میں ہکا بکا ان کا تکنے لگا۔ آج پہلی بار ماموں نے مجھ سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

''وہ عورت نہیں، واقعی تمہاری ماں ہے ..... تمہاری سگی ماں..... جس نے تمہیں جنم دیا ہے۔ تم..... ہاں.....''

میں ماموں کے اس درشت رویے کا برا نہیں مان سکتا تھا کیونکہ انہوں نے میری پرورش اسی طرح تھی جیسے کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی کر سکتا ہے۔ اس لئے ماموں کو مجھے ڈانٹنے کا پورا حق تھا۔

''سوری ماموں!'' میں نے ہولے سے سر جھکا کر کہا، پھر بولا۔ ''مگر ماموں! آخر مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی جا رہی ہے کہ میری ماں..... جیل میں اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے..... آخر نہوں نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے کہ..... کہ..... میری پیدائش بھی جیل کی چہار دیواری میں ہوئی اور..... اور اب جبکہ میں اٹھارہ برس کا ہو چکا ہوں لیکن ماں کی سزا ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ میں نے تو آج تک اپنے باپ کی بھی شکل نہیں دیکھی ہے۔ وہ کہاں ہے؟ کون ہے؟''

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا، ماموں آج بھی ہمیشہ کی طرح خاموشی سے لوٹ جائیں گے۔ مگر آج ایسا نہیں کیا انہوں نے..... وہ میری طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لے کر بولے۔

''نادر!..... تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا باپ تمہاری پیدائش سے قبل ہی انتقال کر چکا تھا اور تمہاری بدنصیب ماں حالات کی اس سیاہ آندھی کی لپیٹ میں آ گئی کہ اس بے گناہ کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ آخر تم..... ماضی کی یہ راکھ کریدنے پر کیوں بضد ہو؟''

میں نے ان کی بات پر قدرے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ میری ماں تو مجھے حقیقت بتانے کے لئے ماموں سے اصرار کرتی رہی تھی۔ مگر جانے کیوں ماموں مجھے کچھ بتانے پر قطعاً راضی نہ تھے۔

''ماموں! آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھ رہے..... میرے اندر ایک پھانس ہے، جو اب ایک ناسور بن گئی ہے۔ یہ پھانس مجھے ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں رہنے دیتی۔ پہلے تو میں بچہ تھا، مگر اب تو میں جوان ہو چکا ہوں۔ شہر کے ایک بڑے کالج میں پڑھتا ہوں، باشعور ہوں..... اور برے بھلے کی تمیز بھی رکھتا ہوں۔ میرا اُٹھنا بیٹھنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز گھرانوں کے لوگوں کے درمیان ہے۔ میں اب معزز معاشرے کا ایک فرد بن چکا ہوں جہاں سب سے پہلے اپنے تعارف کی بجائے اپنے باپ کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ آپ نے تو ایڈمیشن فارمز میں سرپرست کے خانے میں اپنا نام درج کروا دیا ہے مگر میں لوگوں کو کیا جواب دوں جو مجھ سے سب سے پہلے میرے نام کی بجائے میرے باپ کا نام پوچھتے ہیں۔ کون ہے، کیا کرتا ہے؟ ماموں! پلیز..... میں آپ سے گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... مگر ..... مگر ماموں! مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ میرا باپ کون تھا؟ اگر وہ مر چکا ہے تو کیسے مرا؟ ..... اس کا نام کیا تھا؟ کیا ..... کیا مرنے والوں کے نام بھی ان کے ساتھ مر جاتے ہیں؟ نہیں..... نہیں ماموں! نہیں..... آپ مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھ کر بے موت نہیں مار سکتے۔ پلیز ماموں! پلیز.....''

فرطِ رقت و جذبات سے میرا لہجہ رندھ گیا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

ماموں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ میری غم زدہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے ان کا شانہ بھگو دیا۔ اس کے بعد ماموں نے آہستگی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میری آبدیدہ آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیر رہی تھی۔ پھر وہ میرے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر بولے۔

''نادر! تمہارے لئے میرے دل میں ایک باپ جیسی ہی محبت ہے۔ ویسی ہی شفقت ہے جیسی ایک باپ کو اپنی اولاد سے، اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے دل میں اس بات کا بھرپور اعتراف رکھتے ہو۔ تو بیٹا! میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں حکم نہیں دوں گا بلکہ ایک درخواست کروں گا کہ اس وقت تم جس کرب سے گزر رہے ہو، اس کا احساس راکھ میں دبی اس چنگاری سے کہیں بہتر ہے جسے تم کریدنا چاہتے ہو۔ میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں تم پر، تمہارے درخشاں مستقبل پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ہنستی بستی زندگی پر تمہارے ماضی کا وہ بھیانک سایہ نہ پڑنے دوں جسے میری دور اندیش نظریں ایک سیاہ طوفان کی صورت میں تمہاری طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ بیٹے! اس راکھ کو اسی طرح دبا رہنے دو..... اسی طرح دبا رہنے دو..... اس چنگاری کو مت چھیڑو..... اسے مت کریدو..... مت کریدو۔'' ان کا لہجہ مرتعش ہو گیا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

میرے اندر عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ آج پہلی مرتبہ ماموں نے بڑے عجیب وغریب لہجے میں اور بڑی اسرار بھری باتیں کی تھیں۔ جو بظاہر مبہم تھیں مگر ماضی کے کسی ناخوشگوار اور تلخ واقعے کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھیں۔ مجھے واقعی اعتراف تھا کہ ماموں حیدر گل کی میرے لئے شفقت اور محبت بے غرض تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے تو مجھے یہ تک بھی بتا ڈالا تھا کہ وہ جس ٹال کو کامیابی کے ساتھ کاروبار کی بنیادوں پر چلاتے رہے، وہ ان کی ملکیت نہ تھی۔ یہی نہیں، گاؤں میں تعمیر شدہ یہ خوبصورت پہاڑی بنگلہ سارا بینک بیلنس میری ماں کی ملکیت تھا اور وہ جیل جا کر اپنی بہن کو ایک ایک پائی کا حساب دیتے تھے۔ یہی نہیں، انہوں نے اپنی بہن کی رضامندی سے پاور آف اٹارنی میرے سپرد کر دی تھی اور لکڑی وغیرہ کی خرید و فروخت، ٹینڈر وغیرہ کی مطلوبی سے متعلق دیگر کاغذات اور چیکس وغیرہ پر بھی میرے ہی دستخط ہوتے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ان کی یہ منطق نہیں آ رہی تھی کہ آخر میرے ماضی سے متعلق ایسی کون سی چنگاری تھی، جسے وہ کریدنا نہیں چاہتے تھے؟ اور ..... اور آخر اس بھیانک طوفان کی کیا حقیقت تھی جو ان کی دور اندیش نظریں دیکھ رہی تھیں۔

چند ثانیے ماحول میں گمبھیر سناٹے کی سی فضا طاری رہی۔ وہ میری طرف بڑھے اور پُرسوچ نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

''نادر بیٹے! تمہیں ایک اور بات بتاؤں، جس دن تم نے میرے ساتھ جیل جا کر اپنی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، یقین کرو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔''

میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔ وہ میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے۔

''ہاں بیٹا! دراصل میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنی ماں سے ملو۔ بلکہ..... بلکہ میں تو یہ بھی چاہتا تھا کہ تمہیں یہ بھی نہ پتہ چلے کہ تمہاری ماں زندہ ہے اور جیل میں اپنے ناکردہ جرم کی طویل سزا بھگت رہی ہے۔''

ماموں کا لہجہ بری طرح کپکپا رہا تھا اور میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ میرے اعصاب چھٹتی ہو رہے تھے۔

''مگر..... یہ تمہاری ماں کا اصرار تھا کہ میں تمہیں اس سے ملاتا رہوں۔'' وہ کہنے لگے۔ ان کی آواز ہنوز مرتعش تھی۔ ''میں اس کی خواہش رد نہ کر سکا اور دل پر جبر کر کے میں ایسا کرتا رہا۔ لیکن تمہاری ماں اور بھی بہت کچھ چاہتی تھی..... مگر میں نے اس کی مزید کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا۔''

''کیوں..... کیوں ماموں! آپ آخر ایسا کیوں چاہتے تھے؟'' مجھ پر ایک بار پھر کرب ناک سی رقت طاری ہونے لگی۔ میں ایک تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا کہ آخر ماموں ایسا کیوں چاہتے تھے؟ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ماں سے ملاقات سے انکار پر ماموں آخر کار تنگ آ کر مجھے اس حقیقت سے آگاہ کر دیں گے جو مجھ سے پوشیدہ رہ گئی اور جس نے میری نفسیات پر بھی برے اثرات مرتب کئے تھے۔

بہرطور میرے احتجاج آمیز استفسار پر ماموں نے میرے شانوں کو گرم جوشی سے تھاما اور بولے۔

''نادر بیٹے! ابھی تم اپنی پڑھائی مکمل کرو، میں تمہیں ایک بڑے اور کامیاب آدمی کے روپ میں دیکھنا

چاہتا ہوں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم اپنی پڑھائی پر پوری توجہ مرکوز رکھو۔ ٹھیک ہے..... تم اپنی ماں سے نہیں ملنا چاہتے ہو تو نہ ملو مگر اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرو۔ ٹھیک ہے بیٹا!'' ماموں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر کمرے سے نکل گئے۔

پھر مجھے باہر جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لحہ بہ لحہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ ماموں اکیلے ہی اپنی بہن سے ملنے شہر چلے گئے تھے۔

❄❄❄

اب تو میں ماموں حیدر گل کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ ماموں اپنے تئیں میرے کسی بھلے کی خاطر ہی مجھے کسی ایسی نادیدہ آگ سے دور رکھنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی تپش میری زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دے گی۔ وہ مجھے میری ماں کے تلخ ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتانا چاہتے تھے۔ حالانکہ جب میں اس سے پہلے ماموں کے ساتھ جیل، ماں سے ملنے جایا کرتا تھا تو ماں بڑے پیار سے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے ماموں سے یہ کہا کرتی تھی کہ۔

''گل!..... نادر کو دھیرے دھیرے حقیقت سے آگاہ کرتے رہو۔ ورنہ اِدھر اُدھر سے اگر اسے (مجھے) حقیقت کا علم ہوا تو اس کے منفی اثرات اس کے دل و دماغ پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ کہیں ..... کہیں یہ..... میرا بیٹا ہی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جائے۔''

مجھے اس وقت یہ سن کر بہت حیرت ہوئی۔ آج جب ماں کی اپنے بھائی (ماموں) کو کی گئی تاکید میرے دل و دماغ میں گونجی تو میرے اندر کی کرید مزید سوا ہونے لگی تھی کہ آخر اس حقیقت میں ایسی کون سی پراسرار بات پوشیدہ تھی جسے اگر میں اِدھر اُدھر سے معلوم کر لیتا تو میرے دل میں اپنی ماں کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے فضل چاچا اور اس کی بیوی صغراں سے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان دونوں بے چاروں نے نہایت غریبانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

''چھوٹے صاحب! ہم نوکر ہیں..... ہمیں نوکر ہی رہنے دیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے منہ پر تالے لگا دیئے گئے ہیں۔'' مجھے اور غصہ آتا۔ حالانکہ ہونا تو ایسا چاہئے تھا کہ میں اگر ''اپنے تئیں'' نیچے وادی میں جا کر گاؤں کے کسی عمر رسیدہ شخص یا دیگر لوگوں سے استفسار کرنے کی کوششیں کرتا تو مجھے حقیقت کا کچھ نہ کچھ علم ہو سکتا تھا۔ مگر پھر سوچتا کہ کیا ان لوگوں سے اپنے خاندان کے ماضی کے بارے میں پوچھنا مناسب ہو گا؟ میں اپنا ارادہ بدل دیتا۔ البتہ مجھے اتنا تو علم اب تک ہو ہی چکا تھا کہ میری ماں، ایک قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس نے کس کا اور کیوں قتل کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تب اچانک ایک روز مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ جیل سپرنٹنڈنٹ سے مل کر اپنی ماں کے بارے میں استفسار کروں؟ لیکن مجھے یہ بھی نامناسب ہی لگا تھا۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں احتجاجاً ماموں حیدر گل کے ساتھ ماں سے ملنے ہی نہ جایا کروں۔ پھر وہ خود ہی مجھے تنگ آ کر حقیقت سے آگاہ کر دیں گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ماں سے نہ ملوں۔

میں تنگ آ کر ان باتوں کو ذہن سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نگینہ سے سامنا ہونے کے بعد تو اب میں کسی اور ہی دنیا کا باسی ہو گیا تھا۔

❄❄❄

میں دو دن بعد ہی شہر آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگینہ کا سحر آفریں اور دل گزیں چہرہ بھلائے نہیں بھول رہا تھا مجھے۔ میں اب سنجیدگی سے اس مہ جبیں کے متعلق سوچنے لگا۔ آخر اس کے دیدار کی کوئی تو سبیل ہو گی۔ کبیر احمد یوں تو میرا روم میٹ تھا مگر اس کا گھر شہر ہی میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ہوسٹل سے غائب ہی رہتا تھا۔ البتہ امتحانات کے دنوں میں جب اسے کالج لائبریری یا ''کمبائن اسٹڈی'' کی ضرورت پڑتی تو وہ ہاسٹل ہی میں آ کر رہنے لگتا تھا۔

سنا ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ میں اس مہ جبیں کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا کہ ایک دن مجھے وہ رُخِ روشن نظر آ ہی گیا۔ مگر میں اسے اپنے روم پارٹنر کبیر احمد کے ساتھ دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔

نگینہ اسے کالج میں ملنے آئی تھی۔ ایک لیکچر فری تھا اس لئے میں کالج لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ میں نے پری انجینئرنگ لے رکھی تھی۔ کبیر احمد کا سبجیکٹ بھی یہی تھا۔

میں پون گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ کبیر بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ معاً ہماری ایک کلاس میٹ نزہت نے ہولے سے کبیر احمد کو مخاطب کر کے کہا۔

''کبیر!..... تمہاری مہمان آئی ہیں۔''

چونکہ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے بھی سر اٹھا کر نزہت کی طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھ نگینہ کھڑی تھی۔ وہی من موہنی صورت لئے..... وہی دلنشیں سراپا اور ویسی ہی گداز لبوں پر مچلتی شوخ مسکراہٹ جس نے میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ وہ بلیو رنگ کی جینز اور سلکی گلابی شرٹ میں ملبوس تھی۔ پیروں میں سفید اور نیلے جوگرز تھے۔ سادہ سے لباس میں اس کا ملکوتی حُسن مزید نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ کبیر احمد تو یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔

''تھینک یو!'' کبیر احمد نے نزہت کا مسکرا کر ہولے سے شکریہ ادا کیا۔ گویا اسے فارغ کرنے کے بعد کبیر احمد نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور مجھ سے کہا۔

''یار نادر! تم ابھی بیٹھو گے یا چلو گے کینٹین؟''

میں چونکا۔ جی تو چاہا، اس کی آفر قبول کر لوں۔ لیکن یہ عامیانہ پن ہوتا اس لئے میں نے شکریہ کہہ کر اس سے معذرت کر لی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

اب میرا پڑھائی میں کہاں دل لگتا۔

دو باتوں نے میرے دل کو دھچکا پہنچایا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ نگینہ، کبیر احمد سے ملنے آئی تھی۔ ان کی آپس میں دوستی کی نوعیت کچھ بھی سہی لیکن میں اپنے اندر رقابت کا جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ دوسری بات نگینہ کی مجھ سے بے رخی تھی۔

بے شک وہ گزشتہ دنوں ہونے والے اسپورٹس ویک میں میری مدِ مقابل تھی اور میرا اس سے ذرا دبو کا سامنا ہوا تھا لیکن پھر بھی اسے کم از کم مجھ سے تو تھوڑی بہت شناسائی ظاہر کرنا چاہئے تھی۔ بھلے سے یونہی اک ذرا ہائے ہیلو ہی کہہ دیتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

اب میں اس ''ہونا چاہئے تھا، نہ ہونا چاہئے تھا'' کی گردان میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ دونوں جا چکے تھے اور میں اپنے دل کے کسی گوشے میں بھڑکتی ہوئی آتشِ شوق کو بری طرح محسوس کرنے لگا جو بار بار اپنی تپش سے میری انا کے مضبوط خول کو پگھلانے کا باعث بن رہی تھی اور مجھے ایک پچھتاوے کی کیفیت میں مبتلا کرنے کا سبب بھی بن رہی تھی۔

'کاش!..... میں کبیر احمد کی آفر قبول کر لیتا.....'

'نہیں..... محبت میں اس طرح کا عامیانہ پن رنگِ اُلفت کو پھیکا کر ڈالتا ہے۔' دل نے دماغ کو سرزنش کی۔

'کیسا عامیانہ پن؟..... یہی تو دیوانگی ہے..... محبوب سے ملنا، اس کے دیدار کی سبیل کرنا دیوانوں کا حق ہوتا ہے۔'

'لیکن یہ حق تو تب ہی مانا جائے گا جب دونوں طرف برابر آگ لگی ہو۔ یک طرفہ محبت ایک نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔' دماغ نے ایک تو جیہہ پیش کی۔

'ہونہہ..... نادانی.....'' دلِ وحشی بضد رہا۔ 'یہ دیوانگی نہیں تو پھر کیا ہے؟ بے شک محبت کی آگ یکطرفہ سہی لیکن کسی کو اپنانے کی جستجو تو دلِ بے قرار کو دودھ کی نہر کھودنے اور سگِ لیلیٰ سے بھی دوستی پر مجبور کر دیتی ہے۔ صحرا بہ صحرا لیلیٰ لیلیٰ پکارنے پر آمادہ کر کے رکھ دیتی ہے..... اور یہ سب منظور نہیں تو نادر میاں! محبت کا خیال ہی دل سے نکال دو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ پھر تم اپنی انا ہی کے خول میں بند رہو۔ وہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں جو اس جذبۂ محبت میں اپنا سب کچھ وار دیتے ہیں۔'

دماغ نے بردبارانہ تنبیہہ کی۔ 'خبردار نادر! محبت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی ہی معراج ہوتی ہے۔ تمہاری یک طرفہ محبت اگر سچی ہے تو تقدیر ایک دن تمہارا خود ساتھ دے گی۔'

'لیکن تقدیر بھی تدبیر کے تابع ہوتی ہے۔' دل نے کہا۔ اور میں نے بے اختیار جھلا کر اپنی کتابیں بند کر کے سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کتاب کھولی تو سامنے درسِ علم کی بجائے نصابِ محبت وا ہو گیا جہاں نگینہ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے کتاب دوبارہ بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کتابیں سمیٹیں، لائبریری سے باہر آ گیا۔ اب میرے قدم کشاں کشاں کینٹین کی جانب اُٹھنے لگے۔ دل و دماغ کی اس تکرار سے مجھے چائے کی طلب ہونے لگی۔ مگر اصل مقصد تو دیدارِ یار تھا۔

میں سیدھا کینٹین پہنچا۔ یہ وسیع ہال تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر میزیں اور کرسیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کینٹین میں خلافِ معمول رش کم تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ہال پر ڈالی تو مجھے ایک کونے میں کبیر اور نگینہ بیٹھے چائے پیتے دکھائی دے گئے۔ سموسوں اور پیٹیز کی پلیٹ بھی ان کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ نگینہ سامنے کے رخ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ کبیر کی میری طرف پشت تھی۔ نگینہ نے مجھے ہال میں داخل ہوتے دیکھا، ایک لمحے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور پھر میں جبراً اپنی نظریں اس سے پھیر کر ایک قریب کی میز پر براجمان ہو گیا۔ ویٹر نے فوراً میرے آگے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ میں نے اسے چائے لانے کا کہا اور پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے دانستہ اپنا رخ نگینہ کی طرف کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ایک بار جونہی میری نظر اس کی طرف اُٹھی تو مجھے لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہو۔ اچانک اس نے کبیر احمد کی طرف ذرا جھک کر کچھ کہا تھا جسے سن کر کبیر نے فوراً مڑ کر میری طرف دیکھا اور وہیں سے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مجھے آواز دی۔

''نادر! آ جاؤ یار ادھر ہی۔'' میرے دل کی دھڑکنیں یکبارگی اتھل پتھل ہونے لگی تھیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی میز کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''یار! میں نے تو تم سے کہا تھا..... مگر تم..... چلو خیر، آؤ بیٹھو۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے آپ کے دوست کو پڑھائی سے خاصا شغف ہے۔'' نگینہ نے مترنم سی آواز میں کبیر سے کہا اور مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹ ویسے ہی دل موہ لینے والے تاثرات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش کر رہے تھے۔

میں نے ہولے سے گلا کھنکھار کر کہا۔

''دراصل میرا ابھی چائے پینے کو جی کر رہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم دونوں کے بیچ کیوں خواہ مخواہ مخل ہوا جائے۔'' میرے لہجے میں کوٹ کوٹ کر نارسائی بھری ہوئی تھی۔

''ارے یار! ہم یہاں کون سا چونچیں لڑا رہے تھے..... لو، سموسہ کھاؤ۔'' کبیر احمد نے ازراہِ تفنن کہا اور پلیٹ میری طرف کھسکا دی۔ میں نے پلیٹ ہی میں سموسے کا ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔ اس اثناء میں ویٹر میری چائے کا کپ ٹرے میں اٹھائے نمودار ہوا۔ پھر مجھے یہاں بیٹھا دیکھ کر سیدھا ادھر آ گیا۔

''ان سے ملو نادر! یہ نگینہ ہیں۔'' کبیر نے مجھ سے نگینہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو نگینہ ایک ہلکی سی مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈال کر فوراً کبیر سے بولی۔

''جی..... یہ نادر ہیں، میں ان سے مل چکی ہوں..... اور وہ بھی بڑے ہنگامی انداز میں۔''

''اوہ، اچھا..... مگر بھئی ہنگامی انداز میں کیوں..... خیریت؟'' کبیر نے مصنوعی حیرت سے پوچھا اور نگینہ نے اسپورٹس ویک کے دوران ٹیبل ٹینس کے اس گرم جوش میچ کا حوالہ دے ڈالا تو کبیر احمد لاابالی انداز میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اوہ..... اب سمجھا۔ ارے بھئی نادر! ذرا ہوشیار رہنا، تم پر اُدھار کھائے بیٹھی ہے یہ نگینہ۔''

میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ نگینہ نے بالآخر میچ کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ میں اسے یاد تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک کسک سی میرے دل میں اُبھری۔

اگر میں اسے یاد تھا تو اس نے لائبریری میں مجھ سے شناسائی کیوں نہ ظاہر کی تھی اور مجھے سراسر نظرانداز کر کے صرف کبیر احمد سے ہی مصافحہ کیوں کیا تھا؟ مگر پھر فوراً ہی میں نے اسے محبوب کی ایک ادائے بے نیازی پر محمول کر کے ذہن سے جھٹک دیا۔ تاہم میں کبیر احمد کی بات کے جواب میں نگینہ کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ظاہر ہے، انہیں اب اپنا ادھار چکتا کرنے کے لئے اگلے اسپورٹس ویک کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

میری بات پر نگینہ بے اختیار کھنکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ پہلی بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''خیر نادر صاحب! اب ایسی بات بھی نہیں..... کھیل تو کھیل ہوتا ہے۔ جس میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے۔''

''جی ہاں..... اور جیت آپ ہی کی ہوئی تھی۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ چونک سی گئی۔

''کیا مطلب؟..... جیتے تو آپ تھے۔''

''آں..... ہاں..... میں ہی جیتا تھا۔ لیکن آپ سے جیتنے کے لئے مجھے جس طرح دانتوں پسینہ آ گیا تھا، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے، اس طرح جیتنا..... جیتنا نہیں ہوتا۔''

میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بات بنائی تھی لیکن میں نے نگینہ کے چہرے پر پل بھر میں اُمڈتے ہوئے ایک گہرے اور پُرسوچ تاثر کو فوراً محسوس کیا تھا اور اسی ایک پل میں اس نے بھیدوں بھری نگاہ سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سنجیدہ تاثر کو اپنی مخصوص کھلکھلاتی مترنم ہنسی میں بدل کر بولی۔

''نادر صاحب! جیتنے کا لطف بھی تو محنت کر کے جیتنے میں آتا ہے۔ کیا آپ اتنے ہی سہل پسند کھلاڑی ہیں؟'' اس نے جیسے میری اسپرٹ کو جھنجوڑا تو میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ اور اس کی دلنشیں نگاہوں میں جیسے دور تک اترتے ہوئے بولا۔

''میں آپ سے متفق ہوں نگینہ صاحبہ! لیکن کبھی کبھی جیت کر ہارنے کا بھی تو لطف آتا ہے۔''

ایک بار پھر اس نے چونکتی ہوئی پُرتاثر نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

''ارے بھئی، یہ تم دونوں کیا خشک موضوع لے کر بیٹھ گئے؟'' کبیر احمد بور ہوتے ہوئے جھنجلا کر بولا۔ ''ابھی سپورٹس ویک میں پورا سال پڑا ہے۔ بعد میں تم دونوں لڑ لینا آپس میں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اچھا سنو نادر!..... میں نے مری گھومنے کا پروگرام بنایا ہے..... اور چونکہ تم ملکہ کوہسار کے دامن میں رہتے ہو اس لئے تم سے زیادہ بہترین ہمارا اور کوئی گائیڈ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا واقعی.....؟'' میں اس کی بات پر جیسے یک گونہ خوشی سے چونک کر بولا۔ ''موسٹ ویلکم..... میں تم لوگوں کو اپنے گاؤں کی بھی سیر کراؤں گا۔ میرا تو وہ گھر ہے۔ یوں بھی آج سیزن ہے۔ تم اسنو فالنگ سے بھرپور لطف اٹھاؤ گے۔''

''بس پھر ڈن ہوا..... ہم چند دوست ایک مختصر سا ٹرپ ترتیب دے لیتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں اپنے حتمی پروگرام سے آگاہ کر دیں گے۔ کیوں نگینہ! ٹھیک رہے گا نا یہ؟'' کبیر نے آخر میں نگینہ کی رائے لینا چاہی۔

وہ بولی۔ ''ہاں..... میری چند گہری سہیلیاں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے نادر! یہی پروگرام ٹھیک رہے گا۔''

''ایز یو وِش۔'' میں نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔

❄ ❄ ❄

نگینہ سے میری یہ دوسری ملاقات بالتقدیر ہی نہیں، بالتدبیر بھی ثابت ہوئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انجانی مسرتوں کی خوشگوار پھوار میرے پیاسے دل کو سیراب کر رہی تھی۔

تاہم اس کے باوجود میرے اندر ایک پھانس بھی تھی۔ وہ پھانس نگینہ کی کبیر احمد سے دوستی کی تھی اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اس دوستی کی نوعیت کیا تھی؟ محض دوستی تھی یا کوئی تعلق خاطر بھی تھا؟..... اور اگر ان کے بیچ واقعی کوئی جذباتی وابستگی ہوئی تو.....؟ اس تصور سے میرا دل بے اختیار دہل اٹھتا تھا۔ تاہم میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان کے درمیان ''تعلق خاطر'' کا کوئی جذبہ پنپ چکا تھا تو مجھے ان دونوں کی محبت پر شب خون مارنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر میں پھر بھی ساری عمر یک طرفہ آتش عشق میں جلتا رہوں گا۔ یہ تصور ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا۔

بہرطور موضوع چونکہ تازہ تھا اس لئے میں نے ہاسٹل آ کر باتوں باتوں میں کبیر احمد کو اس طرح کریدا کہ میری نگینہ سے متعلق غیر معمولی دلچسپی بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔

اس نے بتایا کہ نگینہ پنڈی کے ہی ایک گرلز کالج میں ایف ایس سی کی طالبہ تھی۔ میری طرح اسے بھی اسپورٹس سے دلچسپی تھی۔ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی، جس کا نام شاہ میر تھا۔ وہ محکمہ جنگلات میں گیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) رہ چکا تھا اور اب کنزرویٹو آفیسر تھا۔ ساتھ ہی اس کا اپنا ٹمبر مرچنٹ کا بھی کاروبار تھا جو بہت وسیع کاروباری بنیادوں پر پھیلا ہوا تھا۔ نگینہ کا ایک بڑا بھائی میر داور خان اسے سنبھالتا تھا جو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔

''تمہاری اس اپسرا سے کب سے دوستی ہے؟'' بالآخر میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے

دوستانہ شوخی سے پوچھا۔

میری بات پر کبیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

''یار!.....دوستی تو خاصی پرانی ہے مگر..... یہ ہے ذرا لاابالی سی لڑکی۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے خوش امیدی سے قدرے چونک کر پوچھا۔

''بس.....اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔''

''تم اپنی کہو کہ تم اس میں کس حد تک انوالو ہو؟'' میں نے کسی خاص خیال کے تحت پوچھا۔

''یار! ایسی کافر ادا حسینہ تو ہر نوجوان شخص کا خواب ہوتی ہے میں تو اسے بہت چاہتا ہوں ..... مگر.....''

''مگر کیا.....؟'' میں نے جلدی سے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''یہی کہ اب تک اس نے ایسا کوئی خاص رسپانس مجھے نہیں دیا ہے۔''

''پھر بھی، کوئی عندیہ تو لیا ہوتا اس کا۔ خاصی بولڈ اور تعلیم یافتہ ہے۔ پھر تم دونوں کی دوستی بھی اتنی پرانی ہے۔ اب جھجکنے کا زمانہ کہاں رہا؟ اب تو پہلی ہی نظر میں پروپوزل دے دیا جاتا ہے۔'' میں اسے بدستور کریدے جا رہا تھا۔

''ہاں.....عندیہ تو میں نے لینے کی بارہا کوشش کی تھی اس سے۔''

''پھر.....؟'' ایک بار پھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

''میں نے کہا نا، اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی ہے۔ ہمیشہ ٹال دیتی ہے۔''

''پھر بھی، کچھ تو کہا ہوگا.....تم سے تو بڑی گہری دوستی لگتی ہے۔ آج تو باقاعدہ تم سے کالج میں ملنے آ گئی۔''

''چھوڑو یار! میں نے کہا نا، وہ عجیب فطرت اور کھلنڈرانہ طبیعت کی مالک ہے۔ پہلے میں بھی اسی خوش فہمی میں تھا مگر پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ اس کی ہائے ہیلو بس لڑکوں سے رہتی ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لینا، وہ تم سے راہ و رسم بڑھانے میں دیر نہ کرے گی اور تم سمجھو گے کہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔''

''ہاں یار! بعض لڑکیاں فلرٹ، کریزی بھی ہوتی ہیں۔ دوسروں کو خواہ مخواہ ہی سودائی بنانے کا جنون ہوتا ہے ان میں۔'' یہ الفاظ میں نے بظاہر برا سا منہ بنا کر کہے تھے۔

میرے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوئی مگر میں نے کبیر احمد پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

'ہوں.....اس کا مطلب ہے، نگینہ کہیں بھی منسوب نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی میں دلچسپی رکھتی ہے۔' میں نے خوش امیدی سے سوچا۔

پھر اچانک کبیر احمد نے قدرے چونک کر اسرار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ڈر گیا، کہیں اسے مجھ پر کسی بات کا شک تو نہیں ہو گیا۔

''یار نادر! تم میرا ایک کام کرو گے؟ دیکھو، تم میرے اچھے دوست ہو نا؟'' وہ قریب آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لجاجت سے بولا۔

''ہاں، ہاں.....بولو، کون سا کام ہے؟''

''تم ذرا اپنے طور پر نگینہ کو میرے بارے میں ٹٹولنے کی کوشش کرو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھورا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ارے یار! مطلب صاف ہے، تم اس سے یونہی میرے بارے میں پوچھو کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں؟''

''اچھا.....تاکہ وہ ادھر سینڈلوں سے میرا سر گنجا کر دے۔ نہ بابا نہ.....میں باز آیا ایسے کاموں سے۔'' میں نے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔

''یار پلیز! دوستی کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟'' وہ دوستی جتانے لگا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر گویا اسے ٹالنے کی غرض سے بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔ مگر وعدہ نہیں کرتا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔

''اچھا، اب یہ مکھن بازی نہ کر اور مجھے پڑھنے دے۔'' میں نے اسے دھیرے سے الگ کیا۔

❋ ❋ ❋

اب مجھے بے چینی سے اگلے دن کا انتظار تھا جب میں، کبیر اور نگینہ مری کے ٹور پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہر لمحہ نگینہ کی ہم رکابی کے جاں گداز تصور سے میرا دل عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا تھا۔ نگینہ کے ساتھ اس کی چند گہری اور قریبی سہیلیوں کا ٹولہ بھی متوقع تھا۔

پروگرام یہی ترتیب پایا تھا کہ اگلے دن علی الصباح نگینہ اور کبیر اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہوں گے اور جاتے وقت مجھے یہاں کالج کیمپس سے ''پک'' کرتے چلیں گے۔

ٹور بس اس حد تک تھا کہ سرِ شام مری سے واپس لوٹ آنا تھا۔ مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ کم از کم ایک رات انہیں اپنے ہاں ضرور مہمان رکھوں گا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری برسوں کی امید بر آ رہی تھی نگینہ کی ہم سفری کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ میں نے احتیاطاً پہلے ہی فون کر کے ماموں حیدر گل کو دوستوں سمیت اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔

کبیر احمد حسب معمول کالج ٹائم کے بعد اپنے گھر جا چکا تھا۔ میں نے کالج میس میں دوپہر کا کھانا کھایا اور واپس ہاسٹل روم میں آ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں قیلولہ کرنے کا قائل تھا۔ اس لئے میں کپڑے بدل کر سونے کے لئے بیڈ پر جا لیٹا۔

شام پانچ بجے اٹھا تو میرے موبائل کی بیل گنگنا رہی تھی۔

''ہیلو.....!'' میں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''نادر!.....میں ہوں.....کبیر۔'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔

''ہاں کہو.....تیاری ہے نا پھر؟'' میں نے پوچھا

''نہیں یار!'' اس کی مری مری سی آواز اُبھری۔

''کیوں.....خیریت تو ہے؟'' میں نے کسی قدر چونک کر پوچھا۔

''بس یار! باقی تفصیل کالج آ کر بتاؤں گا۔ تم کل کا پروگرام کینسل سمجھو۔ میں نے یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا۔'' اس کی آواز میں عجیب سا ارتعاش تھا۔ اس کے لہجے سے مایوسی کے علاوہ پریشانی بھی جھلک رہی تھی۔ ''اچھا پھر.....ابھی میں ذرا پریشان ہوں، کل کالج آیا تو ساری تفصیل بتا دوں گا۔ خدا حافظ!'' یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

نہ جانے اچانک کیا ہوا تھا؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے کبیر کا لب و لہجہ حد درجہ پریشان سا محسوس ہوا تھا۔

''کک..... کہیں خدانخواستہ..... نگینہ کی طبیعت تو اچانک خراب نہیں ہو گئی تھی؟'' میں پریشانی سے بڑبڑایا۔ آخر کبیر کو مجھے کچھ تو بتانا ہی چاہئے تھا۔ ایسی بھی کیا پریشانی تھی کہ اس نے موبائل پر مجھ سے مزید بات کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ مجھے تفکر آمیز پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

بہرطور میں نے اسی وقت ماموں حیدر گل کو اپنے گاؤں نہ پہنچنے کی اطلاع دی کہ کہیں وہ ہمارے انتظار میں پریشان نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد میں پریشان کن خیالات میں گرفتار ہو گیا۔

***

اگلے دن کالج پہنچا تو کبیر نہیں آیا۔ میں نے موبائل پر اس سے رابطہ کرنے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔ اس روز میرا کالج میں دل نہ لگا۔ میں نے میس میں جا کر دوپہر کا کھانا بے دلی سے کھایا اور اپنے روم میں آ گیا۔ مجھے ایک پل کو بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے کبیر احمد پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے ادھوری بات کر کے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

بالآخر میں نے کبیر کے گھر جانے قصد کیا۔ اس کا گھر کالج سے زیادہ دور نہ تھا۔ کبیر کے والد نظر حیات کی نیو پنڈی صدر کے علاقے میں عالی شان کوٹھی تھی۔ وہ اکثر مجھے لے جایا کرتا تھا۔ میرے پاس موٹر بائیک تھی۔ میں اس پر سوار ہو کر اس کے گھر حیات لاج کی طرف روانہ ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لیاقت باغ سے گزرا اور صدر کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کی چھاؤں میں گھری قطار اندر قطار عالی شان بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ میں نے حیات لاج کے قریب اپنی بائیک روک دی۔

گیٹ پر ایک باوردی گن مین کھڑا تھا۔ وہ مجھے کبیر کے دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے خوش خلقی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''کیسے ہو تم؟ ٹھیک ہو نا؟''

''جی صاحب!..... دعا ہے آپ کی۔'' وہ ایک پہاڑی شخص تھا۔

''کبیر احمد ہو گا اندر؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... آیئے..... چھوٹے صاحب اندر ہی ہیں۔'' اس نے مہذبانہ انداز میں مسکرا کر کہا اور بڑے سے آہنی گیٹ کا بغلی دروازہ کھول دیا۔

میں نے اندر قدم رکھا تو پودوں اور پھولوں کی خوشگوار مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہاں بنگلوں کا رنگ زیادہ تر سفید ہی ہوتا ہے۔ میں پختہ روش پر کھڑا تھا۔ روش کے دونوں جانب سرسبز لان تھا جہاں خوشنما پھول رنگِ بہار بکھیر رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ گارڈینیا (موگرا) کی باڑ نے پوری کوٹھی کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اسی طرح روش کے دونوں طرف بھی آبیاری کی گئی تھی۔ خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ پورٹیکو میں نئے ماڈل کی ڈبل کیبن انٹرکولر جیپ کھڑی تھی۔ یہ پہاڑی علاقوں میں چلنے والی ایک لاجواب فیملی پک اپ گاڑی تھی۔ یہ کبیر احمد کا شوق تھا۔ ایک ٹویوٹا کرولا بھی تھی جو اس وقت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورٹیکو کے اوپر خوب صورت ٹیرس تھی۔ وہاں فیس ریلنگ سے جھانکتے ہوئے گملوں میں گیندے کے پھول نظر آ رہے تھے جبکہ دائیں بائیں لان میں سفیدے کے خوبصورت مخروطی انداز میں تراشیدہ پیڑ سبک خرام ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ سامنے روش کے اختتام پر کوٹھی کا مرکزی دروازہ تھا جو ساگوان کی لکڑی کا تھا۔ جسے ایک خاص وسیع و عریض اور سیمنٹ کی پختہ محراب کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ دائیں بائیں بیگونیا، کولی کے خوشنما پھولوں کے گملے بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے پتے بھی اتنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی دیدہ زیب تھے۔

گن مین، جس کا نام بابو خان تھا، وہ مجھے دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بابو خان وہاں موجود ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کو اندر میری اطلاع دینے کی تاکید کر کے واپس لوٹ گیا۔

میں نے ذرا کھڑے کھڑے یونہی کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ دیواروں پر شکاری جانوروں کے سر نصب تھے۔ جبکہ کئی نایاب پرندوں اور آئی بیکس کے حنوط شدہ مجسمے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دھاڑتے ہوئے انداز میں بھس بھرا تیندوا بھی کھڑا نظر آ رہا تھا جس پر اصل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کبیر اندر داخل ہوا۔

''مجھے پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بیٹھو.....!''

''یار! خیریت تو ہے؟ تم.....؟''

''ہاں، بتا رہا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ، کیا پیو گے؟'' وہ میری بات کاٹ کر یکدم بولا۔

''کچھ نہیں یار! جی نہیں چاہ رہا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ مگر کبیر نے ملازم سے کولڈ ڈرنک لانے کا کہہ ہی دیا اور میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں تھا اور پیروں میں سوئٹی پہن رکھی تھی۔

''یار! آخر بتاؤ تو..... کیا بات ہے؟ یہ اچانک تم لوگوں کا پروگرام کیوں کینسل ہو گیا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا تو وہ ایک گہری متفکر سی ہنکاری خارج کر کے بولا۔

''بس یار نادر! کیا بتاؤں۔ ایک ٹریجڈی ہو گئی۔''

''کیسی ٹریجڈی؟'' میں نے یکدم قدرے پریشان ہو کر پوچھا اور جانے کیوں نگینہ کے متعلق میں کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

''ٹریجڈی تو نہیں البتہ کچھ مخدوش اور عجیب ہی صورت حال سے دوچار رہے ہم۔ ایک بہت ہی عجیب سی، پراسرار اور سنگین صورتِ حال۔''

''ارے یار کبیر! تم کیا عورتوں کی طرح پہیلیاں بجھوانے لگے۔ اب کچھ بتا بھی چکو۔'' میں نے آخر تنگ آ کر جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نگینہ ہے نا.....''

''ہاں..... کیا ہوا نگینہ کو.....؟'' میں نے یکدم دھڑکتے دل کے ساتھ اور پریشان کن بے قراری سے پوچھا۔

''اس پر کل سہ پہر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔''

''کک..... کیا.....؟'' میں لرز اٹھا۔

''ہاں..... لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اس حملے سے بال بال بچ گئی۔'' کبیر احمد نے بتایا۔

میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

''کک..... کیسی ہے اب وہ؟..... کہاں ہے؟'' میں نے اپنی بے ترتیب دھڑکن پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے اور اپنے گھر پر ہی ہے۔'' وہ بولا۔

''مجرم کون تھے؟ کس نے یہ حملہ کیا تھا اور کیوں؟'' دوسرے ہی لمحے میں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی اندوہناک خبر نے مجھے یہ بھلا دیا تھا کہ میرا اس کے لئے اس قدر پریشان ہونا کبیر کو کھٹکا سکتا تھا۔

''پتہ نہیں یار! ہم خود پریشان ہیں۔ آخر ہمارا کون دشمن بنا بیٹھا ہے؟ مجرم تو ہمیشہ کی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔'' اس نے قدرے مضطربانہ لہجے میں بتایا۔ اور میں اس کے ''ہمارا'' کے صیغہ کا پر چونک سا گیا۔

''ہمارا سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا وہ پراسرار دشمن.........؟'' میں نے یونہی دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو کبیر پُرسوچ انداز میں سر ہلا کر صراحت سے بیان کرنے لگا۔

''ہاں........وہ جو کوئی بھی ہے، ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے پہلے وہ نگینہ کے باپ شاہ میر پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ اور ایک بار ان کی کوٹھی پر فائرنگ بھی کر چکا ہے۔ یہی نہیں، اس پراسرار حملہ آور نے میرے ڈیڈی پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا اور بالکل اسی طرح ہماری کوٹھی پر بھی اندھا دھند فائرنگ کر چکا ہے۔''

اتنا بتا کر وہ ایک ثانیے کے لئے رکا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ آخر کیا گھن چکر ہے؟''

''تم لوگوں نے اس نامعلوم حملہ آور کے خلاف پولیس میں رپورٹ تو ضرور درج کرائی ہو گی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں........کرائی تو ہے۔ مگر پولیس کا حال تو تمہیں معلوم ہے۔ وہ اندھیرے میں محض ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر پائی ہے۔''

اس کی گفتگو نے مجھے ایک عجیب سی اُلجھن آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی خبر نے تو مجھے ایک لمحے کو بالکل سن کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر پھر اس کے بال بال بچ جانے پر میں نے بے اختیار اطمینان کی سانس لی لیکن یہ بات میرے لئے بہرحال باعثِ تشویش ہی تھی کہ آخر ان لوگوں کا ایسا وہ کون پُراسرار دشمن ہو سکتا ہے جو بیک وقت اتنی دیدہ دلیری سے ان دونوں خاندانوں کے مکینوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا؟ تاہم کبیر نے مزید انکشاف کیا کہ حملہ آور ہمیشہ تین چار کی تعداد میں ہوتے تھے۔ کبھی ایک پوٹھوہار جیپ میں سوار ہو کر آتے تھے یا موٹر سائیکلوں پر۔ اور ان کے چہروں پر ہمیشہ نقاب چڑھے ہوتے تھے۔ نیز کبیر نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ نگینہ اور کبیر کے والد، شاہ میر اور نظر حیات آپس میں بہت پرانے اور گہرے دوست تھے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ نگینہ کے والد شاہ میر محکمہ جنگلات کے کنزرویٹو آفیسر تھے۔ جبکہ کبیر علی کے ڈیڈی سرکاری ٹھیکے دار تھے اور وہ عمارتی لکڑیوں کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اس طرح ان دونوں کے بیچ دوستی کے علاوہ کاروباری لین دین بھی چلتا رہتا تھا بلکہ دونوں کی دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی۔

''یار کبیر! تم نے بھی اپنے ڈیڈی کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ان کی کسی سے کوئی دیرینہ چپقلش تو نہیں چل رہی؟'' چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد میں نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے ایک خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''بلکہ میں نے ہی نہیں، نگینہ نے بھی اپنے پپا کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میری طرح نگینہ کو بھی اس بات کا شبہ ہے کہ ہمارے ڈیڈی ہم سے کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''مگر یار! آخر تفتیشی آفیسر کے سامنے انہوں نے اپنے شک کا اظہار تو کیا ہی ہوگا؟'' میں نے پوچھا

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''پولیس کو بھی انکل اور ڈیڈی نے یہی مشترکہ بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی سے ان کا کوئی اتنا سنگین تنازعہ رہا ہے کہ کوئی یوں ان کی جان کا بیری بن بیٹھے۔''

''عجیب ہی چکر لگتا ہے۔ کوئی بلاوجہ آخر کیوں اتنا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا کہ پہلے اس نے نگینہ اور تمہارے ڈیڈی پر قاتلانہ حملہ کیا، اس کے بعد اب اس پراسرار حملہ آور کی دشمنی اس قدر سنگین صورت اختیار کر چکی ہے کہ اب وہ ان کی اولادوں کو بھی نشانہ بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''ہاں........میرے ڈیڈی کو تو اب میری طرف سے بھی فکر ستانے لگی ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ نگینہ کی طرح اب نامعلوم حملہ آور مجھے بھی ٹارگٹ بنائیں گے۔'' کبیر احمد نے مرتعش سے لہجے میں بتایا۔ میں نے اس کے لرزیدہ لہجے میں پنہاں خوف کو صاف محسوس کیا تھا۔

''یار کبیر! یہ تو واقعی بہت تشویش ناک بات ہے۔ تم لوگوں کو اس سنگین مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا اور جلد سے جلد نامعلوم دشمنوں کا کھوج بھی لگانا ہوگا۔''

میرے لہجے میں تشویش تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ بھلے خاموش سہی مگر وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اسے خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں تاعمر لق و دق صحرا کا مسافر بن کر رہ جاتا۔

''یار! تمہارے والدین کوئی معمولی حیثیت تو نہیں رکھتے۔ انہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے مدد لینا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''ایس پی وجاہت قریشی، ڈیڈی کے قریبی دوستوں میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڈی اور انکل شاہ میر (نگینہ کے والد) نے کمشنر سے بھی رابطہ کیا ہے۔ مگر بات پھر وہیں پر آ کر رکتی ہے کہ ڈیڈی اور انکل شاہ میر آخر کسی پر اپنے شک کا اظہار تو کریں تاکہ پولیس انتظامیہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ محض نامعلوم اور پراسرار دشمنوں کا کھوج لگانا ناممکن حد تک مشکل ہی نظر آتا ہے۔''

اس دوران ادھیڑ عمر ملازمہ ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے چار گلاس رکھ کر جا چکی تھی۔

چند ثانیے کبیر اپنے گلاس کے مشروب کی سطح پر تیرتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو پُرخیال نظروں سے گھورتا رہا پھر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

''تم لوگوں نے اپنی طرف سے کوئی احتیاطی تدابیر کر رکھی ہیں؟''

''ہاں........'' اس نے ایک گھونٹ لیا۔ ''ڈیڈی نے اپنے طور پر مسلح گارڈز تو رکھ لئے ہیں۔'' ابھی وہ اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اس کے کُرتے کے سائیڈ پاکٹ میں رکھے موبائل کی بیل گنگنائی۔

''ہیلو........'' اس نے موبائل جیب سے نکال کر کہا۔

''ارے نگینہ!........تم کیسی ہو؟........کہاں سے بول رہی ہو؟''

نگینہ کے نام پر میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا اور میں نے اپنی بے چین نظریں کبیر کے چہرے پر فوکس کر دیں۔

''ہاں........میں نے نادر کو پروگرام کے کینسل ہونے کی اطلاع کر دی تھی۔ بلکہ وہ بے چارہ خود بھی خیریت معلوم کرنے یہاں آ گیا ہے۔ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ ہاں ہاں، میں نے اسے ساری بات بتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے پریشان ہو رہا تھا۔ لو، بات کرو گی نادر سے؟''

وہ مجھے موبائل دینے کی نیت سے نگینہ سے بولا۔ میرا دل یکبارگی ایک گداز خیال سے دھڑکا۔

''کیا؟..... اچھا، پھر ایسا کرو تم مت آؤ۔ ہم دونوں خود ہی آ جاتے ہیں۔ چند بلاک چھوڑ کر ا تمہارا گھر ہے..... او کے، خدا حافظ!'' یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا اور دوبارہ جیب میں ر ہوئے اٹھ کر مجھ سے بولا۔

''چلو نادر! نگینہ کے ہاں چلتے ہیں۔''

نگینہ کی مزاج پرسی کا موقع، یہ تقاضائے اخلاق بھی تھا اور کچھ دلِ نادان کا اشتیاق بھی۔ اس لئے فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

پھر ہم دونوں باہر پورٹیکو میں آ گئے۔ کبیر اسی لباس میں تھا۔ وہ چابیوں کا گچھا لہراتے ہوئے کیبن انٹرکولر کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوا اور میری طرف کے دروازے کا لاک کھول کر اسے و دیا۔ میں بھی اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک دو بار ہارن دے کر گن مین کو گ کھولنے کے لئے باخبر کیا اور پھر گیٹ کھلتے ہی وہ ڈبل کیبن انٹرکولر پک اپ کو تیزی سے ریورس میں ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔

نگینہ سے دوبارہ ملنے کے مسرت آگیں تصور نے مجھے نہال کر دیا تھا لیکن اس بار سرخوشی کے پُرکیف احساس میں ایک بے چینی بھی پنہاں تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں نگینہ کے اس بزدل د کی بوٹیاں نوچ لوں جس نے میری محبوب ہستی نگینہ کو جان سے مارنے کی جرأت کی تھی۔ دس منٹ اندر اندر ہم نگینہ کی پُرشکوہ کوٹھی پر پہنچ چکے تھے۔

اس کوٹھی کی شان بھی کبیر احمد کی کوٹھی سے کم نہ تھی۔ ہم جب نگینہ کی کوٹھی کے بڑے سے گیٹ قریب پہنچے تو میں نے گیٹ سے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر کو باہر نکلتے دیکھا تھا جس کی چھت پ ہوٹر اور مخصوص مونوگرام سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ پولیس افسر کی گاڑی ہے۔ اس میں چند باو پولیس والے بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سفید سوٹ میں ملبوس ایک شخص کو بھی ڈرائیور کے برابر میں براج دیکھا تھا۔ بعد میں کبیر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایس پی وجاہت قریشی تھے۔

بہرطور جب ہماری گاڑی اندر داخل ہوئی تو میں نے دو مسلح باڈی گارڈز کی معیت میں ایک قامت مگر خاصی گٹھی ہوئی جسامت والے پختہ عمر شخص کو کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے ہ دیکھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہماری گاڑی کی آواز پر وہ چونک کر رکا اور ہ طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

''یہ نگینہ کے ڈیڈی انکل شاہ میر صاحب ہیں۔'' کبیر نے ہولے سے مجھے بتایا۔ پھر کبیر نے گاڑی کار پورچ کے قریب روک دی اور ہم اتر کر سیدھے نگینہ کے ڈیڈی کی طرف بڑھے۔ ان کے شیو چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری تھی۔

''السلام علیکم انکل!'' کبیر نے ادب سے انہیں سلام کیا۔ کبیر کو دیکھ کر شاہ میر کے چہرے پر شنا مسکراہٹ ابھری۔

''یہ میرے دوست ہیں نادر..... نادر علی خان۔'' کبیر نے ان سے میرا تعارف کروایا تو میں بھی مسکرا کر ان سے مصافحہ کیا۔

''آؤ..... اندر ہی آ جاؤ۔'' وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے اور ہم دونوں ان کے ع

ں اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا ماحول سینٹرلی ایئر کنڈیشننگ کی وجہ سے خاصا سرد ہو رہا تھا۔

دبیز اور نقشین قالین پر چلتے ہوئے ہم سبز رنگ کے صوفوں کی طرف بڑھے تو شاہ میر صاحب نے میں ان پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنی بیٹی کو مطلع کرنے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

یہاں بھی دیواروں پر حنوط شدہ شکاری جانوروں کے سر لگے نظر آ رہے تھے۔

ایک کونے میں تیندوے کا بھس بھرا اصلی کھال کا چنگھاڑتا ہوا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر دوسرے میں آئی یکس کا بھی بالکل ایسا ہی حنوط شدہ وجود ایستادہ تھا۔

میں اور کبیر خاموشی سے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کبیر بھی مضطربانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد جس دروازے سے شاہ میر صاحب غائب ہوئے تھے، وہاں سے نگینہ نمودار ہوئی۔ میں چونکہ مذکورہ دروازے کے رخ پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس لئے سب سے پہلے ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ اُبھری۔ ہمیشہ کی طرح وہ گلاب کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے یا انداز میں کوئی خوف یا کسی قسم کی پریشانی کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے ہلکے نارنجی کلر میں چکن کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس میں اس کی گلاب سی نگہت کا گل بدن مزید نکھرا اور ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے تکتے ہوئے فوراً مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا نرم و گداز اور پھول سا نازک ہاتھ تھام کر جیسے میرے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔

''ہائے نادر! کیسے ہو؟'' وہ مجھ سے مترنم لہجے میں بولی۔

''آئی ایم فائن۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ کبیر سے ملی اور اس کے ذرا قریب صوفے پر براجمان ہو گئی۔

''نادر! میں معذرت خواہ ہوں کہ ہمارا پروگرام میری وجہ سے کینسل ہو گیا۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی تو میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کی خیریت پوچھی۔

''نگینہ! مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔''

میری بات پر وہ بے خوف انداز میں ذرا ہنسی، پھر بولی۔

''مگر مجھے سب سے زیادہ افسوس ملکہ کوہسار کی سیر کے ملتوی ہونے پر ہوا۔ بلکہ میں تو چاہ رہی تھی کہ چلے چلتے مگر پپا نے اجازت نہ دے کر سارے ایڈونچر کا سواستیاناس کر ڈالا۔''

''اوہو..... نگینہ! ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں ایڈونچر کی سوجھ رہی ہے۔ آخر تم سنجیدگی سے اس مسئلے کو نچ کیوں نہیں کرتی ہو؟'' کبیر نے جھلا کر اس سے کہا تو نگینہ نے لاابالی پن سے کہا۔

''موت ایک دن آنی ہے تو اس سے کیوں ڈرا جائے؟ خواہ مخواہ کسی انجانے خوف میں مبتلا ہو کر اپنا خون جلانے کا کیا فائدہ؟''

''بے شک نگینہ! موت کا ایک وقت معین ہے۔ لیکن جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا بھی تو دانش مندی نہیں ہوتی۔ آپ کو بہرحال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

''نادر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے نگینہ!'' کبیر نے میری بات کی فوراً تائید کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو..... بھئی یہ تم دونوں نے کیا بڑے بوڑھوں کی طرح مجھے نصیحت کرنا شروع کر دی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پلیز! فار گیٹ اِٹ۔'' نگینہ نے کھلنڈرے پن سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، کیا پیو گے تم دونوں؟''

''سردست تو ہم تمہاری باتیں سن کر اپنا ہی خون پی رہے ہیں۔'' کبیر نے زچ ہو کر کہا تو نگینہ بے اختیار کھنک دار قہقہہ بلند کیا۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانتوں کی جھلک مجھے بڑی بھلی محسوس ہوئی تھی۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ میں نے منع کرنا چاہا مگر اس نے ملازمہ کو بلا کر کولڈ ڈرنک لانے کا کہہ ہی ڈالا۔

''نگینہ! ایک بات بتاؤ؟'' میں نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا تم اس حملے کی تھوڑی تفصیل بتانا پسند کرو گی؟''

اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری مگر قدرے خوشگوار چہرے کے تاثرات کے ساتھ ہمکاری بھری۔

''شکر ہے ..... کسی نے تو مجھ سے اس انداز میں تفصیل پوچھی۔'' پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بتانے لگی۔ ''میں کل سہ پہر ہلکی پھلکی شاپنگ کے لئے صدر بازار گئی تھی۔ کار میں خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہلکی پھلکی شاپنگ میں تنہا ہی کرنے جاتی ہو۔ واپسی میں اپنی ایک سہیلی عروسہ سے مل کر ایوب نیشنل پارک سے گزرنے لگی تو ایک پرانے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا کار نے عقب سے میری کار پر فائرنگ کر ڈالی۔ میری گاڑی کے سارے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ مگر شکر رہا کہ کسی گولی نے میرا مزاج نہ پوچھا۔ میں پہلے تو اچانک حملے پر بوکھلا سی گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور کار کی رفتار خطرناک حد تک بڑھاتی ہوئی کافی دور نکل گئی۔''

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں چند ثانیے پُرسوچ نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا، پھر توصیفی لہجے میں اس سے بولا۔

''یہ تم نے بہت بہادری کا کام کیا کہ بروقت کار دوڑا لے گئیں۔ خیر!'' میں نے لمحہ بھر توقف کے بعد اصل بات کی طرف آتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا تم نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے چہرے دیکھنے کی کوشش کی تھی؟ یا وہ تعداد میں کتنے تھے؟''

میرے استفسار پر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر قدرے گومگو سے لہجے میں بولی۔

''میرے عقب میں چونکہ کچھ خاص ٹریفک نہ تھی اس لئے جب ان حملہ آوروں کی کار عقب سے میرے ذرا قریب آئی تھی تو اچانک غیر ارادی طور پر میری نگاہ اپنی گاڑی کے بیک ویو مرر پر پڑی تھی بس ایک سرسری سی نظر میں مجھے اگلی سیٹوں پر دو افراد بیٹھے دکھائی دے گئے تھے۔ پھر اس کے اگلے لمحے میری کار پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے بریک لگانے کے بجائے فوراً ایکسیلیٹر دبا دیا۔ میری گاڑی کا عقبی شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔''

''حملہ آوروں نے کتنی دور تک تمہارا پیچھا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا تو کبیر احمد بیزار ہو کر درمیان میں جھلا کر مجھ سے بولا۔

''ارے یار!..... تم نے کیا پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دی ہے۔ پولیس یہ سارے سوالات پہلے ہی نگینہ سے کر چکی ہو گی۔''

''نہیں کبیر!..... نادر کو پوچھنے دو۔'' نگینہ نے گہری متانت کے ساتھ کبیر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں ..... پولیس محض ضابطے کی کارروائی نمٹا کر اور ہمیشہ کی طرح طفل تسلی دیتے ہوئے چل دیتی ہے۔''

''اوہو ..... بھئی تو پھر یہ نادر میاں کیا کر سکتے ہیں بھلا؟ پولیس تو اب تک کچھ نہیں کر پائی ہے۔''

کبیر کی جھلاہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیزاری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی گہری متانت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کبیر! نگینہ اور تمہارے ڈیڈی پر دو نا معلوم حملہ آور دو دو مرتبہ قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں۔ اب ان لوگوں کے ناپاک عزائم اس قدر خطرناک نہج پر آ پہنچے ہیں کہ ان بزدلوں نے نگینہ پر بھی قاتلانہ حملہ کر ڈالا..... اور خدانخواستہ تم پر بھی یہ آفت نازل ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو محض پولیس پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔''

''یس رائٹ۔'' نگینہ فوراً چمک کر بولی۔ اس کے گل رنگ چہرے سے ایکا ایکی جوش ظاہر ہونے لگا۔ پھر وہ میری تائید میں کبیر سے مزید بولی۔ ''نادر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے کبیر! تم خود سوچو، ہم ان پے در پے حملوں میں کتنی بار بال بال بچے ..... ہمیں کم از کم اپنے طور پر بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں ہلانا ہوں گے۔''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ..... جبکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے جو سات پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔'' کبیر نے اس بار قدرے تفکر آمیز لہجے میں کہا تو میں مستحکم انداز میں بولا۔

''دیکھو کبیر! تم لوگوں کے مشترکہ دشمن کا کھوج تم دونوں کو اپنے گھر کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں کسی طرح اپنے بڑوں کو کریدنے کی کوشش کرو۔ معاف کرنا، شاید تم دونوں کو میری بات بری لگے لیکن موجودہ سنگین حالات میں یہ اشد ضروری ہے کہ تم دونوں اپنے بڑوں کا ماضی کریدنے کی کوشش کرو ..... مگر اپنے اپنے طور پر۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے نامعلوم دشمنوں کا سراغ اسی طرح لگ سکتا ہے۔''

میری بات پر چند ثانیے کے لئے ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ کبیر کا چہرہ تو بے تاثر ہی رہا البتہ نگینہ بڑی گہری دلچسپی کے ساتھ میری باتوں پر غور کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے۔'' چند ثانیے کی پُرخیال خاموشی کے بعد بالآخر نگینہ نے میری طرف دیکھ کر ٹھوس لہجے میں کہا اور مزید بولی۔ ''اٹ از فیکٹ ..... کہ دشمنی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور اس وجہ سے یقیناً ہمارے بڑے بہ خوبی واقف ہوں گے۔''

میں نے اس کی بات کے اختتام پر فوراً ایک پُرمغز لقمہ دیا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وجہ کا تمہارے سامنے ذکر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات قطعاً نہیں ہو سکتی۔'' کبیر نے پورے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے ڈیڈی اپنے دشمن سے واقف ہوں اور اتنے جان لیوا قاتلانہ حملوں کے باوجود وہ پولیس کو اپنے دشمن کا نام بتانے سے بھی گریز کریں.....؟''

''کیا خبر ..... ان کی کوئی مصلحت آڑے آ رہی ہو؟'' میں نے جرح کی۔

''باوجود اس کے میرا جواب نفی میں ہو گا ..... کیونکہ اب تو ہمارے بڑوں کے علاوہ وہ نامعلوم دشمن میں بھی اپنا نشانہ بنانے لگے ہیں ..... اور کوئی باپ یہ نہیں چاہے گا کہ اپنی مصلحت کے آگے اپنی اولاد کو قربان کر دے۔''

میں نے محسوس کیا کہ کبیر کے لہجے میں قدرے تلخی سی اتر آئی تھی۔ میں نے ذرا خفیف ہو کر ہولے سے کہا۔ ''سوری یار کبیر! میرا مقصد تم دونوں کو اپنے بڑوں سے متعلق شبہے میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا۔ مگر لگتا تھا کبیر کا دل تکدر کم نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بہرحال میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہمارے بڑوں سے ماضی ضرور کوئی ایسی لغزش یا جرم سرزد ہوا ہے ..... اسی لئے وہ نہ صرف اپنے دشمن سے بھی واقف ہیں اس کا نام لینے سے اس لئے کترا رہے ہیں کہ ..... کہیں .....''

''او کے، او کے ..... لیو دِس ٹاپک۔'' میں بدمزگی کی فضا کو بدلنے کی غرض سے اس کی بات کا سنجیدہ لہجے میں بولا۔ مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ کبیر نے میری بات کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ اگرچہ اس کی بھی غلط نہ تھی۔ میں ان دونوں کو جو سمجھانا چاہ رہا تھا وہ اشاروں کنایوں میں سمجھا چکا تھا۔ لیکن کبیر سوچنے کا انداز منفی تھا۔

''کبیر .....!'' اچانک نگینہ نے ذرا سخت لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر سرد انداز میں کہا۔ ''تم بلا جذباتی ہو رہے ہو ..... نادر جو بات سمجھانا چاہ رہا ہے، وہ تلخ ضرور ہے لیکن اس میں ہمارا فائدہ ہے پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''نادر! تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔ میں اب اپنے پپا کو کسی نہ کسی طرح کریدنے کی کوشش کروں گی۔''

''تو گویا اب ہم اپنے والدین کی ٹوہ لینے کی کوشش کریں ..... لاحول ولا .....'' کبیر کا بدستور خراب تھا۔ میں گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے اٹھا تو کبیر نے بھی میری تقلید کی۔ نگینہ سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس کی دل نشیں آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر اپنے لئے ایک بھیدوں بھری چمک محسوس کی تھی۔

میں اور کبیر واپس گاڑی میں آبیٹھے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ مجھ سے کچھ خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات کرنا ضروری نہ سمجھا۔ لیکن مجھے دکھ کے ساتھ عجیب سی حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر کبیر کو میری یہ بات بہ الفاظ دیگر اس قدر بری کیوں لگی تھی؟ حالانکہ میں نے تو ایک حقیقت آمیز بات کہی تھی کہ نگینہ اور کبیر کو اپنے پپا ڈیڈی سے اس بارے میں کھل کر گفتگو کرنی چاہئے تھی کہ ان کے بڑوں کی ماضی میں کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں رہی تھی؟ نگینہ نے البتہ کھلے دل سے میری اس تجویز کی تائید کی تھی۔ کیونکہ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ان نامعلوم حملہ آوروں کا ذاتی طور پر کھوج لگانے کی نہ صرف اپنے میں خواہش رکھتی تھی بلکہ عزم بھی کر رکھا تھا۔

کبیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بدستور خاموشی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ ذرا دور جا کر اس نے موڑ کاٹا تو مجھے سڑک کے دائیں کنارے پر ایک گرین کلر کی ہائی روف کھڑی نظر آئی۔ ہماری ڈبل کیبن انٹرکولر نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھلا ہوا تھا۔ جہاں میری نظر ڈرائیور کے علاوہ دو نقاب پوشوں پڑی۔ پھر ان کے ہاتھوں میں سیاہ رائفلوں کی مہیب جھلک دکھائی دی۔ میرا دل یکبارگی زور سے اور اگلے ہی لمحے میں حلق کے بل چیخا۔

''کبیر .....! نیچے جھک جاؤ۔''

اس کی بھی غالباً ان پر نظر پڑ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں گولیوں کی سمع خراش تڑتڑاہٹ گونجی مگر میں اور میرے بروقت ہوشیار کرنے پر کبیر احمد بھی اپنا سر نیچے جھکا چکا تھا۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز ابھری تھی۔

''ایکسیلیٹر دبا دو ..... فوراً .....'' میں نے نیچے سر کرتے ہوئے کبیر سے چلا کر کہا۔ وہ بری

بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا لیکن میری بروقت ہدایات پر اس کا عمل کرنا غیر ارادی ہی تھا۔ اس لئے اس کے بدحواس ہونے کے باوجود ہم دونوں ہی گولیوں کی اس خونی بوچھاڑ سے محفوظ رہے تھے۔

گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کے علاوہ کئی گولیاں گاڑی کی باڈی میں بھی پیوست ہوئی تھیں۔

بہرطور کبیر نے جیسے ہی میری ہدایات کے مطابق ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا سارا زور صرف کر دیا، ہماری گاڑی کا انجن زور سے غرایا اور ٹائروں کی چرچراہٹ کے اُبھرتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح دوڑنے لگی۔

ہم دونوں اب سیدھے ہو کر بیٹھ چکے تھے۔ کبیر کے چہرے پر ارتعاش تھا۔ خود میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو چکی تھی۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کی گرین ہائی روف ہمارے تعاقب میں تھی۔ وہ ہماری گاڑی پر اب وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا ورنہ ایوب پارک اور نیو پنڈی کے صدر جیسے علاقوں میں اس سے ٹریفک کا سیل رواں ہوتا ہے۔ کبیر احمد خاصی تیز رفتاری سے گاڑی دوڑائے لئے جا رہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی بجائے دوسری طرف ہو گیا تھا۔

یہ سڑک دونوں طرف سے صنوبر اور چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی جو آرمی میوزیم کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اچانک عقب سے ایک فائرنگ کے نتیجے میں ہماری گاڑی کا عقبی شیشہ ایک زوردار چھناکے کی آواز سے ٹوٹا تو غیر ارادی طور پر ہم دونوں نے اپنے سروں کو ذرا نیچے جھکائی دی۔ نتیجتاً کبیر کے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے دونوں ہاتھ بہک گئے۔ گاڑی چونکہ خاصی اسپیڈ میں تھی اس لئے وہ بری طرح ڈولنے لگی۔ یہ بہت جان لیوا حد تک خطرناک صورتِ حال تھی۔

''بریک مت لگانا کبیر!'' میں حلق کے بل چیخا۔ ''گاڑی کو آہستہ آہستہ کنٹرول کرنے کی .....'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بھاری بھر کم ڈبل کیبن انٹرکولر کسی شتر بے مہار کی طرح ڈولتی ہوئی کبیر کے قابو سے باہر ہو گئی اور دائیں جانب ایستادہ درختوں کے جھنڈ کی طرف لپکی اور کبیر نے وہی غلطی کر ڈالی جس کا مجھے ڈر تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں بریک پیڈل پر پڑا۔ گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ الٹ گئی۔ یوں لگا جیسے پوری دنیا گھوم گئی ہو۔ زبردست جھٹکوں کے ساتھ بھیانک دھماکے مجھے اپنی ڈوبتی ہوئی سماعتوں میں سنائی دیئے۔ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا .....!

❋❋❋

بے ہوشی سے ہوش مندی کی طرف لے جانے والی حس کے بیدار ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے ایک ٹیس زدہ سی اذیت کا احساس ہوا اور تکلیف کے باعث میرے منہ سے بے اختیار کراہ آمیز سسکاری نکل گئی۔ اگرچہ ابھی میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جتنے بیدار ہو سکے تھے اسی سے میں نے اپنے اردگرد لوگوں کا شور سا محسوس کیا تھا۔ میرا نیم بے ہوش ذہن اندھیروں کے بھنور سے نکلنے کی از خود مسلسل جدوجہد کر رہا تھا لیکن باوجود اس کے میں نے شاید ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی بے حس و حرکت وجود کو کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی لمحے دوبارہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے رابطہ ٹوٹنے کے دوران میری نیم بیدار سماعتوں نے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنی تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو اس مرتبہ بیک وقت میری پانچوں حسیات نے بیدار ہو کر میرے تاریک ذہن کو مکمل شعور عطا کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے خود کو ایک صاف ستھرے اور آرام دہ بیڈ پر پڑے پایا تھا۔ میرے نتھنوں سے ادویا
مخصوص کی بُو ٹکرائی تو فوری ادراک ہوا کہ میں کسی ہسپتال کے کمرے میں تھا۔ لیکن اس بار میں اپنے حو
میں کچھ خاص تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ البتہ کراہ کا سبب جسمانی اٹھن ہی تھا۔ میرے دائیں جانب
ایک ڈرپ اسٹینڈ نظر آ رہا تھا اور تب اچانک ہی میری نیم وا آنکھوں نے ایک گلرنگ چہرہ دیکھا.....
نگینہ تھی۔

مجھے اپنے حلق میں کانٹوں کی چبھن کا احساس ہوا۔

''پپ..... پانی.....!''

میرے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا ذہن دوبارہ لامتناہی تار
کے گرداب میں ڈوبنے لگا ہو۔ میری نیم وا آنکھوں کے سامنے نگینہ کا چہرہ جیسے ایک لمحے کے لئے ہی محو
تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ پھر نظر آئی تو میں نے جسم و جاں کی ساری توانائی صرف کرتے ہوئے ذہ
کو ظلمت کی دلدل میں پھنسنے سے بچایا۔ نگینہ نے مجھے ایک ہاتھ ذرا سہارا دیا تو میری رگِ جاں تک مج
توانائیوں کا سمندر موجزن ہو گیا۔

اس نے پانی کا گلاس میرے متحرک لبوں سے لگا دیا تھا۔ پیاس کی شدت سے سوکھے حلق میں پا
کی تراوٹ اُترتے ہی میں نے پوری طرح اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اٹھنے کی ایک غیر ارادا
کوشش کی تو مجھے اپنے دائیں بازو کی نس میں چبھن کا احساس ہوا۔

''پلیز نادر!..... آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔'' نگینہ کی مدھر آواز اُبھری۔ ''ش
ہے..... تمہیں ہوش تو آیا۔''

جسمانی اور شعوری طور پر بیدار ہوتے ہی مجھے وہ سب یاد آنے لگا جس کے باعث میں یہاں ز
حالت میں ہسپتال کے بیڈ پر تھا۔

''کبیر..... کیسا ہے؟ وہ کہاں ہے؟'' میں نے نگینہ کے خود پر قدرے جھکے چہرے کی طرف دیکھ
متوحش سی بے قراری سے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ تم دونوں اتنے بڑے حادثے میں موت سے بال بال بچے ہو۔'' نگینہ نے ایک
طمانیت بھری سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری طرح اسے بھی معمولی چوٹیں آئی ہیں۔''

میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ یہ معجزہ ہی
کہ ہم دونوں نہ صرف زندہ تھے بلکہ زخم بھی معمولی آئے تھے۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، باقی و
صحیح سلامت تھا۔

''نگینہ!..... پلیز..... نرس کو بلا کر یہ ڈرپ اتار دو۔ میں اب خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' م
نے ملتجی لہجے میں اس سے کہا تو وہ بولی۔

''ٹھہرو..... میں ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

میں اور کبیر جن سنگین حالات کا شکار ہوئے تھے، وہ دوہری نوعیت کے تھے۔ ہمارے تعاقب
نامعلوم حملہ آور تھے۔ پھر ہماری گاڑی بے قابو ہو کر الٹ گئی تھی۔ مگر مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ہمار
حملہ آور متعاقبین ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر کیوں لوٹ گئے تھے؟ کیا انہیں یقین تھا کہ اس جا
حادثے میں کبیر اور میں جانبر نہیں ہو سکتے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟

بہرطور ذرا دیر بعد نگینہ کے ہمراہ ایک سفید گاؤن میں ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک نرس

ہاتھوں میں کلپ بورڈ اور بی پی اپریٹس وغیرہ اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خاصے پختہ عمر تھے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کے موٹے فریم کی عینک چڑھا رکھی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''نادر صاحب! کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''

میں نے اپنی نقاہت کو خاطر میں لائے بغیر بشاشت سے مسکرا کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر میرا دوست..... کبیر کیسا ہے؟''

وہ جواباً اسی طرح اپنے بشرے پر مسکراہٹ سجائے بولے۔ ''وہ بھی تمہاری طرح بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو میاں! تم دونوں نہ صرف معجزانہ طور پر زندہ بچے ہو بلکہ اس قدر جان لیوا حادثے میں تم دونوں کو معمولی فریکچر بھی نہیں ہوا ہے۔ بہرحال میری طرف سے نئی زندگی کی مبارک باد قبول کرو۔''

''بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کیا اب میں فارغ ہوں؟''

''بالکل.....'' وہ بولے۔ ''میں ذرا آخری ایک معائنہ کر لوں، اس کے بعد ایک نسخہ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ باقاعدگی سے پانچ روز تک استعمال کرتے رہنا۔''

اسٹینڈ پر جھولتی ہوئی ڈرپ بھی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے نرس کو اسے اتارنے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے اُٹھ بیٹھا تو دروازے پر ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھ کر میں ذرا سا چونک گیا۔ وہ شاہ صاحب تھے، نگینہ کے پپا۔ ان کے چہرے پر بلا کی تشویش تھی۔ میں نے فوراً ہولے سے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹے! کیسے ہو اب؟'' انہوں نے جبراً مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

''کافی بہتر ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''اوکے!'' اتنا کہہ کر وہ قریب کھڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''کیا آپ انہیں اب ڈسچارج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں.....'' ڈاکٹر صاحب نے کہا اور نرس کے ساتھ کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد میرا ڈسچارج کارڈ ایک وارڈ بوائے لے کر آیا۔ میں سہارے کے بغیر چل سکتا تھا۔ کبیر کا کمرا بھی میرے برابر ہی تھا۔ اس کے سر پر اور دائیں بازو پر بینڈیج تھی۔ اس کے ڈیڈی نظر حیات وغیرہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چار عدد باوردی پولیس اہلکاران کے ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ شاہ میر اور نظر حیات کے مسلح محافظ بھی چوکس انداز میں وہاں موجود تھے۔

ہم سب ہسپتال کی عمارت سے باہر آئے تو کشادہ احاطے میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ نگینہ مجھے لئے ایک کار کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں باوردی شوفر مستعد کھڑا تھا جس نے لپک کر ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں اور نگینہ عقبی سیٹوں پر براجمان ہو گئے جبکہ شاہ میر صاحب ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر تھے۔ ایک پولیس افسر کی نیلی جیپ بھی وہاں موجود تھی۔ نظر حیات کے ہمراہ چار پولیس گارڈ اور ایک پولیس آفیسر بھی تھا، جس کے شولڈر اور سینے پر لگے پھولوں سے وہ ایس پی رینک کا افسر نظر آ رہا تھا۔ ہماری گاڑی میں سب کے براجمان ہوتے ہی تینوں گاڑیاں ہسپتال سے روانہ ہو گئیں۔ ان گاڑیوں کی منزل کبیر کے والد نظر حیات کی رہائش گاہ تھی۔

مجھے اب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں واپس اپنے ہاسٹل جانا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ کیونکہ کم از کم ڈیڑھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو گھنٹوں سے پہلے میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایس پی نے، جن کا نام مظفر حسین تھا اور جو نظام حیات اور شاہ میر کے چند قریبی مشترکہ دوستوں میں سے تھے، ہم دونوں سے نہایت باوقار اور دھیمے دھیمے لہجے میں حالاتِ گزشتہ کی تفصیل پوچھی۔ درمیان میں وقتاً فوقتاً سوالات بھی کرتے رہے۔ زیادہ تر مجھ سے ہی مخاطب رہے تھے۔

بالآخر پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور پھر میں واپس اپنے ہاسٹل آ گیا۔

میرا ارادہ چند روز کے لئے گاؤں جانے کا ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں ماموں حیدر کل پریشان نہ ہو جائیں، دوسری بات میرے امتحانات بھی سر پر تھے لہٰذا میں نے بہ غرضِ آرام کالج سے صرف دو روز کی چھٹی لے لی۔

تیسرے روز میں بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔ میرے سر سے پٹی بھی اتر گئی تھی۔ باقی چھوٹے موٹے زخم بھی بھر گئے تھے۔ پیشانی پر البتہ زخم کا ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ معمولی قسم کا زخم تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی بھر جاتا۔ اس عرصے میں نہ کبیر کا فون آیا اور نہ ہی وہ خود کالج آیا۔

چوتھے روز صبح کو جب میں تیار ہو کر کالج جانے لگا تو نگینہ نے موبائل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ آج مجھ سے کالج آ کر ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے کالج کینٹین میں بارہ بجے کا وقت دیا۔ پہلا موقع تھا کہ نگینہ نے مجھ سے نہ صرف بذاتِ خود میرے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا تھا بلکہ مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا۔ میرے دل میں عجیب سی مسرتیں پھوٹنے لگیں تاہم مجھے حیرت تھی کہ اسے میرے موبائل کا نمبر کس طرح پتہ چلا تھا؟ ہو سکتا ہے کبیر سے میرا موبائل نمبر لے لیا ہو؟ میں نے سوچا اور نگینہ سے ایک ''تنہا'' ملاقات کی سرشاری میں شاداں و فرحاں کالج پہنچا۔

مجھے بے چینی سے بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ تین لیکچرز بھگتانے کے بعد میں ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل کے ساتھ کالج کینٹین پہنچا تو میری بے قرار متلاشی نظروں نے ایک قدرے دور افتادہ گوشے میں نگینہ کو بیٹھے پایا۔ وہاں دو کرسیوں پر اس کی سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ اسے سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر مجھے کوفت سی محسوس ہوئی تھی۔ بہرطور جب میں ان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں سہیلیاں اسی کالج کی طالبات تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ نگینہ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئیں۔ نگینہ کو شستہ لہجے میں آداب کہہ کر میں قریبی چیئر پر براجمان ہو گیا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی تازہ گلاب کی مانند دمک رہا تھا۔

''کیا آپ نے باہر نکلنا شروع کر دیا مس نگینہ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

جواباً وہ بھی مسکرا کر بولی۔ ''ظاہر ہے، گھر میں آخر کتنے روز بند ہو کر بیٹھا رہا جا سکتا ہے؟''

''ہاں ..... یہ تو آپ کی بات درست ہے۔'' میں نے اس کی تائید ضروری سمجھی۔ ''لیکن پھر بھی موجودہ حالات میں آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے ساتھ ہی اپنی فکرمندی بھی ظاہر کر دی۔

''موت تو ایک دن آنی ہے۔ پھر ڈرنا کیسا۔ یوں خوف زدہ ہو کر گھر میں قید ہو کر زندگی گزارنا بھی موت سے بدتر ہے۔ خیر چھوڑیئے، آپ سنائیں ..... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' اس نے پروا ہی سے کہا اور آخر میں میری خیریت پوچھی۔

مجھے اس کا کبھی ''تم'' اور کبھی ''آپ'' کا صیغہ استعمال کرنا عجیب ہی لگتا تھا۔

''خاصی بہادر ہیں آپ ..... ویسے مجھے کیا ہوا تھا؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ کبیر کی خیر نہیں معلوم ہو سکی مجھے۔ نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا دوبارہ۔''

''لگتا ہے وہ تم سے چڑ گیا ہے۔'' نگینہ نے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے عجیب

مسکراہٹ سے کہا تو میرے ہونٹوں پر بھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی مگر میں بولا کچھ نہیں۔ نگینہ کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر پوچھا۔

''کیا پئیں گی آپ؟''

''آں ..... نہیں ..... ابھی ابھی میں نے عذرا اور شہلا کے ساتھ چائے پی لی تھی۔'' وہ بولی۔ میں نے اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہراتے دیکھیں۔

''پھر بھی ..... میرے ساتھ تو آپ کو کچھ نہ کچھ لینا ہی پڑے گا۔'' میں نے اس کے چہرے کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے نیم باز مسکراہٹ سے کہا۔ میرے لئے یہ بڑے گراں قدر لمحات تھے۔ محبت کا سرمایہ۔

''اچھا، پھر ایسا کرتے ہیں ذرا دیر بعد کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں۔'' اس نے کہا پھر چند ثانیے میری طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے تکتے رہنے کے بعد بولی۔

''نادر صاحب.....!''

''آں ..... نہیں، صاحب نہیں چلے گا ..... صرف نادر.....'' میں نے دوستانہ بے تکلفی سے اسے ٹوکا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''نادر! ..... درحقیقت میں آپ کے پاس ایک گزارش لے کر آئی تھی۔''

میں اس کی بات پر ذرا چونکا۔ ''گزارش ..... کیا مطلب؟ ..... بھلا دوستوں میں یہ باتیں زیب دیتی ہیں؟'' میں نے اپنے بے لگام دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ میرے لہجے میں اپنائیت کا سمندر موجزن تھا۔ اس کے سرخ لبوں پر صرف ایک لمحے کے لئے بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھری تھی۔

''یہ آپ کا ظرف ہے ..... دراصل اس روز مجھے آپ کی باتوں نے کافی متاثر کیا تھا۔ آپ نے ہماری پریشانیوں سے شیئر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی غور طلب باتیں کی تھیں جو میرے لئے کافی سودمند ثابت ہوئی تھیں۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس لئے مسکرا کر بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے آپ کو متاثر کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہاں، محض دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے میں نے تمہارے اور کبیر احمد کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر لگتا ہے ..... کبیر احمد مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔''

''اسے ناراض ہونا چاہئے تھا۔'' وہ عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولی اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میری استفہامیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے دوبارہ بولی۔

''کبیر کو تمہاری بات اس لئے بری لگی تھی کہ تم نے ہمارے نامعلوم دشمن کا کھوج لگانے سے متعلق جو بامقصد تجویز ہمیں دی تھی، اس سے میں تو سو فیصد متفق تھی۔ لیکن کبیر تمہاری اس تجویز سے بری طرح چڑ گیا تھا۔ اس پر مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی کہ آخر وہ ..... وہ یہ بات تسلیم کرنے سے کیوں انکاری تھا کہ ہمارے والدین کی ماضی میں ضرور کسی سے دشمنی رہ چکی تھی اور وہ یہ وجہ بتانے سے دانستہ کترا رہے تھے کہ کیا خبر ..... اس میں ہمارے بڑوں کی غلطی بھی شامل رہی ہو ..... اس لئے ہمیں اپنے بڑوں کی ٹوہ لینا ہو گی۔ یہ بات بری سہی لیکن اس کے نتائج ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمہاری تجویز کے فوراً بعد میں نے اس پر عمل کر ڈالا اور جلد ہی اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے لگے۔'' وہ یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک بتا کر خاموش ہوئی تو میں ذرا ٹھٹک سا گیا۔

''کیا نتائج برآمد ہوئے..... پھر؟'' میں نے فوراً پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بتانے لگی۔

''سب سے پہلے تو میں نے اپنے پپا سے ان کے ماضی کے حوالے سے یہی پوچھنے کی کوشش کی کہ ماضی میں ان کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں رہی۔ انہوں نے اگرچہ پورے وثوق کے ساتھ انکار کیا تھا مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ مجھے یہ بات کھٹک گئی اور میرا تمہاری اس بات پر پختہ یقین ہونے لگا کہ ہمارے نامعلوم دشمنوں کا تعلق ہمارے بڑوں سے رہ چکا ہے۔ ابھی کل رات ہی کی بات ہے.....'' وہ انکشاف کرنے کے انداز میں آخر میں بولی اور میں بہ غور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''کل شام پپا کو انکل نظر حیات صاحب (کبیر کے ڈیڈی) کا فون آیا تھا۔ انہوں نے پپا کو رات نو بجے اپنے ہاں بلوایا تھا۔ انکل (نظر حیات) نے شاید پپا سے کوئی ضروری بات کرنا تھی ورنہ اکثر وہی پپا کے پاس آتے تھے۔ جب وہ ٹھیک نو بجے رات کو ان کے ہاں جانے لگے تو میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر میرے اصرار پر وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب ہم دونوں انکل نظر حیات کے ہاں پہنچے تو اس وقت انکل اور کبیر ان کے منتظر تھے۔ البتہ مجھے ان کے ہمراہ دیکھ کر وہ دونوں خاصے جز بز ہوئے۔ اس کے بعد انکل نظر حیات پپا کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئے اور میں کبیر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کبیر میری خلاف توقع آمد پر ذرا بے چین اور الجھا الجھا سا نظر آنے لگا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ میری آمد پر چہک اٹھتا تھا۔ خیر، تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن ہما کے ساتھ چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔ مجھے اس کے یوں اچانک اٹھ کر چلے جانے پر اچنبھا ہوا۔ تاہم مجھے شک ہوا کہ وہ بھی اوپر پپا اور اپنے ڈیڈی انکل نظر حیات کے ساتھ شامل گفتگو ہونے گیا ہے۔ اوپر کس قسم کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ درحقیقت میں پپا کے ساتھ آئی ہی اس لئے تھی کہ میں یہ جاننا چاہتی تھی، آخر انکل پپا کے ساتھ کون سی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے؟ پھر میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی بہانے اوپر گئی تو ایک بند کمرے میں پپا، انکل نظر حیات اور کبیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کمرے کا دروازہ اگرچہ بند تھا مگر ان تینوں کے آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جسے میں نے دروازے کے ساتھ لگ کر سننے کی کوشش کی تو اچانک کبیر باہر نکلا اور مجھے دروازے سے کان لگائے کھڑا دیکھ کر پہلے تو بری طرح چونک گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے میرا بازو پکڑ کر مجھے نیچے لے آیا اور سخت لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

اس کا یہ درشت رویہ میرے لئے باعث تعجب تھا مگر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔''

''بڑوں کی باتوں پر کان لگانا تم اچھا سمجھتی ہو؟'' وہ بدستور خار کھائے لہجے میں بولا تو میں نے کہا۔

''تم بھی تو اندر موجود تھے۔ کیا میں اپنے پپا کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی؟''

''ہم بہت اہم باتیں کر رہے تھے۔ تمہارے مطلب کی کوئی بات نہ تھی۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''وہ اہم باتیں میں سن چکی ہوں۔'' میرے انکشاف پر اس کے چہرے سے غصہ کافور ہو گیا اور وہ

پریشان نظر آنے لگا۔ پھر مضطرب لہجے میں بولا۔

''تت..... تم نے..... کیا سنا.....؟''

''میں نے سب سن لیا ہے..... کیا تمہیں بتانا ضروری ہے؟'' میرے سرد لہجے نے اسے جب بری طرح زچ کیا تو وہ میری طرف چند لمحے بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک ایک لفظ چبا کر مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''نگینہ!..... بعض باتوں کو جاننا ہمارے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ اس طرح خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔'' اس کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا تھا۔ مگر میں بدستور خشک لہجے میں بولی۔

''مگر میں جاننا چاہتی تھی کہ اندر ہمارے کون سے نامعلوم دشمنوں کے بارے میں خفیہ ڈسکشن ہو رہی ہے؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے نگینہ!'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔ ''یہ سارا کیا دھرا نادر کا ہے۔ اس نے ہی تمہارے دماغ میں یہ خناس بھر دیا ہے کہ اپنے بڑوں کی ٹوہ لگاؤ۔''

''یہ خناس نہیں، حقیقت ہے۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ کیونکہ میں جان چکی تھی کہ اندر ان تینوں کے درمیان ضرور ان نامعلوم حملہ آوروں کے بارے میں خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی جو ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے کبیر احمد سے صاف صاف کہہ دیا کہ نادر کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے کہ پپا اور انکل ہی نہیں بلکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے دشمن کون ہو سکتے ہیں؟ مگر ان کا نام لینے سے دانستہ گریز کیا جا رہا ہے۔ اتنا کہہ کر میں باہر چلی آئی۔''

نگینہ یہ سب بتا کر خاموش ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کبیر کا رویہ غیر فطری اور کچھ معاندانہ سا تھا۔ کچھ دیر دریائے سوچ بچار میں غوطہ زن رہنے کے بعد میں نگینہ سے مخاطب ہوا۔

''نگینہ! درحقیقت میں نے تو دوستی کے ناتے اپنا ایک فرض نبھانے کی کوشش کی تھی جو شاید کبیر کو بری لگی۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے ناراضگی بجا ہے۔ مجھے واقعی تم لوگوں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے تھی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں تمہیں بھی میری بات ناگوار گزرے..... اور میں..... تمہاری دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں جو مجھے بہرحال قطعاً گوارا نہیں۔'' نہ جانے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کیسے کہہ ڈالا تھا کہ اچانک نگینہ کے چہرے پر ایک گہرا تاثر ابھرا تھا۔ میری بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا، اس کے نرم و گداز لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''نادر.....!'' اس کے پکارنے میں بھیدوں بھری عمیق گہرائی تھی۔

''ہوں.....؟'' میں نے بدستور اس کی دل نشین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مختصراً کہا۔

''کیا تم مجھے کبیر جیسا انسان سمجھتے ہو؟''

میں اس کی بات پر ذرا چونکا پھر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

''نہیں..... ایسی بات نہیں۔ دراصل.....''

''مجھے تمہاری دوستی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے نادر.....!'' وہ اچانک میری بات کاٹ کر جیسے دل کی گہرائیوں سے بولی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کہ..... نادر! مجھے تمہاری محبت پر ذرا بھی شبہ نہیں۔

''مجھے اگرچہ تمہارے ساتھ دوستی میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا..... مگر دوستی تو دوستی ہوتی ہے۔ جو دنوں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سالوں اور صدیوں کی محتاج نہیں ہوتی ..... اور کیا یہ ضروری ہے کہ دوستی جیسے جذبات پنپنے کے لیے طویل مدت درکار ہو؟ خلوص تو خلوص ہوتا ہے، جو پہلی ہی نظر اور پہلی ہی ملاقات میں بے لوث اور دوستی کو جنم دے ڈالتا ہے۔'' وہ جیسے عالمِ بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ میں اسے آج بالکل ایک نئے روپ میں دیکھ رہا تھا جو میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

میرے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں اور اس کے بے اختیار اور دھیمے لہجے کی چاشنی نے مجھے ایک سرشاری میں مبتلا کر ڈالا کہ بے اختیار میرے مرتعش ہونٹوں سے اُبھرا۔

''نگینہ! پھر تم نے مجھے کیسا دوست پایا؟''

''میں نے تمہیں واقعی ایک سچے اور پُرخلوص دوست کے روپ میں دیکھا ہے۔'' اس کا جواب فوراً اور بلا جھجک تھا۔

''بس ..... اس سے آگے کچھ نہیں.....؟'' میرے اندر کا دیوانہ پن اپنے جوبن کو چھو رہا تھا۔ جذبات کی سرکشی نے مجھے ایکا ایکی دلیر بنا دیا۔ کیا محبت ایسی ہی دلیری بخشتی ہے؟

وہ بہ غور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ یقیناً میری آنکھوں میں اسے اُلفت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن نظر آیا ہوگا۔ تب میں نے بھی اس کی آنکھوں میں مدھ بھری جھیل کو ہلکورے لیتے محسوس کیا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تو جیسے میں ایکا ایکی سرشاری کی کیفیت سے نکلا اور ذرا کھنکار کر قدرے خفیف لہجے میں جھینپ کر بولا۔

''سوری.....! پتہ نہیں میں کیا کہہ گیا آپ سے۔''

وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں۔ ہم دونوں لمحہ بھر کے لئے انجانے سے تاثر کی غیر مرئی ڈور میں بندھ سے گئے تھے۔ میں نے ویٹر کو آواز دی۔ پھر اسے کولڈ ڈرنک لانے کو کہا۔ نگینہ نے ایک گہری سانس کھینچی اور میز پر رکھے پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو میں جلدی سے ایک کانچ کے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے تھما دیا۔

''تھینکس!'' کہہ کر اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد وہ بولی۔ ''نادر! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اپنے پپا اور گھر والوں سے بہت محبت ہے۔ گھر کے کسی فرد کو چھینک بھی آ جاتی ہے تو پورے گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں لیکن ..... لیکن.....''

اچانک اس کے لہجے میں رقت اُتر آئی۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے اس نے پونچھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔

''نادر!..... مجھے..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ رندھے ہوئے سے لہجے میں بڑی مشکل کے ساتھ مجھ سے بولی۔ ''مم ..... مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جو میری ہیلپ کر سکتے ہو۔'' اس کا لہجہ مرتعش تھا۔ اس کی التجا نے مجھے اندر سے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے رندھے ہوئے لہجے میں ایک آس تھی، ایک حسرت تھی۔ وہ مجھ سے ملنے ایک امید کے سہارے آئی تھی اور میں اس کی امید کا ایک فروزاں چراغ بن جانا چاہتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ وہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار ہے مجھے خود پر، اپنے جذبات پر قابو پانا تھا کہ کہیں میرے دلِ بے قرار کی تمنا اظہارِ محبت کی صورت میں لب تک نہ آ جائے اور یہ میرے نزدیک ایک انتہائی درجے کی خودغرضی تھی اور محبت کا عامیانہ پن بھی۔ اس کا پورے یقین اور امید بھرے انداز میں مجھے یہ کہنا کہ۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص

جو میری ہیلپ کر سکتے ہو۔'' میرے لئے اس کا یہ مان کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے وجدان نے یقیناً میرے پُرخلوص، دوستانہ اور سچے جذبات کو محسوس کیا تھا۔ اس کے اس ایک جملے نے مجھے سرشار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اب بڑی پُر اُمید نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

''نگینہ! میں تم سے اپنے دل کی بات کہوں کہ تم اور کبیر کو پریشان دیکھ کر میں نے یہ پختہ عزم کر لیا تھا کہ میں اس سنگین صورتِ حال میں تم دونوں کا ساتھ ضرور دوں گا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس پراسرار مسئلے کے حل کے سلسلے میں تمہارے اور کبیر کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر کبیر کو میری بات شاید حد درجہ ناگوار گزری تھی۔ لیکن تم نے جب خود میری اس تجویز پر عمل کیا تو یہ پراسرار حقیقت واضح ہونے لگی کہ ..... میری بات کسی حد تک درست ثابت ہوئی ہے ..... تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایک اچھے اور مخلص دوست کی حیثیت سے مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں ضرور کروں گا۔''

میں نے دانستہ کبیر کے تذکرے کو بھی شاملِ گفتگو رکھا تھا۔ کیونکہ نگینہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری طرف سے ذرا بھی کسی تعلق خاطر یا جذباتی لگاوٹ کا احساس ہو۔ البتہ میری تشفی آمیز اور یقین دلانے والی گفتگو نے اس کا بجھا بجھا چہرہ کنول کی طرح کھلا دیا تھا اور وہ ایک گہری پُرطمانیت سانس خارج کر کے ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''نادر.....! تم ایک ذہین شخص ہو ..... مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنی غیر معمولی ذہانت کے ذریعے یہ سنگین معاملہ حل کرنے میں ضرور میری مدد کرو گے۔''

''مدد کیسی؟..... دوستی کے ناتے یہ میرا فرض ہے۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''اب پلیز! مدد اور گزارش جیسے الفاظ دوبارہ استعمال نہ کرنا۔''

ویٹر کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں رکھ کر جا چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے کولڈ ڈرنک پینے کو کہا۔

تقدیر اب مجھ پر یوں مہربان ہونے لگی کہ اس مسئلے کے بہانے نگینہ، کبیر سے دور اور میرے بتدریج قریب ہوتی چلی گئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ نگینہ اور کبیر کی دوستی محض اچھے دوستوں کی سی رہی تھی۔ اس کی ایک فطری وجہ ان دونوں کے پپا اور ڈیڈی کا آپس میں پرانے اور گہرے دوست ہونا بھی تھا اور اس دوستی میں کم از کم نگینہ کی طرف سے کبیر کے لئے کوئی جذباتی لگاؤ یا تعلق خاطر نہ تھا۔ یوں میرے ضمیر پر بھی اس بات کا بوجھ نہ رہا تھا کہ میں نے خدانخواستہ کبیر کی محبت پر شب خون مارا ہو۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات تھی۔ تاہم مجھے اب بھی یہ دعویٰ نہ تھا کہ نگینہ کی مجھ سے دوستی محبت میں بدل گئی تھی۔ میں ابھی خود بھی اس خوش فہمی سے دور ہی تھا۔ ہماری گفتگو کا لب لباب صرف اور صرف ان پراسرار حملہ آوروں کے بارے میں ہوتا جو ان دونوں خاندانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تاہم کبیر کو نگینہ کا مجھ سے بار بار ملنا، بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کبیر نہ صرف مجھ سے روکھا روکھا رہنے لگا تھا بلکہ بسا اوقات تو اس نے مجھے نگینہ کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے پر ٹوکنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک روز تو حد ہی کر دی۔

''نادر!..... تمہارا نگینہ کے ساتھ پینگیں بڑھانا کیا معنی رکھتا ہے؟''

اس کے لہجے میں طنزیہ کاٹ کو میں نے محسوس تو بہت کیا اور مجھے غصہ بھی آیا مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے معتدل لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یہ پینگیں بڑھانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مطلب صاف ہے .....تم اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ وہ بھی بے وقوفوں کی طر
تم پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا نادر! پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ہمارے ذاتی معاملا
میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ نگینہ میری پہلی اور آخری مح
ہے۔ سمجھے تم.....؟'' نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ کبیر کا رویہ میرے ساتھ اب رقیبانہ ہونے لگا تھا۔
اس کے اس اندازِ گفتگو پر جہاں دکھ ہوا تھا وہاں غصہ بھی آیا۔ تاہم میں نے بدستور کول مائنڈڈ ہو
ہوئے دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یار کبیر! ..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کس قسم کی غلط فہمی میں پڑ چکے ہو؟ میں نے تو آج تک
نگینہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ہے۔ اگر نگینہ کو کبھی تمہاری طرح تم سے محبت ہے تو خوف زد
ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جہاں تک تمہارے معاملات میں ٹانگ اڑانے والی بات ہے تو معاملا
کرنا یار! تم اس سلسلے میں بھی بڑی خطرناک غلط فہمی کا شکار ہو۔ نگینہ جیسی تمہاری دوست ہے، ویسی میر
بھی ہے۔ اس نے مجھ سے دوستانہ استدعا کی ہے کہ میں ان پراسرار دشمنوں کا کھوج لگانے میں اس
مدد کروں۔ حیرت ہے، تم بھی تو اس مسئلے سے دوچار ہو۔ پھر مجھ سے تم اس قسم کی جرح کیوں کر رہے ہو؟''
میری وضاحت پر اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری اور استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری اور وہ اپنے ہونٹ بھ
کر مجھ سے بولا۔

''تم مجھے ڈاج نہیں دے سکتے نادر! کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نگینہ کی مدد کی آڑ میں تم ا
سے کیا چاہتے ہو۔ ایک بات صاف صاف کان کھول کر سن لو نادر! تم نے پہلے ہی نگینہ کو مجھ سے برگشتہ
رکھا ہے۔ اب تم اس کے ساتھ یہ چال چل رہے ہو کہ اسے اپنے باپ سے بھی متنفر کرنا چاہتے ہو۔ میں
تمہیں ایسی اوچھی حرکت ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔'' اس کا لب و لہجہ بتدریج جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یار!..... میں نگینہ کو اس کے باپ سے کیوں متنفر کرنا چاہ رہا ہوں ..... ذرا اس کی تفصیل بھی
دو۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی ترشی عود کر آئی۔

''اپنے باپ کی ٹوہ میں لگانا ..... ان سے برگشتہ کرنا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟'' وہ گرم لہجے میں بولا۔

''اور ذرا یہ بھی بتا دو کہ مجھے اس کا کیا فائدہ ہو گا؟'' میں بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اگر تم سننا چاہتے ہو تو سن لو.....'' وہ انکشاف کرنے والے انداز میں بولا۔ ''میں نے پہلے دن
سے محسوس کر لیا تھا کہ تم نگینہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہو۔ مگر میں دوستی کی خاطر خاموش رہا۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں ..... ذرا حوصلے سے سننا۔'' وہ بلا تامل زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ تم
اچھی طرح جانتے تھے کہ نگینہ کے پپا اور میرے ڈیڈی آپس میں بچپن کے گہرے دوست ہیں اور اس
ناتے میرے اور نگینہ کے درمیان دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوطی اختیار کر گیا ہے۔ تم نے مار آستین بن کر
سب سے پہلے نگینہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے مجھ سے بدگمان کیا اور اب نگینہ کو یہ باور کرانا چاہتے
ہو کہ ہمارے والدین سے ماضی میں ضرور کوئی ایسی مجرمانہ غفلت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہمارا کوئی
نادیدہ دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ تم اچھی طرح سے حقیقت جانتے ہو کہ نگینہ کے پپا مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ
دینے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیں گے اسی لئے تم نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا یہ منصوبہ بنایا کہ
نگینہ کے پپا کو اس کی نگاہوں میں مجرم بنانے کی ٹھانی تا کہ کل کلاں تم نگینہ کو اپنی جھوٹی محبت کے دام
میں پھانس لو تو نگینہ اپنے پپا کے سامنے سرکشی پر اُتر آئے۔''

وہ یہ فضول بیانی کر کے خاموش ہوا تو میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں ..... مگر میرا طیش میں آنا اس کے
لیے کو تقویت میں بدل سکتا تھا اس لئے میں نے اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے قدرے
تلخ لہجے میں کہا۔

''کبیر!..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے بارے میں اتنی گری ہوئی سوچ رکھتے ہو۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب دو ..... کیا تم نگینہ سے محبت نہیں کرتے؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' مجھے اس سے اس سوال کی پہلے ہی سے توقع تھی اس لئے میں نے بلا
تامل جواب دیا تھا۔

''مجھے صاف صاف جواب چاہئے۔ اگر تم نگینہ سے محبت کرتے ہو تو مجھے بتانے سے کیوں ڈرتے
ہو؟'' اس نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تو میں نے بھی برملا اس سے سوال کر ڈالا۔

''تم یہ بتاؤ، کیا کبھی نگینہ سے تم نے اظہارِ محبت کیا ہے؟'' میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ
سا آ کر گزر گیا۔ ''بولو ..... تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''نہیں ..... مگر ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تو بس ..... پھر بات ہی ختم۔ نگینہ نہ تمہاری ملکیت ہے نہ میری ..... اب یہ اس کی مرضی پر منحصر
ہے کہ وہ ہم دونوں میں سے کسے اپنا جیون ساتھی چنتی ہے۔'' میں نے بھی صاف گوئی سے کہا۔

کبیر کے چہرے پر اشتعال کی سرخی اُبھر آئی۔ اور پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زہریلے
لہجے میں بولا۔

''نادر! تم اپنی حیثیت پہچان کر بات کرو ..... تمہاری کیا اوقات ہے؟ یہ میں اچھی طرح جانتا
ہوں ..... اور تمہارا ماضی کیا ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں۔ جس طرح تم ہمارے بڑوں کی ٹوہ
لگانے کی کوشش کر رہے ہو، اسی طرح میں بھی تمہاری ٹوہ لگا چکا ہوں۔ میں چاہوں تو نگینہ کو تمہاری ساری
حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ جسے جاننے کے بعد وہ تم پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔''

میں اُس کی اس بے ہودگی پر پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر حلق
کے بل دہاڑا۔

''کبیر!..... زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ.....'' میں اشتعال کے مارے لرزنے لگا۔ اس نے
میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ورنہ ..... ورنہ کیا؟ میری بات کی کریہہ سچائی نے تمہیں آخر کھولا دیا نا ..... اس لئے تو سیانے
کہتے ہیں کہ دوسروں کی ٹوہ لینا اچھی بات نہیں۔'' وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور وہاں سے چلا
گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ میرے اندر الاؤ سا بھڑکنے لگا تھا۔ کبیر کی باتوں نے میرا
اندر بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر کی دبی دبی ازلی چنگاری نے ایکا ایکی آگ پکڑ لی۔

میں اپنے تاریک ماضی سے غافل نہ تھا بلکہ بذاتِ خود میں اپنے ماضی کے بارے میں جاننے کی ازلی
خواہش رکھتا تھا۔ تو پھر ..... تو پھر کیا کبیر میرے ماضی سے واقف ہو چکا تھا؟ مجھ سے پہلے وہ میرے
ماضی کے بارے میں جان چکا تھا؟ ..... میرے اندر لرزہ خیز خیال اُبھرا۔ میرا پورا وجود ایک لاوے کی
صورت کھولنے لگا۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے لرزتے
ہاتھوں کے ساتھ کونے میں رکھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ڈھکنا کھول کر منہ سے لگا لی۔
ٹھنڈا پانی بھی میرے سینے کی تپش کو سرد نہ کر سکا تو میں نے ہسٹریائی انداز میں چلا کر بوتل کونے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھینک دی۔ میرے اندر کی ازلی آگ پوری طرح بھڑکنے لگی تھی۔

❋ ❋ ❋

دوسرے دن نگینہ نے مجھے اپنی برتھ ڈے کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔ کبیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک لمبی چوڑی ٹویوٹا کریسیڈا کار میں آئے تھے اور ان دونوں کے ہمراہ تین عدد بردار باڈی گارڈز بھی تھے۔ کبیر کو دیکھ کر میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی۔ مگر مجھے ایک بات کی حیرت تھی کہ اس کے چہرے پر گزشتہ روز کی گرما گرمی کا کوئی تاثر ظاہر نہیں تھا۔ یا شاید وہ بڑی مکاری سے نگینہ کے سامنے مجھ سے اپنی ناراضگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

بہرطور میں نے بھی مسکرا کر دونوں کا استقبال کیا۔ پھر نگینہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے کارڈ لے لیا مگر اسے ٹالنے کی غرض سے یہ بھی کہہ ڈالا کہ میں اس کی سالگرہ میں شریک ہونے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

''نہیں نادر! وعدہ کرو..... تم ضرور آؤ گے۔'' وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''پلیز نادر!..... تم ضرور آنا..... ورنہ مجھے بالکل مزہ نہیں آئے گا۔'' وہ اصرار کئے جا رہی تھی۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ البتہ دوسرے ہی لمحے وہ سے دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔

''ارے یار نادر! بے چاری نگینہ کتنے مان سے تمہیں بلا رہی ہے۔ کچھ دوستی کا ہی خیال کرو۔ دے دو..... ورنہ یہ تمہارے انتظار میں بلاوجہ گھلتی رہے گی۔''

میں نے ایک پُرمتانت نگاہ کبیر کے چہرے پر ڈالی۔ اسنے بڑی مکاری سے کینچلی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا یہ دوہرا انداز عجیب بھی لگا اور میں اُلجھن آمیز پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا۔

''اچھا..... پھر میں ضرور آؤں گا۔'' بالآخر میں نے ہار مانتے ہوئے وعدہ کر لیا۔ نگینہ کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔

❋ ❋ ❋

سالگرہ کی دعوت رات دس بجے تھی اور ڈنر کا بھی پروگرام کارڈ پر درج تھا۔ مجھے سالگرہ کے اوقات پر حیرت سی ہوئی۔ کیونکہ عموماً سالگرہ جیسی تقریباً شام چھ بجے ہی ہوا کرتی تھیں۔ بہرطور میں نے اس بڑے لوگوں کے وطیرے جان کر کندھے اچکائے اور سب سے پہلے یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ نگینہ کو اس سالگرہ کا کون سا تحفہ دینا چاہئے۔ میں چاہتا تھا تحفہ ایسا ہو جو مادی قیمت سے زیادہ جذبے کی قیمت بالکل انمول ہو اور جو نگینہ کے لئے میرے جذبات کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کرتا ہو۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اچھا تحفہ خریدنے کے لئے صدر مارکیٹ کا رخ کیا اور کافی دھوپ اور تا کا جھانگی کے بعد مجھے ایک سرخ گلاب پسند آیا۔

سرخ گلاب کا یہ پھول اگرچہ مصنوعی تھا مگر اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں گلاب ہی کی سی خوشبو کا اسپرے کیا گیا تھا۔ یہ گلاب ایک چھ انچ کے چوکور شیشے کے ڈبے میں بند تھا جس کے نیچے چھوٹا سا بٹن دبانے کی صورت میں گلاب کی سرخ پتیاں روشن ہو جاتی تھیں اور ساتھ ہی ڈبے کا ڈھکنا خودکار طریقے سے کھل کر گلاب کی سی خوشبو بکھیرنے لگتا۔ ڈھکن اوپر اٹھتے ہی برتھ ڈے کی مبارک باد کے نغمے کی سریلی میوزیکل آواز بھی اُبھرتی تھی۔ مجھے یہ تحفہ بہت بھایا۔ میں نے اس کی دیدہ

پیکنگ کروائی، پھر ایک کشمشی رنگ کا لارنس ٹراپیکل کا بیش قیمت ٹو پیس سوٹ خریدا اور ایک اعلیٰ درجے کا پرفیوم اسپرے بھی خرید لیا۔ یہ سارا اہتمام کرنے اور تیاری کے بعد میں مقررہ دن اور وقت پر نگینہ کی رہائش گاہ پر پہنچا تو مجھے سب سے پہلے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

رہائش گاہ کو دیکھ کر قطعی طور پر یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں کسی تقریب کا انعقاد کیا گیا ہو۔ نہ کوئی سجاوٹ تھی، نہ آرائشی تزئین اور نہ ہی مہمانوں کی آمد و رفت دیکھنے میں آئی تھی۔ کوٹھی پر ایک عجیب سی ویرانی اور پراسراری خاموشی طاری تھی۔ مجھے سخت اچنبھا ہوا، ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ کہیں میں غلطی سے کسی اور جگہ پر تو نہیں آ گیا۔ مگر گیٹ کے دو طرفہ گول محرابی ستونوں پر جلتے ہوئے گلوب کی روشنی میں نیم پلیٹ پر جلی اُبھرواں لفظوں والی تحریر میں نگینہ کے پپا کا نام شاہ میر صاف پڑھنے میں آ رہا تھا۔ جسے میں نے دو بار ذرا غور سے پڑھا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں اس تقریب کا انعقاد کسی مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ کیا گیا ہو۔ احتیاطاً میں کارڈ اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے اسے اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر بہ مقام ایڈریس کالم کو پڑھا تو اس میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی بجائے تقریب کا انعقاد رہائش گاہ ہی درج تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر کارڈ دوبارہ جیب میں رکھا اور اُلجھن آمیز انداز میں سر کو جھٹک کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد بغلی دروازہ کھلا اور کبیر نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔

''آؤ..... آؤ.....'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور میں گومگو سے انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ کبیر رُکے بغیر مجھ سے آگے تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اس کے انداز پر حیرت سی ہوئی۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ تو جیسے دوڑا جا رہا تھا۔ بہرطور میں بھی خاموشی کے ساتھ اس کے عقب میں چلتا ہوا اندر ایک کشادہ کمرے میں پہنچا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

اندر کمرے میں بھی کوئی سجاوٹ نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی مہمان نظر آ رہے تھے۔ البتہ سامنے صوفوں پر نگینہ، اس کے پپا شاہ میر اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات براجمان تھے۔ کبیر بھی البتہ میرے ذرا قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ سب عام گھریلو لباس میں تھے اور میری طرف عجیب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ نگینہ کے چہرے پر بھی حد درجے سنجیدگی طاری تھی اور اس کی بھی سرد نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ایک عجیب سی پراسراریت اور تناؤ محسوس کر کے نہ جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

''بیٹھو نادر.....!'' کبیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر خشک لہجے میں کہا اور میں غیر ارادی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ گفٹ پیک ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا اور میں حیران پریشان ایک ایک کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

''تحفہ لائے ہو میرے لئے..... نادر صاحب!'' معاً نگینہ نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی۔ ''لاؤ..... مجھے دو.....''

میں نے میکانکی انداز میں تحفہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے گفٹ پیک لیا اور انتہائی رُکھائی کے ساتھ نیچے دبیز قالین پر پھینک دیا اور پھر اپنے ایک پاؤں سے اسے روند ڈالا۔

میرے سر پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مجھے نگینہ کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری اور میں غصے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ..... یہ کیا مذاق ہے..... نگینہ.....!''

''بیٹھ جاؤ آرام سے نادر!'' اچانک شاہ میر نے مجھے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوسان خطا ہونے لگے۔ دل مضطربانہ انداز میں بے تحاشا دھڑکنے لگا۔

''کیا مجھے بے عزت کرنے کے لئے یہاں بلایا گیا تھا؟ ..... میں پوچھتا ہوں، یہ سب کیا ہے؟'' میں غصے سے پھنکارتے ہوئے شاہ میر سے بولا تو کبیر کے ڈیڈی نظر حیات مجھے گھورتے ہو سرسراتے لہجے میں بولے۔

''پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ ..... نادر علی خان!..... ولد قادر علی خان.....!''

میں اس کے منہ سے پہلی بار اپنی ولدیت کے بارے میں سن کر بری طرح ٹھٹکا۔ 'قادر علی خان میرے باپ کا نام قادر علی خان تھا.....؟ مگر انہیں کس طرح معلوم ہوا جبکہ میں نے تو آج تک نہ باپ کا نام سنا تھا اور نہ ہی اسے دیکھا تھا۔' میں نے دل میں سوچا۔

''کیوں ..... ششدر ہو گئے نا..... دیکھ لو، ہم نے نہ صرف تمہیں پہچان لیا بلکہ تمہاری سا سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔'' کبیر نے مجھ سے زہریلے لہجے میں کہا۔

میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔

''سازش..... کیسی سازش.....؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے پا پر کھڑا ہونا دوبھر محسوس ہونے لگا اور میں صوفے پر گر سا گیا۔ نہ جانے یہ کیا پراسرار چکر تھا۔ نگینہ کا سراسر بدلا بدلا اور اجنبی سا ہو رہا تھا۔

''دشمن ہماری بغل میں تھا اور ہم شہر بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔'' اس بار نگینہ نے اف زہریلے لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہو تھا جیسے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

''پلیز نگینہ! خدا کے لئے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، یہ سب کیا ہے؟..... ورنہ میں ..... میں پاگل جاؤں گا۔'' میں نے اپنا سر پکڑ کر نگینہ سے التجا کی۔

''نگینہ تمہیں کیا بتائے گی نادر علی خان! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا ہو.....؟'' اس نظر حیات نے اسرار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا اور پوچھا۔ ''تمہاری ماں اس وقت جیل میں عمر قید کی کاٹ رہی ہے نا؟'' میں دھک سے رہ گیا اور تھوک نگل کر ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ وہ عمر قید کی سزا کیوں کاٹ رہی ہے؟'' نظر حیات نے استہزائیہ انداز پوچھا۔ میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔

''او ..... بڑے بھولے بادشاہ بن رہے ہو ..... تمہاری اداکاری کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اس بار شاہ میر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''چلو ..... یہ بھی ہم ہی بتائے دیتے ہیں تاکہ تمہارے سر سے اداکاری کا بھوت اتر جائے۔'' کہہ کر شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم اٹھاتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر انتہائی سفاکی سے بو

''تمہاری ماں نے اپنے شوہر کا قتل کیا تھا..... یعنی تمہارے باپ..... قادر علی خان کا قتل.....''

میں یہ سن کر یکدم سناٹے میں آ گیا تھا۔

میری زخمی ساعتوں میں جیسے وحشتوں کے سناٹے چیخ رہے تھے۔ میں ایک ٹک اپنے سامنے کھڑے نگینہ کے باپ شاہ میر کو تکے جا رہا تھا۔ نگینہ سمیت کبیر اور اس کے ڈیڈی نظر حیات میرے چہرے کے تاثرات کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ گویا یہ بھانپنے کی کوشش میں ہوں کہ ابھی ذرا دیر پہلے شاہ میر کے لرزہ خیز انکشاف سے میں واقعی لاعلم تھا یا یہ لاعلمی میری اداکاری تھی۔

مجھے ذرا چکر سا آیا اور میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ برا سانس نہ جانے کیوں چڑھ گیا تھا، سینہ لوہار کی دھونکنی بنا ہوا تھا۔

''.....انکل..... آ..... آپ کیا..... کہہ رہے ہیں؟'' مجھے علم نہیں ہو سکا کہ یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا۔

وہ میری حالت پر استہزائیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''خوب ..... بہت خوب!..... جیسے تم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔'' اس نے زہریلی آنکھوں سے ری طرف دیکھا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری کبیر احمد اور بعد میں میری بیٹی نگینہ ے دوستی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہماری پشت میں بہ آسانی خنجر پیوست کر سکو۔''

میرے اندر ابھی تک سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے باری باری سب کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ رف نگینہ کے چہرے پر مجھے اُلجھن آمیز تاثرات نظر آئے تھے۔

میں نے سب سے پہلے خود پر قابو پایا اور عجیب سے متحمل لہجے میں شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔ انکل!..... میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔ خدا کے لئے، میری بات پر بھروسہ کریں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ ط فہمی ہے کہ درحقیقت میں ہی آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروا رہا ہوں تو اس کے پیچھے دشمنی کی کوئی ٹھوس بہ ہونا چاہئے۔''

''تمہاری بات بالکل درست ہے۔'' اس بار کبیر احمد کے ڈیڈی نظر حیات نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ ھڑا ہوا۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے بولا۔ ''غلط فہمی ہمیں نہیں، تمہارے ماموں بدر گل اور تمہیں ہے اور تم دونوں مل کر ہمارے خلاف دشمنی کا جو جال بُن رہے ہو، ہم اس سے بھی اچھی رح واقف ہیں اور تمہیں یہاں ڈرامائی انداز میں بلانے کا ہمارا مقصد محض یہی تھا کہ ہم تمہیں یہ بتا سکیں ہ ہم تمہاری درپردہ سازش سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور ہاں، اگر دوبارہ ہم پر یا ہمارے بچوں پر تم نے رتمہارے ماموں حیدر گل نے حملہ کرنے کی کوشش کی تو تم دونوں ماموں بھانجے یاد رکھنا..... ہمیں نی نبھانی اچھی طرح آتی ہے۔ ناؤ یو گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔'' اس نے آخر میں تضحیک آمیز لہجے میں ے دھتکارا۔

احساسِ ذلت سے میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ میرا دماغ پہلے ہی جل رہا تھا۔ میں گویا ایک ابال کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ میں بھی اڑ گیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میر اور نظر حیات کے چہروں پر نظریں گاڑتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔

''اب میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک کہ مجھے ماموں حیدر گل اور میرے خلا آپ لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھتی دشمنی یا غلط فہمی کی تفصیل معلوم نہیں ہو جائے گی۔''

ماحول میں یکلخت پراسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا جسے کبیر احمد کی نفرت آمیز آواز نے پارہ پارہ کر کہہ رہا تھا۔ ''نادر!.....بس، اب بہت ڈراما رچا لیا تم نے۔ تمہارے چہرے سے نقاب اتر چکا اب تم ہمارے ساتھ مزید ڈھٹائی آمیز مکاری نہیں کر سکتے ..... جاؤ اور اپنے ماموں حیدر گل کر کہہ دینا کہ آئندہ تم لوگوں نے ہمارے خلاف کوئی چال چلنے کی کوشش.....''

میں اس کی بات کاٹ کر یکدم چیخ اٹھا۔ ''پلیز.....پلیز، فار گاڈ سیک! میں پاگل ہو جاؤں گا..... مجھے..... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ کس دشمنی اور کون سی سازش کی بات کر رہے ہو؟..... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اگر تم لوگ میرے ماضی کے جانتے ہو تو مجھے بتاؤ، میں تم لوگوں کا ممنون رہوں گا۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ میری ماں اس سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور ..... حد یہ کہ مجھے میری ماں نے جیل کی سیلن زدہ کوٹھڑی کے ننگے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ وہ پھانسی ہے جس نے آج تک مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ میں نے تو ..... میں نے تو اپنے ما حیدر گل سے بھی کئی بار دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری ماں جیل کے پیچھے اپنے کس جرم کی بھگت رہی ہے؟ میرا باپ کون اور کہاں ہے؟ لیکن نہ ماں نے کبھی مجھے یہ حقیقت بتانے کی کوشش کی نہ ہی ماموں حیدر گل نے۔ میں نے تو اب ماں سے بھی ملاقات کرنا چھوڑ دی ہے۔ حتیٰ کہ ماموں گل، جنہوں نے مجھے آج تک بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا ہے، تنگ آ کر میں نے ان سے بھی پوچھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب جبکہ آپ لوگوں کی زبانی مجھے اس حقیقت کا پتہ چلا ہے کہ میری ماں نے میرے باپ قادر خان کا قتل کیا ہے اور وہ اسی جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہی ہے تو ..... میں جوڑ کر آپ لوگوں سے التجا کروں گا کہ خدارا، مجھے یہ ساری حقیقت بتائیں کہ میری ماں نے میرے کا قتل کس وجہ سے کیا تھا؟''

میں نے اتنا کہا اور خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میری رگوں جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس نے مجھے جوالا مکھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ میرے وجود کے سوالیہ نشانات کے جونوکیلے آنکڑے پھنسے ہوئے تھے، ان کی چبھن سے میرا اندر چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ آگ تھی جو مجھے خاکستر کئے دے رہی تھی۔

میں خاموش ہوا تو ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس میں مجھے اپنے سانسوں کی آواز بہت بلند محسوس رہی تھی۔

کبیر احمد نے دانت نکوس کر دوبارہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نظر حیات نے ہاتھ کے اشا سے بیٹے کو روک دیا۔ اس کے ہی نہیں بلکہ شاہ میر کے چہرے پر بھی مجھے پہلی مرتبہ پُرسوچ خاموشی آنے لگی تھی۔ البتہ نگینہ سے نہ رہا گیا اور وہ میرے چہرے پر اپنی گہری نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے شاہ میر سے بولی۔

''پپا! میرا خیال ہے کہ نادر واقعی کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا تھا، وہ یہ کہ

ہے۔ اب میری آپ سے اور انکل نظر حیات سے درخواست ہے کہ اگر آپ لوگوں کو حقیقت کا علم ہے تو سے آگاہ کر دیں۔''

اس بات پر میں نے نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری نظروں میں اس کے لئے کسی گلے، کسی شکوے کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاں، ایک تشکر تھا، ایک التجا تھی۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ نگینہ ہی شاید وہ ہستی ہو سکتی ہے جو میرے اندر کے ہیجان اور تڑپ کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ سب شاید میری طرف سے کسی بھیانک غلط فہمی کا شکار تھے تو میں اس کی وجہ جاننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آخر مجھے اپنا دشمن سمجھنے کی کیا وجہ تھی؟ یہ بہت اہم سوال تھا میرے لئے۔

نظر حیات نے ایک طویل ہنکاری لی اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پھر شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے، نگینہ بیٹی کی بات صحیح ہے ..... پھر کیا کہتے ہو شاہ میر! نادر کو وہ ساری داستان سنا دی جائے؟''

میں اب شاہ میر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا طاری تھی۔ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ جواباً اپنے دوست نظر حیات سے بولا۔

''یہ ابھی قبل از وقت ہو گا۔ کیونکہ اسے شاید ہماری بات پر یقین نہ آئے۔ اس کے لئے ابھی اتنا جاننا ہی کافی ہو گا کہ اسے یتیم کرنے والی خود اس کی اپنی ماں تھی۔ اب اسے چاہئے، یہ اپنے ماموں حیدر گل کا گریبان پکڑے اور اس سے پوچھے کہ اس نے اپنی بہن شبینہ کا جرم اپنے بھانجے سے چھپانے کی کوشش کیوں کی۔ کیا اس لئے کہ وہ عورت اس کی بہن تھی؟''

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں استہزائیہ کاٹ اتر آئی تھی۔ جس سے میرا دماغ جلنے لگا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، ماموں بھلا مجھے کس منہ سے اپنی بہن کے اس ناقابلِ معافی اور بھیانک جرم کا جواب دیتے۔ آج مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کتراتے تھے۔ تاہم میں نے شاہ میر کی طرف دیکھ کر اٹل لہجے میں کہا۔

''نہیں انکل!..... ماموں حیدر گل سے تو میں اچھی طرح پوچھوں گا ہی .....مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو جو حقیقت معلوم ہے وہ مجھے بتائیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کو سب سے پہلے مجھ پر ہی اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ نگینہ پر گمنام قاتلانہ حملے کروانے والا میں ہی ہوں۔ آپ کی اس غلط فہمی کی ضرور کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔ رہی بات ماموں کی تو میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھ سے کئی باتیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے میں نے ان سے کچھ پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''یہی تو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں برخوردار!'' اس بار شاہ میر کی آواز میں خاص انداز کا تحمل تھا اور لہجے میں بھی پہلے والی کاٹ نہ تھی۔

''ہم بھی یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ تم سے کتنا سچ بولتے ہیں؟ کیونکہ یہ سچ بڑا کڑوا ہے۔ ہو سکتا ہے تم سے ہمارے منہ سے سن کر آپے سے باہر ہو جاؤ اور یہاں کسی قسم کی بدمزگی ہو۔'' شاہ میر نے پہلی بار ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کی تو نظر حیات بھی مجھ سے ذرا معتدل لہجے میں بولا۔

''ہمیں اب اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم شاید تمہاری طرف سے غلط فہمی کا شکار تھے۔ کیونکہ تمہارے چہرے اور لہجے کی سچائی سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں بہرحال حقیقت کا علم نہیں ہے اس لئے ہم بھی اب اپنے رویے کی تم سے معافی چاہتے ہیں لیکن ہمارا اب بھی تمہیں وہی مشورہ ہے کہ اپنے ماموں حیدر گل کو کریدنے کی کوشش کرو پھر ہمارے پاس آنا، ہم تمہیں ساری حقیقت بتا دیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس کی بات سے ذرا متذبذبانہ سوچ میں پڑ گیا۔

''پلیز نادر!..... پپا اور انکل کا مشورہ مان لو۔ اس طرح ہمارے دل بھی ایک دوسرے صاف ہو جائیں گے۔'' معاً نگینہ نے مجھے مخاطب کر کے بڑے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہاں مجھے شرمندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ مگر کبیر کا منہ ابھی تک پھولا تھا۔ میں نے بالآخر انکل نظر حیات سے کہا۔

''انکل! میرے لئے بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے میری بات پر بھروسہ کیا۔ آپ لوگوں کی باتوں کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروانے میں میرے ماموں حیدر گل کا ہی ہاتھ ہے۔ کیا آپ مجھے اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ آخر ماموں اور آپ لوگوں کے درمیان کی کیا وجہ ہے؟''

میری بات پر نظر حیات نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہو فوراً بولا۔

''یہ بات کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ تم پہلے اپنے ماموں حیدر گل سے بات کرو لیکن اس بار خاص خیال رہے کہ ان سے ہمارے حوالے سے کوئی بات مت پوچھنا۔''

''لیکن انکل! مجھے ماموں سے کچھ پوچھنے کے لئے آپ لوگوں کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔'' میں جواز پیش کیا اور مزید بولا۔ ''کیونکہ ماموں نے آج تک میری کسی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔''

میری بات پر وہ دونوں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے، پھر نظر حیات بولا۔

''اس میں قباحت یہ ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل ایک دم محتاط ہو جائے گا۔ ہم اس کا جھوٹ چاہتے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ تمہارے ہم سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے ہیں تو وہ کئی باتوں پہلوتہی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے تم بغیر ہمارے کسی حوالے کے ایک صرف یہ کریدنے کی کوشش کرو کہ اس کی بہن یعنی تمہاری ماں شبینہ نے اپنے شوہر کا قتل کیوں کیا آگے وہ خود ہی کھلتا چلا جائے گا۔ اب تم بچے تو نہیں رہے کہ وہ تمہیں ٹالنے کی کوشش کرے۔ تم اب کڑیل جوان ہو۔ شبینہ تمہاری ماں ہے۔ اس کے بارے میں، اس کے ماضی کے بارے میں جاننے تمہیں پورا حق حاصل ہے۔ پس، اس بار تم اس سے دوٹوک بات کرو۔'' وہ خاموش ہوا اور میں دھیرے دھیرے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگا۔

میں واپس یونیورسٹی کیمپس آیا۔ میں نے اگلے روز ایک دن کے لئے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ اب ماموں حیدر گل سے حتمی بات کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

صبح یونیورسٹی میں مجھے صرف دو لیکچرز اٹینڈ کرنا تھے۔ پہلا ساڑھے آٹھ بجے اور دوسرا ساڑھے سے تقریباً گیارہ بجے تک تھا۔ باقی لیکچرز اتنے اہم نہ تھے۔ یوں بھی امتحانات قریب تھے۔ کورس تقر مکمل ہو چکا تھا۔ اکا دکا اسپیشل لیکچر ہوتے تھے۔ میں صبح ساڑھے سات بجے بیدار ہوا۔ غسل وغ کرنے کے بعد میں آٹھ بجے کالج پہنچا۔ سینٹرل کینٹین میں ناشتہ کیا اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے لیکچر کی طرف بڑھ گیا۔

گیارہ بجے جب میں دوسرے لیکچر سے فارغ ہوا تو نگینہ کو میں نے ہال میں جھانکتے ہوئے دیکھ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔ وہ مسکرائی، میں اس کی طرف بڑھا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''آؤ، کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں .....لان بہتر رہے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی.....''

ہم دونوں سرسبز لان کے ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے عقب میں خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میری نظریں نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس کے شفاف اور ستھرے چہرے پر مجھے ہلکا سا ارتعاش نظر آ رہا تھا۔ نرم و گداز لبوں پر موہوم سی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے اس کی گہری آنکھوں کے گوشوں میں نمی سی چمکتی نظر آئی۔ تب اس کے لب متحرک ہوئے۔

''نادر! آئی ایم سوری.....ایکسٹریملی سوری.....'' آواز میں رقت آمیز لرزش تھی۔

''واٹ.....؟'' میں چونکا۔ ''کس بات کی سوری بھئی؟''

''ہاں .....کم از کم مجھے تمہیں غلط نہیں سمجھنا چاہئے تھا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر تڑپی ہوں نادر!..... کہ دوستی میں اول تو کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں ہونی چاہئے۔'' وہ جیسے بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ ''اور پھر دوستی تو .....دوستی ہوتی ہے۔ کیونکہ دوستی سہنا بھی تو سکھاتی ہے۔''

میں اب کہیں جا کر اس کا ''مسئلہ'' سمجھا تھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود آئی۔

''اوکے .....کم آن.....نگی! تم تو یکدم سنجیدہ ہو گئیں۔ اگنور کر دو .....رات گئی، بات گئی۔ ویسے بائی دا وے، یہ کیا منافقت ہے بھئی؟'' میں نے آخر میں موضوع کا سنجیدہ پن ختم کرنے کی کوشش کی۔

''کیسی منافقت.....؟'' وہ کجراری آنکھیں پھیلا کر بولی اور میرا ان میں ڈوب ڈوب جانے کو دل چاہنے لگا۔

''تو اور کیا.....؟'' میں ٹھٹک کر بولا۔ ''یہ آخر دوستی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''دوستی .....یعنی.....'' وہ ذرا رُکی تو اس کے چہرے پر شفق پھوٹی تاہم اس نے ہولے سے اپنا مختصر جملہ پورا کیا۔ ''دوستی.....!''

''نہیں، تم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں؟'' میں نے معنی خیز انداز میں اصرار کیا۔

''مثلاً.....'' اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک اُبھری

''مثلاً.....یہ کہ جو تمہارے دلنشین اور گداز ہونٹوں پر آتے آتے رہ گیا۔''

''تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ .....میں دوستی کی جگہ کچھ اور کہنا چاہتی ہوں؟'' اس کی مسکراہٹ جتنی خفیف تھی، اتنی ہی دل موہ لینے والی بھی۔

''بھئی .....میرے دل نے محسوس کیا۔'' میں بولا۔

''آخر بتاؤ تو .....کیا کہنا چاہتی تھی میں؟'' جو اعلیٰ و ارفع لفظ نگینہ کہتے کہتے رہ گئی تھی، شاید وہ لفظ میرے ہونٹوں سے سننا چاہتی تھی لہٰذا میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''محبت .....دوستی .....یعنی محبت!'' میں جیسے اسے درسِ اُلفت پڑھانے لگا۔

تھوڑی دیر پہلے ضمیر کی چبھن سے کملایا ہوا اس کا اُداس چہرہ یہ لفظ سننے کے بعد ایک دم تازہ گلاب کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح کھل گیا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر انجانے جذبوں کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ شہابی گالوں پر شفق مزید گہری ہو گئی۔ اس نے ایک ادائے دل ربانہ کے ساتھ اپنی گھنیری زلفوں کو جھٹکا اور میں اس کی جانب ذرا جھک کر بولا۔ ''کیوں ..... یہی کہنا چاہتی تھیں نا تم؟''

''ہاں۔'' اس نے سر کو خفیف جنبش دیتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔ ''نادر!'' پھر وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

میں مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''کل تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اس کی تم سے معافی چاہتی ہوں ..... پلیز، مجھے اپنا بار بار کرنے دو۔'' وہ پھر سنجیدہ موضوع کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دوبارہ ٹوکنا چاہا۔ مگر اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ''دراصل پے در پے ہم پر ہونے والے گمنام قاتلانہ حملوں نے میری بھی عقل ایک لمحے کو ماؤف کر دی تھی پھر پپا اور انکل حیات نے تمہارے حوالے سے تمہاری ماں کے ماضی کے بارے میں جو باتیں مجھے بتائیں، اسے سن کر میں خود ایک لمحے کو چکرا گئی تھی اور یوں تمہیں بھی مجرم سمجھ بیٹھی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ پپا اور انکل حیات کی طرح میرا دل بھی اب تمہاری طرف سے صاف ہو گیا لیکن میرے ضمیر پر بوجھ سا بن گیا تھا کہ کم از کم مجھے کبیر احمد کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''کبیر احمد .....؟'' میں نے استفہامیہ لہجے میں قدرے اُلجھ کر کہا۔

''ہاں ..... یہ ساری کھچڑی کبیر احمد نے ہی تو بنائی تھی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''ہماری دوستی کے بعد وہ تم سے خار کھانے لگا تھا۔ تمہارے باپ اور ماں کے حوالے سے وہ کھٹک گیا تھا پھر اس نے تمہارا بیگ گراؤنڈ کھنگالا تو اسے ہمیں اور بالخصوص مجھے تم سے متنفر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا مگر اس کی یہ سازش بری طرح ناکام ہوئی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

مجھے کبیر احمد کی اس کینہ پروری پر دکھ ہوا تاہم میں کھلے دل سے مسکرا کر بولا۔ ''چلو چھوڑو اب۔ دوست کا بول بالا ..... دشمن کا منہ کالا۔ مجھے اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پپا انکل شاہ میر اور ان کے دوست انکل حیات کا آخر میری ماں کے ماضی کے حوالے سے ایسا کون سا پراسرار تعلق ہے کہ انہیں مجھ پر بھی شک ہوا؟ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ آخر تمہارے پپا اور انکل حیات نے میری ماں کے ماضی کے حوالے سے کیا باتیں تمہیں بتائیں؟''

میری بات پر وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔ ''نادر! ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو ..... پلیز، تم صرف وہ کرو جو پپا اور انکل حیات نے تم سے کہا ہے ..... لیکن پپا اور انکل کی طرح میرا بھی تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگوں کو پہلے حقیقت بتانے میں کون سی مصلحت مانع ہے؟'' میں قدرے اُلجھ کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بڑی رسان سے بولی۔

''بے فکر رہو نادر! بڑوں کے فیصلے میں بھی ایک بھید ہوتا ہے۔ جس میں چھوٹوں کی بھلائی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ کیا خبر ہمارے پہلے حقیقت کھولنے پر تم بدگمان ہو جاؤ ہم سے؟''

میں پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔

پھر میں اسی روز گاؤں روانہ ہو گیا۔

❄❄❄

گاؤں پہنچا تو ماموں حیدر گل ''گرین لاج'' میں موجود نہیں تھے۔ (گرین لاج ..... ہماری پناہ

رہائش گاہ کا نام تھا)

چاچا فضل بھی نہ تھے۔ البتہ ان کی بیوی صغراں موجود تھی۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ ماموں حیدر گل آج سویرے ہی ''ٹال'' کی طرف نکل گئے تھے۔ میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ ماموں کا انتظار بھی نہ ہو پا رہا تھا۔ جیپ بھی نہیں تھی۔ فضل چاچا بھی غائب تھے۔ صغراں البتہ قدرے پریشان ہو کر بولی۔

''بیٹا! خیریت تو ہے نا؟ ..... تم .....'' الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور میں ہونٹ سکیڑ کر لاج سے نکل آیا۔

ہمارا لکڑیوں کا ٹال، مال روڈ کے آخری سرے پر واقع تھا۔ میں لاج سے نکل کر باہر سرسبز قطعہ پر آ کر ذرا دُور شمال مغرب میں واقع گلیات کی طرف جانے والی سڑک کو گھورنے لگا جس کے دو رویہ بلند و بالا صنوبر اور چیڑ کے درخت ایستادہ تھے۔ وہاں سے شہر آنے جانے والا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے ساتھ کھڑا رہا، پھر میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر گلیات کی طرف سے آتی ہوئی ایک ہائی ایس کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد میں مال روڈ پر اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ کر اتر گیا۔ یہاں سے ہمارا ٹال زیادہ دور نہ تھا۔ تھوڑا ہی پیدل راستہ تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔

ماموں حیدر گل سے آج دوٹوک بات کرنے کے جوش میں مجھے اس بات کا بھی خیال نہ رہا تھا کہ میں پہلے ''گرین لاج'' سے فون کر کے پوچھ ہی لیتا کہ آیا وہ وہاں موجود بھی تھے یا نہیں؟

ذرا دیر بعد میں ٹال کے قریب پہنچ گیا۔ سڑک کی طرف کھلنے والے دفتر ٹائپ کمروں کے دو شیشے دار دروازے بند تھے۔ دیوار پر شٹر بھی نصب تھے۔ میں ایک دروازے کو پش کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کمرا خالی تھا، دوسری طرف کا حصہ کھلا پڑا تھا۔ میں وہاں آ گیا۔

اب میرے سامنے وسیع و عریض احاطہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف آرا مشین کا ہال نما کمرا تھا۔ باقی سارا میدان بھانت بھانت کی لکڑیوں اور بھاری بھرکم شہتیروں سے اٹا پڑا تھا۔ مذکورہ کمرے میں خاموشی تھی۔ ورنہ بجلی سے چلنے والے ووڈ کٹر کی گھنگھناتی ہوئی آواز تو ہر وقت ہی گونجتی رہتی تھی۔ غرض مجھے یہاں بھی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ کوئی ملازم، مزدور بھی نہ تھا۔ البتہ ایک خالی راکٹ ٹرک احاطے کے پرے دیوہیکل پوبی گیٹ کے باہر کھڑا نظر آ رہا تھا۔

''جی ..... سر جی! آپ .....'' اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ یہ مشتاق سیال تھا۔ ہمارا منیجر۔ بھاری بھرکم اور درمیانے قد کاٹھ کا مالک۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا اور خاصا منکسر المزاج تھا۔

''کیا بات ہے منیجر؟ ..... کام بند پڑا ہے؟'' میں نے پُرمتانت لہجے میں پوچھا۔

''بس جی کیا بتاؤں ..... مزدوروں نے تنخواہ بڑھانے کے لئے ہڑتال کر رکھی ہے۔ جتنا بھی دو، ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''آیئے ..... آپ اندر تشریف لائیں۔'' وہ آخر میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ماموں کدھر ہیں؟'' میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔

''صاحب آنے والے ہیں۔ آپ آیئے۔''

''گئے کہاں ہیں؟'' میں بدستور سنجیدگی سے بولا۔

''وہ جی ..... اعظم خان کے رئیس خانے تک گئے ہیں۔'' وہ جواباً بولا۔

''اعظم خان .....؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں یہ نام دہرایا۔

''آپ اعظم خان کو نہیں جانتے سر جی؟''

اس کے استعجاب پر مجھے یاد آ گیا۔ ''یہ وہی تو نہیں، جسے سرکاری مال خانے سے کروڑوں روپوں کی خورد برد پر معطل کر دیا تھا؟''

میری بات پر منیجر مشتاق سیال کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''چھوڑیں سر جی! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔''

مجھے اس گھسے پٹے اور بے محل مقولے پر تلخی محسوس ہوئی جس کا میں اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''منیجر!..... ملک و قوم کی دولت پر غاصبانہ طریقے سے ہاتھ صاف کرنے والوں کو تم بڑے لوگ کہتے ہو؟''

وہ میرے طنز کی کاٹ پر ذرا بوکھلا سا گیا۔

''نہیں سر جی! مم..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے ..... اب تو اعظم صاحب پر یہ کیس بھی جھوٹا ثابت ہو چکا ہے اور وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر.....''

''مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں کی وہاں سے کب تک آمد متوقع ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر پُرمتانت لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کا اعظم خان کو ''صاحب'' کہنا بھی برا لگا تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا جی میں ..... ظاہر ہے، وہ بڑے آدمی سے ملنے.....'' اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہو رہا۔ میں اسے گھورنے لگا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... ماموں سے اسی وقت موبائل پر رابطہ کرو۔''

''جی سر!..... ابھی کرتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا اور جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ ماموں کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ پھر کان سے لگا لیا۔ ''سر جی! میرا خیال ہے انہوں نے موبائل اپنا آف کر رکھا ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے طویل ہنکاری خارج کی، پھر اس سے پوچھا۔ ''انہیں یہاں سے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''میرا خیال ہے جی، بس آپ کے آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ نکل کر گئے ہیں۔''

''بتایا نہیں کہ کب تک واپسی ہو گی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کہہ تو رہے تھے کہ گھنٹہ ڈیڑھ لگ ہی جائے گا۔'' وہ گومگو سے لہجے میں بولا۔

''سمجھ نہیں آتا آخر ماموں نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا ہے؟'' میں ہولے سے بڑبڑایا۔

''بس جی..... بڑے آدمی سے ملنے گئے ہیں۔ ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتے ہوں گے صاحب۔'' وہ اپنی عادت سے مجبور لگتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے اپنی غلطی محسوس کر کے دوبارہ اپنی بات دہرانے لگا۔ ''مم ..... میرا مطلب ہے جی ..... چھوٹے آدمی سے ملنے گئے ہیں..... ڈیڑھ.....''

''بکواس بند کرو۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''تم پر اعظم خان جیسا چور اچکا کسی بھوت کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ آخر تم کس وجہ سے اس کے لئے بڑا آدمی، بڑا آدمی کی گردان لگائے ہوئے ہو؟''

میرے گھرکنے پر وہ شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔

''وہ سیدھا ادھر ہی آئیں گے نا؟'' میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈال کر پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی، سر جی!''

''کمال ہے ..... یہاں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے، کام بند پڑا ہے۔ اور ماموں کو کوئی واہ نہیں۔ سمجھ نہیں آتا آخر وہ اعظم خان کے پاس کیا کرنے گئے ہیں؟'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو خود ہی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

اچانک ٹال کے دیوہیکل چوبی گیٹ سے ایک سنگل ڈور پجیرو اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ں نے قدرے چونک کر جیپ کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ایک بیل جیسا فربہ اندام ص سوار تھا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھ رکھا تھا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین کے عقب میں اندر عقبی بت پر مجھے چار عدد مسلح سواروں کی جھلک دکھائی دے گئی۔

''ارے ..... ملک صاحب بھی تشریف لے آئے۔ بڑے آدمی ہیں جی۔'' منیجر کے منہ سے بے تیار مجھے چڑا دینے والا لفظ کسی تکیہ کلام کی طرح برآمد ہوا تھا۔

جیپ عین ہمارے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گول مٹول سا منیجر پکے ہوئے شلجم کی طرح ھکتا ہوا جیپ پر جا گرا۔ مجھے اس کا یہ خوش آمدانہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ بیل جیسا ٹھسے دار شخص نیچے اُترا تو اس سے پہلے ہی اس کے اسلحہ بدست چاروں محافظ کار پرداز کدکڑے مار کر نیچے اُتر چکے تھے۔

''آیئے، آیئے ملک صاحب!..... زہے نصیب..... اندر تشریف لائیں۔'' منیجر مشتاق سیال دیا اس کے قدموں پر کسی کتے کی طرح لوٹتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں بولا۔

بیل جیسے خاکستری رنگت والے لحیم شحیم شخص نے چشمہ اتار کر بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ر اس کی میری جانب گھورتی نظروں کا مطلب فوری بھانپتے ہوئے باچھیں پھیلا کر اس سے بولا۔

''ملک صاحب! یہ اپنے چھوٹے صاحب ہیں ..... نادر علی خان۔''

''ہوں.....'' اس نے ایک گمبھیر اور پراسرار ہنکاری خارج کی، پھر وہیں کھڑے کھڑے منیجر سے مرکھراتی آواز میں بولا۔ ''کدھر گئے ہیں ..... آپڑیں حیدر گل صاحب؟''

''وہ جی ..... صاحب، اعظم خان صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ یں تو میں آپ کو بٹھا دوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ ملنا بھی ضروری ہے۔ انتظار کر ہی لیتے ہیں۔'' وہ پُرنخوت لہجے میں اطراف پر نظر لتے ہوئے بولا اور پھر منیجر کے ساتھ چلتا ہوا آفس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس کرخت صورت ص سے ملنے کی کوشش نہیں کی مگر جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو عین میرے سامنے رک گیا۔ ا کے بعد میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولا۔

''تم..... حیدر گل کے بھانجے ہو نا؟''

میں نے اس سے مصافحہ کیا اور محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے اپنے کاندھوں پر رے، بغیر گردن کے سر کو گینڈے کی طرح بہ مشکل موڑ کر اپنے چاروں مسلح محافظوں کی طرف دیکھا۔ راز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے چاروں خبیث صورت کارندوں سے کہہ رہا ہو، پہچان لیا اسے؟

میں نے دیکھا، ان چاروں نے بیک وقت میرے چہرے پر اپنی پراسرار نظریں مرکوز کرتے ہوئے لے سے اپنے سر ہلا دیئے۔ مجھے ان کا یہ پراسرار انداز جانے کیوں بہت ہی عجیب لگا تھا۔ پھر وہ آگے ھ گئے تھے۔ منیجر مشتاق ان کو لے کر ماموں حیدر گل کے شاہانہ آفس میں داخل ہو گیا تھا۔ میں خاموشی ے ساتھ چلتا ہوا ماموں کے کمرے میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آ کر ایک کرسی پر براجمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا۔ یہ منیجر کا کمرا تھا۔ دونوں کمرے آپس میں متصل تھے۔ درمیان میں چھ بائی چار کی چوکھٹ کھڑکی تھی۔ یہاں اس بیل جیسے شخص نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اوئے کاکے! اندر آ جا ..... ہم تو تیرے ماموں کے پرانے یار بیلی ہیں ..... آ شاباشے۔'' اس کا انداز بے تکلفانہ تھا۔ مگر لہجے میں عجیب سا اکھڑ پن تھا۔ اس کی بات نہ ماننا غیر اخلا ہی ہوتا۔ چنانچہ میں طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوم کر ماموں والے کمرے میں آ گیا۔ منیجر نے ماموں کی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کو کہا۔ یوں بھی میں جب آتا، ماموں کی غیر موجودگی میں چیئر پر بیٹھا کرتا تھا اس لئے میں وہیں براجمان ہو گیا۔

''کمال ہے ..... آپ ماموں کے اتنے پرانے دوست ہیں لیکن میں آج پہلی بار آپ کو دیکھ ہوں؟'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہمکلام ہونا ضروری سمجھا۔

''وہ جی ..... یہ ..... اپنے ملک سردار خان صاحب ہیں، بڑے آدمی ہیں جی۔ ان کی او ذرا کم ہی آوک جاوک ہوتی ہے نا۔'' منیجر نے فوراً اپنی پاچھیں کانوں کی لوؤں تک پھیلا کے لقمہ ضروری سمجھا اور میں نے اس کی اس مداخلت بے جا پر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو اس یکدم گھبرا کر اپنی گردن کچھوے کی طرح شانوں میں دبکا لی۔ مگر باز وہ پھر بھی نہ آیا۔ منمنا کر ہولے بولا۔ ''بڑے آدمی ہیں جی.....''

''یہ منیجر بڑا دلچسپ آدمی ہے۔'' ملک سردار خان نامی وہ شخص غیر تاثرانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''بس ذرا بڑبولا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے پسند ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مکلف کُرتے کی سائیڈ پاکٹ سے بینسن اینڈ ہیجز کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے ذرا اُبھار کر میری طرف کیا۔

''شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' میں نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے خاموشی سے اپنے لئے سگریٹ نکال کر اپنے بدہیئت سیاہ ہونٹوں میں دابا اور بیش قیمت لائٹر سے اسے سلگانے کے بعد منیجر سے بولا۔

''کیا بات ہے مشتاق میاں! آج مزدوروں کی چہل پہل نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ جی ..... ملک صاحب! مزدوروں نے ہڑتال جو کر رکھی ہے۔''

''او ..... اچھا ..... کر لینے دو یہ شوق بھی پورا۔ پیٹ کی آگ بڑھے گی تو خود ہی آٹے دال بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ کیوں جی، نادر میاں .....؟'' اس نے تضحیک آمیز انداز میں بے محل تبصرہ اور آخر میں مجھ سے تائید چاہی لیکن میں خاموش رہا۔

''مگر یہ ہڑتالی ہیں کدھر؟ نظر تو نہیں آ رہے۔ نہ اندر ..... نہ باہر۔'' میری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے دوبارہ منیجر سے پوچھا۔

''وہ لوگ جی ..... اپنے بیوی بچوں کو لینے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی آ کر مجمع لگائیں گے۔'' منیجر نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر سے بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے اور شور مچانے کی آوازیں اُبھریں ..... دھواں دھار نعروں اور شور شرابے نے مجھے بے اختیار ریوالونگ چیئر سے اُٹھنے پر مجبور کر دیا مگر ملک سردار سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہتے ہوئے بولا۔

''بیٹھے رہو کاکے! انہیں اہمیت دو گے تو یہ اور منہ کو آئیں گے۔ ان لوگوں کا کام ہی مالکان کو بلیک میل کرنا ہوتا ہے۔''

اس کے لہجے میں ان معصوم اور غریب محنت کشوں کے لئے تضحیک آمیز حقارت کو محسوس کر کے میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ملک سردار علی خان! سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں کاکا نہیں ہوں، میرا نام نادر علی خان ہے۔ دوسرا یہ کہ اس ٹال کا مالک میں خود ہوں اور یہاں کے مزدوروں کے مسائل سے واقف ہونا میرا اولین فرض ہے۔ لہٰذا آپ یہاں آرام سے بیٹھ کر اپنے دوست حیدر گل کا انتظار کریں اور بس۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو مجھے منیجر مشتاق سیال کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''بڑے آدمی ہیں جی۔''

''محنت کشوں کے پسینے کا حساب دو ..... حساب دو۔''

''غریب مزدوروں کے خون پسینے پر تجوریاں بھرنے والو! ہمارا حساب دو۔''

''تپتی دھوپ میں ہاتھوں سے کمائی کرنے والے غریب محنت کشوں کو روٹی کے نام پر بلیک میل کرنے والو! اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں سے باہر نکلو، ہمارا احساس کرو، احساس کرو۔''

ویران سے ایک مکان میں
ایک بیوہ بیٹھی روتی ہے
اس کا بچہ یہ پوچھ بیٹھا ہے
عید بنگلوں میں کیوں ہوتی ہے

میرے کانوں میں پڑنے والے ان دردانگیز نعروں نے میرا جگر چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فطری طور پر ایک حساس طبع انسان تھا۔ میں گیٹ کے باہر آیا تو یکدم جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ ان محنت کشوں کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ تھی۔ ان کا اوپری بدن برہنہ، نیچے بوسیدہ میلی چیکٹ شلواریں تھیں۔ پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے مدقوق جسموں والے ان مزدوروں کے مفلوک الحال چہروں سے عسرت اور تنگ دستی پسینے کی صورت ٹپک رہی تھی۔ ان لوگوں کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے یکدم خاموش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مجھے حیدر گل کے بھانجے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ سب سے آگے میری عمر کا نوجوان تھا جو شاید ان کا لیڈر تھا۔ خاصا تنومند تھا۔ میرا دیکھا بھالا تھا۔ مردان شاہ نام تھا اس کا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر ان سب پر ڈالی پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے؟''

مردان شاہ میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

''چھوٹے صاحب! ہمیں بڑے صاحب سے بات کرنی ہے۔''

بڑے صاحب سے اس کی مراد ماموں حیدر گل ہی تھے۔ تاہم میں نے کہا۔

''وہ یہاں موجود نہیں ہیں ..... تم لوگوں کا جو مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ۔''

''چھوٹے صاحب! ہم صرف مالک سے ہی بات کریں گے۔'' وہ اٹل لہجے میں جواباً بولا۔

''تم مجھے نہیں جانتے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ مالک کے بھانجے ہیں جی ..... لیکن.....''

میں نے اچانک اس کی بات کاٹی۔

''بس اتنا ہی جانتے ہو مجھے.....؟''

اس پر وہ ایک ذرا چونکتی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس ٹال کا اصل مالک میں ہوں۔''

''جی ہاں چھوٹے صاحب! یہ تو ہم جانتے ہیں۔ مگر آپ تو ہر وقت ادھر نہیں ہوتے۔ ہم صرف مالک سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مالک تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں جو مذاکرات کروں گا، وہ حتمی ہوں گے۔'' میں نے اس بار ٹھوس لہجے میں کہا تو مردان شاہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''دیکھئے چھوٹے مالک.....''

''میرا نام صرف نادر علی خان ہے۔ مالک والی ذات کوئی اور ہے۔'' میں نے دوبارہ اس کی بات کاٹ کر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

''جی.....نادر علی صاحب! بات یہ ہے کہ ہماری ہڑتال کو آج ساتواں روز ہے مگر بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) نے ہم سے باہر نکل کر بات تک کرنا گوارا نہیں کیا ہے۔''

اس نے بتایا اور مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ گویا سات روز سے کام بند تھا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ غریب مزدور تو روز کمانے اور روز کھانے والے لوگ تھے۔

''تم لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتاؤ مجھے۔''

وہ بتانے لگا۔ ''دن بہ دن بڑھتی ہوئی مہنگائی کے تناسب سے ہماری تنخواہیں بہت کم ہیں۔ ہم نے مالک سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ہماری تنخواہیں تو بڑھا دیں لیکن روز کی مزدوری کو ''بھتا مزدوری'' کا نام دے کر بند کر دیا۔ آپ خود انصاف کریں کہ ہم صبح چھ بجے یہاں بغیر ناشتہ کئے آتے ہیں۔ بھاری شہتیر اٹھاتے ہیں، ٹرکوں پر لادتے ہیں، بجلی اکثر جاتی رہتی ہے تو ہم ان ہاتھوں سے خود آرا مشین چلاتے ہیں۔ رات نو بجے تک۔ کیا ہمیں یہاں دو وقت کی روٹی بھی نہ ملے؟ وہ اگر گھر کھانے جائیں تو مالک اسے وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔ آپ ہی بتائیں، ہم کیا کریں؟''

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام مزدوروں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر میرے سامنے کر دیئے۔

میں نے ان کی ہتھیلیوں کو دیکھا تو احساسِ دروں کی ایک ٹیس سی اُٹھی۔ ان بے چاروں کی ہتھیلیاں سرخ اور پھٹی پھٹی سی ہو رہی تھیں۔ چھالے پرانے ہو کر سیاہ پھوڑوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔

''تم لوگوں کی اس وقت ماہانہ تنخواہ کتنی ہے؟'' میں نے ایک ہنکاری لے کر مردان شاہ سے پوچھا تو وہ بولا۔

''پہلے دو ہزار تھی۔ پھر صرف دو سو روپے بڑھا کر ہماری روز کی دو وقت کی روٹی اور چائے کی مزدوری میں ملنے والے پچھتر روپے فی کس بند کر دیئے گئے۔ اس طرح تو ہمیں اُلٹا نقصان ہو گیا۔ یہ تو ہمارا حق غصب کرنے والی بات ہو گئی۔''

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک مجمع میں ایک مزدور سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے لیڈر کے منہ سے ناانصافی کی کتھا سننے پر جوش سے مغلوب ہو کر بہ آواز نعرہ لگا دیا۔

''ہمارے پسینے کا حساب دو.....حساب دو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مزدوروں کی کمائی سے کروڑوں کمانے والو! ہمارے ایک ایک روپے کا حساب دو۔''

میں نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموشی اختیار کرنے کو کہا تو ان کے مزدور لیڈر مردان شاہ نے بھی ہاتھ کے اشارے سے مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔

اس دوران منیجر مشتاق بھی وہاں آ گیا۔ پھر میرے قریب آ کر عادت سے مجبور ہو کر بڑبڑایا۔

''چھوٹے لوگ ہیں.....جی۔''

میں نے گردن موڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔ ''مم.....میرا مطلب ہے.....سب بڑے لوگ ہیں جی۔'' پھر میری بدستور اپنی جانب گھورتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے میری مرضی کے مطابق جملہ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے منمنا کر دوبارہ بولا۔

''نکلتے ہیں جی۔''

اس کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تو اس بار مسمسی سی صورت بنا کر باریک آواز میں بولا۔ ''ابھی جچے ہی ں جی!''

''منیجر!.....'' میں زور سے دہاڑا۔ ''تمہاری دماغی حالت درست نہیں۔ تم اندر جاؤ۔''

وہ ایسی صورت بنا کر واپس جانے کے لئے پلٹنے لگا جیسے اسے قبض کی شکایت ہو گئی ہو۔ مجھے اس کی ت پر ہنسی تو آئی مگر یہ موقع نہ تھا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر دوبارہ مجمع پر ڈالی، پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب مجھے یہ بتاؤ ماموں حیدر گل پر تم لوگوں کے مطالبے کا کیا اثر ہوا ہے؟''

''وہ تو جی ہم سے بات کرنا ہی گوارا نہیں کر رہے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''ہم چھ روز تک ادھر ہی کے پیاسے دھرنا مارے گرمی اور دھوپ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ آج مجبور ہو کر ہم اپنے بیوی بچے بھی آئے ہیں۔ مالک ہم سے یہی کہتا ہے کہ پہلے کام شروع کرو، مذاکرات بعد میں ہوں گے۔ یہ تو ہم بوں کو ٹالنے والی بات ہوئی نا جی!''

میں اس کی بات پر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بات واضح تھی۔ اگر مردان کے کہنے کے مطابق واقعی ں حیدر گل نے ان کے ساتھ ناانصافی کی تھی اور تنخواہ کے محض دو سو روپے بڑھا کر ان کی روز کی ئے روٹی کے جو ان کا بہرحال حق تھا، پچھتر روپے دینا بند کر دیئے تھے تو اس طرح ماموں نے ان کا حق مارا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔

مجھے ٹال سے ہونے والی ماہانہ آمدنی کا اندازہ تھا، جو ایک لاکھ اسی ہزار سے دو لاکھ دس ہزار کے بان تھی۔ خرچ اخراجات اور مزدوروں کی تنخواہ کی مد میں کٹ کٹا کر یہ آمدنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے ب قریب بنتی تھی۔ یہ سارا حساب کتاب کرتے ہی میں مردان شاہ سے ذرا بلند آواز میں بولا تاکہ دیگر بھی میرے فیصلے سے آگاہ ہو جائیں۔

''ٹھیک ہے.....تم لوگ اپنے بیوی بچوں کو گھر چھوڑ آؤ اور آج سے کام شروع کر دو۔ میں تم کے روز کے نہ صرف پچھتر روپے بحال کرتا ہوں بلکہ اسے بڑھا کر پورے سو روپے کرتا ہوں اور میں بھی مزید تین سو روپے کا اضافہ کرتا ہوں۔ اس طرح وہ ڈھائی ہزار روپے ہو جائے گی۔ کیا میرا یہ فیصلہ قبول ہے؟''

میرے فیصلے پر جیسے ان لوگوں کے بدحال چہروں پر زندگی کی رونق دوڑ گئی اور انہوں نے خوشی کے ''چھوٹے مالک زندہ باد'' کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ مردان شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مجمع کو خاموش کروایا۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب بھی عدم اطمینان کی سی کیفیت طاری تھی
''صاحب جی! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے دُکھوں اور ہماری پریشانیوں کا احسا
کیا۔ لیکن کیا یہ فیصلہ بڑے مالک قبول کریں گے؟''

مجھے اس کی بے اطمینانی کی وجہ معلوم ہو گئی۔ لہٰذا میں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ازراہِ تشفی ان
بولا۔ ''اس ٹال کا اصل مالک میں ہوں ....اور میرے ماموں کو میری بات ماننا پڑے گی۔ تم لو
بے فکر ہو کر آج سے کام شروع کر دو۔''

یہ کہہ کر میں واپس آفس کی طرف لوٹ گیا۔ وہ لوگ خوشی سے میرے حق میں نعرے بلند کر
ہوئے لوٹ گئے۔ منیجر گھبرائے ہوئے اُلو کی طرح آفس کے باہر ہی کھڑا تھا۔

اس نے شاید وہاں کھڑے ہو کر میرے فیصلے کی روداد، مذاکرات سمیت سن لی تھی۔ وہ ڈرتے ڈر
مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سس.........سر جی!......... یہ......... یہ آپ نے کیا کر دیا؟''

''تم اپنی اوقات میں رہو منیجر! سمجھے.........؟'' میں نے اسے گھور کر جھڑکا اور ماموں کے کمر
میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔

ملک سردار خان ماموں والے کمرے میں ہی بیٹھا تھا اور شیشے کے چوکھٹے سے بہ مشکل اپنی گر
موڑے میری طرف عجیب نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

ذرا دیر بعد تمام مزدوروں نے آ کر کام شروع کر دیا۔ ان لوگوں کے آنے کے پندرہ بیس منٹ
ہی ماموں حیدر گل بھی لوٹ آئے۔ ان کی سفید رنگ کی پوٹھوہاری جیپ گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔
کے ہمراہ ایک آدمی بھی تھا۔ وہ نیچے اُترے اور دائیں بائیں مزدوروں کو کام میں مگن دیکھ کر چونک اٹھ
پھر عجیب انداز میں اپنا سر جھٹک کر اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔ میں بھی کرسی سے اٹھ کر باہر آیا۔
دیکھ کر اس کے قدم جیسے یکدم زمین میں گڑ گئے۔

میں نے اخلاقاً مگر بے تاثر لہجے میں انہیں سلام کیا۔

''ارے نادر بیٹا! تم یہاں کیسے؟''

''کیوں ماموں؟.........کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟'' میں نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' جواباً وہ بھی سنجیدہ بلکہ خشک لہجے میں بولے۔ ''بہرحال.........اندر آ
یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملک سردار خان نے کھڑے ہو کر ماموں سے معانقہ کیا۔
کے بعد وہ اپنی بھاری بھر کم چیئر پر براجمان ہو گئے۔ میں بھی ملک سردار خان کے برابر والی کرسی پر
گیا۔ منیجر پاس ہی آن کھڑا ہوا۔ وہ بڑی بے تابی سے ماموں کے بولنے، بہ الفاظ دیگر ان کے کچھ کہ
کا منتظر تھا اور ہوا بھی یہی۔

''منیجر! کیا ان مزدوروں کے کس بل نکل گئے؟'' ماموں حیدر گل کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ
جو مجھے حد درجے ناگوار گزری۔ مگر میں نے ابھی دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی تھی۔

''وہ جی ....کس بل تو ہمارے نکل گئے۔'' وہ جیسے پھٹ پڑا۔

''کام کی بات کرو۔'' ماموں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''سر جی! آپ کے بھانجے صاحب، نادر میاں نے مزدوروں کے سارے مطالبے مان لئے ہیں
ان کی بھتا مزدوری کے علاوہ ماہانہ تنخواہیں بھی بڑھا دی ہیں۔'' اس کے لہجے میں میرے لئے شکایت

کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''ایں......... یہ کیا.........؟'' ماموں یکدم جیسے بدک گئے اور میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوئے۔
''یہ منیجر کیا کہہ رہا ہے نادر بیٹے! کیا تم نے.........؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ماموں!'' میں نے مستحکم لہجے میں ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نادر بیٹے! یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی؟ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کے دماغ خراب ہو جائیں
گے اور آئے روز اسی طرح بلیک میل کر کے اپنے مطالبے منواتے رہیں گے۔''

میرے بولنے سے پہلے ہی منیجر بول پڑا۔ ''سر جی! میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی نادر میاں کو
کہ اس طرح یہ ہر روز ہمارے منہ کو آنے لگیں گے۔ آخر چھوٹے لوگ جو ہوئے۔'' وہ اپنے تکیۂ کلام کے
ذریعے دل کی بھڑاس نکالنے پر تلا بیٹھا تھا۔

''تم اپنی چونچ ذرا دیر کے لئے بند رکھو۔'' ماموں حیدر گل نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ پھر میری
طرف دیکھ کر بولے۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''جواب تو آج تک مجھے بھی میری باتوں کا نہیں ملا ہے ماموں!'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے
اپنے کاٹ دار لہجے میں دیرینہ تپش سموتے ہوئے ماموں سے کہا۔

''یہ آج تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟'' ماموں نے قدرے سخت لہجے میں مجھ سے کہا تو
میں ان سے مرعوب ہوئے بغیر ملک سردار خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ماموں! پہلے آپ ان سے فارغ ہو لیں، پھر بات ہو گی۔''

میری بات پر ماموں نے ایک نظر ملک سردار خان کی طرف دیکھا پھر بہ غور میرے چہرے کے
تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی نادر!.........گھر جاؤ۔ وہیں تم سے بات ہو گی۔''

''نہیں ماموں! مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں اسی لئے پنڈی سے صبح سویرے ہی
گاؤں چلا آیا تھا۔ مگر آپ گھر سے جا چکے تھے۔ یہاں آ کر میں گھنٹے بھر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''
میں نے بھی چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے.........اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، تم گھر جاؤ.........میں.........''

''ماموں! آپ پہلے ملک صاحب کو فارغ کر دیں۔'' میں نے ان کی بات کاٹی تو ان کے چہرے پر
ناگواری کے تاثرات ظاہر ہونے لگے۔ پھر ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ملک سردار خان نے اپنی جگہ
سے اٹھتے ہوئے ماموں سے کہا۔

''حیدر!.........میں چلتا ہوں۔ تم کسی وقت آ کر مجھ سے مل لینا۔'' یہ کہہ کر وہ ماموں کا جواب سنے
بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔

''نادر!.........یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں چھوٹے بڑے کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ شہر کی پڑھائی نے
تمہارا اتنا ہی دماغ خراب کر دیا ہے؟'' وہ درشتی سے بولے۔

''ماموں! شہر کی پڑھائی نے اب میرا دماغ درست کیا ہے۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ''مجھے
معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے آج تک مجھے میرے سوالوں کے جواب سے کیوں محروم کر رکھا تھا.........
اسی لئے نا کہ آپ کی لاڈلی بہن کا مکروہ جرم مجھ سے پوشیدہ رہے؟'' میرے لہجے میں نفرت کی زہریلی
کڑواہٹ اُتر آئی اور ماموں کا منہ پہلے تو حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بل گرج کر بولے۔

"نادر.....!"

"آہستہ بولیں ماموں! کہیں ہمارے خاندان کی یہ لرزہ خیز کتھا کوٹھوں تک نہ جا پہنچے۔" میں بدستور تلخی سے کہا۔ ماموں کے چہرے پر غصے کا ارتعاش لرزاں تھا۔

پھر وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے قریب آ کر میرا بازو پکڑا۔

"آؤ میرے ساتھ ..... گھر چل کر تم سے بات کرتا ہوں۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور ان کے ساتھ گھر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

❋❋❋

"ہاں ..... بولو، کیا کہنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟" گرین لاج پہنچنے کے بعد ماموں حیدر گل میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

"ماموں!..... میرے باپ کو تمہاری بہن نے کیوں قتل کیا تھا؟"

میرا خیال تھا کہ میرے اس سنسنی خیز انکشاف پر انہیں حیرت و پریشانی کا زبردست جھٹکا لگے گا! ان کے چہرے پر ہلکی سی چونکنے کی علامت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ میرے منہ سے ماں کی بجائے "اپنی بہن" کے الفاظ پر ماموں نے مجھ سے کہا۔

"وہ میری بہن ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہے۔ کیا تم اتنے ہی بے حس ہو چکے ہو کہ اپنی مظلوم ماں بھی نہیں کہہ سکتے؟"

"مظلوم ..... ہونہہ.....!" میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ "ماموں! مظلوم میرا باپ قادر خان تھا، جسے اس ناگن....."

"نادر.....!" ماموں پھٹ پڑے اور مارے طیش کے مجھے تھپڑ مارنے کے لئے انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ مگر وہ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ میرے اندر بھی غم و غصے کی ایک شدید لہر اُٹھی تھی۔

"ماموں!..... کیا میرا سچ اتنا ہی کڑوا ہے کہ آج آپ کا ہاتھ بھی مجھ پر اٹھنے لگا؟ لیکن آپ کس کے منہ پر یہ تھپڑ ماریں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ سچ کو جتنا دبایا جاتا ہے، وہ اتنا ہی شدت سے اُبھرتا ہے۔" میں فرطِ جوش سے پھٹ پڑا۔

"مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بچپن سے لے کر اب تک مجھے میرے سوالوں کے جواب کیوں محروم رکھا ..... میں پوچھتا ہوں ماموں! کہ تمہاری بہن نے میرے باپ قادر خان کا کیوں کیا تھا؟"

"نادر!..... تم اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ..... ایسا نہ ہو، میرا ہاتھ واقعی اٹھ جائے۔" ماموں نے سرخ چہرے کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ان کا لہجہ غصے کی شدت کے باعث لرز رہا تھا۔

میں نے ایک گہری ہمکاری بھری اور چند لمحے ماموں کے چہرے کو تکتا رہا۔ اگرچہ مجھے پہلے ہی اس بات کا پورا یقین تھا کہ ماموں میرے اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے پائیں گے کیونکہ آج تک ہی ہوتا چلا آیا تھا۔ وہ مجھے ٹالتے چلے آئے تھے مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس خونی راز سے اٹھا کر رہوں گا۔ کیونکہ اب معاملہ میرے باپ کے قتل کا تھا اور قاتل بھی کون ..... یعنی میری اپنی ماں!

"ماموں! مجھے گاڑی کی چابی دو۔" چند ثانیوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد میں نے جیسے

چابی مانگی۔ ماموں نے خاموشی کے ساتھ چابیاں مجھے تھما دیں۔ میں جانے لگا تو عقب سے ان کی بھیگتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

میں ایک پل کے لئے رکا اور گردن موڑ کر عقب میں ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اپنے سوال کا جواب لینے۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے نکل گیا۔

میں جیپ میں آ کر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ صنوبر اور چیڑ کے لانبے لانبے پیڑوں سے گھری بل کھاتی سڑک پر میں جیپ خطرناک رفتار کے ساتھ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظر ونڈ اسکرین کے پار چکنی سڑک پر مرکوز تھی اور دل و دماغ میں زناٹے دار ہواؤں کی شائیں شائیں ہو رہی تھی۔

میرے اس سوال پر کہ میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ ماموں حیدر گل کا جواب دینے کی بجائے آپے سے باہر ہونا میرے اس شبہے کو یقینی بنا رہا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ چنانچہ اب مجھے اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ ماموں حیدر گل بھی میرے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ یقیناً وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے ہوں گے کہ میری ماں یعنی اپنی بہن کے اس بھیانک اور ناقابل معافی جرم کا میرے سامنے اقرار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ اب میں جیل جا کر خود اپنی ماں سے ان سوالوں کا جواب لینا چاہتا تھا۔

نصف گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میں نے جیل کی عمارت کے سامنے جیپ روکی اور اندر داخل ہو گیا۔ یہاں لیڈیز عملہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سطح کی وومن جیل تھی، جس کے ساتھ Juvenile Crime کی جیل بھی منسلک تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ اظہر اقبال مجھے ماموں حیدر گل کے بھانجے اور قیدی عورت کے بیٹے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس نے فوراً میری ماں سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا۔

دو پولیس والے مجھے ایک تنگ و تاریک اور سیلن زدہ سی بیرک کے سلاخ دار دروازے کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ سامنے وہ عورت کھڑی تھی جو میری ماں تھی۔

وہ اب تک اُنیس سال کی سزا کاٹ چکی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے پیٹے میں تھی۔ میری محدود معلومات کے مطابق اسے اکیس سال کی عمر میں جیل ہوئی تھی اور اس چہار دیواری کے اندر اس عورت نے مجھے ننگے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ میں کئی سال بعد اس سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت وہ یک بھرپور جوان عورت تھی۔ اگرچہ اب بھی اس کی صحت میں کچھ خاص فرق نہیں نظر آتا تھا۔ تاہم عمر رفتہ کے روز و شب، جیل جیسی گھٹن اور پُر مصائب فضا میں بتانے کے بعد اس کے سرخ و سپید چہرے کی پہلے والی رونق ماند سی پڑنے لگی تھی۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار بھی جھلکنے لگے تھے۔ لیکن اس کی بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں آج بھی وہی ایک عجیب سی خوں ناک چمک محسوس کر رہا تھا، جو میں اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور پھر جیسے اس کا پژمردہ چہرہ کھل اُٹھا۔ ممتا بھرے جذبات کی یک مخصوص سرخی اس کے چہرے پر امڈ آئی اور وہ بے اختیار سلاخوں کے قریب آ گئی۔

"نادر!..... میرے بچے! میرے جگر کے ٹکڑے!..... تُو آ گیا؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے سلاخوں کے پیچھے سے اپنا ایک کپکپاتا ہوا ہاتھ میرے سر پر پھیرنے کے لئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر نکالا تو میں ایک نفرت انگیز نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں کے چہرے پر ایکا ایکی تاریکی اترتی چلی گئی۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ آنکھوں میں درد کی رمق سی اُبھر آئی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا پھر دانت کچکچا کر لفظوں کو چبا چبا کر اس سے مخاطب ہوا۔

''جس طرح میں تیرے جگر کا ٹکڑا تھا ماں! اسی طرح میں اپنے باپ قادر خان کا بھی لخت جگر تھا۔ پھر..... پھر تُو نے اسے قتل کر کے، مجھے باپ کے سائے سے کیوں محروم کر دیا؟..... میں تجھ سے یہ سوال پوچھنے آیا ہوں ماں!..... مجھے جواب دے۔ ابھی..... اور اسی وقت۔''

میں جیسے پھٹ پڑا۔ ماں سناٹے میں آ گئی۔ اس کا رنگ گہرا ہو گیا اور چہرے پر سیاہی کے ساتھ زردی بھی نمودار ہو گئی۔ وہ ایک سراسیمگی کی سی کیفیت میں مجھے تکتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گویا غم کا سمندر موجزن تھا۔ چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر اس کے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا۔

''ی..... لی..... یہ..... یہ تُو کیا..... کہہ رہا ہے بیٹا؟''

''مجھے بیٹا مت کہہ۔ صرف میرے سوال کا جواب دے..... کہ تُو نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟''

میں نے انتہائی سرد مہری سے اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو گھور کر کہا مگر وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک ٹک مجھے تکنے لگی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ شدید تذبذب کا شکار ہے۔ مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے ان کہے سے الفاظ اس کے لرزیدہ لبوں پر دم توڑ رہے ہوں۔ تب پھر اس نے اپنی آنکھیں موند کر ایک گہری سانس لی اور یاس زدہ لہجے میں بولی۔

''میں..... تمہارے اس سوال کا جواب ابھی نہیں دے سکتی۔''

''کیوں؟..... کیا میرے سامنے اپنے بھیانک جرم کا اقرار کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی؟'' میرے لہجے میں طنز کی بڑی زہریلی کاٹ تھی۔ ''ماں! تُو نے اور ماموں حیدر گل نے کیا سمجھ رکھا تھا مجھے کبھی اس کریہہ حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا؟''

''نادر!'' ماں غضب ناک آواز میں چلاّ اُٹھی۔

''کیوں ماں!..... میرا سچ اتنا ہی کڑوا لگا تمہیں؟'' میں نے دوبارہ کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''تم..... تم..... میری نظروں سے دور ہو جاؤ..... جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ چلاّئی اور میرے اندر اس کے خلاف ایک نفرت انگیز لہر اُبھری۔

لہٰذا میں اسی لہجے میں بولا۔ ''تمہارے پاس اور کہنے کے لئے رہا بھی کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا ماں! اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اور ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کترا رہے ہو لیکن مجھے بہت جلد اصل حقیقت کا علم ہونے والا ہے۔'' میں یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹخ کر ماں کو حیران و پریشان چھوڑے، وہاں سے چلا آیا۔

میں واپس گرین لاج میں آیا۔ ماموں اندر موجود تھے۔ وہ شاید گاڑی کے انتظار میں ابھی وہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے جیپ کی چابیاں مانگیں۔ میں نے انہیں چابیاں تھماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''ماموں! ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ میں نے ٹال کے مزدوروں کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ طرح برقرار رہنا چاہئے۔''

وہ میری طرف دیکھ کر سرد مہری سے بولے۔ ''ٹال کے معاملات میں خود بہتر طریقے سے حل جانتا ہوں۔ تم صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگے تو میں نے انہیں پکارا۔

''ماموں.....!''

میرے پکارنے پر وہ رکے مگر میری طرف گردن موڑے بغیر خاموشی سے کھڑے میرے بولنے کے منتظر رہے۔

''میری پڑھائی جاری ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ لیکن جہاں تک ٹال کے معاملات کا تعلق ہے، انہیں حل کرنے کا مجھے بھی حق پہنچتا ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بولا۔ ''اور..... میں نے مزدوروں کے حق میں جو فیصلہ کیا ہے، وہ کاروبار کے مفاد میں جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان مزید کسی قسم کی ناچاقی اور بدمزگی سے پہلے میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے فیصلے کو حتمی سمجھا جائے۔''

میری دوٹوک بات پر ماموں حیدر گل میری طرف گھومے۔ پھر چند قدم چلتے ہوئے میرے قریب آئے۔ چند ثانئے میری آنکھوں میں جھانکنے کی سعی کرتے رہے۔ پھر پُرسوچ انداز میں سر کو دھیرے دھیرے جنبش دیتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں اسی دن واپس پنڈی روانہ ہو گیا۔ میرے اور نگینہ کے درمیان جذباتی تعلق خاطر پنپنے کے بعد سے کبیر نے میرے روم سے اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹ لیا تھا۔ اس نے اب اپنے کسی اور دوست کے روم میں شراکتی رہائش اختیار کر لی تھی۔ مجھے بہرحال اس پر مطلق اعتراض نہ تھا۔

میں جب کالج کیمپس پہنچا تو شام کے سائے جھک آئے تھے۔

میں تھکا تھکا سا اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

میں نے اب ماں اور ماموں حیدر گل سے مایوس ہو کر یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے ماضی کے بارے میں نگینہ کے پپا شاہ میر صاحب سے مکمل تفصیل جاننے کی کوشش کروں گا۔ ماں اور ماموں حیدر گل کی پراسرار خاموشی انہیں میری نظروں میں مجرم بنا رہی تھی۔ اگرچہ مجھے اس بات کا تو پورا یقین ہو چکا تھا کہ میری ماں ہی نے میرے باپ کا قتل کیا تھا اور وہ اپنے اسی بھیانک جرم کی سزا اب عمر قید کی صورت جیل میں بھگت رہی تھی۔ مگر میں اب یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ وہ کیا عوامل تھے کہ جس نے میری ماں کو اپنے ہی شوہر کے قتل پر اُکسایا تھا۔

یہ وہ اہم سوال تھے جو میرے اندر اب لاوے کی طرح کھولنے لگے تھے۔ میں بہرحال ماموں حیدر گل اور ماں سے یہ کریہہ حقیقت اُگلوانے میں ناکام رہا تھا۔ مگر میری یہ ''ناکامی'' اس بات کا واضح اور ٹھوس ثبوت تھی کہ میرے باپ قادر خان کے قتل میں میری ماں کے ساتھ میرا ماموں حیدر گل بھی ضرور برابر کا شریک رہا ہو گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے نگینہ کے پپا شاہ میر اور ان کے دوست انکل نظر حیات کے حوالے سے بھی ایک کریدسی لگ گئی تھی کہ آخر ان دونوں نے کبیر احمد کے ورغلانے پر یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ان لوگوں پر گمنام قاتلانہ حملے کروانے میں ماموں حیدر گل اور میں ہی ملوث تھا؟ اگرچہ میری طرف سے ان کے دل اور ذہن صاف ہو چکے تھے مگر میرے لئے سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر کس حوالے سے شاہ میر اور نظر حیات نے یہ سمجھا تھا کہ یہ گمنام دشمنی ہمارے سوا ان کے ساتھ اور کوئی نہیں کر سکتا؟ دوسرے ان کی باتوں سے ہی یہ بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ میری ماں کے ماضی سے بہ خوبی واقف تھے۔ لیکن کیوں؟ ان کا میری ماں کے ماضی سے ایسا کون سا پراسرار تعلق تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنانچہ اب مجھے نگینہ کے پپا اور انکل نظر حیات سے ہی اصل حقیقت کا پتہ چل سکتا تھا۔ اور اب وا
اس پراسرار راز سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔

میں نے یونیورسٹی کیمپس پہنچتے ہی نگینہ سے موبائل پر رابطہ کر کے اسے بتا دیا کہ میں ماموں حیدر
سے اس بار بھی حقیقت اگلوانے میں ناکام رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں پہلی بار خود جیل جا کر ماں سے بھی ملا
مگر اس کی پراسرار خاموشی کو بھی میں نہیں توڑ سکا ہوں۔

''اس کا مطلب ہے .....اب ہمیں ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔'' میری بات
کے بعد نگینہ پُرخیال لہجے میں بولی۔

''ہاں نگینہ! یہ میری زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ پلیز نگینہ! اب تم لوگ ہی میری مدد کر
ہو۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''نادر! تمہاری جذباتی طبیعت کو دیکھ کر مجھے جانے کیوں خوف آتا ہے کہ .....کہیں.....''
کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب فوری سمجھتے ہوئے بولا۔

''تم بے فکر رہو۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ لیکن جب تک اس راز سے پر
نہیں اٹھے گا، میں بے چین ضرور رہوں گا۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ حقیقت بتا کر، چاہے وہ کتنی ہی کریہہ
کڑوی کیوں نہ ہو، مجھے ایک ڈگر پر تو لا کھڑا کر سکتی ہے۔''

''ہاں ..... میں پہلے پپا سے بات کرتی ہوں .....پھر تمہیں فون کر کے اپنے ہاں بلا لو
گی۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا پھر بولی۔ ''اور ہاں، تم ذرا کبیر احمد سے محتاط رہنا۔ اور ا
کے منہ لگنے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔''

میں اس کی تنبیہہ پر قدرے چونکا۔ ''کیوں؟.....کیا اس نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا تھا؟
وہ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ ''ہاں ..... وہ مجھ سے ملا تھا اور زبردستی اپنی محبت
جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرے صاف جواب دینے پر وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں
نکالتے ہوئے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نادر کو بھی دیکھ لوں گا۔''

اس کی بات پر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ مارے طیش کے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔

''پلیز نادر! میری بات یاد رکھنا۔ تم اس سے بھڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں تم سے یہ بات
چھپانا چاہتی تھی لیکن تمہارے اصرار پر میں نے تمہیں بتا دی ہے۔'' وہ میری گمبھیر خاموشی سے میرے
جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے محبت آمیز فکرمندی سے بولی۔

میں نے اپنے ابال پر قابو پایا اور اپنے لہجے کو متحمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ازراہِ تشفی نگینہ
بولا۔ ''تم فکر مت کرو۔ میں اپنی طرف سے اس حاسد کو موقع نہیں دوں گا۔'' اس کے بعد میں نے موبائل
آف کر دیا۔

اگلے روز میں یونیورسٹی پہنچا تو وہاں میں نے اپنے کلاس فیلوز کے درمیان کچھ عجیب سا ماحول محسوس
کیا۔ میرے کلاس فیلوز مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اکرم نامی اپنے ایک کلاس میٹ سے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ
پوچھا۔ ''ارے بھئی، کیا بات ہے؟ تم لوگ مجھے ایسے گھور رہے ہو جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو؟''

میرے استفسار پر اکرم بولا۔ ''نادر! کیا کبیر احمد کی یہ بات درست ہے کہ تمہاری ماں جیل میں اپنے
شوہر کے قتل کی سزا بھگت رہی ہے اور تم نے بھی جیل ہی میں جنم لیا تھا؟''

میں اس کی بات سن کر سکتے میں آ گیا اور پتہ نہیں کب تک اسی حالت میں رہا۔ جب سکتہ ٹوٹا تو اکرم
جا چکا تھا۔

اب میری کیفیت بدل گئی، مجھے کبیر جیسے کینہ پرور اور حاسد پر طیش تو بہت آیا مگر نگینہ کی التجا میرے
دماغ میں گردش کرنے لگی۔ اس لئے میں ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے لیکچر ہال کی طرف بڑھ گیا۔ میرا
موڈ خراب ہو چکا تھا۔ لیکچر میں میرا ذرا دل نہ لگا۔

اکرم کے علاوہ چند دوسرے کلاس فیلوز نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تو میں پوچھنے والے اپنے
دوست پر ہی چڑھ دوڑا۔

وہ بے چارہ گھبرا کر مجھ سے دور بھاگ گیا۔ میں اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے لائبریری کی طرف
بڑھا تو کوریڈور میں ہی مجھے کبیر احمد نظر آ گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس
نے میری طرف دیکھا اور ہونٹوں پر اس کے بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

''یہ قاتل ماں کا بیٹا ہے۔ بے چارے نے جیل میں جنم لیا تھا۔ واہ، کیا دردناک اسٹوری ہے اس کی
.....چچ.....چچ.....بے چارہ۔''

میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تضحیک آمیز استہزاء سے ایک زہریلا جملہ اُگلا۔ میرے تن
بدن میں آگ لگ گئی۔ ایکا ایکی میرے دماغ میں نگینہ کی التجا کی جگہ لاوا کھولنے لگا۔ میں طوفانی بگولے کی
طرح پلٹا اور کبیر کو عقب سے کالر کے ذریعے پکڑ لیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟.....اب میرے سامنے بولو.....'' میں غضب ناک انداز میں
اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر اپنی قمیص کا کالر چھڑایا اور میرے چہرے
پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر میں نے یکدم اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اپنی جھونک میں گھوم گیا اور میں نے پوری
قوت کے ساتھ اس کی کمر پر اپنی لات رسید کر دی۔ وہ کئی قدم لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں میں
سے ایک نے ''دوستی'' نبھاتے ہوئے مجھے گھور کر غصیلے لہجے میں کہا۔

''نادر! یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''تم چپ رہو ..... ورنہ.....'' میں نے اسے جلتی سلگتی نظروں سے گھور کر کہا اور تہدیدی
انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس دوران کبیر احمد نے پلٹ کر دانت پیستے ہوئے مجھ پر
چھلانگ لگا دی اور میں بھی اسی وقت اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں بیک وقت ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

ہم دونوں کے قد و قامت میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ میں کسرتی جسم کا تنومند پہاڑی نوجوان تھا
جبکہ وہ قدرے فربہی مائل تھا۔ میں اسپورٹس بوائے تھا اور وہ سہل پسند مگر باوجود اس کے وہ طاقت کا ایک
چلتا پھرتا پہاڑ تو تھا ہی، مجھ سے ٹکراتے ہی وہ مجھے رگیدتا ہوا لے گیا حتیٰ کہ میرے قدم کوریڈور کے چکنے
فرش سے اُکھڑ گئے۔ میرا سر زور سے پکے فرش پر لگا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔
کبیر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔

اس کے دوست نیم دائرے کی صورت کھڑے گویا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کبیر احمد کا چہرہ مارے غصے
کے کریہہ سا ہو رہا تھا۔ مگر میری رگوں میں اس سے کہیں زیادہ وحشیانہ کھولن اُتری ہوئی تھی۔ میں نے
خرخراتی آواز کے ساتھ فرش پر پڑے پڑے پوری قوت کے ساتھ لوٹ لگائی اور کبیر احمد کو اپنے سینے سے
نیچے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ گرتے گرتے اس نے زور سے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میرے پیٹ
میں رسید کر دی۔ اذیت کی ایک دردناک لہر میری رگِ جاں تک میں اترتی چلی گی۔ مگر آتش جنوں خیزی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے یہ تکلیف میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون جاری ہوگیا۔ میرے ایک ہی طاقت ور گھونسے نے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر کے رکھ دیئے اور میں اس کے بے سدھ وجود کو حقارت سے ٹھوکر مار کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی کو میرے آگے آنے کی جرأت نہ ہوسکی تھی۔ البتہ وہاں دیگر لڑکوں کا ہجوم ضرور اکٹھا ہوگیا۔

اس اثناء میں کبیر احمد اپنی خود آلود ناک کو سہلاتا ہوا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے جا بھڑتے، دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرا لیا۔ کبیر احمد خون آلود چہرے سے مجھے گھورتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

''میں .... میں .... تمہیں یونیورسٹی سے نکلوا کر رہوں گا۔ دیکھنا تم..........''

یہ دھمکی دینے کے بعد وہ ہانپتا کانپتا اپنے چند دوستوں کے ساتھ اسی حالت میں وائس چانسلر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ میں اپنے ہاسٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اپنے روم میں پہنچا ہی تھا کہ وی سی کے دفتر سے بلاوا آ گیا۔ ناچار میں دوبارہ یونیورسٹی پہنچا اور سیدھا وائس چانسلر کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

''نادر!..........تم کب سے یہ بدمعاشی کرنے لگے ہو؟ مجھے اگر یونیورسٹی کی بدنامی کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔'' وہ غصے سے بری طرح کھول رہے تھے۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ دھاڑ کر بولے۔ ''اسی وقت کبیر احمد سے معافی مانگو ....اور اب اپنے گارجین کے بغیر یونیورسٹی مت آنا۔''

''سر!..........آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر کس طرح یکطرفہ فیصلہ کر لیا؟'' مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ ''تم میرا حکم نہیں مانو گے؟'' ان کے خار کھائے لہجے میں چھپی تہدید کو محسوس کرنے کے باوجود میں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

''آئی ایم سوری سر! میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا۔ البتہ میں اپنے گارجین کو لے آؤں گا۔''

''ہوں ....'' انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے اندر ہی اندر ایک گہری ہمکاری بھری۔ ''شاید تمہیں اب اپنے سرپرست کو بھی لانے کی ضرورت نہ پڑے۔'' وہ دانت بھینچ کر بولے۔ ''ناؤ یو گیٹ لاسٹ...... او کے!'' وی سی کے اس یکطرفہ فیصلہ پر مجھے طیش آ گیا۔

''سر! میں پھر بھی یہی درخواست کروں گا کہ ....آپ..........''

''آئی سے .... گیٹ آؤٹ..........اینڈ بی آف۔'' وہ میری بات کاٹ کر چلائے۔ اور پھر میں ایک حقارت بھری نظر ان پر ڈالتا ہوا اپنے ہاسٹل آ گیا۔ میں وی سی کے جانبدارانہ رویے پر بری طرح جل بھن رہا تھا۔ مجھے دکھ تھا کہ انہوں نے مجھے صفائی کا ذرا بھی موقع نہ دیا تھا۔ کیوں ....اس لئے کہ وہ شاید جانتے تھے کہ میں کون تھا؟ جبکہ کبیر احمد ایک با اثر شخص کا بیٹا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں نے کبیر احمد کو زخمی کیا تھا مگر سب سے پہلے اس نے ابتداء کی تھی اور مجھے نہ صرف اشتعال دلایا تھا بلکہ مجھ پر سب سے پہلے حملے کی ابتداء بھی اس نے ہی کی تھی۔ اب یہ کبیر احمد کی مکاری تھی کہ وہ اس وقت اپنا خون آلود چہرہ لئے وی سی کے کمرے میں پہنچا تھا اور یوں وہ مظلوم کہلایا تھا۔ میں اپنے کیریئر سے اب مایوس سا ہونے لگا تھا۔ وائس چانسلر کے ارادے مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے چند قریبی خیرخواہ

دوستوں نے مجھے اس ڈر سے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں نہ صرف وی سی صاحب سے معافی مانگ لوں بلکہ کبیر احمد سے بھی ''سوری'' کہہ دوں ورنہ نہ صرف میرا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے گا بلکہ بیڈ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

نگینہ تک جب یہ بات پہنچی تو اسے بہت دکھ ہوا اور وہ پریشان بھی ہوگئی۔ پھر اس نے اندر ہی اندر نہ جانے کس طرح کبیر احمد کے والد نظر حیات سے یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا اور یوں مجھے شوکاز نوٹس دے کر آئندہ کے لئے سختی سے ''وارن'' کر دیا گیا۔ گویا میرے رقیب کبیر احمد کو میرے خلاف ہرزہ سرائی کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔

''نادر! تم نے میری نصیحت بھلا دی نا؟'' نگینہ نے اس روز مجھ سے شکوہ کیا تھا۔

میں جواباً تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں کیا کرتا نگی! کبیر احمد نے مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''تم اگنور کر دیتے۔ یہی سمجھ کر کہ اس میں سارا قصور تمہارے تلخ ماضی کا ہی ہے۔'' اس نے مثبت اندازِ فکر کا منطقی فلسفہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر نگی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر میری ماں ایک قاتلہ ہے اور اس نے مجھے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا تو میری پیشانی پر یہ کلنک زبردستی کیوں تھوپا جا رہا ہے؟''

میرے کرب انگیز لہجے پر نگینہ کے لہجے پر بھی گہرے دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

''نادر!..........تم ایک با حوصلہ نوجوان ہو۔ ابھی سے ہمت ہار بیٹھو گے تو آگے تم حالات کا کس طرح مقابلہ کرو گے؟'' اس نے مجھے دوسرے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی اور مزید پُرزور لہجے میں بولی۔ ''تم ایک اسپورٹس مین ہو۔ ایک اچھے کھلاڑی۔ تمہارے اندر بھرپور اسپرٹ ہونا چاہئے اور.......... اور پھر میں بھی تو تمہیں ایک با ہمت اور با حوصلہ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے مایوس کرو گے نادر؟''

میں نے ایک نظر نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ بخش رہی تھی۔

''نگینہ! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' میں نے بلاتوقف فوراً جواب دیا ''لیکن نگی! میرا اپنے تلخ ماضی سے فرار بھی ممکن نہیں۔ وہ کوڑے کی طرح کبھی میری پیٹھ پر اور کبھی سینے پر پڑتا ہے۔ مگر میں بھی حوصلے سے اس کی ضربیں سہے جا رہا ہوں۔''

''شاباش نادر! .... میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔'' نگینہ یکدم کھل کر بولی۔ ''حالات کا سوچ سمجھ کر مقابلہ کرو۔ جذباتیت اور جوش سے کام بگڑتے ہیں۔ کبیر احمد جیسے سازشی نے تمہاری اس طبیعت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور تمہارا نام یونیورسٹی سے خارج کروانا چاہا۔ مگر شکر ہے کہ ایز یو نو، انکل نظر حیات میرے پپا کے پرانے دوست ہیں، معاملہ رفع دفع ہوگیا۔''

''انکل نظر حیات تو مجھ سے ضرور ناراض ہوئے ہوں گے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، میری ساری تفصیل بتانے پر الٹا انہوں نے اپنے بیٹے کو ہی سرزنش کی تھی۔'' وہ جواباً بولی۔

''اس کا مطلب ہے انکل حیات فراخ دل انسان ہیں؟'' میں متاثر کن لہجے میں بولا۔ ''ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔''

''ہاں ....انہیں احساس ہوگیا تھا کہ قصور ان کے بیٹے کبیر احمد کا ہی ہے۔''

''نگینہ!'' اچانک میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں.........کہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں تمہارے پپا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اب وہ ہی مجھے میرے ماضی کے متعلق........" میں جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے یک دم کسی خیال کے تحت پوچھا۔ "تم نے اپنے پپا اور انکل حیات سے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ میں ماموں حیدر گل اور ماں سے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ اُگلوانے میں ناکام رہا ہوں؟"

"ہاں........" وہ پُرسوچ لہجے میں مختصراً بولی۔

"پھر کیا کہا انہوں نے؟ ....میرا مطلب ہے اب تو وہی مجھے یہ سب بتا سکتے ہیں۔"

وہ میری بات پر کسی گہری سوچ میں غلطاں ہوگئی۔ پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

"میں پپا سے بات کروں گی۔ پھر وہ تمہیں بلانے کے لئے جو وقت مجھے دیں گے، میں فون پر تمہیں آگاہ کر دوں گی۔" اس کی بات سن کر میں چپ ہو رہا۔

ہم دونوں اس وقت حسب معمول یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے کبیر احمد کو دیکھا، وہ تنہا تھا اور ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ نگینہ کی بھی اس پر نظر پڑ چکی تھی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر نہ جانے کیوں میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں مگر میں تحمل سے بیٹھا رہا۔ تاہم میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اب اس نے کوئی بکواس کی تو اسے اچھی طرح سبق سکھاؤں گا۔"

"ہیلو نگینہ.........!" وہ قریب آ کر مسکراتے ہوئے نگینہ سے مخاطب ہوا۔ نگینہ نے بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر سر کی اثباتی جنبش سے اسے ہیلو کہا۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر قدرے شرمندگی سے بولا۔ "نادر! آئی ایم سوری یار......... میں نے واقعی تمہارے ساتھ اس روز زیادتی کر ڈالی تھی۔"

مجھے اس کے لہجے پر خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ شرمسار نظر آ رہا تھا۔ میرا جواب دینا اب ضروری بن گیا لہٰذا میں بھی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کوئی بات نہیں ....آؤ بیٹھو یار!"

وہ ہم دونوں کے قریب سرسبز گھاس پر بیٹھ گیا۔ کتابیں اس نے اپنی گود میں رکھ لیں۔

"چلو، اب دونوں شیک ہینڈ کرو۔" نگینہ ہم دونوں سے مسکرا کر بولی۔

میں نے کبیر کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں کی صلح کی خوشی میں نگینہ نے اپنی طرف سے کولڈ ڈرنک پلایا۔ اس کے بعد کبیر ہم سے رخصت ہوا تو نگینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے اس کی کار تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں یونیورسٹی آورز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاسٹل آیا۔ میس میں لنچ کیا پھر اپنے روم میں آ گیا۔ کبیر احمد کے رویے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے میرا دل صاف کر دیا تھا۔ میرے دل میں اب اس کے لئے کوئی ناراضگی نہ تھی۔ تاہم میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے نگینہ کی خاطر مجھے سوری کیا تھا؟ یا پھر اسے ازخود اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ انٹر لاک تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ذرا سا چونک گیا۔ میرے سامنے کبیر احمد کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر میرا دل جانے کیوں کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔

"خیریت تو ہے ....تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ آؤ.........اندر........" میں نے اس کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھ کر قدرے تفکر سے پوچھا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"نادر! نگینہ کو کڈنیپ کر لیا گیا۔"

اس نے جیسے دھماکہ کیا اور میں ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ پر سُن ہو کر رہ گیا۔

"یہ.........کک.........کیسے ہوا؟ ....کب ہوا؟" بالآخر میں نے اپنے حواس پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وہ جب تم سے ملنے کے بعد واپس اپنے گھر لوٹ رہی تھی ....میرا خیال ہے، اس وقت یہ واقعہ ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لل.........لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اسے اغواء کیا گیا ہے؟ ہوسکتا ہے، وہ اپنی کسی سہیلی........."

"اس کے زخمی باڈی گارڈ نے بتایا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا اور بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس وقت بری طرح پریشان تھا ورنہ کبیر احمد کے چہرے کے عجیب تاثرات مجھ سے چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔"

"کیا بتایا باڈی گارڈ نے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہی کہ چند مسلح نقاب پوش ایک ہائی روف میں سوار تھے۔ انہوں نے ان کی کار پر فائرنگ کر ڈالی۔" وہ صراحت سے بتانے لگا اور میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑ دھڑا رہا تھا۔

"ایک باڈی گارڈ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ دوسرا زخمی ہوا ہے نامعلوم حملہ آوروں نے ان کی کار کا ٹائر بھی برسٹ کر ڈالا تھا۔ پھر وہ نگینہ کو زبردستی اپنی ہائی روف میں بٹھا کر آناً فاناً رفو چکر ہو گئے۔"

"اوہ.........یہ تو بہت برا ہوا.........بہت ہی برا ہوا........." میں دانت بھینچ کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے غصے اور پریشانی سے بڑبڑایا۔ "پولیس کو انفارم کر دیا گیا؟" اچانک میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، زخمی گارڈ کی حالت قدرے بہتر ہے۔ پولیس نے اس کا بیان قلم بند کر لیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی نظریں ہنوز ایک ٹک میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر میں اس وقت خود بری طرح پریشان تھا۔ نگینہ میرا سب کچھ تھی۔ میرا دل، میری جان، میری پہلی اور آخری محبت۔

"تم.........اب کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اچانک کسی خیال کے تحت کبیر احمد سے پوچھا۔

"انکل شاہ میر کے ہاں۔"

"چلو، میں بھی چلتا ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔

اس کے بعد میں اس کی کار میں بیٹھ کر نگینہ کے پپا شاہ میر کے ہاں روانہ ہو گیا۔ نگینہ کے اغواء سے متعلق یہ اندوہناک خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی۔ مجھے ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟" میں سوچنے لگا۔

ظاہر ہے، ان اغواء کنندگان کا تعلق انہی نامعلوم دشمنوں سے ہوسکتا تھا جو انکل شاہ میر اور انکل نظر حیات کے مشترکہ دشمن تھے اور ان پر کئی بار ناکام قاتلانہ حملے بھی کر چکے تھے۔

یوں تو انہوں نے اشاروں کنایوں میں مجھ پر یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ پراسرار دشمن حیدر گل کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر انہوں نے کھل کر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ

میں ان کا سگا بھانجا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے وجود میں ایک جانی پہچانی تپش کا احساس ہونے لگا۔

''کبیر!.....کار روکو۔'' اچانک میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسے ذرا حیرت ہوئی۔ مگر میرے چہرے پر چھائی ہوئی پُرتپش سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کار روک دی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک رکشے میں بیٹھا اور سیدھا ویگن اسٹینڈ پہنچا۔

میں اب جلد از جلد ''گرین لاج'' پہنچنا چاہتا تھا۔

❄❄❄

سہ پہر کے وقت میں گرین لاج پہنچا تو ذرا ٹھٹک سا گیا۔ مجھے وہاں غیر معمولی گہما گہمی کا احساس ہوا تھا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں چار پانچ دیگیں پک رہی تھیں۔ نوکر چاکر اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آئے۔ تین چار گاڑیاں بھی کھڑی نظر آئیں۔ ان میں ایک تو ہماری سفید پوٹھوہاری جیپ تھی جبکہ دوسری ایک گرے کلر کی لینڈ کروزر اور ایک سنگل ڈور پجیرو تھی۔ ایک کار بھی تھی۔ سنگل ڈور پجیرو کو میں فوراً پہچان گیا۔ یہ ماموں حیدر گل کے دوست ملک سردار خان کی تھی۔ مجھے وہاں ٹال کے مزدور بھی ہاتھوں میں پلیٹیں تھامے نظر آئے۔ گویا ایک بھرپور دعوت کا سماں تھا۔

کوٹھی کو باہر سے سجایا گیا تھا۔ رنگین بلب اور قمقمے روشن تھے۔ جھنڈیاں بھی لہراتی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سب دیکھ کر اچنبھا سا ہوا۔ جب میں اندر پہنچا تو فضل چاچا کی مجھ پر نظر پڑی۔ ان کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔

''نادر بیٹا! تم آ گئے ..... بہت ٹھیک وقت پر آئے۔'' وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''چاچا! یہ سب کیا ہے؟''

میری بات پر وہ اپنے خوشی کے بے اندازہ احساس کو دباتے ہوئے بولے۔

''بس بیٹا! ہم سے کچھ نہ پوچھو۔ اندر جاؤ اور تم بھی اس خوشی میں شریک ہو جاؤ۔''

مجھے تعجب ہوا اور میں اندر کی طرف بڑھ گیا۔

فضل چاچا کی بیوی صغراں سے میری مڈبھیڑ ہوئی مگر اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور ایک بڑے کمرے کی طرف اشارہ کر کے خاموشی سے چلی گئی۔

میں اپنے دل و دماغ میں عجیب و غریب احساسات لئے مذکورہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہوا اور بری طرح چونک گیا۔

نیم دائرے میں بچھے صوفوں پر مجھے پانچ افراد براجمان نظر آئے۔ ماموں حیدر گل، منیجر مشتاق اور ملک سردار خان کے علاوہ چوتھا ایک بارُعب شخص میرے لئے اجنبی تھا۔ اس نے لارنس پور کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے پیٹے میں تھی۔ وہ چوڑے شانوں اور دراز قد و قامت کا مالک تھا۔ رنگت پہاڑی لوگوں کی طرح سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر عجیب قسم کی کرختگی چھائی ہوئی تھی۔

ان میں جو پانچواں شخص تھا بلکہ ''تھی'' وہ ایک پُروقار عورت تھی۔ وہ بہ مشکل چالیس کی عمر کے قریب تھی۔ اس نے بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا بیش قیمت فریم والا چشمہ تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں پژمردگی اس بات کی غماز تھی کہ اس نے عمر کا بیشتر حصہ بڑے کڑے حالات میں بتایا تھا۔ بادی النظر میں وہ بڑی دبنگ خاتون نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر ماموں حیدر گل کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں پہلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظر میں اس خاتون کو پہچان ہی نہیں پایا تھا مگر بہ غور دیکھنے پر میں اس قدر بری طرح چونکا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور میں ایک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ماموں حیدر گل سمیت اس عورت کی بھی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ پھر وہ ممتا بھری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی یکدم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نادر!..... بیٹا! تم آ گئے.....؟'' وہ عورت یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ ہاں..... وہ میری ماں تھی۔ مگر اسے جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھ کر میرے ذہن کو ایک تکلیف دہ جھٹکا لگا تھا۔

ماموں موجود سب لوگ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ماموں حیدر گل بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ں میرے قریب آئی اور محبت بھرے انداز میں اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد میری پیشانی دم لی اور میرا ہاتھ پکڑے صوفے کی طرف بڑھی۔

میں میکانکی انداز میں ماں کے شانہ بہ شانہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ ماموں حیدر گل نے بھی مجھ سے عانقہ و مصافحہ کرنے کے بعد وہاں موجود چیدہ چیدہ افراد سے تعارف کروا دیا۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس بارعب شخصیت کے علاوہ سب کو میں جانتا تھا اس لئے ماموں نے بھی صرف اس کا مجھ سے خاص طور پر تعارف کروانا ضروری سمجھا اور اس کی طرف احتراماً اشارہ کرتے وئے مجھ سے بولے۔

''نادر بیٹا! ان سے ملو۔ آپ اعظم خان صاحب ہیں سیاست کی سدا بہار شخصیت!'' میں اس وقت ان کی وہاں غیر متوقع موجودگی پر دم بہ خود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ ان کے بھاری بھرکم چہرے پر چندی چندی سی آنکھیں نہایت پراسرار سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے بال بھی چھوٹے یعنی ''میجر کٹ'' کے تھے۔ بالوں کا یہ اسٹائل آفیسر طبقے میں بہت رائج تھا۔ یہ سولجر کٹ کے قریب قریب کٹنگ تھی۔ یونیورسٹی کے بیشتر لڑکوں نے بھی لمبے بال اور لانبی لانبی قلمیں چھوڑ کر یہی ''میجر کٹ'' اپنا رکھی تھی۔ میں اب ماموں اور ماں کے درمیان صوفے پر بیٹھ گیا اور سخت شش و پنج میں مبتلا تھا۔ یہاں کی اچانک بدلی ہوئی صورت حال پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نگینہ کے متعلق کیسے بات کروں؟ اور پھر مجھے اس کے پپا شاہ میر اور انکل نظر حیات کی نصیحت بھی یاد تھی کہ میں نے کسی صورت میں بھی ان کا ماموں حیدر گل اور ماں کے سامنے ذکر نہیں کرنا تھا۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا مگر اندر ہی اندر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''نادر میاں! کیا تمہیں اپنی ماں کے جیل سے رہائی پانے کی خوشی نہیں ہوئی؟'' معاً سامنے اعظم خان کے قریب بیٹھے ملک سردار خان نے عجیب سے لہجے میں بہ غور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا؟'' میں نے ان سے ہی الٹا سوال کر ڈالا تھا۔

اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری اور بولا۔ ''تم اپنی ماں کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہو۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اعظم خان کے کلین شیو چہرے پر غیر تاثراتی مسکراہٹ اُبھری اور وہ مجھ پر اپنی چندی چندی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''شاید ..... میڈم شبینہ (ماں) کی غیر متوقع رہائی پر نادر میاں سے خوشی سنبھالے نہیں جا رہی۔ یکدم خوشی بھی تو انسان کو پریشان کر کے رکھ دیتی ہے۔''

''شاید آپ نے درست فرمایا خان صاحب!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ذہن نے ایک فوری لائحہ عمل کی تیاری کرتے ہوئے ان میں گھلنے ملنے کا فیصلہ کیا تو م
فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا، میری بات پر بالخصوص ماموں اور ماں کے چہروں پر طما
بھری مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اب شاید میں انکل شاہ میر اور نظر حیات کی ہدایات کے مطابق ٹھیک بل
درست ڈگر پر آ رہا تھا۔

"خان صاحب! نادر آخر میرا بیٹا ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ بھلا اسے کیسے خوشی نہیں ہوگی؟" ما
نے ایک ممتا بھرے فخر کے ساتھ مجھے اپنے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اس پر منیجر مشتاق میاں جو شاید کافی دیر سے بولنے کو بے چینی سے منتظر تھا، اعظم خان کی خوشامد
ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ سب اپنے خان صاحب کی مہربانی ہے کہ میڈم (میری ماں) اپنی مدت سے چند برس پہلے رہائی پا چکی ہیں۔ آخر بڑے آدمی جو ہوئے۔" اس نے عادتاً تکیہ کلام اُگل کر جیسے خود کو پُرسکون کیا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب کی کوششوں سے آج میری بہن شبینہ نے اپنی م
سے پہلے رہائی پا کر گرین لاج کی رونقیں بڑھا دیں اور اب آپا شبینہ کے آنے سے میں اپنے اندر ا
عجیب سا حوصلہ بھی محسوس کر رہا ہوں۔" ماموں حیدر گل نے مسرور ہو کر کہا۔

"ارے نہیں بھئی، اس میں میری کوششوں کا کیا دخل ہے" اعظم خان نے خالصتاً ایک گھا
سیاستدان کی طرح کسرِ نفسی سے کام لیا۔ "میڈم شبینہ کا چال چلن اچھا ہونے کی وجہ سے ان کی سزا م
تخفیف کی گئی تھی۔"

"پھر .... خان صاحب! آپ بھی کم شخصیت تو نہیں ہیں۔ میں نے ابھی نادر بیٹے سے آپ
تعارف کرواتے ہوئے آپ کے بارے میں ایک جملہ کہا تھا یعنی سیاست کی "سدابہار" شخصیت۔ اس
مطلب تھا کہ آپ جیسی قد آور شخصیت کے تو ہر آنے جانے والی حکومتوں سے بڑے گہرے روابط رہ
ہیں۔" ماموں حیدر گل نے خوشامدانہ توصیف سے کہا۔

"بڑے آدمی جو ہوئے جی۔" منیجر مشتاق کو پھر اپنے مخصوص تکیہ کلام کا دورہ پڑا۔ وہاں موجود ہر ا
اعظم خان کے گن گا رہا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم تھا کہ یہ کوئی سیکرٹری کی س
بیورو کریٹ آفیسر تھا۔ میں جب پچھلے دنوں ماموں حیدر گل سے دو ٹوک گفتگو کرنے کے لئے تال
پہنچا تھا تو اس وقت ماموں اسی شخص سے ملنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

یوں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں خود کو نروس ہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بع
پُرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔

ناچار میں نے بھی ان سب کے ساتھ کھانا زہر مار کیا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت شدید طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ نگینہ کا فریاد کرتا چہرہ بار با
میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کی مدد کو پکارتی ہوئی کرب ناک چیخیں جیسے میری سماعتوں کو چھل
کئے دے رہی تھیں۔ یہ میرا جگر ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان اپنی بے چینی اور اپنے ذہنی کرب ک
میں کس طرح دبائے ہوئے تھا۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مگن تھے مگر میرے اندر ایک ناقابل بیان لا
آگ سلگ رہی تھی۔

"نادر بیٹے! تم کچھ کھا نہیں رہے۔ کیا بات ہے؟ .... چپ چپ سے کیوں ہو؟" ماں نے بالآخ
ممتا بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

حالانکہ وہ اور ماموں میری خاموشی کی وجہ جانتے تھے اور میرا دیرینہ مسئلہ بھی .... کیونکہ اکثر میری
دل حیدر گل سے گرما گرمی ہوتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ جیل جا کر میں نے اپنے ماضی کے بارے میں جاننے
لئے ماں کو بھی کریدنے کی کوشش کی تھی اور اس بات کا بھی ماں سے جواب مانگا تھا کہ اس نے آخر
ے باپ قادر علی خان کو کیوں قتل کیا تھا؟

ہی وجہ تھی کہ وہ دونوں ہی مجھے سرِ دست نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ لیکن نگینہ کی وجہ سے میری
یشانی اور تشویش میرے چہرے، میری آنکھوں اور میری حرکات و سکنات کے مضطربانہ ارتعاش نے
ماموں کو یہ باور کروا ہی دیا تھا کہ اس بار میرے ساتھ معاملہ سوالوں کا نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے۔

"نہیں ماں! ایسی بات نہیں۔ بس تھکا ہوا آیا ہوں نا۔ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔"

"گل! میں تم سے کہہ رہی تھی نا کہ فضل چاچا کو گاڑی دے کر نادر کو لانے کے لئے بھیج دیتے۔ میرا
بسوں ویگنوں میں دھکے کھاتا ہوا آیا ہے۔" ماں نے ماموں حیدر گل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
ے لئے ماں کے یہ ممتا بھرے جملے جانے کیوں میرے اندر ایک درد ناک سی ہوک اُبھارنے کا
ث بنے تھے۔ جواباً ماموں ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے ماں سے مختصر بولے۔

"میں دراصل نادر بیٹے کو اچانک سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" اس کا لہجہ کسی بات کی چغلی کھا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد جب اعظم خان نے رخصت ہونا چاہا تو میں نے دیکھا، ماموں حیدر گل اور ماں نے
ے احترام کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کیا پھر آخر میں ماموں نے بڑے اسرار بھرے انداز میں اعظم خان
ہ مخاطب ہو کر کہا۔

"خان صاحب! آپ نے ایک اور ہم معاملے میں بھی ہمارا ساتھ دیا۔ میں اپنی طرف سے اور آپا
ینہ کی طرف سے آپ کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

ماموں حیدر گل کے ذومعنی الفاظ پر میں اندر سے چونکے بنا نہ رہ سکا۔ مگر میں نے یہ ظاہر نہ ہونے
۔ تاہم میری تمام تر سماعتوں کا رخ اسی طرف تھا۔

"میں تمہاری آخری دم تک اس اہم معاملے میں مدد کرتا رہوں گا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟" اعظم
ن نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر کہا پھر تائید طلب انداز میں ملک
ار خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں جی اپنے سردار خان صاحب؟"

"ہاں .... ہاں جی۔ کیوں نہیں۔" وہ یکدم چونک کر بولا۔

"یار حیدر گل! تُو بالکل فکر مت کر اور نہ ہی آپا کو فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم جو ہیں۔"

اس کے بعد ہم لوگ اسے اس کی لینڈ کروزر تک چھوڑنے آئے۔ میرے ذہن میں پُراسراری کھٹک
ا ہوگئی۔

منیجر مشتاق کو بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب مجھے اپنے خیر خواہ انکل شاہ میر اور نظر حیات
خود کو ماموں اور ماں کے سامنے ظاہر نہ کرنے کی حکمتِ عملی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا
کہ اس طرح ماموں اور ماں میری طرف سے بھی محتاط ہو جاتے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال
دش کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے آخر کس اہم معاملے کے سلسلے میں ذومعنی گفتگو کی تھی؟

بہرحال ادھر ماموں حیدر گل، ماں اور ملک سردار خان اندر لوٹے تو میں دانستہ آرام کرنے کے
ے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے ذہن میں یکبارگی ایک خیال آیا تھا اور اب میں اسے عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا لگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا کہ میرا بروقت یہاں گرین لاج آنا، خالی از علت نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ماں کا جیل سے اچا
ہونا اور پھر نگینہ کا اغواء..... ان سب لوگوں کا یہاں جشن منانا ..... کسی پُراسرار کہانی کی ابتد
معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے رِسٹ واچ میں وقت دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے
کے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ صرف سبز رنگ کا زیر
بلب روشن تھا۔ میں بہ آہستگی دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ تب مجھے اچانک ڈرائنگ روم
ملحقہ ایک کمرے کے دروازے کی جھری سے روشنی آتی نظر آئی۔ میں دبے پاؤں مذکورہ کمرے کی
بڑھا۔ میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے دھیمے دھیمے باتیں کر
آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ اندر ماموں حیدر گل، ملک سردار خان اور ما
درمیان کوئی اہم گفتگو ہو رہی ہے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر آوازوں کے غیر
''آہنگ'' کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اچانک مجھے کھڑ
خیال آیا۔ یہ کھڑکی مذکورہ کمرے کی مشرقی دیوار کی طرف تھی۔ اس کے قریب پہنچنے کے لئے مجھے ڈرا
روم سے باہر نکل کر ایک مختصر کوریڈور میں آنا پڑتا۔

میں بہ سرعت وہاں پہنچا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اگرچہ اس کی چوبی چوکھٹ
فینسی آہنی گرِل نصب تھی مگر میں یہاں کھڑے ہو کر خاموشی سے اندر ہونے والی گفتگو بہ آسانی سن
تھا میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کی دوسری جانب پردہ جھول رہا
اندر اس کھڑکی کے قریب ہی صوفے دھرے تھے۔ اس لئے اب مجھے صوتی آہنگ کے ساتھ گفتگو کا
بھی صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔

''ملک صاحب! اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی لاش دشمنوں کو بھیج دو۔'' مجھے ماں کی غضب
آواز سنائی دی۔ اس کے مستقمانہ لہجے میں زخمی ناگن کی سی پھنکار تھی۔ میں ''لڑکی'' کے ذکر پر بری
چونکا تھا۔

''ہاں ..... آپا شبینہ درست کہتی ہے سردار خان!'' یہ ماموں حیدر گل کی آواز تھی۔ ''ہمارے دشم
نے پے در پے قاتلانہ حملوں کے باوجود ہماری بات نہیں مانی ہے۔ اب ان کو ایک عدد لاش کا تحفہ د
دینا چاہئے۔''

''تم دونوں کو شاید ابھی تک ایک اہم بات کا علم نہیں ہوا ہے۔'' لمحے بھر کی اسرار بھری خاموشی
بعد معاً ملک سردار خان کی بھاری آواز اُبھری۔ میں دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پائے ہمہ تن
تھا۔

''کون سی بات؟'' مجھے بیک وقت ماں اور ماموں حیدر گل کی قدرے چونکتی ہوئی آواز سنائی
ملک سردار خان ہولے سے کھنکھارنے کے بعد دونوں سے مخاطب ہوا۔

''اپنا کاکا نادر، نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کا دوست ہے۔'' اس نے بتایا اور میری رگوں میں بچا
خون کی گردش تیز ہو گئی۔

''کیا.....؟'' میں نے ماموں اور ماں کی چونکتی ہوئی آوازیں سنیں۔

''مم ..... مگر تمہیں کیسے پتہ چلا ملک سردار خان؟'' ماموں حیدر گل نے غیر یقینی لہجے میں اس
پوچھا تھا۔

''ہاں، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ اب آگے سنو.....'' ملک سردار خان کی گمبھیر آواز اُبھری۔ ''میں نے
تمہارے کہنے پر نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کی گاڑی پر حملہ کیا تھا تو اس وقت کاکے نادر کو میں نے
کے برابر میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ وہ حملے سے بچ گیا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے کاکے
کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اس دن اتفاق سے ٹال آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا۔ خیر.....''
وہ اتنا بتا کر چند ثانیے کے لئے رکا۔ میرا دل سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا۔

''اس کے بعد سے میں نے کاکے نادر کی باقاعدہ ٹوہ لینا شروع کی تو مجھ پر اس حقیقت کا بھی
شاف ہوا کہ کاکا نادر، شاہ میر کی بیٹی نگینہ کے بھی بہت قریب آ چکا ہے۔ دونوں کے درمیان لگتا ہے، پیچ
چکا ہے۔''

وہ اتنا کہہ چپ ہوا تو اندر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ خود ادھر میری حالت جیسے قطب شمالی کے
زاروں کی سی ہو رہی تھی۔

''یہ ..... بہت برا ہوا ..... بھائی حیدر گل! بہت برا ہوا یہ.....'' معاً اس سناٹے میں ماں کی
براتی آواز اُبھری۔ اس کے لہجے میں زبردست جلن تھی۔

ماموں جواباً کچھ نہیں بولے تھے۔ البتہ ملک سردار خان نے ازراہِ تشفی ماں سے کہا۔ ''میڈم! پریشان
نے کی ضرورت نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم دونوں کو اب کاکا نادر سے ہوشیار و محتاط رہنے
ضرورت ہے۔''

اس کی اس بات پر ماموں حیدر گل نے سفاک لہجے میں ملک سردار خان سے کہا۔

''اچھا ہوا ..... تم نے یہ بات ہمیں بتا دی۔ بہرحال، اب تم اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی
دشمنوں کو بھیج دو۔ بس، یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔''

میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ لڑکی سے مراد یقیناً نگینہ ہی تھی۔ میرے اندر ایکا
جوار بھاٹا اُٹھنے لگا۔ ماموں حیدر گل اور ماں آتشِ انتقام میں اس قدر بے رحم اور سفاک بھی ہو سکتے
مجھے اس کی امید نہ تھی اور پھر یہ لوگ، میری نگینہ کو قتل کرنے کا گھناؤنا ارادہ کر چکے تھے۔ میں یہ کیسے
اشت کر سکتا تھا؟ ایک بار تو جی میں آئی کہ اسی وقت اندر داخل ہو کر ان کے مکروہ چہرے نوچ ڈالوں۔
اروں رواں غیظ و غضب کے مارے تھرتھرانے لگا تھا۔ میں نے اتنی مشکلوں سے اپنی اُبلتی کھولتی
یات پر قابو پایا تھا، یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو کسی جنونی اقدام سے باز رکھا اور
یدہ کن لینے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی ملک سردار خان نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔
یکدم محتاط ہو گیا۔

ان لوگوں کی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نگینہ کو ماموں حیدر گل اور ماں نے ملک سردار
ان کے ذریعے اغواء کروایا تھا اور اب یہ لوگ میری نگینہ، میرے دل، میری محبت کو بے دردی سے موت
کے گھاٹ اُتارنے کا سفاکانہ فیصلہ کر چکے تھے۔

لیکن میرے ہوتے ہوئے بھلا کون نگینہ کا بال بھی بیکا کر سکتا تھا؟ اب مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی
توں پر سو فیصدی یقین ہو چکا تھا کہ ان کا شک ماموں حیدر گل پر بے بنیاد نہیں تھا۔ لیکن میری سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماموں حیدر گل اور ماں ان سے کون سی دشمنی کا بدلہ چکانا چاہتے تھے؟ وہ اہم بات
یا تھی، جس کے منوانے کے لئے ماں اور ماموں نگینہ کے باپ شاہ میر اور انکل نظر حیات پر ہر طرح
ے دباؤ ڈال رہے تھے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کمرے میں کھڑ پڑ کی آواز سنی اور پھر بہ سرعت وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن میں اپنے ک
میں کانے کی بجائے گرین لاج سے باہر نکل کر تاریکی میں آ گیا۔ دور نیچے وادی میں تاریک سناٹا
تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گھنیرے بادلوں کے عقب میں چاند چھپ چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا، پھر سامنے وسیع احاطے میں کھڑی ملک سردار خا
سنگل ڈور پجیرو کی طرف دیکھ کر، وہاں آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ پا کر میں بہ سرعت آگے بڑ
پھر قریب پہنچ کر بیک ڈور کو کھولنے کی کوشش کی، وہ لاک تھا۔ مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ مگر پھر دوسر
لمحے میں اگلے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے بہ آہستگی اسے ذرا کھینچا تو وہ کھل گیا۔ میں پھرتی
داخل ہوا۔ دروازہ آہستگی سے بند کیا۔ اس وقت میں نے شیشے کی کھڑکی سے پار کوٹھی کی طرف دیکھ
لوگ اس طرف ہی آ رہے تھے۔ میں فوراً سیٹوں کے درمیان جھکا اور رعقبی سیٹوں کی طرف رینگ
پھر ایک سیٹ کے نیچے سکڑ سمٹ کر گھس گیا۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچے۔ میں سانس روکے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد
دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے ہی لمحے جیپ کا طاقتور انجن رات کے
بھرے سناٹے میں گھرگھرا کر جاگ اُٹھا۔ جیپ کے فرش پر مجھے ہلکی سی تھرتھراہٹ کا احساس ہ
دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

❄ ❄ ❄

میں عقب سیٹ کے نیچے دبکا اس سوچ میں غلطاں تھا کہ مجھے اب فوری طور پر اگلا قدم کیا
چاہئے؟

نگینہ کی زندگی شدید خطرے میں تھی اور ملک سردار خان اس وقت نگینہ کے لئے موت کا فرشتہ
ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا۔

پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اسے ادھر ہی قابو کرنے کی کوشش کروں۔ بے شک مسلح
اور اس کی جیب میں پستول وغیرہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر نگینہ کو قتل کرنے کا ارادہ
طور پر بدل دیتا۔ لیکن مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی سختی سے دی ہوئی وہ ہدایات یاد تھیں کہ اگر مل
حقیقت جاننا تھی تو مجھے کسی بھی صورت یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ میں ماموں اور ماں کی خونیں سازشوں
واقف ہو چکا ہوں۔ چنانچہ مجھے اپنی صوابدید اور اپنے زورِ بازو سے اس نازک ترین صورتِ حال
تھا تا کہ ملک سردار خان، اعظم خان اور ماموں حیدر گل سمیت ماں کے اصل چہرے میرے سامنے
نقاب ہو جائیں۔

چنانچہ میں دم سادھے وقت اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔

جیپ بڑے ہموار انداز میں اور خاصی رفتار کیساتھ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ رات اور ویرانی کے
ملک سردار خان جیپ کو اچھی خاصی اسپیڈ سے دوڑا رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس مردود کی منزل
تھی جہاں اس نے ماموں اور ماں کے ایماء پر نگینہ کو اغواء کر کے یرغمال بنا رکھا تھا اور اب یہ خبیث
اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کا سفاک ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس نے میری نگینہ کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی
کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے اب رہ رہ کر اس بات پر بھی پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش میں
اپنا اڑتالیس بور کا ''میگارڈ'' ہی ساتھ رکھ لیتا۔

تقریباً گھنٹے پون کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد اچانک جیپ میں شاید کوئی خرابی پیدا ہونے لگی اور
جھٹکے کھاتی ہوئی رک گئی۔

جیپ رکتے ہی ماحول میں ایکا ایکی ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔ ملک سردار خان نے دو تین بار جیپ
نارٹ کرنے کی کوشش کی، پھر دروازہ کھول کر وہ شاید باہر اترا تھا۔ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتیں اس کی
کات پر گوش بر آواز تھیں۔

پھر مجھے جیپ کا بونٹ اُٹھنے کا کھٹکا سنائی دیا۔ وہ شاید کوئی خرابی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا دیر
ب وہ انجن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا، اس کے بعد بونٹ کے بند ہونے کی آواز اُبھری۔ میں دم
ادھے سیٹ کے نیچے دبکا ہوا تھا۔

وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر براجمان ہوا اور ایک بار پھر جیپ
نارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود۔ جیپ کا انجن ہر سیلف کے بعد کسی غنودہ جانور کی طرح
لے سے غرا کر خاموش ہو جاتا۔

''اس کم بخت کو بھی ادھر ہی خراب ہونا تھا۔''

اچانک مجھے اس کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ خود میں بھی ذرا پریشان سا ہو گیا تھا۔ میرا اضطراب
ھنے لگا تو مجھے بے چینی نے آ لیا۔ جیپ کا ایسے نازک موقع پر خراب ہونا خود میرے لئے بھی بہتر نہ
ا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے بری طرح تشویش لاحق تھی۔

اچانک میں بری طرح چونکا۔ میری ٹھٹکی ہوئی ساعتوں میں ملک سردار خان کی آواز اُبھری۔ وہ شاید
بائل پر اپنے کسی آدمی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

''غفورے! میری گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ میں شہر سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر مضافات میں
ں۔ تم شکر خان کو کرولا دے کر بھیجو.........'' کیا کہا؟......... شکر خان نہیں ہے؟ .... کہاں مر گیا
ام زادہ عین وقت پر؟''

وہ غصے سے غرا کر بولا۔

''اسے معلوم نہیں ہے کہ ایک یرغمالی ہمارے قبضے میں ہے؟......... کیا......... گاؤں سے بلاوا آ گیا
ا؟ بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی......... ہوں، تم اب اس لڑکی کے پاس اکیلے ہو؟''

پھر لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ بولا۔

''غفورے! تو ایسا کر، گاڑی تو کھڑی ہے نا ڈیرے پر؟......... شکر خان لے گیا......... کمینہ،
ردود!'' وہ دانت پیس کر جھلاہٹ آمیز انداز میں غرایا۔

میں یک ٹک سیٹ کے نیچے سکڑا سمٹا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میرے اندر بری طرح کی پکڑ دھکڑ مچی
ئی تھی۔ اس کی آواز پھر سنائی دی۔

''اچھا غفورے! میری ایک بات غور سے سن۔'' اس کے اسرار بھرے لہجے پر میرے کان بھی کھڑے
و گئے۔

''اس لڑکی کا گلا دبوچ کر جان سے مار ڈالو اور لاش دشمنوں تک پہنچا دو۔ سمجھے؟'' ملک سردار خان
کے ان سفاک الفاظ نے مجھے ایک ثانیے کو سن کر کے رکھ دیا۔ میری جان سے عزیز ہستی نگینہ کو موت کے
گھاٹ اتار دینے کا پیغام دیا جا چکا تھا اور میں سیٹ کے نیچے دبکا جیسے اس کی موت کا منتظر تھا۔ نہیں، ایسا
ہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا......... میرے روم روم میں آگ سی بھڑک اٹھی اور پھر میں جنوں خیز انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سیٹ کے نیچے سے نکلا اور زخمی شیر کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ملک سردار خان کے
سے اُبھرا۔ اسے بھی شاید اپنے عقب میں گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے جیسے ہی چونک کر
گردن موڑنا چاہی، میں نے چیتے کی طرح اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکنجے میں مضبوطی سے
اور وحشت انگیز لہجے میں بپھر کر غرایا۔

”ذلیل انسان! اسی وقت اپنے کتے غفورے کو فون کر کے اپنا یہ سنگدلانہ حکم واپس لے لے
تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔“ اس نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر میں نے اس کی گردن
گرد اپنے بازو کا آہنی حلقہ مزید تنگ کر لیا۔ حتیٰ کہ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی بے ربط آوازیں
ہونے لگیں۔ تب پھر اس نے ایک لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قمیض کی سائیڈ پاکٹ سے
نکالنا چاہا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ کر پھرتی سے پستول اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اس کی
سے لگا کر دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے۔ اس نے گردن موڑ کر پہلے غیر یقینی نظروں سے میری طرف
پھر اور کچھ کہنا چاہا مگر میں نے پستول کا آہنی دستہ اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ اس کے حلق سے
ڈکراہٹ نکلی اور وہ بری طرح خوف زدہ نظر آنے لگا۔

”وقت ضائع مت کر کتے! ابھی فون کر .... جلدی، ورنہ تیری کھوپڑی میں روشندان بنا
گا۔“ میری قطعیت آمیز سفاکانہ تہدید پر اس نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے موبائل نکالا اور نمبر پنچ
لگا۔ اس نے ایسا دو تین بار کیا پھر منمناتی آواز میں بولا۔

”مم .... میرے موبائل کی .... بب .... بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ شش .... شاید

اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے سلگتے وجود میں ان گنت آتش فشاں پھٹنے لگے۔ میرے جی میں تو آ
اسی وقت اس رذیل کا قصہ پاک کر دوں مگر میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ جیپ خراب ہو چکی
موبائل کی بیٹری نے کام چھوڑ دیا تھا۔ میری جان سے عزیز ہستی نگینہ کو موت کا حکم صادر کیا جا چکا
میں تصور میں اپنی پہلی اور آخری محبت نگینہ کی نرم و نازک گردن کی طرف بڑھتے ہوئے دو خوفناک
دیکھ رہا تھا۔ بے بسی کے انتہائی جاں گسل احساس تلے میرا پورا وجود لرزنے لگا۔ میں کسی تماشائی کی
نگینہ کی موت کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی اُبلتی کھولتی حالتِ جنوں پر قابو پایا اور ملک
سردار کو جیپ کے اندر ہی محبوس کر کے دروازوں کو لاک کیا، پھر بونٹ اٹھا کر جلدی جلدی خرابی
کرنے لگا۔ مجھے اپنی جیپ کا تجربہ تھا۔ فوراً ہی میں نے خرابی تلاش کی۔ فیول ٹینک سے کاربوریٹر
پیٹرول پہنچانے والی نلکی نکل گئی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے درست کیا اور پھر بہ سرعت ملک سردار
کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”جلدی چلاؤ گاڑی۔ جلدی .... ایک لمحے کی بھی دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ میں حلق کے بل
ناک آواز میں چلایا اور اس نے فوراً جیپ اسٹارٹ کی۔ رات کے تاریک، چیختے ہوئے سناٹے میں
غرا کر اسٹارٹ ہوا تھا۔ پھر اس نے فوراً گیئر بدلا اور ایک طوفانی جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

”کتنی دور ہے وہ جگہ؟“ میں نے اپنی جنونی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا

”تھ .... تھوڑی ہی دور ہے۔ تت .... تین چار .... کک .... کلومیٹر۔“ وہ لکنت
لہجے میں بولا اور میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑ رہی تھی مگر میرے دل و دماغ اس وقت کروڑوں میل فی
رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ میرے اندر وحشتوں کا طوفانِ بلاخیز سر اُبھار رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا

میں اُڑ کر منزل تک پہنچ جاؤں کہ اپنی جان سے عزیز ہستی نگینہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاؤں۔ اندیشناک لمحوں کا ایک ایک پل متوقع وسوسوں کی بھاری سل کی طرح اس سے میرے دل و جگر کو پیستا گزر رہا تھا۔

سڑک دور دور تک ویران اور قدرے بل کھاتی ہوئی تھی۔ میری چھلنی ساعتوں میں نگینہ کی ہراساں اور گھٹی گھٹی چیخیں اُبھر رہی تھیں۔

”آں .... نادر! مم .... مجھے .... بب .... بچالو۔ یہ .... دو خوفناک ہاتھ .... میری گردن دبوچنے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ نادر! .... تم کہاں ہو؟ .... تمہاری نگینہ ہمیشہ کے لئے تم سے بچھڑنے والی ہے۔ مجھے مرنے سے بچالو .... آہ .... کیا ہماری محبت کی بس اتنی تھوڑی عمر تھی؟ آہ .... ابھی تو ہمارے ارمانوں کے گلاب بھی پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ ان پُرشوق آنکھوں نے تو ابھی جشنِ بہاراں کے نظارے دیکھنے تھے۔ ان پیاسے لبوں کو تو ابھی آبِ خیزاں چکھنا تھا۔ کیا .... کیا یہ سب اتنی جلد .... قصرِ فنا کی وحشت ناک گہرائیوں میں گم ہو جائے گا؟“

وحشت ناک سناٹوں سے اُبھرنے والی نگینہ کی یہ یاس زدہ صدائیں مجھے بے حال کئے دے رہی تھیں۔

جیپ دو رویہ بد ہیبت ہیولوں کی طرح ایستادہ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے درمیان بل کھاتی، ویران سڑک پر طوفانی رفتار سے دوڑے جا رہی تھی۔

”جلدی .... اور تیز .... اور تیز .... رفتار بڑھاؤ۔“

میں شدید مضطرب ہو کر چلایا۔ وہ میرے جنوں خیز لہجے پر بری طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔ جیپ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ ذرا دور اریب قریب ڈھلوان چھتوں والے چوبی مکانوں کے پُراسرار ہیولے نظر آنے لگے۔ جیپ پکی سڑک سے اب نیم پختہ راستے پر اُتر کر ہچکولے کھاتی دوڑ رہی تھی۔ پھر چند ہی منٹوں میں سامنے ایک قدرے وسیع اراضی پر مجھے وہ چوبی کاٹیج نظر آ گیا۔ آسمان پر دمکتے طباق چاند نے بادلوں کی اوٹ سے روشن ضوفشانی کی تھی۔ جیپ کاٹیج کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رکی۔

میں نے ملک سردار خان کو باہر دھکا دیا اور خود بھی نیچے اُتر آیا۔

وہ پاگلوں کی طرح کاٹیج کی طرف ”غفورے! .... غفورے!“ کہتا ہوا دوڑا چلا گیا اور میں اس کے عقب میں۔

کاٹیج پر وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ جیسے وقت کو موت آ گئی ہو۔ میرا دل اب سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔

ملک سردار جیسے ہی کاٹیج کے دروازے پر پہنچا اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص نمودار ہوا۔

”غفورے! .... غفورے! .... وہ لڑکی ز .... زندہ ہے نا؟“

ملک سردار خان نے بدحواسی کے عالم میں اس شخص سے پوچھا جو بلاشبہ غفورا ہی تھا۔ وہ پہلے تو ملک سردار کو یوں اچانک ہی دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ میں نے پستول والا ہاتھ دانستہ اپنی پشت پر کئے رکھا تھا۔ میری نظریں غفورے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور میں وحشیانہ انداز میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

کاش .... یہ کہہ دے کہ .... اس نے ملک سردار کا حکم ماننے میں دیر کر دی ہے۔ کاش، یہ کہہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے کہ اس نے اپنے سفاک ہاتھوں سے نگینہ کا گلا نہیں دبوچا ہے۔

میرے اندر امید و یاس کی گردان ہو رہی تھی۔ ملک صاحب!.....آ.....آپ نے ہی تو حکم
تھا کہ اس لڑکی کا گلا دبوچ کر مار ڈالو۔ میں نے اسے ختم کر ڈالا ہے۔''

اس نے اتنا کہا اور میرے آس پاس جیسے خون کی آبشاریں پھوٹ پڑیں۔ میرے دل و دماغ
خوفناک آندھیاں چلنے لگیں اور پھر عجیب میکانکی انداز میں میرا پستول والا ہاتھ اٹھا۔ ٹھیک اسی وقت ملک
سردار خان نے گھبرا کر اپنی گردن گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ
کر ٹریگر دبا دیا۔

رات کے بے رحم سناٹے میں میرے پستول نے خوفناک دھماکے سے ایک شعلہ اُگلا جو ملک
خان کی پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہوتا چلا گیا

غفورے نے خوف اور حیرت کے باعث پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ سب وقوع پذیر ہوتے دیکھا
اور پھر دوسرے ہی لمحے ''صورت حال'' کی خطرناکی کو بھانپتے ہوئے آناً فاناً غائب ہو گیا۔

میں نے ایک نظر ملک سردار خان کے بدہیئت چہرے کو دیکھا جس کی پیشانی سے بہنے والا خون زمین
تک پہنچ گیا تھا۔ پھر تیزی سے غفورے کے عقب میں لپکا۔ وحشت اور غیظ کے سبب مجھے یہ بھی دھیان
نہیں رہا تھا کہ اس طرح دیوانہ وار کاٹیج کے اندر داخل ہونا خود میری اپنی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ میں
اس جگہ اجنبی تھا جبکہ میرا دشمن غفورا اسی کاٹیج کا باسی تھا۔ وہ میری وحشت سے فائدہ اٹھا کر مجھے اپنا نشانہ
بنا سکتا تھا۔ مگر مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں دیوانہ وار اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ لیکن میری چھٹی ساعتوں میں تو
بس نگینہ کی گھٹی گھٹی چیخیں گونج رہی تھیں اور غفورے کے وہ بے رحم الفاظ ..... کہ اس نے نگینہ کا گلا
دبوچ کر اسے مار ڈالا تھا، کسی آتشیں بگولے کی مانند میرے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے

میں زخمی شیر کی طرح کاٹیج کے اندر داخل ہوا ..... میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی
تھی۔ میں نے شعلہ بار آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا مگر غفورا کہیں نظر نہ آیا۔ میرے دائیں جانب مختصر
سی راہداری تھی اور اس کے بعد کسی کمرے کا دروازہ تھا۔ میں طوفانی بگولے کی طرح اسی سمت بڑھا اور
دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ میں ملک سردار خان سے
چھینا ہوا پستول ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوا تو اچانک میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ بے
اختیار میرے حلق سے کربناک چیخ بلند ہوئی اور میری آنکھوں کے سارے مناظر دھندلانے لگے۔ مگر یہ
سب ایک لمحے کے لئے ہوا تھا۔ میرے اندر کی آتشِ غیظ نے اس قیامت کی اذیت کو نگل لیا تھا اور
دوسرے ہی لمحے میں پلٹا تو غفورا ایک لمبا سا موٹا ڈنڈا اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے اگلے وار کے لئے
پر تول رہا تھا۔ میں نے خود کو اس کے اگلے حملے سے بچانے کی کوشش کی مگر اس بار ڈنڈا میرے سر پر
پڑنے کی بجائے میرے پستول والے ہاتھ پر پڑا اور پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے مجھ پر
تیسرا وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا مگر اب میں اسے موقع دینے والا نہیں تھا۔ میں نے بجلی کی سرعت کے
ساتھ اپنی دائیں ٹانگ اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ اُسے اس کی توقع نہیں رہی ہو گی۔ دوسرے یہ بھی
کہ میری لات میں غیر معمولی قوت تھی اس لئے میں نے غفورے کو کئی قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔
وہ گرتے گرتے بچا۔ میرے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ میں انگارا آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا جھپٹا، اس نے
ایک مرتبہ پھر ڈنڈا لہرایا۔ میں رکوع میں جھکا اور اپنا سر اس کے سینے سے ٹکرا دیا اور اسی طرح تیزی سے
اس رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس دوران میں یقیناً اس کے حواس بھی قدرے بحال ہو چکے تھے۔ لہٰذا
دیوار سے پشت لگاتے ہی اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے گھٹنے کی ضرب میرے چہرے پر رسید کر دی۔
میری آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ شکر تھا کہ ناک سے خون نہیں خارج ہوا تھا۔ تاہم اسے ایک موقع مل گیا۔

میں نے سر جھٹک کر آنکھوں کے پانی کو صاف کرنے کی کوشش کی اور اس دوران وہ کمرے کے ا دوسرے اندرونی دروازے سے غائب ہو گیا۔ میرے اندر کا کھلاڑی پوری طرح جاگ اُٹھا تھا۔ میرا اشتعال ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں بھی اس کے عقب میں دوڑا مگر اس مردود غفورے نے شاید میری خوں نا کیفیت اور خطرناک عزائم سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے ملک سردار خان کو موت کے گھاٹ اُتارتا دیکھ لیا تھا۔ چنا غفورے نے کمرے سے نکلتے ہی دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ میں شاید حالِ اشتعا میں بند دروازے کو ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ پھر اچانک مجھے فرش پر پڑے پستول کا خیال آیا۔ میں لپک کر اسے اٹھا لیا اور اوپر تلے دروازے پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

اچانک ایک گھر گھراتی آواز پر میں بری طرح چونکا۔ یہ کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی غفورا دوسری طرف سے باہر نکل کر ملک سردار خان کی جیپ میں فرار ہو رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی م دوسرے دروازے سے مختصر راہداری کی طرف آیا اور پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا کاٹیج سے باہر آ گیا۔ م خیال درست ثابت ہوا۔ غفورا میری نگینہ کا قاتل، جیپ میں فرار ہو رہا تھا۔ میں جب تک دوڑتا ہوا تک پہنچا، وہ آندھی طوفان کی طرح جیپ دوڑاتا تاریکی میں گم ہو گیا۔

احساسِ شکست اور بے بسی کے مارے میں دانت پیس کر رہ گیا۔

پھر اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں بے اختیار دوبارہ کاٹیج کی طرف دوڑا۔ میری آنکھوں کو اب ا ہولناک اور خونی منظر دیکھنا تھا۔ یہ وہ منظر تھا جو میرے لئے دنیا کا انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ میں اس کرب ناک منظر کو برداشت کرنے کی اپنے اندر تاب رکھتا بھی تھا یا نہیں مگر مجھے یہ سب د تھا......... میں جلتی آنکھوں اور سوختہ دل کے ساتھ کاٹیج کے ایک ایک کمرے میں گیا اور تب مجھے چھوٹے کمرے میں بیڈ پر بے سدھ پڑا ایک نسوانی وجود نظر آ گیا جسے دیکھتے ہی میں جیسے دروازے پر س ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دہکتے سینے میں غبارِ غم کا ایک گولا سا اُترنے لگا۔ آنکھوں میں آنسوؤں سیلاب اُمڈنے کے قریب تھا۔ دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ میرے پورے وجود پر رقت طا ہونے لگی۔ ایکا ایکی مجھے اپنے وجود کی ساری طاقت سلب ہوتی محسوس ہوئی۔

کمرے میں فقط ایک دودھیا بلب روشن تھا۔ پھر مجھے ایک جھٹکا لگا اور بے اختیار میرے لرزیدہ د میں امید کی جیسے بجھتی شمع کسی لوئے آخر کی طرح بھڑک اُٹھی۔ میری آنکھوں میں روشنی اُبھرنے لگی تھ

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول پھینکا اور بے ساختہ بیڈ کی طرف لپکا۔

میں جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ میرے اندر کی بھیانک اور ہولناک آندھیاں یکلخت ماند پڑنے لگی تھیں میری کائنات جیسے بکھرنے سے بچ گئی تھی۔ کیا ایسی انہونیاں بھی ہوتی ہیں؟ کیا جانکاہ صدمات کے ہا یوں بھی سرک جاتے ہیں؟

میرے سامنے جس لڑکی کی لاش تھی، وہ نگینہ نہ تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی میرے اجنبی تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا، وہ معصوم صورت لڑکی نظر حیات کی بیٹی اور کبیر احمد کی چھوٹی صدف حیات تھی جو نگینہ سے دو تین سال ہی چھوٹی تھی۔ میں نے فوراً اپنے حواس پر قابو پایا اور صدف لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی گردن کے گرد نیل کے ہلکے نشانات سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھ کھلی ہوئی تھیں جن میں ایک معصوم التجا کے ساتھ موت کی دہشت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے سنگ غفورے نے بڑی بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ گلا گھونٹ کر قتل کیا تھا اور یہ سب میری ماں شبینہ اور ما

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیدر گل کے ایما پر ہوا تھا۔ ایک بار پھر میرے اندر کی نفرت میں اضافہ ہونے لگا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ماں اور ماموں حیدر گل اس قدر سفاک بھی ہو سکتے تھے۔ اچانک بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔

میرے سامنے صاف کی لاش تھی، تو پھر نگینہ کہاں تھی؟ اسے کن لوگوں نے اغواء کیا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے ایک بار پھر مجھے بری طرح بے چین کر ڈالا تھا۔ دفعتہً مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا اور بری طرح ٹھٹک گیا۔ دروازے پر میں نے کبیر احمد کو کھڑے پایا جو بڑی کینہ توز نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس کی نال میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ میں ایک لمحے کو ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ بیڈ پر پڑی اور وہ لپک کر بیڈ کے قریب آیا، اپنی بہن کی لاش دیکھ کر ایک لمحے کو اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''ذلیل......... ! کتے !......... خونی !......... قاتل !......... تت......... تُو نے میری معصوم بہن کو مار ڈالا۔ مم......... میں تجھے زندہ.........'' وہ کپکپاتی ہوئی غیظ آلود آواز میں بولا اور مجھ پر اچانک گولی چلا دی۔ میں اسے روکتا رہ گیا۔ کمرے کے پُر ہول سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور میرے حلق سے بے اختیار ایک کرب ناک چیخ خارج ہو گئی۔ گولی میرے بائیں بازو کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ کبیر احمد صدمے اور طیش کی شدت سے بری طرح پاگل ہو رہا تھا۔ اسی خونخوار کیفیت میں اس نے اس بار مجھ پر اوپر تلے گولیاں داغ ڈالیں۔ میں چونکہ فوری طور پر اس نازک اور خطرناک صورتِ حال کا ادراک کر چکا تھا کہ کبیر احمد کو اس وقت میری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا، اپنی بہن کی لاش کو سامنے پا کر وہ کچھ سننے کو بھی تیار نہ تھا۔ آتشیں ہتھیار اس کے ہاتھ میں تھا اور میں اس کے سامنے۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے دوبارہ مجھ پر پستول تانتے ہوئے گولیاں برسائیں تو میں یکدم فرش پر گرا اور گرتے ہی میں نے ''سوئیپ'' کے انداز میں اپنی دائیں ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرا دی۔ نتیجتاً اس کے قدم فرش سے اکھڑ گئے اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میرا بازو شدید زخمی تھا۔ اس میں سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا مگر یہ زخم سہلانے کا وقت نہ تھا۔ وہ شدید مشتعل تھا اور اس کی آنکھوں اور چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے بے دردی سے ہلاک کرنے کا ایک بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرش پر گرتے ہی اس نے لوٹ لگائی اور کسی زخمی چیتے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ مجھ پر جھپٹتے ہی اس نے اپنے گھونسے کا پہلا وار میرے زخمی بازو پر کیا تھا۔ زخم در زخم درد کی ایک اذیت ناک لہر میرے پورے وجود میں اترتی چلی گئی اور میں بے حال سا ہونے لگا۔ کبیر احمد پر جنون طاری تھا۔ اس نے پے در پے کئی گھونسے میرے مضروب بازو پر مارے اور پھر میرے سینے پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں ان میں دیرینہ انتقام کی آگ مجھے صاف سلگتی محسوس ہوئی۔

''میں......... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ شدید ابال کی کیفیت میں غرا کر بولا۔ ''تُو نے میری معصوم بہن کا قتل کر ڈالا......... تُو سنپولیا ہے......... بول کتے! نگینہ کہاں ہے؟......... ورنہ......... ورنہ.........''

شدید غصے اور غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پایا اور ہانپنے لگا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ تو تقریباً بے کار ہی ہو چکا تھا جبکہ محض دوسرے ہاتھ سے میں کبیر احمد کے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے مقدور بھر نبرد آزما تھا۔ لحہ بہ لحہ اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر

اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ مجھے تو اب سانس لینے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔ میری آنکھیں ابلنے کے قریب ہو گئیں۔ وہ اپنے توانا بدن کی پوری قوت صرف کر رہا تھا اور میں بے سدھ اس کے وجود کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا، جیسے اب مجھے جنونی کبیر کے خونی شکنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن میں ایسی بے بسی کی موت بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے بے دم ہوتے وجود کی قوت کو بہ مشکل سمیٹا اور پھر یکدم ایک ذرا پہلو کے بل لوٹ لگانے کی کوشش کی مگر کبیر احمد کسی پہاڑ کی طرح مضبوطی سے میرے سینے پر جما رہا۔ تب میں نے اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ کر اپنے وجود کو کمان کیا تو اس کی گردن میری دونوں ٹانگوں کے شکنجے میں پھنس گئی۔ میں اسے ''لیگ لاک'' کر چکا تھا۔ ایک ذرا کامیابی ملتے ہی فطری طور پر میرے اندر کا اسپورٹس مین بیدار ہوا اور پھر جوں ہی میں نے اپنی ٹانگوں کو جھٹکا دیا، کبیر احمد کے حلق سے خرخراتی غراہٹیں خارج ہونے لگیں اور میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ حتیٰ کہ اسے میری گردن چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی دونوں ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی دائیں جانب لوٹ لگائی تو کبیر احمد کا وجود میرے اوپر سے اکھڑ گیا۔ مگر پہلو کے بل فرش پر گرتے ہی اس نے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میری ناف کے قدرے نچلے حصے پر رسید کر دی۔ میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی اور وہ گرفت کمزور پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپ کر میری ٹانگوں کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑا گیا۔ پھر وہ دوبارہ فرش پر قریب ہی گرے اپنے پستول کی طرف لپکا۔ میں نے بھی زخمی ہونے کے باوجود نہایت پھرتی کے ساتھ اپنے پستول کی طرف پیش قدمی کی اور جھک کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کبیر احمد مجھ پر گولی چلاتا، میں نے اپنے پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا اور بلا تاخیر گھوڑا دبا دیا مگر اس میں سے سوائے ٹرچ کی آواز کے کچھ برآمد نہ ہو سکا۔

موت سے پہلے یقینی موت کا تصور بہت جاں گسل ہوتا ہے، جس کا اندازہ اس وقت صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں تشویش آمیز پریشانی سمٹ آئی۔ جبکہ کبیر احمد شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ میری بے بسی دیکھتے ہوئے بڑی قہر آلود مسکراہٹ سے غرا کر بولا۔

''بس........ نادر علی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔ تم نے میری معصوم بہن کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ میں تمہیں اب کتے کی موت ماروں گا۔''

''کبیر!........ میری بات کا یقین کرو۔ میں نے تمہاری بہن کو مارا ہے اور نہ ہی اسے میں نے اغوا کرایا تھا۔'' بالآخر میں نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے اس سے کہا۔ ''کبیر! اگر میں نے نگینہ کو اغواء کیا ہوتا تو وہ بھی ادھر ہی کہیں ہوتی۔ تم بے شک اس کاٹیج کی تلاشی لے سکتے ہو۔ کیا تم نے باہر کسی کی لاش نہیں دیکھی؟ وہ ملک سردار خان کی لاش تھی، جس نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے ایما پر تمہاری بہن کو اغواء کیا تھا اور یہاں........''

''میں نے کہا نا .... اپنی بکواس بند کرو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔'' وہ دھاڑ کر بولا۔ ''میں نے باہر کسی کی لاش پڑی ہوئی نہیں دیکھی ہے۔ سمجھے تم!''

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھٹکا۔

''تم نے........ اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے اشارے پر یہ سب کیا تھا۔ ان دونوں انتقام کے مارے بہن بھائیوں نے تمہیں ہمارے خلاف اژدھا بنا ڈالا ہے اور تم نگینہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا چکے ہوتا کہ رفتہ رفتہ اس کے ذریعے تم ہمارے گرد بھی اپنی مکروہ سازش کا جال بن سکو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس کی باتیں سن کر ہکا بکا سا کھڑا بے اختیار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''چلو اندر........'' معاً اس نے مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا حکم دیا۔

میں نے بے اختیار قدرے طمانیت کی سانس لی۔ شاید وہ مجھے فوری طور پر موت سے ہمکنار کرنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کی اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے مجھے کمرے میں دھکیلنے کے بعد باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

میں ذرا دیر تک دروازے سے چپکا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے دروازے کے دوسری طرف اب گہری خاموشی محسوس ہوئی۔ مجھے اچنبھا ہونے لگا کہ آخر کبیر احمد کا مجھے یہاں قید کرنا کیا معنی رکھتا تھا؟ تب پھر اچانک ایک لرزہ خیز خیال بجلی کی طرح میرے شل ہوتے ہوئے دل و دماغ میں کوندا۔

''کہیں وہ بدبخت مجھے یہاں بند کر کے پولیس کو تو مطلع کرنے نہیں چلا گیا؟''

یہ روح فرسا خیال آتے ہی میری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہونے لگا۔ میں نے بہرحال اپنی زندگی کا پہلا قتل کیا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ بہ قول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

میں نے فکرمندی سے سوچا۔ میں نے خود ملک سردار خان کی پیشانی پر حالتِ اشتعال میں گولی داغی تھی۔ وہ میرے سامنے تیورا کر گرا تھا اور موقع پر ہی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پھر اس کی لاش کہاں گئی؟ یہ وہ سوال تھا جو بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اچانک پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

'کہیں .... کبیر احمد نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا تھا؟'

'مگر کیوں؟ .... اُسے یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟'

میں نے خود ہی اپنے سوال کو رد کرتے ہوئے سوچا۔ میں شدید اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے ان سارے سوالات کو ذہن سے جھٹکا اور یہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا۔

سردست تو مجھے اپنے مفر کی راہ سجائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے میں فقط ایک کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے قریب ایک چوکور روشن دان تھا۔ مضبوط لکڑی سے بنا دروازہ باہر سے بند تھا۔ سامنے بیڈ پر صدف کی لاش پڑی تھی اور ماحول پر عجیب سا پراسرار سناٹا طاری تھا۔

میں نے دروازے کے ساتھ مقدور بھر زور آزمائی کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے کسی آہنی شے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، جس کی مدد سے میں دروازے کے انٹرلاک کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ مگر مجھے ایسی کوئی شے بھی نظر نہ آ سکی۔

ناچار میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

مجھے اگرچہ اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ بدبخت کبیر پولیس کو اطلاع دینے ہی گیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے تئیں مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے تسلی تھی کہ اس کی بہن صدف حیات کا قتل میں نے نہیں کیا تھا اس لئے مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ مگر پریشانی مجھے ملک سردار خان کے قتل پر ہو رہی تھی جسے میں نے نگینہ کو ہلاک کرنے کے حکم پر شدید اشتعال کی حالت میں مار ڈالا تھا۔ اگرچہ وہ ایسی ہی موت کے قابل تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی اور نکلا تھا۔ پھر اب بہ قول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اسے باہر کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ میرے لئے اچنبھے کا باعث تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر کبیر احمد

نے سچ کہا تھا تو یہ بات بھی میرے حق میں ایک طرح سے بہتر ہی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں سردست قانون کے شکنجے سے بچ سکتا تھا۔ کبیر احمد کو گئے، گھنٹے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا۔

اچانک میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح چونک گیا۔ شاید کبیر پولیس والوں کو یہاں لے آیا تھا۔

یہ گویا میرے لئے ایک اور نئی مصیبت کا آغاز تھا۔ پولیس والوں کے ہاتھوں بننے والی اپنی درگت مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ میں نے دروازے کی باریک جھری سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر سوائے تاریکی کے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر گویا تن بہ تقدیر ہو گیا۔ میں اب کمرے میں بند دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے یوں ٹھٹکی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا جیسے ابھی کوئی ہولناک منظر دروازے کو توڑتا ہوا اندر داخل ہونے والا تھا۔

اچانک دروازے کے بالکل قریب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے انٹرلاک میں ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.....!

❄ ❄ ❄

پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہ آیا کہ میں جو منظر دیکھ رہا تھا وہ حقیقی تھا یا خواب.....؟

میرے سامنے کبیر کھڑا تھا۔ اس نے ایک بدمعاش ٹائپ کے گنجے شخص کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا جو میرے لئے سراسر اجنبی تھا۔ لیکن میرے چونکنے کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ ان کے ہمراہ انتہائی مضطرب الحال انداز میں میری وہ عزیز ترین اور جان جاناں گل بداماں ہستی کھڑی تھی جس کی خاطر میں قتل جیسے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ ہاں، وہ نگینہ ہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی کے علاوہ اُلجھن آمیز تاثرات مترشح تھے۔

''دیکھ لو نگینہ! اپنی آنکھوں سے اس سنپولیے کا اصل روپ۔'' معاً کبیر نے میری طرف گھورتے ہوئے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر نگینہ سے کہا۔

''وہ دیکھو..... سامنے میری معصوم بہن صدف کی لاش پڑی ہے، جسے اس ظالم اور سفاک انسان نے بے دردی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اب یہ تمہیں بھی اسی طرح اغوا کرنے کے بعد ہلاک کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتا تھا کہ میں بروقت پہنچ گیا۔''

''یہ کیا بکواس کئے جا رہے ہو تم کبیر؟'' اس کی لغو بیانی پر میں آپے سے باہر ہو گیا اور چلا کر بولا۔

نگینہ نے ایک نگاہ بیڈ پر صدف کی بے سدھ پڑی لاش پر ڈالی مگر وہ خاموش رہی۔ کبیر شاید نگینہ کی طرف سے میرے لئے نفرت انگیز ردِعمل کی توقع کئے ہوئے تھا مگر اسے گومگو کی خاموشی میں پا کر اس نے دوسرا حربہ آزمایا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے گنجے بدمعاش کی کنپٹی پر اپنے پستول کی نال چبھوتے ہوئے غرا کر کہا۔

''تم بتاؤ، اصل حقیقت کیا تھی؟ ورنہ تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔''

گنجا بدمعاش گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ''مم..... میرا کوئی قصور نہیں ہے جی۔ مم..... میں تو حکم کا غلام تھا۔''

''کس کے حکم کے غلام تھے؟ بولو جلدی..... ورنہ.....'' کبیر نے دوبارہ پھنکارتے ہوئے اس سے کہا۔ میں حیران پریشان کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ..... وہ جی، ان تینوں کے حکم پر میں نے پہلے صدف کو اور پھر نگینہ کو اغوا کیا تھا۔''

''کن تینوں کے حکم پر؟..... نام لو۔''

''یہ..... یہ نادر علی، اس کی سزا یافتہ ماں شبینہ اور اس کے ماموں حیدر گل کے کہنے پر۔'' اس کے سفید جھوٹ پر میری آنکھوں میں حیرت کے سمندر موجزن ہو گئے۔

''یہ..... یہ جھوٹ بول رہا ہے کمینہ۔'' اس کے پے در پے سفید جھوٹ پر میں پھٹ پڑا۔ ''میں..... میں تو اسے جانتا تک نہیں۔

''واہ جی واہ!..... نادر میاں! آپ نے ہی تو میرے ساتھ مل کر نگینہ بی بی کو اغوا کیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد صدف کو۔''

''بکواس بند کر کمینے انسان! میں تیرا خون پی جاؤں گا۔'' میں اس کی مسلسل بکواس پر مارے طیش کے سرخ ہو کر دہاڑا اور چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لوں کہ کبیر فوراً اپنے پستول کا رخ میری جانب کرتے ہوئے حلق کے بل گرجا۔

''خبردار نادر!..... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ تمہارا پول کھل چکا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کہ تم نے ہم سے برسوں پرانی دشمنی خوب نبھائی۔ مجھے تو اس دن سے ہی تم پر شبہ ہو گیا تھا جب تم ہمارے ہاں آئے تھے اور نگین کے پپا شاہ میر اور میرے ڈیڈی (نظر حیات) کو تم نے اپنی لچھے دار باتوں سے متاثر کیا تھا۔

وہ جانے کون کون سے جنموں کے زہر اُگل رہا تھا۔ جبکہ اس کی رقیبانہ سازشوں کے ایک ایک تار و پود سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مردود یہ نیا جال مجھ پر پھینک کر مجھے نگینہ کی نگاہوں میں پھر مشتبہ کرنا چاہتا تھا۔

میری گھورتی ہوئی خوں ناک نظریں کبیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے قریب کھڑی نگینہ کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ نگینہ کی پیہم اور اسرار بھری خاموشی اسے بری طرح کھل رہی ہے۔

میں نے نگینہ کے گم صم چہرے کی طرف دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے اسے مخاطب کر کے بولا۔

''نگینہ! یہ سازشی انسان اس سے پہلے بھی ہمارے بیچ دراڑ ڈالنے کی ایک مذموم اور ناکام کوشش کر چکا ہے۔ مجھے اس کے لہجے سے ہی سازش کی بُو آتی ہے۔ میں اپنی صفائی میں محض اتنا ہی کہوں گا کہ میرے دل میں کسی بھی دشمنی کا کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اغوا کرنے جیسے ناپاک فعل کا تصور کر سکتا ہوں۔ صدف کو میں نے قتل نہیں کیا بلکہ میں تو تمہارے دشمنوں کو تلاش کرنے کی کوششوں میں تھا جس میں مجھے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔''

''ہمارے دشمن کون ہیں؟'' معاً نگینہ نے مجھ پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میری ماں شبینہ اور ماموں حیدر گل۔'' میں نے کہا اور نگینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس لمحے میں نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہ کچھ بھانپنا اور اخذ کرنا چاہ رہی ہو اور اس میں خاطر خواہ کامیاب بھی رہی ہو۔

''نگینہ! اس فریبی اور دغا باز کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ خود کو اپنی ماں اور ماموں سے الگ کر کے تمہاری نظروں کے سامنے اپنے بھیانک جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' کبیر نے پھر میرے خلاف زہر اگلتے ہوئے نگینہ کو مجھ سے متنفر کرنے کی کوشش کی تو نگینہ نے اسے ٹوکتے ہوئے گہری مگر پُرغور

سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''کبیر! اگر نادر ہمارا واقعی دشمن ہوتا تو یہ کبھی بھی اپنی ماں اور ماموں کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتا۔'' اس کی بات پر کبیر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ البتہ نگینہ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے جذ... ہوئے بغیر، ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بہ غور حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کبیر سے میری حمایت... ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی کہ وہ اپنی بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پھر میں نے بھی نگینہ کو حالاتِ گزشتہ کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا کہ کس طرح میں اس کی ت... میں پاگل ہو رہا تھا اور چونکہ مجھے پہلے ہی اپنی ماں اور ماموں حیدر گل پر شبہ تھا اسی لئے میں اس کی... لینے لگا اور یوں میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ پھر ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک... تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہاں ان کے ایک غفورے نامی ساتھی نے صدف کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک... ڈالا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے میں ملک سردار خان کے قتل کا ذکر دانستہ گول کر گیا تھا۔

یہ سب سن کر نگینہ کے چہرے پر ہلکی سی جوش آمیز تمتماہٹ اُبھری تھی پھر اس نے کبیر سے ایک... ہی اہم سوال کر ڈالا۔

''کبیر! تم ایک بات یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک ایسی گمنام جگہ پر مقید ہوں جہاں تم... مجھے آزاد کرانے پہنچے تھے؟''

اب تو کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنے چہرے کے تاثرات پر... پاتے ہوئے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

''مم......... میں نے اس کے ساتھی کا تعاقب کیا تھا۔''

''کون سے ساتھی کا تعاقب کیا تھا؟'' نگینہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''یہ جو میرے ساتھ کھڑا ہے۔'' کبیر نے گنجے بدمعاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کبیر نے مجھے نگینہ کی نگاہوں میں مجرم ثابت کرنے کی ایک اور ناکام سازش کی تھ... چنانچہ میں کبیر کی سازش کا تارو پود بھانپتے ہوئے نگینہ سے بولا۔

''نگینہ! حقیقت یہ ہے کہ کبیر نے ہی تمہیں اغوا کیا تھا تاکہ بعد میں تمہیں وہ خود ہی بازیاب کر... مجھے تمہاری نگاہوں کے سامنے گرا سکے۔ البتہ میں یہ بات پورے یقین اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت... سے کہتا ہوں کہ کبیر کی بہن صدف حیات کو غفورے نامی شخص نے ہی گلا دبوچ کر ہلاک کیا ہے اور جس... تعلق میری ماں اور ماموں حیدر گل سے تھا۔ وہ فرار ہو چکا ہے لیکن میں عدالت میں اپنی ماں اور ماموں... حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

نگینہ میری طرف سے مطمئن ہو چکی تھی۔ میری طرح وہ بھی اتنا سمجھ گئی تھی کہ اسے اغواء کرنے... کبیر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس گفتگو کے دوران بالکل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے کبیر کی طرف... سرکنا شروع کر دیا تھا۔ میں اب کبیر کی اس سازش کو پوری طرح بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ ایک موقع ملتے ہی میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ کبیر پر چھلانگ لگاتے ہوئے اس... پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ نتیجتاً وہ اپنا توازن قائم نہ... سکا اور زمین بوس ہو گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹا جسے زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اچک لیا...

''خبردار! تم دونوں اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا .... ورنہ گولی مار دوں گا۔'' میں نے ان دونو... پر پستول تانتے ہوئے خوف ناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گنجا بدمعاش حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ جبکہ کبیر کا چہرہ غیظ آلود ہو رہا تھا۔ وہ سنبھلتے ہوئے جارحانہ انداز میں اٹھ کر میری طرف لپکا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس پر گولی نہیں چلا سکتا تھا مگر میں نے اسے روکنے کے لئے دوسرا طریقہ آزمایا اور چلاّ کر بولا۔

''کبیر!.........تم اگر سچے ہو تو خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اس گنجے بدمعاش سے کچھ پوچھنے دو۔ بہ صورتِ دیگر ہم یہی سمجھیں گے کہ تم حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' میں نے دانستہ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا تھا اور یوں نگینہ بھی میرا اشارہ بھانپ کر اس سے میری تائید میں بولی۔

''کبیر! نادر کو حقیقت بے نقاب کرنے کا موقع دو یا پھر اپنا جرم تسلیم کر لو۔''

نگینہ کے سپاٹ اور فیصلہ کن لہجے پر کبیر دانت پیس کر رہ گیا۔ میں نے گنجے بدمعاش کو گدی سے پکڑا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا کر غراتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو......... میرے سامنے سچ اُگل دو.........اور خود کو ایک بڑے جنجال میں پھنسنے سے بچا لو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا جرم بہت معمولی نوعیت کا ہوگا۔ لیکن اگر تم نے حقیقت چھپانے کی کوشش کی تو پھر یاد رکھو، پولیس خود ہی تم سے اچھی طرح حقیقت اُگلوا لے گی۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو۔''

میری بات پر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میری عقابی نظروں نے اس ٹائپ کے گلی کوچوں والے بدمعاش کی ''کیفیت'' بھانپ لی تھی جو پولیس کے دبکا دبکے سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خاصا پریشان اور مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔

''وہ جی!......... یہ سچ ہے کہ نگینہ بی بی کو کبیر نے میری مدد سے ہی اغوا کیا تھا۔'' بالآخر اس نے ٹھوس لہجے میں حقیقت اُگل ہی دی۔ کبیر جیسے پھٹ پڑا۔

''یہ......... یہ جھوٹ بول رہا ہے......... نگینہ! نادر نے بڑی چالاکی سے اسے پولیس سے خوف زدہ کر کے اپنی مرضی کا بیان اُگلوانے پر مجبور کیا ہے۔'' وہ گنجے بدمعاش کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر اس سے بولا۔

''میں تیرا خون پی جاؤں گا.........تُو نے میرے خلاف جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے کی؟''

''کبیر! اس طرح تو تم بھی اسے دھمکی دے کر ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' نگینہ نے ناگوار نظروں سے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا مگر گنجا بدمعاش کبیر کے رویے سے چنداں خوف زدہ ہوئے بغیر جوش سے بولا۔

''جس پرانے ریسٹ ہاؤس میں تم نے نگینہ بی بی کو یرغمال بنا کر رکھا تھا، وہ تمہاری ملکیت ہے......... ٹھیکے دار عزیز اللہ خان اس بات کا گواہ ہے۔''

اب تو کبیر احمد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مگر وہ پھر بھی تلملا کر خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ اس پر کوئی بھی اپنی ملکیت نہیں جتا سکتا۔''

میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کا لہجہ شکست خوردہ ہونے لگا تھا۔ اس پر گنجے بدمعاش نے میری طرف دیکھ کر جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بعض پرانے ریسٹ ہاؤس حکومت نے نیلام بھی کر دیئے ہیں۔ اس نے نیلام میں ہی وہ خریدا ہے۔ نادر صاحب! میں آپ کو ابھی ٹھیکے دار عزیز اللہ کا پتہ یا اس کا موبائل فون نمبر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتا ہوں۔ آپ اس سے خود ہی پوچھ لیں۔"

اس کی بات پر میں نے اور نگینہ نے بیک وقت کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو دھواں دھوا رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس کے اندر مزید اپنی "ہٹ" پر قائم رہنے کی سکت نہیں رہی لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔

"اب کیا کہتے ہو کبیر؟" میں نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کر کے نگینہ بھی اب جلتی سلگتی نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف گھورے جا رہی تھی۔

پھر دوسرے ہی لمحے کبیر نے فوراً کینچلی بدلی اور نادم ہو کر نگینہ سے بولا۔ "نگینہ! مم..... معاف کر دو۔ مم..... مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں نے ..... میں نے یہ سب اپنی تم سے ایک طرفہ محبت سرکشی میں کیا تھا۔ تم خود میری دلی کیفیت کا اندازہ کرو نگینہ! ..... اس شخص نے دوستی کی آڑ میں پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے اور تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔"

اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں اس کی مکاری پر تلملا اٹھا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نگینہ تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ نادر نے مجھے تم سے چھین لیا ہے۔ محبت کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اور میری تم سے دوستی تھی۔ اس لئے کہ ہمارے والدین بھی ایک دوسرے کے پرانے جاننے والے دوستوں میں سے تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس دوستی میں دل کا معاملہ بھی شامل ہو۔"

"تم کچھ بھی کہو نگینہ! مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔" اس بار وہ عجیب سے لہجے بولا تھا۔ نگینہ اسے جلتی نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

"کیا تم محبت میں زبردستی کے قائل ہو؟"

"ہاں ..... کوئی اگر اس طرح میری محبت کو مجھ سے چھین لے گا تو مجھے بھی اپنی محبت چھیننا ہے۔" ایکا ایکی کبیر کے لہجے میں جارحانہ خودسری عود کر آئی۔ نگینہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو دبا دبا کا تاثر اُبھرا تھا۔ تاہم میں نے کبیر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"کبیر! اگر تم نے نگینہ کو ذرا سا بھی گزند پہنچانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔"

"میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا سنپولئے! ..... اچھی طرح سے دیکھ لوں گا۔" کبیر نے جواباً بھرے لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا اور پھر بیڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی بہن صدف حیات کی لاش پڑی تھی۔ اس نے اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں اور نگینہ دم بخود کھڑے رہ گئے۔

"میں اسے ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" اس کے جاتے ہی میں دانت پیس کر بڑبڑایا۔

"نہیں نادر! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" معاً نگینہ نے پُرمتانت لہجے میں مجھ سے کہا اور میں چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر جیسے کچھ سمجھتے ہوئے میں نے گہری سانس لے کر چپ سادھ لی۔

وہ شاید نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پپا اور کبیر کے ڈیڈی کے درمیان پرانی دوستی میں کسی قسم کی دراڑ پڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ نظر حیات پر اس کی بیٹی صدف حیات کے قتل کی صورت میں قیامت بھی ٹوٹ پڑی تھی۔ گنجے بدمعاش نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا، تاہم میں نے اسے سرزنش کر کے جانے دیا۔

"چلو نگینہ! میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دوں۔ انکل شاہ میر تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو

ہوں گے۔" میں نے دھیرے سے نگینہ کو مخاطب کر کے کہا۔

پھر اس کے بعد ہم دونوں جیپ میں سوار ہوئے اور پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

پو پھٹے ہم شاہ میر کی کوٹھی پہنچے تھے۔ نگینہ کو میرے ساتھ زندہ سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ نگینہ نے ان سے اصل بات چھپاتے ہوئے محض اتنا ہی بتایا تھا کہ اسے چند اوباش غنڈے پکڑ کر لے گئے تھے مگر نادر نے مجھے بروقت ان کی قید سے چھڑا لیا تھا۔ نگینہ کی مرضی یہی تھی اس لئے میں بھی خاموش رہا۔ البتہ نگینہ نے جب انہیں نظر حیات کی بیٹی صدف حیات کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتایا تو وہ بری طرح چونکے اور پھر میں نے انہیں یہ سنگین اور سفاک حقیقت گوش گزار کی کہ صدف حیات کے قتل میں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا ساتھ ہے تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں سے انجانے خوف کی جھلک بھی نمایاں ہونے لگی۔ انہوں نے جلدی سے اپنی بیٹی نگینہ کو گلے لگاتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

"خدا کا شکر ہے بیٹی! کہ تم ان دونوں سفاک بہن بھائیوں کے خونی ہاتھوں سے بچ گئیں۔ اب مجھے ان کے خلاف کوئی عملی کارروائی کرنا ہی پڑے گی۔ ٹھہرو، پہلے میں اپنے دوست نظر حیات کو فون کر لوں۔" بھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک قریب دھرے فینسی ٹیلی فون اسٹینڈ پر رکھے فون سیٹ کی گھنٹی بج اٹھی..... انکل شاہ میر نے چونک کر ریسیور اٹھایا۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے چہرے کو تکنے لگے۔

"ہیلو..... ہاں، نظر حیات!..... اوہ، یہ بہت برا ہوا ..... مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔" دوسری طرف نظر حیات ہی تھے جن سے نگینہ کے پپا مخاطب تھے۔

"صدف میری بھی بیٹی تھی حیات! مجھے بہت ملال ہے، تم حوصلہ رکھو۔ وہ دونوں قاتل بہن بھائی قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکیں گے۔ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔" انہوں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر بہ عجلت ہم دونوں سے بولے۔

"آؤ..... نظر حیات کی طرف چلتے ہیں۔"

ذرا ہی دیر میں ہم تینوں نظر حیات کے سامنے موجود تھے۔ ان کا چہرہ شدید غم کی عکاسی کر رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ کے ساتھ ایک غیظ آلود جوش کی تپش بھی جھلک رہی تھی۔ ان کی بیگم نڈھال اور اندر کمرے میں تھیں اور عزیز رشتے دار عورتوں نے انہیں سنبھالا دے رکھا تھا۔ جبکہ کبیر بھی اس وقت اپنے چہرے پر سوگواری طاری کئے باپ کے قریب ہی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید اب تک اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ نگینہ نے اپنے اغواء وغیرہ کے سلسلے کو اپنا ذاتی معاملہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

انکل شاہ میر نے اپنے دوست نظر حیات کو ساری بات سنا ڈالی تھی اور ان کو یہ بھی بتایا کہ نادر یعنی میں اپنی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار ہوں۔ ایس پی وجاہت قریشی کو بھی فون کر کے بلا لیا گیا تھا اور میں نے انہیں تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد غفورے کے متعلق بھی بتا دیا تھا کہ اس نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے کہنے پر یہ سفاک قدم اٹھایا تھا۔ ایس پی وجاہت قریشی نے اسی وقت پولیس پارٹی کو ماں اور ماموں حیدر گل کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور غفورے کی تلاش کا بھی سختی سے حکم دے دیا گیا تھا۔

صدف حیات کی تجہیز و تدفین کے بعد رات گئے میں، انکل شاہ میر اور نگینہ واپس کوٹھی آ گئے۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوران میں ہمیں یہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ ایس پی وجاہت قریشی کے حکم کے مطابق ماں اور ماموں حیدر گل کو صدف حیات کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب ان دونوں بہن بھائیوں سے غفور کے سلسلے میں پوچھ گچھ جاری تھی۔

کوٹھی پہنچنے کے بعد انکل شاہ میر نے مجھے رات وہیں گزارنے کو کہا مگر میرا اب ''گرین لاج'' پہ ضروری تھا۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان سے کہا۔

''انکل! کیا اب بھی مجھے آپ لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کریں گے کہ آخر میری ماں، ماموں حیدر گل کی آپ لوگوں سے دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے؟..... ان حالات میں میرا یہ سب جاننا اور ضروری ہو گیا ہے۔''

میری بات پر انکل شاہ میر نے ایک گہرا اور پُرسوچ ہنکارا بھرا اور پھر دھیرے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں ان کے گمبھیر تاثرات کے حامل چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ مگر چونکہ یہ ساری حقیقت معلوم تھی اس لئے وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ماحول میں ایکا ایکی اعصاب شکن سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ انکل شاہ میر بالآخر آج مجھے ان سوالوں کے جوابات دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے جن سے میری ماں اور ماموں حیدر گل آج تک پہلو تہی کر آئے تھے۔

''نادر بیٹے!.....'' بالآخر انہوں نے کہنا شروع کیا اور میں سرتاپا سماعت بن گیا۔ ''چاہتے تو یہی تھے کہ یہ تلخ اور کریہہ حقیقت تمہیں اپنی ماں اور ماموں کی زبان سے معلوم ہوتی لیکن ان کی اس سلسلے میں بدستور خاموشی سے تم خود اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیوں خاموش ہیں؟''

انہوں نے چند لمحے کے لئے توقف کیا اور میری بے چینی لحظہ بہ لحظہ فزوں تر ہونے لگی۔ ان کا لمحے کے لئے متوقف ہونا بھی مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔

''ہمیں یہ حقیقت تمہیں بتانے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ لیکن اب شاید صدف حیات والے اندوہناک واقعے کے بعد تمہیں ہماری باتوں پر شبہ نہ رہے..... بہرحال سنو۔ یہ آج سے پورے پچیس سال کی بات ہے۔ نظر حیات اور میں تمہارے باپ قادر خان کے پرانے اور گہرے دوستوں میں سے تھے۔ قادر خان کی دوستی پر ہمیں آج بھی فخر ہے۔ وہ ایک دوست نواز اور غیور شخص تھا۔ تمہاری ماں یعنی قادر خان کی بیوی شبینہ، نظر حیات کی طرف ملتفت ہونے لگی لیکن نظر حیات چونکہ ایک شریف انسان تھا اس لئے وہ دامن بچاتا رہا۔ تمہاری ماں یہی سمجھی کہ نظر حیات، قادر خان سے ڈرتا ہے۔ پھر تمہاری ماں نے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر ڈالا لیکن قادر خان نے جب اس کی وجہ پوچھنا چاہی تو تمہاری ماں نے بتائے بغیر اپنی بات پر اڑی رہی۔ لہٰذا قادر خان نے اسے بری طرح سرزنش کی۔ تب پھر ایک روز تمہاری ماں نے اس بے چارے کا قتل کر ڈالا اور پھر وہ سیدھی نظر حیات کے پاس اس کے سرکاری ریسٹ ہاؤس جا پہنچی جہاں وہ تنہا ہی رہتا تھا کیونکہ اس وقت وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس وقت نظر حیات کے ہمراہ میں بھی تھا۔ ان دنوں میں محکمہ جنگلات میں گیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) تھا اور نظر حیات گورنمنٹ کانٹریکٹر۔ جبکہ تمہارا باپ قادر خان ایک بڑے لکڑی کے ٹال کا مالک تھا۔

''بہرطور..... جب تمہاری ماں نے نظر حیات کو یہ بتایا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے اپنے شوہر قادر خان کا قتل کر ڈالا ہے تو بے چارہ نظر حیات یکدم گھبرا گیا اور اس نے تمہاری قاتل ماں سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ تمہاری ماں نے اسے بھی قتل کر

دھمکی دی تو میں درمیان میں آ گیا اور کسی نہ کسی طرح تمہاری ماں کو ریسٹ ہاؤس سے جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر بعد میں ہم نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ پولیس شبینہ کو گرفتار کر کے لے گئی۔ آخر کو تمہارا باپ قادر ہمارا دوست تھا، ہم اس کا خون کیسے رائیگاں جانے دیتے۔ لہٰذا شبینہ پر مقدمہ چلا اور عدالت نے سزائے موت دے دی جو بعد میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے پر عمر قید میں بدل گئی۔''

انکل شاہ میر اتنا بتانے کے بعد خاموش ہو گئے۔

میں پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ میری سماعتوں میں انکل شاہ میر کا ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہا تھا۔ میرے پورے وجود کو جیسے تیز، نوکیلی برچھیوں نے چھلنی کر کے رکھ دیا تھا اور میں پھر بھی پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ میرے وجود کی عمارت برسوں پرانی جس تلخ کتھا کی گونج سننے کے لئے بے چین تھی، آج وہ ڈھینے لگی تھی مگر میں پھر بھی بت بنا بیٹھا تھا۔ میری چھلنی سماعتوں میں خزاں رسیدہ ہوائیں شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ جو کچھ میں نے سنا تھا وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا مگر میں انکل شاہ میر کے ان یقین اور بے رحم الفاظ کو جھٹلانے کی بھلا کیسے ہمت کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ میرے پیہم اصرار کے باوجود میری ماں اور ماموں حیدر گل کی اس سلسلے میں اب تک پراسرار خاموشی تھی جو انہیں لامحالہ مجرم ہی ثابت کئے ہوئے تھی اور میرے ان دونوں سے متنفر ہونے کی بھی ٹھوس وجہ یہی تھی۔

''نادر بیٹے! حوصلہ رکھو..... تم بہت ہمت والے لڑکے ہو۔ ٹیک اِٹ ایزی، مائی سن!''

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب انکل شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئے اور ازراہِ تشفی انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں مجھے مخاطب کیا تھا۔

پھر انہوں نے نگینہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو انہوں نے اسے مجھے ایک گلاس پانی دینے کو کہا۔ میں نے نگینہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور اپنے لرزیدہ ہونٹوں سے لگا کر غٹ غٹ سارا پانی پی گیا۔ پانی کی ٹھنڈک بھی میرے اندر کی تپش کو کم نہ کر سکی تھی۔ میرے سوکھے حلق میں ببول کا خارزار جنگل بدستور موجود رہا۔

''انکل! اب میں چلوں گا۔'' اچانک میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اپنے قدموں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''نادر! تم پپا کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آج کی رات ادھر ہی ٹھہر جاؤ، ہمارے پاس۔'' نگینہ نے بڑے رسان کے ساتھ کہا۔

''نہیں نگینہ! میرا اب گرین لاج پہنچنا ضروری ہے۔ میں پھر آؤں گا۔'' میں نے ہولے سے کہا تو انکل شاہ میر نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''نادر! مجھے تمہیں نصیحت کرنے کا کوئی حق تو نہیں ہے لیکن میں تم سے اتنا ضرور کہوں گا کہ تم کوئی بھی کام ہم سے مشورہ کئے بغیر نہیں اٹھاؤ گے۔ کیونکہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''جی انکل! آپ کو پورا حق حاصل ہے مجھے نصیحت کرنے کا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن میں اب سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے باپ کی جاگیر، کاروبار کو سنبھالوں تاکہ بعد میں میری ماں اور ماموں اس پر اپنا حق نہ جتا سکیں۔ میں انہیں بے دخل کر دوں گا۔''

''ہاں، یہ کام تو تمہیں سب سے پہلے کرنا ہو گا۔'' انکل شاہ میر نے فوراً میری تائید کی، اس کے بعد میں واپس لوٹ گیا۔

❄❄❄

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جیپ دوڑاتا ہوا گرین لاج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ
تھا جیسے میری زندگی اب سرخ آندھیوں کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ میری ڈگر بدلنے کو تھی۔ میں ہا
راستوں کا راہی بننے والا تھا۔ میں وہ بدنصیب شخص تھا جسے اس کی اپنی ماں نے اس وقت یتیم کر ڈا
جب وہ اس کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ میں اس دھرتی کا ایسا بوجھ تھا جس نے میری ماں کے شرمناک
کا اس قدر بھاری بوجھ اپنے جلتے ہوئے سینے پر اٹھا رکھا تھا جو مجھے زمین کے اندر گاڑے دے رہا
میرے جینے کا بھلا کیا مقصد تھا؟ میری ذات کے سارے حوالے، وہ پہچان جو ایک طرح کا نقا
کرتے ہیں، اپنوں ہی کے ہاتھوں فنا ہو چکے تھے اور جو باقی بچے تھے وہ میرے لئے باعثِ شرم و ند
تھا۔ مگر نہیں، میرا فخر تو زندہ تھا۔ میں تو ..... میں تو ایک غیرت مند باپ کا بیٹا تھا۔ جس نے غیر
خاطر جان دی تھی اور مجھے اس کا بدلہ لینا تھا مگر کس سے؟ اپنی ماں سے ..... یا ماموں حیدر گل سے
انہی شوریدہ سر خیالات کی کشاکش میں بالآخر میں اپنی پہاڑی رہائش گاہ ''گرین لاج'' پہنچا۔
حسبِ توقع میں نے وہاں فضل چاچا کو پریشان اور متفکر پایا۔ ''بیٹا! تت..... تم آ گئے.....
ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ فوراً میری طرف لپکے۔
''ہاں بابا! ..... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اندر اپنے کمرے میں آ گ
بھی حیران و پریشان میرے پیچھے چلے آئے۔
''بیٹا! وہ ..... وہ تمہاری ماں اور ماموں کو پپ..... پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔''
انہوں نے اپنے تئیں مجھے چونکا دینے والی اطلاع دی۔ مگر میں نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔
''بابا! مجھے معلوم ہے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ پولیس نے ان دونوں کو کیوں گرفتار کیا ہے؟''
''ہاں ..... مگر یہ جھوٹ ہے۔ دشمنوں کی سازش ہے۔'' بابا پُریقین لہجے میں بولا۔ مجھے ان کے
بے بنیاد یقین پر غصہ آ گیا اور میں پہلی بار ان سے ذرا سخت لہجے میں بولا۔
''بابا! پھر تم کچھ بھی نہیں جانتے ..... تم جاؤ، مجھے ذرا دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دو۔''
ان کے چہرے پر کرب کی لہر سی اُبھری اور وہ خاموشی سے سر جھکا کے لوٹ گئے۔
میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میرا سر نیند کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ تھکاوٹ بھی غالب آ رہی تھی۔
بیڈ پر لیٹتے ہی سو گیا۔

❋❋❋

انکل نظر حیات نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کو اپنی بیٹی صدف کا قاتل نامزد کر دیا تھا۔
نے عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لے کر ملزمان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔
میں نے کاروبار سنبھال لیا تھا اور اب باقاعدگی سے ''ٹال'' جانے لگا تھا۔
فضل چاچا کو دکھ تھا کہ میں ایک بار بھی ماں اور ماموں حیدر گل کی خیر خبر لینے متعلقہ تھانے نہ
تھا۔ اب تک البتہ وہ دونوں میاں بیوی ہر روز ان کے لئے کھانا لے کر جایا کرتے تھے۔ فضا
اگرچہ میری، ماں اور ماموں کے درمیان سرد جنگ کا علم تھا مگر انہیں اس کا قلق بھی تھا کہ میں
تک ماں اور ماموں کو مقدمے سے بچانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے اشاروں
میں میری اس طرف توجہ دلانے کی بھی کوشش کی مگر میں نے انہیں اس معاملے میں کسی بھی قسم کی
کرنے سے منع کر دیا تھا۔
البتہ ٹال کا وہ تیز طرار منیجر مشتاق گوندل ماموں حیدر گل کی گرفتاری پر کچھ زیادہ ہی بولایا ہوا تھ

یک روز اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس روم میں بیٹھا تھا کہ وہ صورت لٹکائے حاضر ہوا۔
''کیا بات ہے؟'' میں نے خشک نظروں سے اسے گھور کر کہا۔
''وہ جی ..... صاحب کے بغیر یہاں کا ماحول سُونا سُونا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے آدمی تھے جی
ہ۔ آپ نے ان کے لئے اب تک کوئی وکیل.....''
''منیجر.....!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔
وہ فوراً اٹینشن ہو گیا۔ ''جی ..... جی ..... سر جی!''
''تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اگر تمہیں صاحب (ماموں حیدر گل) کے بغیر یہاں مزہ نہیں آ رہا ہے تو
یہاں سے جا سکتے ہو۔''
اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''نن ..... نہیں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔''
''اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔'' میں نے اس کی طرف گھور کر تنبیہہ آمیز لہجے میں کہا۔
''کاروباری معاملات کے سوا یہاں اور کوئی بات نہ ہو گی۔ آئندہ ساری ڈیلنگ میں خود کروں گا .....
اور ہاں، آج ہی اخبارات میں حیدر گل کی طرف سے ہماری لاتعلقی کا اشتہار بھی دے دو ..... سمجھے تم۔''
''جج ..... جی ..... سمجھ گیا جی۔ آخر کو اب آپ بڑے آدمی ہو۔'' وہ اپنے مخصوص تکیہ کلام سے
باز نہ آیا۔
''کل میں اپنی میز پر اخبارات میں یہ اشتہارات دیکھوں گا ورنہ تم خود کو فارغ سمجھو۔ جاؤ اب۔''
وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔ ذرا دیر بعد مردان شاہ اندر داخل ہوا۔ یہ مزدور یونین کا لیڈر تھا اور بہت
سنتی تھا۔ ماموں حیدر گل کے مقابلے میں یہ میری زیادہ عزت کرتا تھا اور مزدوروں کے دلوں میں بھی
میرے لئے نسبتاً زیادہ احترام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ روز قبل میں نے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر
دیا تھا۔
''آؤ مردان شاہ! ..... بیٹھو۔'' میں نے ہولے سے مسکرا کر اس سے کہا۔
اس کا چہرہ ذرا افسردہ سا لگ رہا تھا۔ وہ میری اجازت کے باوجود کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ایسے ہی
کھڑا رہا۔
''کیا بات ہے مردان شاہ! کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔'' میں نے اس کی بدستور خاموشی پر نرمی سے پوچھا
وہ میری طرف افسردہ سی نگاہ ڈال کر بولا۔
''صاحب جی! ہم لوگوں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہمیں بڑے صاحب اور بی بی جی کی گرفتاری پر
بہت دکھ ہوا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ..... مگر صاحب جی! ہمارے دل بڑے ہیں۔ ہمارے سارے
زدور ساتھی بھی بے چین اور پریشان ہیں۔ آپ سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں لیکن اپنے دل کے
ھوں مجبور ہو کر انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کیونکہ ہم اتنے خودغرض نہیں ہیں کہ صرف اپنے
سئلے حل کرنے کے لئے یکجا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب مل کر عدالت جائیں اور وہاں بڑے صاحب
ور بی بی جی کے حق میں ان کی بے گناہی کی گواہی دیں۔ وہ قاتل نہیں ہو سکتے۔''
وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ماں اور ماموں حیدر گل کے ذکر پر اگرچہ میرے حلق میں کڑواہٹ سی
گھل گئی تھی مگر ان کی طرف سے ان کا پریشان ہونا فطری عمل تھا۔ بہرطور میں نے ایک گہری ہنکاری لی
اور متانت لہجے میں بولا۔
''مردان شاہ! میں تم لوگوں کے خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن جرم بہرحال جرم ہوتا ہے۔ اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی بے گناہ ہوئے تو عدالت دونوں کو باعزت بری کر دے گی۔"

"لیکن ..... صاحب جی! ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے بی بی جی اور بڑے صاحب کے لئے تک کوئی وکیل تک نہیں کیا ہے؟"

"مردان شاہ! میں نے اسے ذرا سخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہ تلخی عود کر آئی تھی۔ وہ بے چارہ میرے اس طرح پکارنے پر گھبرا سا گیا۔ "تم ..... اور کچھ کہنا چا ہو؟" میں نے اسے رخصت کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"نن ..... نہیں ..... صاحب جی!"

"ٹھیک ہے ..... تم جا سکتے ہو۔"

وہ واپس جانے کے لئے مڑا مگر پھر ایک لمحے کو رک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "صاحب میری بات بری لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکراتے ہوئے سر ہلا وہ چلا گیا۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لئے نظر حیات نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا اس نے شہر کے بہترین وکیل کو بھی "ہائر" کر لیا تھا۔ عدالت میں مقدمہ پیش کیا جا چکا تھا۔ جہاں مجھے اور ماموں کے خلاف گواہی کے لئے پیش کیا جانے والا تھا اور اس سلسلے میں نظر حیات اور انکل شاہ نے مجھ سے رابطہ بھی کیا تھا بلکہ اس سلسلے میں ایک روز وہ دونوں خود ہی مجھ سے ملنے گرین لاج آ تھے۔ ان کے ہمراہ نگینہ بھی تھی۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ دور برف پوش پہاڑوں سے سورج پوری طرح چکا تھا اور نیچے وادی کے جنگل میں پرندوں کی گونجیلی چہکاریں بلند ہونے لگی تھیں۔

وہ لوگ کار میں آئے تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ میں بھی لاج میں ہی موجود تھا۔ آنے سے قبل نگینہ مجھے فون کر کے آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

میں نے فضل چاچا اور ان کی بیوی سکینہ کو "مہمانوں" کی آمد کے بارے میں بتایا، وہ کاموں مصروف ہو گئے۔ بالآخر وہ لوگ پہنچ گئے۔

فضل چاچا انکل شاہ میر اور نظر حیات کو پہچانتے تھے۔ ان کے چہرے پر پہلے حیرانی اور پھر بعد ناگواری کے تاثرات اُبھرے تھے۔ تاہم ان کا استقبال میں نے کیا تھا۔

"نادر بیٹے! کل تمہاری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیشی ہے۔ ہم نے سوچا تمہیں مطلع کر دیں رسمی علیک سلیک کے بعد نظر حیات نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں نے بلا توقف جواب دیا۔

"آپ بے فکر رہیں ..... میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"شاباش بیٹے! ہمیں پوری امید تھی کہ تم حق کی خاطر ہمارا ساتھ دو گے۔" اس بار انکل شاہ میر مجھ سے کہا۔ نگینہ ان کے قریب ہی خاموش بیٹھی تھی۔ "نادر بیٹے! ہمیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے تمہیں تمہاری ہی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینی پڑ رہی ہے۔ لیکن میری معصوم بیٹی صدف کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید ....." انکل نظر حیات کچھ کہتے کہتے رک گئے، پھر فوراً ہی بولے۔ "اگر تمہارے دل پر کسی قسم کا بوجھ محسوس ہو تو کوئی بات نہیں، ہم تم پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتے۔"

"نہیں انکل!" میں فوراً قطعیت سے بولا۔ "اگر میں نے گواہی نہ دی تو اس صورت میں میرے پر بوجھ ضرور پڑے گا۔ اور یہ ایک بے گناہ اور معصوم بچی کا قتل ہے۔ اگر آپ مجھ سے نہیں بھی کہتے تو

ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس کی گواہی دینے عدالت پہنچ جاتا اس لئے آپ اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ نہ لیں۔"

"بیٹا! تم نے واقعی میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔" میرے لہجے کی سنجیدگی اور قطعیت نے انکل نظر حیات کو بہت متاثر کیا تھا۔

"انکل! پیشی کب ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"کل گیارہ بجے۔" اس بار نگینہ کے پپا انکل شاہ میر بولے۔

"ٹھیک ہے ..... میں صبح ساڑھے دس بجے عدالت پہنچ جاؤں گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"بہت شکریہ بیٹا! اب ہم چلیں گے۔" انکل نظر حیات نے کہا اور اٹھنے لگے تو میں نے انہیں روکنا چاہا لیکن وہ لوگ خاصی عجلت میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے فضل چاچا پر غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک مہمانوں کے لئے چائے وغیرہ سرو نہیں کی تھی۔

"بیٹھیں انکل! کچھ کھا پی کر تو جائیں ..... آخر کو پہلی بار آئے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے فضل چاچا کو آواز دینا چاہی تو انہوں نے مجھے روک دیا۔

"نہیں بیٹا! اپنا ہی گھر ہے، کیس جیتنے کے بعد ہم باقاعدہ کھانا کھانے آئیں گے۔ سمجھو، ہماری دعوت تم پر اُدھار رہی۔"

اس کے بعد میں انہیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ کن انکھیوں سے نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے جانے کیوں مجھے وہ کچھ مضطرب سی نظر آئی۔

ان کے جانے کے بعد میں غصے سے بھرا ہوا اندر آیا اور سامنے فضل چاچا کو کھڑے پایا تو میرا غصہ دو آتشہ ہو گیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ناگوار لہجے میں بولا۔

"بابا! میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی اوقات بھول جاؤ۔" میرے سخت جملوں پر انہوں نے بڑی کرب انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا مگر کچھ بولے نہیں۔ مجھے ان کی ڈھٹائی پر مزید غصہ آ گیا۔

"کیا تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں رہی ہے کہ کوئی مہمان آتا ہے تو اسے چائے پانی کو پوچھا جاتا ہے؟"

"وہ مہمان نہیں، ہمارے دشمن تھے۔" فضل چاچا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"فضل چاچا!" میں نے بھنا کر کہا۔ "تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے مہمانوں کو دشمن کہنے کی؟"

"نادر بیٹا! اپنے دشمنوں کو پہچاننے کی کوشش کرو۔" وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "اور یہ کیا، تم نے بڑے صاحب اور بی بی جی کے خلاف کل عدالت میں ان کے کہنے پر گواہی دینے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے؟" ان کی بات نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

میں انہیں قہر آلود نظروں سے گھور کر درشتی سے بولا۔ "فضل چاچا! تمہیں ہماری باتیں سننے کی جرأت کیسے ہوئی؟ ..... اور تم کون ہوتے ہو، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے والے، میری مرضی ..... میں کچھ بھی کروں۔"

"نادر بیٹے! تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ خدا کے لئے اپنوں کو اور دشمنوں کو پہچانو۔ میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں اسے تباہ و برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔" ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ حقیقت تھی کہ فضل چاچا ہمارے بہت پرانے خدمت گار تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ جب وہ میری عمر کے تھے اور اپنے بیمار بوڑھے والدین کا واحد سہارا تھے تو میرا باپ قادر خان ان کی مدد

کیا کرتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فضل چاچا نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی گویا ''گرین لا کے مکینوں کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دی تھی۔ میں نے بہ غور فضل چاچا کے چہرے کی طر دیکھا اور تلخی سے بولا۔

''فضل چاچا! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی نے کون سا گھناؤنا جرم کیا ہے

''یہ دشمنوں کی سازش ہے.....''

وہ بولے ہی تھے کہ میں نے درمیان میں استہزائیہ قہقہہ بلند کیا، پھر انہیں ساری بات بتا دی کر طرح ہم نے ماموں حیدر گل کی وہ بات سن لی تھی جب وہ اپنے خاص دوست ملک سردار خان یرغمال لڑکی (صدف حیات) کو قتل کرنے کی ہدایات دے رہے تھے اور بعد میں، میں یہی سمجھا تھا یرغمالی لڑکی کہیں نگینہ نہ ہو.....اس لئے جب میں ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہ غفورا نامی ایک کارندہ اس لڑکی (صدف) کا گلا دبوچ کر اسے ختم کر چکا تھا۔

میری بات پر فضل چاچا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''کیوں فضل چاچا! اب کیا کہتے ہو اپنے بڑے صاحب اور بی بی جی کے کالے کرتوتوں کے بار میں؟ .....کیا میں یہ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی حقیقت جھٹلا سکتا ہوں؟ .....کبھی نہیں۔''

میں نے ان کے گنگ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ چند لمحے ساکت سامت کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر نمی اُترنے لگی تھی۔ پھر وہ ہموار میں بولے۔

''ہاں .....اگر یہ سچ ہے تو بڑے صاحب جی اور بی بی جی کو یہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن بیٹا! میں بھی بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہوں نے یقیناً اتنا بڑا اقدام رحمانہ قدم بی بی جی (ماں شبینہ) کے کہنے پر ہی مجبوراً اُٹھایا ہوگا۔''

''فضل چاچا! اب کچھ بھی ہو، وہ دونوں مجرم ہیں اور انہیں ان کے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔''

''نادر بیٹا! .....ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے کبھی یہ سوچا تھا کہ تمہاری ماں نے اپنی ساری جوانی کی سلاخوں کے پیچھے کس جرم میں گزار دی؟'' انہوں نے اچانک عجیب لہجے میں پوچھا۔

''کیوں بابا! کیا تم نہیں جانتے؟ .....آخر کو تم ہمارے پرانے نمک خوار ہو۔'' میں نے استہز لہجے میں کہا۔

''ہاں ..... میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ماں نے ایک ناکردہ جرم میں اپنی ساری جیل میں گزار دی.....اور تم جانتے ہو یہ کس کی سازش تھی؟ تمہاری ماں کو کس نے بے گناہ عمر سزا میں جھونک دیا تھا۔ تو سنو، وہ یہی دو شیطان نظر حیات اور شاہ میر تھے۔''

فضل چاچا کا خیال تھا کہ میں اس بات پر چونک پڑوں گا۔ مگر مجھے تو اصل حقیقت کا علم تھا اس میں بدستور سپاٹ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''مجھے اگرچہ اس راز سے پردہ اٹھانے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی لیکن شاید ہم سے یہیں غلطی کہ تمہیں اس راز سے لاعلم رکھا گیا۔'' ان کی آواز اب مرتعش ہو رہی تھی۔

''میں سب جانتا ہوں بابا! اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم لوگوں نے آج تک اس راز سے کیوں لاعلم رکھا، تاکہ میں ماں اور ماموں حیدر گل کے کالے کارناموں کی اصل حقیقت نہ سکوں۔'' میں نے تلخی سے کہا تو فضل چاچا قدرے چونک کر میرا چہرہ تکنے لگے۔ پھر ان کے چہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ متاسفانہ لہجے میں بولے۔

''یہی تو غلطی ہوئی تھی تمہارے ماموں سے کہ انہوں نے تمہاری ماں کے اصرار کے باوجود تمہیں اب اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا اور بالآخر بی بی جی (ماں شبینہ) کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ ان کے دشمنوں نے تم سے بڑی مکاری کے ساتھ راہ و رسم استوار کی اور آخر کار تمہارے دل و دماغ میں اپنی ہی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف زہر انڈیلنے میں کامیاب ہو گئے۔''

فضل چاچا کی اب تک کی گفتگو میں یہ بات ایسی تھی جس نے ایک لمحے کو مجھے ذرا چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے بھی جوش آ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے فضل چاچا سے انکل شاہ میر اور نظر حیات سے سنی ہوئی وہ ساری کریہہ حقیقت گوش گزار کر دی کہ کس طرح میری ماں نے میرے باپ کا بے گناہ خون کیا تھا۔

میری بات سن کر ان کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شدید کرب کے ساتھ غیظ کی چنگاریاں نکلنے لگیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے تحمل بھرے لہجے میں مجھ سے بولے۔

''تم ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ تم اپنی پاک دامن ماں پر لگائے گئے ان دونوں مردود شیطانوں کے ان گھٹیا الزامات کو سچ مان لو؟ کیا ..... کیا تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو نے اتنی بھی غیرت نہ کی کہ تم اصل حقیقت کا کھوج لگانے کی جستجو کرتے۔''

''فضل چاچا! کیا تم نہیں جانتے کہ میرے دل و دماغ میں تو بچپن سے ہی یہ سوال گردش کرنے لگے تھے کہ آخر میری ماں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے؟ مگر مجھے کسی نے کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میں نے تو تم سے بھی اس سلسلے میں پوچھنا چاہا تھا لیکن تم بھی مجھے کچھ بتانے سے قاصر ہی رہے تھے۔'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''تمہیں نہ بتانے کی بہت سی وجوہات تھیں۔'' فضل چاچا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''اگرچہ تمہاری ماں یہی چاہتی تھی اور اکثر اپنے بھائی حیدر گل سے اصرار بھی کرتی رہتی تھی کہ تمہیں ماضی کی اس خوں رنگ داستان سے ضرور آگاہ کر دیا جائے تاکہ تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے غیرت مند باپ کا لہو جوش مارے اور کھولتے ہوئے لاوے کی طرح دشمنوں پر آگ اور خون کی بارش کر دو۔ لیکن تمہارے ماموں حیدر گل نے اپنی بہن کی یہ بات نہ مانی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا کہ ماضی کی اس خونی داستان کے چھینٹے تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل پر پڑیں۔ وہ خود دشمنوں سے اپنی بہن اور اس کے شوہر (قادر خان) کا انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ یہ سب درون خانہ کر رہا تھا۔ مجھے اس کا ضرور اعتراف تھا لیکن نادر بیٹا! یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل تم سے بہت محبت کرتا ہے، تمہیں بالکل اولاد کی طرح چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے دشمنوں سے انتقام لینے کا بوجھ تمہارے سر ڈالنے کی بجائے اپنے سر لے لیا اور ان کی خاموشی کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ تمہیں اس لئے اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے تاکہ تم ایک آزاد اور خوشگوار زندگی گزارو۔''

''اصل حقیقت کیا ہے بابا! اب تم بتاؤ۔'' میں نے سنسناتے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں .....اب شاید مجھے اپنی بی بی جی اور بڑے صاحب کی نافرمانی کرنا ہی پڑے گی۔ کیونکہ تم کل عدالت میں ان کے خلاف گواہی دینے کے لئے پیش ہونے والے ہو۔''

فضل چاچا نے عجیب اسرار بھرے لہجے میں کہا اور پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''نادر بیٹے! یہ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، تمہارا باپ قادر خان اور تمہاری ماں شبینہ خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دنوں تمہارا ماموں حیدر گل جنگل کا چوکیدار تھا اور قادر خان ایک چھو سے ٹال کا مالک۔ انہی دنوں ان دونوں بدخصلت شیطانوں، نظر حیات اور شاہ میر نے قادر خان ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کئے۔ نظر حیات سرکاری ٹھیکے دار تھا۔ وہ جنگلاتی لکڑیوں کے ٹھیکے لیا کر اور شاہ میر گیم وارڈن (فارسٹ آفیسر) تھا۔ یہ دونوں بدخصلت غیر قانونی طور پر درختوں کی کٹائی اسے چور دروازے سے فروخت کرنے کے جرم میں ملوث تھے۔ حیدر گل کو ان کی غیر قانونی سرگر کے بارے میں علم تھا اور وہ اشاروں کنایوں میں اپنے بہنوئی قادر خان کو بھی ان دونوں شیطانوں دور رہنے کی نصیحت کرتا رہتا تھا مگر قادر خان ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ ایک روز نظر حیات اور شاہ میر پورے سو درختوں کی غیر قانونی کٹائی کا ارادہ کیا مگر اسے فروخت کرنے کے سلسلے میں انہوں نے خان سے اس کا ذکر کیا۔ قادر خان چونکہ ایک شریف اور ایماندار شخص تھا، اسے ان جنگلوں اور مرغزار سے بہت پیار تھا۔ اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان دونوں کو بھی سرزنش کی کہ وہ اس خوب صو وادی کو اتنے بیش قیمت درختوں سے محروم نہ کریں۔ مگر وہ دونوں نہ مانے۔ یہ بات قادر خان بھی جا کہ وہ دونوں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آئیں گے۔ لہٰذا اس دن سے اس نے ان کے اس ''غ غیر قانونی اقدام سے باخبر رہنے کے لئے ٹوہ لینا شروع کر دی اور بالآخر عین وقت پر اس نے جنگلات کے حکام بالا کو خبر کر دی۔ نظر حیات اور شاہ میر کے خلاف انکوائری ہوگئی مگر انہوں نے کچھ دلا کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ لیکن انہوں نے قادر خان کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ یوں بھی قادر خان ہوتے ہوئے وہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں انجام نہیں دے پا رہے تھے۔ ان دونوں مکاروں نے تمہا باپ قادر خان سے معافی مانگی تاکہ اس سے پھر دوستی استوار ہو سکے۔ قادر خان بھی بے چارہ سادہ انسان تھا۔ وہ ان کی چال میں آ گیا۔

پھر ایک روز ان دونوں نے قادر خان اور شبینہ کو اپنے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں دعوت پر بلا کھانے میں اسے زہر ملا کر دے دیا۔ پھر دونوں شیطانوں نے شبینہ کی عزت لوٹنے کی بھی کوشش کی آفرین ہے شبینہ پر کہ اس نے اپنی عزت پر آنچ تک نہ آنے دی۔ وہ ایک بہادر پہاڑی عورت تھی جانے کس طرح اس کے ہاتھ ایک پھل کاٹنے والی چھری لگ گئی۔ اس نے نظر حیات کے گھونپنے کوشش کی مگر ان دونوں شیطانوں نے شبینہ کی کلائی والا ہاتھ مروڑ کر اس کے ہاتھ سے وہ چھری بے پڑے قادر خان کے پیٹ میں گھونپ دی۔ شبینہ اس صدمے کے باعث وہیں بے ہوش ہوگئی اور یوں میں نظر حیات اور شاہ میر نے بڑی چالاکی کے ساتھ شبینہ کو اس کے شوہر قادر خان کے قتل کے جرم پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا اور پولیس کو شاہ میر نے شبینہ کے خلاف شرمناک بیان دیتے گواہی دی کہ شبینہ درحقیقت نظر حیات کی طرف ملتفت تھی اور اسی کی خاطر اس نے اپنے شوہر قادر خا قتل کیا۔ شبینہ بے چاری ایسا شرمناک اور بھیانک الزام سن کر سکتے میں آ گئی اور بعد میں عدالت اسے قرار واقعی سزا سناتے ہوئے پھانسی کی سزا دی جو بعد ازاں عمر قید میں بدل گئی۔''

فضل چاچا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ وہ پھر لرزیدہ لہجے میں بولے۔

''نادر بیٹا! یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح اپنے سینے پر پتھر رکھ کر یہ خونی داستان سنائی ہے۔ مگر آج مجبور ہو کر مجھ کمین کی زبان پر یہ راز آ گیا لیکن میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ں کہ تمہاری ماں شبینہ ایک شریف، نیک اور شوہر پرست عورت تھی۔ مگر وہ یہ داغ آج تک نہیں بھولی ہے اور اس لرزہ خیز داستان کو مجبوراً زبان پر لانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ تمہیں اصل حقیقت کا علم ہو جائے تاکہ جو زہر ان دونوں شیطانوں نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے وجود میں اتارا ہے، اسے تم نکال سکو۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے اندر زبردست شکست و ریخت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ فضل چاچا کی بات میں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ ہمارے خاندان کا پرانا نمک خوار اور خدمت گزار تھا۔ یہ سب سن کر میری عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے بہ مشکل اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتے ہوئے ایک آخری سوال فضل چاچا سے کیا۔

''بابا! کیا ان ساری باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا ہمارے پاس؟..... کیا قانون اتنا ہی اندھا ہے کہ اس نے ایک بے گناہ عورت کی جوانی کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیئے جو پہلے اپنے شوہر کے بہیمانہ قتل کے غم میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔

''نادر بیٹا! قانون اندھا ہوتا ہے۔'' فضل چاچا نے تلخی سے کہا۔ ''وہ صرف شواہد اور گواہوں کی سنتا ہے، مظلوم کی نہیں ..... اور یہ شواہد اور گواہ حاصل کرنا نظر حیات اور شاہ میر جیسے دولت مند اور اثر و رسوخ والے شیطانوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بے چارے حیدر گل نے حقائق سامنے لانے کے لئے اپنی سی جدوجہد کی تھی لیکن نظر حیات اور شاہ میر جیسے درندوں کے سامنے اس بے چارے کی بھلا کیا حیثیت تھی؟ مگر پھر بھی حیدر گل نے کسی طرح تمہارے باپ قادر خان کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کروایا تھا جس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ قادر خان کی موت پیٹ میں لگنے والے چاقو سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ آؤ بیٹا! میں تمہیں وہ اصل رپورٹ دکھاؤں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا اور میں گم صم سا ان کے عقب میں ہو لیا۔

وہ مجھے ماموں حیدر گل کے کمرے میں لے کر آ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی قمیض کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا، ایک قد آدم آہنی الماری کو کھولا۔ اس کے اندر ایک چوکور سیف نصب تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور ایک کوٹڈ کاغذ میرے حوالے کر دیا۔

یہ میڈیکل ایگزامینر کی دستخط شدہ پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی۔ جس میں آج سے پچیس سال پرانی تاریخ بھی درج تھی۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ قادر خان کی موت کی اصل وجہ وہ زہر تھا جو اسے کھانے میں ملا کر دیا گیا تھا اور کیونکہ خوراک میں ملے زہر کی وجہ سے فوراً ہی میرے باپ کی موت واقع ہو چکی تھی اس لئے کچھ عرصہ بعد دوبارہ لاش کو قبر سے نکالنے کے بعد بھی خوراک کے زرات نظام انہضام کے معطل ہونے کی وجہ سے جوں کے توں موجود تھے۔

''بابا! پھر ماموں حیدر گل نے یہ اصل رپورٹ عدالت کے سامنے کیوں نہیں پیش کی؟'' میں نے اُلجھ کر فضل چاچا سے پوچھا۔

''حیدر گل نے ایسا ہی کیا تھا۔'' وہ بولے۔ ''لیکن اس اصل رپورٹ کو جعلی قرار دے کر جھٹلا دیا گیا اس کے اگلے ہی روز جس میڈیکل ایگزامینر نے یہ رپورٹ دی تھی، اسے بھی خرید لیا گیا جس نے بعد میں الٹا حیدر گل کے خلاف یہ بیان دیا تھا کہ اس کے جعلی دستخط سے یہ رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ اس پر حیدر گل کو بھی عدالت کے ساتھ دھوکا دہی کے جرم میں تین سال قید کی سزا بھگتنا پڑی۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صورتِ حال کی یوں چونکا دینے والی کلپ نے میرے دماغ کو بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے ہاتھ سے وہ کونڈ کاغذ لے کر دوبارہ سیف میں رکھا، الماری کو بند کر کے وہ خاموش کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ .... میں بہ دقت تمام اپنے وجود کی شکستہ عمارت کو گھسیٹتے ہوئے مسہری کے قریب لایا اور یکدم گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

سوچوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ایک شوریدہ سر طوفان تھا جو میرے اندر اٹھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کہانی کو جھٹلاؤں؟ .... اس کہانی کو جو شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے سنائی تھی یا پھر فضل چاچا کی کہانی کو جو اس نے پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ کے ساتھ میرے گوش گزار کی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک بار پھر فضا میں معلق ہو گیا ہوں۔ جھوٹ اور سچ کے دو بھاری پاٹوں والی چکی میں پس رہا ہوں۔ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا تھا؟ .... لیکن چاچا فضل جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ پھر مجھے ان کی بات ماننے میں تامل کیوں تھا؟ انکل شاہ میر نے جو خونی داستان سنائی تھی، کیا وہ جھوٹی تھی؟ مگر انہوں نے تو مجھ سے خود کہا تھا کہ پہلے میں یہ داستان اپنی ماں شبینہ سے یا ماموں حیدر گل کی زبانی سنوں۔ اگر وہ جھوٹے ہوتے تو پھر کیوں وہ مجھ سے اتنے یقین کے ساتھ ایسا کہتے؟ اگر نظر حیات اور شاہ میر کو میری ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلانا مقصود ہوتا تو وہ اس روز ہی ایسا کر سکتے تھے جب ان لوگوں کو مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں درونِ خانہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

"کیا سوچنے لگے نادر بیٹا.........؟" مجھے سوچوں میں غلطاں پا کر اچانک فضل چاچا نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔

"بابا! اگر یہ بات ہوتی تو پھر شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہ بتا دیا؟" میں نے قدرے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا تو ان کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ عود کر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔

"وہ دونوں بہت شاطر اور مکار انسان ہیں بیٹا! وہ پہلے اپنی بات میں اس طرح وزن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بعد میں تمہاری باتوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو کہ تمہیں واقعی اب تک تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل نے ماضی کے اس تلخ راز سے لاعلم رکھا ہے اور تمہارے اصرار کے باوجود جب کچھ بھی نہیں بتایا تو ان دونوں نے اپنا اعتبار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہیں سب سے پہلے یہ خونی راز تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل سے ہی پوچھنے پر زور دیا۔ انہوں نے شاید اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل کسی مناسب وقت کے انتظار سے قبل تمہارے علم میں یہ خونی راز نہیں لا سکتے تھے۔"

بابا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میں نے اپنا سر تھام لیا۔ فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے شانے پر اپنا ہاتھ دھرا اور آزردہ سی آواز میں بولے۔

"نادر بیٹا! کیا تمہیں ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں آیا؟ .... کیا تم نے وہ پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ نہیں دیکھی؟"

"بابا! میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا۔ خدا کے لئے مجھے ابھی تنہا چھوڑ دو .... تنہا چھوڑ دو مجھے۔" میں گہرے دکھ اور کرب کے احساس سے مغلوب ہو کر بولا اور فضل چاچا خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میرا دماغ اس قدر جھنجھنا گیا تھا کہ میں کوئی ایک فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شدید ذہنی خلجان سے گزر رہا تھا اور بری طرح اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔

میں وہیں مسہری پر ہی دراز ہو گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور یوں کئی منٹوں تک خالی الذہنی کے عالم میں مسہری پر لیٹا رہا۔

دوپہر کے کھانے پر فضل چاچا نے مجھے جگایا۔ مگر مجھے بھوک بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اب میں بار پھر اس کڑے فیصلے کے پلِ صراط سے گزر رہا تھا کہ مجھے اگلے دن کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینی چاہئے یا نہیں؟

بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ہاں، کچھ بھی سہی، ان دونوں نے بہرحال معصوم اور بے گناہ صدف کے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا تھا اور مجھے ایک ذمہ دار اور اچھے شہری ہونے کے ناتے اپنا فرض ضرور نبھانا چاہئے تھا۔ لیکن میں ایسا کیوں کرنا چاہ رہا تھا؟ .... آخر مجھے فضل چاچا کی اس بات پر کیوں نہیں یقین آ رہا تھا کہ میری ماں نے مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بے گناہ اور مظلوم کی حیثیت سے اپنے ناکردہ جرم کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں گزار دیئے تھے۔ کیا اس میں میری خودغرضی شامل نہ تھی؟ .... کیونکہ میں شاہ میر کی اکلوتی بیٹی نگینہ سے محبت کرتا تھا۔ کیا......... کیا نگینہ کی محبت نے میرا خون اس قدر سفید کر دیا تھا کہ میں اپنی ماں اور ماموں کا دشمن بن گیا تھا اور .... اور کیا یہی سبب تھا کہ میں چاچا فضل کی بات ماننے پر تذبذب کا شکار تھا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں۔ میں نے بہ مشکل اپنی تباہ حال کیفیات پر قابو پاتے ہوئے خود کو تسلی دینا چاہی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میرے باپ قادر خان کا اصل قاتل کون تھا؟

یہ ایک دوسرا معاملہ تھا۔ مگر انہوں نے بہرحال صدف حیات کا خون ناحق بہایا تھا اور انہیں اس کی سزا ضرور بھگتنا چاہئے تھی۔

'لیکن کیوں.........؟' اچانک میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا۔

'انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ .... ضرور اس جرم کے پیچھے کوئی انتقامی جذبہ ہی کارفرما تھا۔ نیز یہ کہ ماں کیا واقعی اپنے ناکردہ جرم کا بدلہ نظر حیات اور شاہ میر سے لینا چاہتی تھی؟'

یہ وہ سوال تھے جو مجھے ایک لمحے کے لئے یہ سوچنے پر مجبور کئے ہوئے تھے کہ فضل چاچا کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا تھا۔

فضل چاچا جب دودھ کا گلاس میرے لئے لے کر کمرے میں آئے تو انہوں نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔

"بیٹا! تم نے آخر کیا فیصلہ کیا؟"

میں نے خاموشی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر دودھ کا گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور انہیں سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

"بابا! ایک بات بتاؤ، ماں کی بے گناہی اپنی جگہ لیکن کیا انہوں نے ایک معصوم لڑکی کی جان لے کر سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کیا؟ جس کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔" ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی میں نے بہ غور ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پھر وہ ہولے سے بولے۔

"بیٹا! تم یہ بھی تو سوچو کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل بھی تو کیا تھا۔ اور یہی نہیں،

انہوں نے یہ جرم بڑے شرمناک الزام کے ساتھ تمہاری ماں کے سر تھوپ دیا جس کی وجہ سے اس
چاری کو دوہرے کرب اور سزا سے گزرنا پڑا۔ جبکہ تمہارے باپ کے وہ دونوں قاتل اب تک زندہ
تم ایک الم نصیب عورت کے کرب کا کس طرح اندازہ لگا سکتے ہو، جس نے بے گناہ ہوتے ہوئے
دوہری سزا بھگتی۔ اسے جوانی میں بیوہ کر دیا گیا۔ پھر عمر قید کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ اور اس کی زند
دُکھوں اور آلام کے سپرد کرنے والے شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئے پھر مجھ پر ایک جوش بھری نظر ڈالتے ہوئے پُرتپش لہجے میں بولے

"نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ، اگر تمہیں اس بات کا یقین واثق ہو جائے کہ نظر حیات اور شاہ می
نے تمہارے باپ کا قتل کیا اور بعد میں ایک گھناؤنی سازش کے ذریعے تمہاری ماں کو بھی ساری عم
لئے بے گناہ داخل زنداں کر ڈالا اور تم اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی بھی نہ کر سکو کیو
تمہارے پاس ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہ ہو تو پھر تم ایسے میں کیا کرو گے؟"

ان کی اس مدلل گفتگو پر میں ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ فضل چاچا
بات نے میرے سینے میں ایک الاؤ بھڑکا دیا تھا جس کی حدت میرے چہرے سے مترشح ہونے لگی تھی
جس کی شدت بھانپ کر فضل چاچا فرطِ غیظ سے دوبارہ بولے۔

"میں جانتا ہوں بیٹا! کہ تمہاری رگوں میں ایک غیرت مند باپ کا خون ہی نہیں بلکہ ایک بہادر
کے دودھ کا مان اور فخر بھی گردش کر رہا ہے اور انتقام کی جو آگ تمہاری بہادر اور باہمت ماں کے
سوزاں میں بھڑک رہی ہے، اس سے زیادہ تم اس کی تپش اور جلن محسوس کرو گے۔"

"بس بابا! بس..... خدا کے لئے بس کرو۔" میں اچانک شعلوں کی طرح بھڑکتے لہجے میں تڑپ
بولا۔ "اگر یہ سچ ثابت ہوا تو یقین کرو بابا! مجھے اپنے غیرت مند باپ کے خون ناحق کی قسم، میں اپنی
نصیب ماں کے دودھ کا قرض ضرور چکاؤں گا اور میری زندگی کا مقصد ہی دشمنوں کا جینا محال کرنے
سوا کچھ نہ ہوگا۔"

"یہی تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا۔"

اچانک فضل چاچا نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ ان کے بشرے پر اب ایک گہری طمانیت م
تھی۔ میں قدرے چونک کر مستفسرانہ نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگا، وہ بولے۔

"ہاں نادر بیٹا! تمہاری ماں کا قرض ایک غیرت مند بھائی کے ناتے حیدر گل نے ہی اپنے ذمے
لیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اس انتقام کی اندھی آگ میں جھونک دے۔ اس لئے کہ وہ تم
حقیقی اولادوں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ خود سارا بوجھ اپنے کاندھے پر رکھے تمہیں اس آگ اور خونا
جنگ سے دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم اپنی امنگوں بھری زندگی میں مگن رہو اور اپنا روشن مستقبل بناؤ۔"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر ایک گہری ہمکاری لے کر مزید بولے۔ "شاید ان کی خاموشی کی ا
وجہ بھی یہی ہو۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئے تو اچانک میرے ذہن کے پردے پر بچپن سے لے کر ا
تک وہ تشنہ سوالات اُبھرنے لگے جو میں ماموں حیدر گل سے ماں کے اور اس کے دردناک ماضی
بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ ٹال دیا کرتے تھے اور میرا دھیان اپنی پڑھائی اور اپنا مستقبل ر
بنانے پر زور دیا کرتے تھے۔ حالانکہ جب میں ان کے ساتھ ماں سے ملنے جیل جایا کرتا تھا تو ما
ماں کو بھی ان سے یہ کہتے سنا تھا۔

"گل! تمہیں میرے سینے کی آتشِ انتقام سے میرے نادر کو ضرور آگاہ کرنا چاہئے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن مجھے یاد تھا کہ ماموں اس سلسلے میں اپنی بہن کی بات نہیں مانا کرتے تھے۔ ماں مجھے درسِ انتقام
دینا چاہتی تھی لیکن ماموں حیدر گل مجھے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ کئے ہوئے تھے۔ اب مجھے رفتہ رفتہ ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اندر کی اُلجھنیں سلجھنے لگی تھیں۔ وہ گرہیں جو مجھے اندر سے اب تک بے چین
کئے ہوئے تھیں، اب وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھیں۔ مجھے میرے سارے سوالوں کے جوابات نئے
سرے سے ملنے لگے تھے اور جن کی سچائی اور حقانیت کی گواہی پہلی بار میرا دل بھی دے رہا تھا۔

"نادر بیٹا! سانچ کو آنچ نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ جب تمہیں اصل حقیقت کی سچائی کا ضرور علم ہو
گا۔ لیکن میں ڈرتا ہوں بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔"

فضل چاچا نے عجیب سے لرزیدہ لہجے میں کہا اور آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے
جاتے ہی جانے کیا بات تھی کہ ایکا ایکی میرا پورا وجود جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میرے دل و دماغ سے گرد آلود
خیالات کی کثافت جیسے اب خود بہ خود ڈھلنے لگی تھی۔ کوئی ان جانا سا بوجھ تھا جو میرے سینے سے سرکتا ہو
محسوس ہو رہا تھا۔

میرا دل اور ذہن جو کچھ دیر پہلے زبردست تضادات کا شکار تھے، اب جیسے دونوں یکجا ہونے لگے تھے
اور شاید یہی سبب تھا کہ میں خود کو ایکا ایکی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اگلے
دن کورٹ میں حاضر ہونے کا ارادہ ملتوی نہیں کیا تھا۔

❄❄❄

دوسری صبح میں جلدی جاگ گیا تھا۔ ہلکا پھلکا ناشتہ وغیرہ کر کے فارغ ہوا اور پونے گیارہ بجے میں
کورٹ پہنچ گیا۔

برآمدے میں ہی مجھے شاہ میر، نظر حیات اور ان کا بیٹا کبیر احمد وکیل کے ہمراہ نظر آ گئے۔

❄❄❄

مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مجھے استغاثہ کی جانب سے بہ طور گواہ پیش کیا گیا تھا۔ استغاثہ نے
میرے حلف اٹھانے کے بعد پوچھا۔

"نادر علی خان! تم نے وقوعے کی رات کو کیا سنا اور کیا دیکھا تھا؟"

میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور جج صاحب کی طرف دیکھ کر لہجے کو متحمل
رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جج صاحب! سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی یہ عورت میری ماں ہے۔ شاید یہ بات آپ
سب کو معلوم ہو اور معزز عدالت کے ریکارڈ میں بھی موجود ہو۔ لہٰذا میں کوئی گواہی دینے سے قبل معزز
عدالت سے یہ سوال کروں گا کہ آج سے پچیس سال پہلے جب میری ماں کو اس کے شوہر کے قتل کے
الزام میں سزائے موت سنائی گئی اور جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی تھی، کیا وہ فیصلہ انصاف پر مبنی تھا؟"

میرے سوال پر جیسے بھری عدالت کو سانپ سونگھ گیا۔ کمرۂ عدالت میں بیٹھے شاہ میر اور نظر حیات
سمیت وکیل استغاثہ کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔ کیونکہ میرا یہ سوال ان کے لئے ہی نہیں، بلکہ میری
ماں، ماموں حیدر گل اور وکیل صفائی کے لئے بھی سراسر غیر متوقع تھا۔

"آج سے پچیس سال پہلے کے اس کیس کا متوقلہ صدف حیات کے قتل سے کیا تعلق ہے؟" وکیل
استغاثہ دانت پیس کر مجھ سے بولا۔

"تعلق ہے وکیل صاحب.....!" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو پھر تم معزز عدالت کو بتاؤ کہ مقتولہ صدف حیات کے قتل کے اصل محرکات کیا تھے؟"

"ان محرکات پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قادر خان مرڈر کیس پر بھی کچھ بات کی جائے" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے کہا اور وہ تلملا کر رہ گیا۔

"یور آنر!..... میرا خیال ہے کہ گواہ نادر علی خان کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اپنی ماں کو ملزمہ والے کٹہرے میں دیکھ کر جذباتی ہو گیا ہے ..... اور ..... انصاف کے تقاضوں کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے جانبداری برت رہا ہے۔"

جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو میرے جواب دینے کا پابند کیا تو وکیل استغاثہ نے اپنی پیشانی پر نمودار ہوتی پسینے کی ننھی ننھی سی بوندوں کو رومال سے پونچھتے ہوئے باریک سی آواز میں کہا۔

میرے موکل نظر حیات کی بیٹی مقتولہ صدف حیات کے قتل کا سبب پرانی دشمنی ہے۔"

"میرے فاضل دوست اس پرانی دشمنی کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟" وکیل صفائی نے ہلکے کے ساتھ کہا۔ وہ شاید وکیل استغاثہ کے گول مول سے جواب کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے پر وہ ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر جج صاحب سے قدرے جھنجلا کر بولا۔

"می لارڈ!..... وکیل صفائی، معزز عدالت کو اصل بحث سے ہٹا کر قیمتی وقت برباد کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں می لارڈ!" وکیل صفائی نے کہا۔ "یہی وہ اہم سوال ہے جس کا جواب دینے سے وکیل استغاثہ دانستہ کترانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ آگے چل کر وہ اس کا ذکر ضرور کریں گے۔ اس کیس کا یہی ایک بنیادی سوال ہے جس کے جواب سے معزز عدالت کو بہت کچھ اخذ کرنے میں آسانی مدد ملے گی۔ کیونکہ میں اپنی باری پر عدالت کے سامنے ایک اہم گواہ پیش کرنے والا ہوں ..... یقین ہے اس کی گواہی کے بعد بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔"

وکیل صفائی کی اس اسرار بھری بات پر میں نے دیکھا کہ وکیل استغاثہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

"استغاثہ بلا وجہ عدالت کا وقت برباد نہ کرے ..... اس سوال کا جواب دے جو ان سے پوچھا گیا ہے۔" معاً جج صاحب نے استغاثہ کو سرزنش کرتے ہوئے جواب دینے کا پابند کیا تو مجبوراً استغاثہ کو مختصراً بتانا پڑا کہ اس کے موکل نظر حیات کو ملزمہ شبینہ، یعنی میری ماں پر اپنی بیٹی صدف حیات کے قتل کا یقین کی حد تک شبہے کی وجہ یہی ہے کہ آج سے پچیس برس قبل بقول ملزمہ کے نظر حیات اور شاہ میر اس کے شوہر قادر خان (میرے بلپ) کا قتل کرنے کے بعد یہ جرم اس کے سر تھوپ کر عمر قید کی دلوائی تھی۔ اور یوں اب وہ (میری ماں) اپنے بھائی حیدر گل (ماموں) کے ساتھ ان سے انتقام لے رہی ہے۔

وکیل کے جواب پر میں نے ماں کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو وہاں شعلوں کی تپش ایک متانت بھرے وقار میں بدل گئی۔ جب کہ شاہ میر اور نظر حیات کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔

ادھر وکیل صفائی نے اجازت لے کر اپنے گواہ کو بلا لیا۔

اس اہم گواہ کو دیکھ کر فریقین بری طرح چونک گئے۔ خود مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری ماں اور ماموں حیدر گل کے حق میں اہم گواہی دینے والی وہ شخصیت نگینہ بنت شاہ میر تھی۔ حلف اٹھانے کے بعد نگینہ نے جو بیان دیا اس نے کیس کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔

"جج صاحب!..... نادر علی خان کو ایک گہری سازش کے ذریعے اس کی ماں کے خلاف ورغلا کر اس سے متنفر کیا گیا۔ اس عورت کے دکھ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے جج صاحب! کہ اس بے چاری کو

جوانی میں نہ صرف بیوہ کر دیا گیا بلکہ ایک جھوٹے الزام میں الٹا اسے اپنی زندگی کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں گزارنے پڑے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے اس عورت کے شوہر کا بہیمانہ قتل اور بعد میں اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے دو شیطان ہیں۔ ایک نظر حیات اور دوسرا شاہ میر جو بدقسمتی سے میرا باپ ہے۔

جج صاحب! میں نے کل رات اتفاق سے اپنے پپا شاہ میر اور ان کے دوست نظر حیات کی گفتگو سن لی تھی جس سے مجھ پر ساری حقیقت آشکارا ہو گئی کہ انہوں نے اس عورت پر کیسا ظلم ڈھایا تھا۔ وہ صدف حیات کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب تھے مگر اس بات سے بھی پریشان تھے کہ ان کے پچیس سال پرانے جرم کی قلعی نہ کھل جائے۔ نادر کی اپنی ماں کے خلاف گواہی دینے کے فیصلے نے انہیں شیر کر دیا تھا اور وہ اپنی دانست میں یہ منصوبہ بنائے بیٹھے تھے کہ صدف کے قتل کے جرم میں ان بہن بھائیوں کو پھانسی ہو جائے گی اور نادر کو وہ خود راستے سے ہٹا دیں گے۔"

عدالت میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ میری نظریں نگینہ کے چہرے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر اور اس کے دوست نظر حیات کے مکروہ چہرے بے نقاب کر دیئے تھے اور اس نے میری ماں پر ہی نہیں بلکہ مجھ پر بھی احسانِ عظیم کیا تھا۔ میں اب تذبذب کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں کچھ ایسا ارتعاش محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹنے اور لاوا اُگلنے سے پہلے بری طرح لرزیدہ ہوتا ہو..... میری آنکھوں کے سامنے اب سرخ اندھیروں کے طوفان بلاخیز کی چادر سی تن گئی تھی اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے مکروہ چہروں کو خاکستر کرنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ میری ماں کی نگاہیں میرے چہرے سے میرے اندر برپا ہونے والے طوفانوں کا خوب اندازہ کر رہی تھیں اور میں نے اس کے لب ترساں پر ایک خنجر آمیز مسکراہٹ رقصاں ہوتے دیکھی۔

ایسے میں وکیل استغاثہ نے لاکھ کوششیں کیں کہ عدالت صدف حیات کے کیس پر بحث کرے مگر اب چونکہ بالکل غیر متوقع طور پر صدف حیات مرڈر کیس پچیس سال پہلے والے قادر علی خان مرڈر کیس میں بدل چکا تھا اس لئے عدالت نے نگینہ کی گواہی کے نتیجے میں فوری طور پر پچیس سال پہلے والے قادر علی خان مرڈر کیس کی فائل کھولنے کے احکامات جاری کر دیئے اور ساتھ ہی شاہ میر اور نظر حیات کو نظر بند کرنے کے علاوہ نئے سرے سے قادر علی خان مرحوم کیس کی تفتیش کسی دوسرے پولیس آفیسر، آئی او کو سونپ دی۔

عدالت کے برخواست ہوتے ہی میں کٹہرے سے نکلا اور سیدھا ماں اور ماموں کی طرف لپکا۔ میں بے اختیار ماں سے جا کر لپٹ گیا اور اس کے مہربان اور ممتا بھرے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رو دیا۔

"میرے لعل!..... اپنے آنسو اچھی طرح بہا لے۔ کیونکہ اس کے بعد تجھے فولاد میں ڈھلنا ہے۔"

میری مجبور اور چھلنی سماعتوں میں ماں کی پُرجوش آواز اُبھری اور یہ آواز جذبات سے سراسر عاری تھی۔

"ماں!..... مجھے معاف کر دے ..... مجھے معاف کر دے ماں! کہ میں ناسمجھی میں اپنے دشمنوں کے بہکاوے میں آ گیا۔" میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد میں ماموں حیدر گل کے کاندھے پر سر رکھ کر رو دیا۔ وہ ہولے ہولے میرا کاندھا تھپتھپانے لگے۔

"ٹیک اِٹ ایزی مسٹر نادر علی خان!..... حوصلہ رکھو..... تمہاری حاضر دماغی کے باعث مقدمے کی نوعیت ہی تبدیل ہو گئی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ وکیل صفائی تھا۔ اتنے میں پولیس میری ماں اور ماموں کو کمرۂ عدالت سے باہر کھڑی موبائل کی طرف لے گئی۔ اسی اثناء میں اعظم خان بھی میرے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری طمانیت اور مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے بھی میرے لئے توصیفی کلمات ادا کئے تو معاً وکیل صفائی جن کا مجھے بعد میں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی معلوم ہوا تھا، بولے۔

''ارے بھئی .....اصل تعریف کی حق دار تو وہ بہادر لڑکی نگینہ ہے۔ مگر وہ اچانک کہاں چلی گئی؟''

ان کی بات پر میری بے قرار متلاشی نظروں نے نگینہ کو دیکھنا چاہا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں پریشان سا بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار دیوانوں کی طرح نگینہ!.....نگینہ! پکارتا ہوا اسے ہر سمت ڈھونڈنے لگا مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ایڈووکیٹ حامد ہمدانی نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے مجھ سے رابطے میں رہنے کی تلقین کی پھر قریب کھڑے اعظم خان سے گفتگو کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اعظم خان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہا۔

''نادر میاں!.....حوصلہ رکھو۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

''انکل! میری جیپ کھڑی ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''اوکم آن یار!.....وہ کہیں نہیں جائے گی۔ تم چابیاں دو مجھے۔'' وہ بے تکلفی سے بولے اور میں نے انہیں اپنی جیپ کی چابیاں پکڑا دیں۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''حضور بخش!''

''سر.....!'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''یہ چابیاں لو اور نادر میاں کی جیپ سنبھالو۔''

''بہتر.....بہتر.....'' وہ یہ کہہ کر احاطے میں کھڑی میری جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اعظم خان مجھے اپنی لمبی چوڑی نئے ماڈل کی چمچماتی کار کی طرف لے گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔

میرے سوار ہونے پر ان کے دونوں گن بردار محافظ بھی عقبی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ اعظم خان کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور میں نگینہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

❄❄❄

پنڈی کے معروف چاندنی چوک سے گزر کر کار اب مری جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ کوئی نصف گھنٹے کی تیز رفتار نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد کار مال روڈ پر آ گئی جس کے انتہائی سرے پر ہمارا ہوٹل ہے۔ وہاں سے گزرنے کے بعد اب کار چیڑ اور صنوبر کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر مضافات کی جانب دوڑ رہی تھی۔

یہاں سے لگ بھگ مزید پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد کار ایک محل نما بلند و بالا کوٹھی کے خوش رنگ پھولوں سے لدے ہوئے احاطے میں داخل ہو گئی۔

کار کے احاطے میں رکتے ہی چار پانچ خدمت گار دوڑتے ہوئے ہماری طرف لپکے۔ دو افراد نے انتہائی مؤدبانہ مستعدی کے ساتھ ہماری طرف کے دروازے کھول دیئے۔ میں اور اعظم خان اترے۔ اس پختہ روش کے دائیں بائیں خوب صورت لان تھا۔ وہاں دو ہینڈسم سے نوعمر لڑکے نیٹ پریکٹس بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ انہوں نے اعظم خان کو دیکھ کر دور سے ہی با آواز بلند ''ہائے ڈیڈ!'' کہا اور اعظم خان نے بھی ہاتھ کے اشارے سے ان کا جواب دیتے ہوئے ایک فضائی بوسہ ان کی طرف اچھال دیا۔ اس کے بعد وہ مجھے لئے کوٹھی کے وسطی محرابی دروازے سے اندر شاہانہ کمرے میں لے آئے۔

یہاں کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ کیا کچھ نہ تھا یہاں۔ علاقے کی مناسبت سے یہاں کے لوگ شکار کے بہت رسیا تھے۔ خال خال بنگلے اور کوٹھیاں ہی ایسی ملیں گی جہاں بھس بھرے درندوں کے اصل ایستادہ'' مجسمے، کھالیں اور سر کمروں کے گوشوں اور دیواروں میں نظر نہ آئیں۔ یہاں بھی آرائش کے لئے اسی طرح کے مجسمے استعمال کئے گئے تھے۔

ہم دبیز قالین پر چلتے ہوئے آمنے سامنے دو صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ اسی وقت ایک تیس، پینتیس سالہ دبنگ سی خاتون نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکی جامنی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ساڑھی کے بارڈر اور فال پر سنہرے تاروں سے کڑھائی کی ہوئی تھی اور یہ تار خالص سونے کے تھے۔ اس کا قریباً آدھا سراپا بیش قیمت جیولری سے لدا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کی ایک فربہی مائل عورت تھی۔ صورت تو واجبی سی تھی مگر رنگت میدے جیسی صاف اور شفاف۔

وہ شاید ان کی بیگم تھیں۔ میں احتراماً کھڑا ہوا اور دھیرے سے انہیں آداب کہا۔ وہ میرے سلام کا جواب اپنے سر کے ہولے سے اشارے سے دے کر اعظم خان کے قریب بیٹھ گئیں۔

اعظم خان نے ان سے میرا مختصراً تعارف کروایا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''نادر خان! ہم تمہارے ماموں حیدر گل کے بہت پرانے دوست ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ تمہارے سلسلے میں بھی وہ اکثر مجھے بتاتے رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تمہاری غلط فہمی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ چلو، شکر ہے آج تمہارا دل بھی اپنی ماں اور ماموں کی طرف سے صاف ہو گیا۔ بہرحال!'' وہ اتنا کہہ کر ذرا تھے، پھر پُرخیال لہجے میں مجھ سے دوبارہ گویا ہوئے۔

''نادر میاں! شاہ میر اور نظر حیات بہت زہریلے سانپ ہیں۔ شکر ہے کہ تم ان کے زہر سے بچ گئے۔ لیکن آج کے بعد وہ کھل کر تم تینوں کے خلاف میدان میں پھن کاڑھے اُتر آئیں گے۔ تمہیں اب ان سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''جی انکل!.....میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہمیں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب کے ساتھ بھی ایک نشست رکھنی ہو گی۔'' وہ بولے۔ ''اور میرا تمہیں یہاں لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ رابطے میں رہ سکو۔''

''انکل! وہ.....کیا اب.....ماں اور ماموں کی صدف حیات مرڈر کیس سے بریت ممکن ہو سکے گی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اچانک ان سے پوچھا۔ وہ میری بات پر ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری بھرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے۔

''ہاں.....تمہارے باپ کے مرڈر کیس کے اب نئے سرے سے کھلنے اور تفتیش کرنے پر ہو سکتا ہے نہ صرف تمہاری ماں اور حیدر گل بری ہو جائیں بلکہ شاہ میر اور نظر حیات کو بھی سزا ہو جائے۔''

میں چپ رہا۔ اس دوران ملازمین درمیان میں رکھی ایک شیشے کی ٹاپ والی میز پر اشیائے خورد و نوش سجا کر چکے تھے۔ میرا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن خان صاحب کے اصرار پر میں نے ایک بسکٹ اور چائے کے کپ پر اکتفا کیا اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ پھر میں اپنی جیپ میں وہاں سے ''گرین لاج'' کی طرف روانہ ہوا۔

دورانِ ڈرائیونگ میں نے موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید اس کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی یا پھر اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔

مگر کیوں؟..... میں نے اُلجھن آمیز حیرت سے سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیا نگینہ نے

ایسا دانستہ کیا تھا؟ .... وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی؟ مگر کیوں؟ .... اس'' کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ عدالت نے اس کے پپا شاہ میر اور نظر حیات کو مقدمے کی پیروی تک نہ کرنے کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ یوں بھی میرا اب اپنے دشمنوں کے پاس جانے کا کوئی جواز بنتا تھا کہ میں کم از کم نگینہ کی ہی خیر خیریت معلوم کر لیتا۔ مجھے یہ بات رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی کہ اپنے پپا اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات کے خلاف گواہی دینے کے بعد کن جاں گسل حالات سے تھی۔ نگینہ نے سچ کی خاطر اور اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔

کیا اس میں ہماری محبت کا بھی دخل تھا؟ نیز اب شاہ میر کا اپنی بیٹی سے کیا برتاؤ ہو سکتا تھا؟ والے واقعے کے بعد یقیناً دونوں باپ بیٹی کے درمیان ضرور ایک نفرت کی خلیج حائل ہو چکی ہو گی۔ نگینہ........ وہ کیسی تھی؟ اپنے باپ کے کالے کرتوتوں سے واقف ہونے کے بعد وہ اب کون سے دوچار تھی، مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ اچانک میں نے نگینہ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کا سوچا۔ شاہ میر کی رہائش گاہ کے نمبر پنچ کرنے کے بعد میں نے دھڑکتے دل سے موبائل اپنے کان سے رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ہر بیل پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکتا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ فون نگینہ ہی اُٹھاتی۔

''ہیلو........!'' معاً ایک بھاری آواز اُبھری۔ جسے سن کر میری رگوں میں ایک لمحے کے لئے غیظ کی سنسناہٹیں اُبھری تھیں۔ یہ شاہ میر کی آواز تھی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کچھ کہے بغیر موبائل آف کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے موبائل کی رِنگ بج اُٹھی۔ میں نے ڈسپلے پر نمبر دیکھا اور چونک اُٹھا۔ سی ایل آئی پر نگینہ کے گھر کا نمبر آ رہا تھا۔

'کیا میرے موبائل کا نمبر سی ایل آئی پر دیکھنے کے بعد نگینہ نے مجھ سے رابطہ کرنا چاہا تھا؟' میں نے سوچا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''نادر علی خان! تمہاری ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہوں میں۔'' معاً شاہ میر کی پھنکارتی ہوئی آواز اُبھری اور میرے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ ''تم نے میری ہی چال مجھ پر اُلٹ دی۔ میری بیٹی نگینہ کو بھی ہم سے متنفر کر ڈالا۔''

''شاہ میر! تم نے ابھی میری چالیں دیکھی ہی کہاں ہیں؟ حقیقت جاننے کے بعد دیکھنا........ اب تمہارا اور تمہاری شیطانی جوڑی نظر حیات کا کیا حشر کرتا ہوں۔''

''تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے .... سنپولئے!''

''مجھے سنپولیا نہیں، اب اژدھا کہو۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تم نے دیکھ لیا نا شاہ میر! سانچ کو آنچ نہیں۔ تم مجھے میری مظلوم ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلانے کی مذموم کوشش کر رہے تھے مگر دیکھ لو، کاتب تقدیر نے ایک ایک سچ کھول کر رکھ دیا۔ تمہاری اکلوتی بیٹی، تمہارے ماضی کے کالے کارنامے سے آگاہ ہو چکی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بھری عدالت میں تمہارے اور نظر حیات جیسے شیطان مردود کے مکروہ چہروں کو بھی بے نقاب کر ڈالا۔''

''نگینہ میری اولاد ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تمہاری محبت کے جوش میں کیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ محبت کا نشہ جب اس کے دل و دماغ سے اتر جائے گا تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔''

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا شاہ میر!'' میں نے دانت بھینچ کر زہریلے طنز سے کہا۔ ''ہماری محبت ہوس نہیں، ایک جذبہ ہے۔ ایک سچا جذبہ........ اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لو اب شاہ میر! کہ تمہاری اپنی بیٹی نے تمہارے مکروہ چہرے سے شرافت کا نقاب نوچ ڈالا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گا نادر خان!'' وہ میرے بہ دستور جچی تلی جوابی گفتگو سے زچ ہو کر غراتے ہوئے بولا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

میں گرین لاج پہنچا۔ فضل چاچا وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کی بیوی سکینہ سے معلوم ہوا کہ آج صبح سورج نکلتے ہی وہ بھی ایک مسافر ویگن میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔ مگر کہاں، شہر یا پنڈی؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ تاہم مجھے ذرا حیرت تو ہوئی لیکن اس وقت میں خود نگینہ کی طرف سے پریشان تھا۔ اس لئے میں سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا........ میرا جب تک نگینہ سے رابطہ نہیں ہوتا، مجھے چین نصیب نہیں ہونا تھا۔ یہی سبب تھا کہ لمحہ بہ لمحہ میری بے چینی اب پریشان کن حد تک فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس بات پر شدید پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ کاش میں وہیں عدالت ختم ہوتے ہی اس سے جا ملتا، اس کا شکریہ ادا کرتا۔ مگر نگینہ نے مجھے خود سے ملنے کا ایک ذرا بھی تو موقع نہیں دیا تھا۔ میں جب ماں اور ماموں سے گلے مل رہا تھا تو وہ شاید اس دوران وہاں سے اچانک غائب ہو چکی تھی۔ خود مجھے اس کے یوں مجھ سے ملے بغیر اچانک وہاں سے چلے جانے پر حیرت سی ہو رہی تھی۔

'آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیا ایسا اس نے دانستہ کیا تھا؟ .... کیا وہ خود ہی مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ .... مگر کیوں؟ ....' کئی سوالیہ نشان نوکیلے آنکڑوں کی طرح میرے دل و دماغ میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

سکینہ نے مجھے دوپہر کے کھانے کا پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میری بھوک بالکل اُڑ چکی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نگینہ سے ملنے کے سلسلے میں میری بے چینی اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میرا نگینہ سے ملنا اشد ضروری تھا۔ حالات کے اچانک غیر متوقع انداز میں پلٹا کھانے کی وجہ سے نگینہ اور میری ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب پہلے والے حالات نہیں رہے تھے کہ میں جب چاہتا اس سے ملنے پنڈی پہنچ جاتا۔

اچانک مجھے باہر کسی گاڑی کے انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دی۔ میں چونک کر اُٹھا۔ معاً مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ فضل چاچا کی بیوی سکینہ کی تھی۔ میرا پورا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ پھر میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ معاً میرے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور میں یکدم جیسے سناٹے میں آ گیا۔ وہ تین اسلحہ بدست نقاب پوش تھے۔ ان میں ایک نسبتاً قدرے مضبوط تن و توش کا قد آور شخص تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا تو مذکورہ قد آور شخص سیاہ نقاب کے عقب سے مجھے اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ پھر میرے بالکل قریب پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خوفناک پستول کی سیاہ نال میری پیشانی سے لگا دی اور ساتھ ہی غراتے ہوئے بولا۔

''نگینہ کہاں ہے........؟''

اس کے سوال پر میرے دماغ میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نگینہ..... کہاں ہے؟"

نقاب پوش نے سرسراتی ہوئی آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ پستول کے ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑ
لگا تھا۔ پستول کے ٹریگر پر رکھی اس کی انگلی سفید ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹریگر دبانے کا
ارادہ کر چکا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس صورت حال پر کپکپا اُٹھتا۔ مگر میرا دماغ اپنی جگہ پر
تھا۔ مجھے تو اس کے غراتے ہوئے سوال نے نہ جانے کن عمیق گہرائیوں میں لا پٹخا تھا کہ مجھے کچھ
اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس صرف ایک گونج تھی کہ "نگینہ..... کہاں ہے..... کہاں ہے؟"
کا سوال میرے روئیں روئیں میں شور مچاتا ہوا گزرتا رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کیفیت کب تک رہی۔ میں تو تب چونکا، جب اس نے غرا کر اپنا
دہرایا۔

"مم..... مجھے نہیں معلوم نگینہ کہاں ہے؟" میں نے گویا عالم خود فراموشی میں اسے جواب دے
تھا۔ اس کے ساتھ غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے بھی ایک سوال پھسل گیا۔ "مگر تم لوگ کون ہو؟"

اس وقت تک شاید میرے حواس کچھ بجا ہو چکے تھے۔ اس لئے خود بہ خود میرے لہجے میں عجیب
درشتی اُتر آئی تھی۔ وہ میری بدلتی ہوئی کیفیات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا، نقاب کے پیچھے
جھانکتی اس کی سرد آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بے یقینی سی لہرائی تھی گویا اسے مجھ سے اس جواب
توقع نہ رہی ہو یا شاید میرا سخت لہجہ اس کے لئے باعث حیرت بنا ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اس وقت
میں اپنے پورے ہوش و حواس میں واپس آ چکا تھا۔

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بدستور غیظ اور نفرت بھری نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ پستول
لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بدستور موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے گولی چلانے میں ذرا بھی تامل نہیں
"تم دونوں یہاں کی اچھی طرح تلاشی لو۔" وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ "وہ لڑکی
کہیں ہو گی۔"

اس کا حکم پاتے ہی اس کے دونوں گرگے حرکت میں آ گئے۔ ایک کا رخ ملحقہ کمرے کی طرف
جبکہ دوسرے نے کمرے سے باہر نکلنے والے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

مجھے اپنی حالت کا بخوبی ادراک تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نقاب پوش پستول کا ٹریگر دبانے میں ذرا
نہیں ہچکچائے گا۔ اس کے باوجود میں غصے کی شدت کے سبب چلا اُٹھا۔

"آخر تم لوگ ہو کون؟ اور اس تمام کارروائی کا کیا مقصد ہے؟"

"مقصد....." نقاب پوش استہزائیہ انداز میں بولا۔ "مقصد تو تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔"
بدستور استہزا آمیز تھا۔ تاہم آنکھوں کی سفاکی اور سرد مہری برقرار رہی تھی۔ "رہی یہ بات کہ ہم کون ہ

یہ جاننا تمہارے لئے قطعاً ضروری نہیں۔ اور ہاں، اب تم اپنی چونچ کو بند ہی رکھو تو بہتر ہو گا۔" وہ پُر اعتماد
دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ لوگ نظر حیات اور شاہ میر کے مشترکہ "فرستادے" بھی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ فی زمانہ یہی دو افراد
میرے مقابل تھے۔ جبکہ کبیر "سپلی" میں میرے حصے آیا تھا۔

قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ نگینہ نے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے پپا کے خلاف عدالت میں "بھاری
بھرکم" گواہی دینے کے بعد اس کے محل نما آشیانے کے بجائے کہیں اور کا رخ کیا تھا۔ وہ کسی نازک
اندام سبک مزاج لڑکی کی بجائے خود میرے دشمنوں کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہی تھی۔ جس نے
بہرکیف اپنے قاتل باپ کے ہاں رہنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اگر میرا یہ قیاس درست تھا تو نگینہ جہاں بھی
تھی، محفوظ تھی۔ مگر اس کا مجھ سے رابطہ نہ تھا..... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے محبوب کے باپ کے
قاتل کی بیٹی کے روپ میں میرے سامنے نہ آنا چاہتی ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد نقاب پوش کے دونوں ساتھی قدرے ہانپتے ہوئے باری باری آ پہنچے اور ہاتھ ملتے
ہوئے بولے۔

"ہم نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہے..... مگر لڑکی یہاں نہیں ہے۔"

"یک کونا رہ گیا۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"کون سا کونا؟" نقاب پوش پستول لہرا کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ وہ جھنجلاہٹ کے مارے میرا طنز
سمجھ نہ پایا تھا۔

"کمرے کا ٹیچ باتھ۔" میں نے کہا۔

تینوں نے غیر ارادی طور پر ملحقہ باتھ روم کی طرف دیکھا۔ ان میں سے دو کا رخ اسی طرف ہو گیا
تھا۔ میرے لئے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ پستول بردار نقاب پوش کی لمحاتی توجہ ہٹتے ہی میں نے اس کے
پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بغیر کسی نشانے کے
فطراری طور پر ایک فائر کر دیا۔ فائر کی آواز گونجتے ہی جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ نقاب پوش اپنے
ہتا ہونے پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ایک ساتھ یوں گھومے تھے گویا ان کے
پیروں میں پہیے لگے ہوں۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں اس قدر پھرتی سے ان کی بازی
پلٹ دوں گا۔

"چلو شاباش.....! اپنے چہروں سے نقاب اتار دو۔" میں نے پستول کی نال ان کے سامنے
ہراتے ہوئے انہیں پچکارا۔ وہ تینوں متذبذب نظر آنے لگے۔

حالات کا تقاضا تھا کہ میں فاسٹ ایکشن کے عمل پر کاربند رہوں۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین
ائر، ایک گولی فی ران کے حساب سے داغ دیئے۔

وہ تینوں نقاب پوش کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ ڈھیتے چلے گئے۔ اور پھر اپنی زخمی رانوں کو پکڑ کر
کراہنے لگے۔

"نہ..... نہ..... رونے چلانے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں
ں۔" میں نے ان کی پُر اذیت "ہائے..... ہائے" پر زہریلے لہجے میں کہا۔

"نقاب اتارتے ہو یا پھر تمہاری دوسری ٹانگوں کا بھی یہی حشر کروں؟" میں نے آخر میں دانت پیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرخوں ناک لہجے میں کہا اور ان تینوں نے خوف زدہ انداز میں فوراً ہی اپنے اپنے نقاب اتار دیئے۔ میں نے بہ غور تینوں کے چہروں کو دیکھا اور ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ تینوں میرے لئے قطعی اجنبی تھ

"تمہارے مکھڑے اتنے خوب صورت تو نہیں ہیں کہ انہیں نقاب سے چھپایا جاتا۔" میں نے مصنوعی مایوسی سے کہا۔ "چلو، اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟ .... نظر حیات نے شاہ میر نے؟ .... یا پھر دونوں نے؟"

وہ پھر متردد نظر آنے لگے۔ میں نے ایک بار پھر فاسٹ ایکشن کے مقولے پر عمل کرنا چاہا اور پھر سے ان کی دوسری ٹانگ کا نشانہ لینے لگا تو وہ تینوں ہی بیک وقت ہاتھ کے کپکپاتے ہوئے اشارے چلا کر بولے۔

"نن......... نہیں .... گگ......... گولی مت چلانا .... مت چلانا گولی۔"

میرے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے فلمی اسٹائل میں پستول کی نال کو پھونک ما

"صرف تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ ہاں، اب بولو .... رکنا مت۔" میں نے گروہ پوش سے دانت پیس کر کہا۔

"بب......... بات دراصل یہ ہے کہ .... مم .... مجھے نگینہ .... بہت اچھی لگتی ہے ...... لل .... لیکن وہ مجھے بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔ آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مم ...... میں ا اٹھانے کے لئے یہاں آیا تھا۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

میرے حلق سے ایک سنسناتا ہوا ہنکارا خارج ہوا اور اس کے سفید جھوٹ نے میری نس نس میں آ اتار دی۔ وہ اس وقت بھی مکاری دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دشمن جتنے خطرناک تھے، اس زیادہ مکار تھے۔ اور "مکاری" سے بڑھ کر کوئی خطرناک ہتھیار نہیں ہو سکتا۔

"ڈز......... ڈز........." یکے بعد دیگرے میں نے دو بار ٹریگر دبایا تھا۔

دونوں گولیاں ایک ایک کر کے اس کے بازوؤں میں پیوست ہو گئیں اور وہ دہری تہری تکلیف باعث فرش پر بڑا بری طرح کراہنے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ مطلب یہ کہ اب اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

"تم دونوں نے اپنے گروہ کا حشر دیکھ لیا .... اور یقیناً میرا سوال بھی سن لیا ہوگا۔ تم صحیح جواب گے یا پھر........."

میں باقی دو نقاب پوشوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں وحشتیں کروٹیں لے تھیں۔ وہ پہلے ہی اپنے سامنے ایک ایسے چھلاوے کو دیکھے ہوئے تھے جس نے نہ جانے کس طرح صفت انداز میں بازی ہی پلٹ دی تھی۔

"کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟" کوئی جواب نہ پا کر میں حلق کے بل دھاڑا اور پستول کو خطرنا انداز میں حرکت دی۔

"نن......... نہیں۔ ہم .... ابھی بتاتے ہیں۔" انہوں نے خوف سے گھگھیاتے ہوئے بیک جواب دیا۔ "ہمیں نظر حیات اور اس کے بیٹے کبیر نے یہاں بھیجا تھا۔"

"صرف نظر حیات اینڈ سن نے .... یا اس کی کمپنی .... یعنی شاہ میر بھی اس سازش شریک تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"یہ حکم تمہیں کب اور کہاں دیا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے بنگلے پر .... آج ہی، لگ بھگ کوئی ایک گھنٹہ پہلے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم تینوں کون ہو؟ .... کیا اس کے پالتو کتے یا کرائے کے ٹٹو؟"

"ہمارا کوئی قصور نہیں ہے جی .... ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ آپ حکم کرو تو ہم آپ کا حکم مان لیں گے۔" ان میں سے ایک نے تکلیف کی شدت اور خوف کی زیادتی کے باعث لرزتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تو گویا تم تینوں کو کرائے پر حاصل کیا گیا ہے؟ .... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم تینوں نظر حیات اینڈ شاہ میر کمپنی کے مشترکہ طور پر پالتو کتے ہو؟"

"او نہیں جی۔ اب آپ ہماری جان چھوڑ دو۔ پہلے ہی اتنے زخمی ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمیں کرایہ بھی نہیں ملے گا۔" پہلے والا مایوسی سے منہ پھلا کر بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے لڑھکتے پھڑکتے اپنے تیسرے ساتھی کو سنبھالا جو شاید تکلیف کے باعث نیم بے ہوش ہو چکا تھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سکینہ بے ہوش تھی۔ ذرا دیر بعد فضل چاچا نے آ کر انہیں سنبھال لیا تھا۔ اس وقت تک میں ان تینوں کرائے کے بدمعاش ٹائپ ٹٹوؤں کو روانہ کر چکا تھا۔ فضل چاچا کو میں نے مختصراً سارے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

میں نے اسی وقت نظر حیات کا فون نمبر ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فون خود اس نے وصول کیا۔ اس کے "ہیلو" کہنے سے ہی میں اس کی آواز پہچان چکا تھا لہٰذا ایک ایک لفظ چبا کر گویا انگارے اگلتے ہوئے اس سے بولا۔

"نظر حیات! ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تمہاری ناپاک اور شرم ناک زندگی کا دائرہ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دائرہ عنقریب پھندا بن کر تمہاری گردن دبوچنے والا ہے۔"

دوسری طرف چند ثانئے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر نظر حیات کی درشت آواز ابھری۔

"کون ہو تم ....؟" صاف محسوس ہوتا تھا، تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ آواز سے خفیف کپکپاہٹ واضح طور پر ظاہر ہو رہی تھی۔

"تمہارے لئے یہ بات بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے نظر حیات! کہ تم مجھے اب تک پہچان نہیں پائے ہو۔ کیا میرے لہجے کی نفرت آگیں تپش اور آواز میں آتش انتقام کی تمتماہٹ کہیں محسوس نہیں ہو رہی؟ کیا .... کیا تمہیں میرے لہجے کی آگ سے ایک ایسے آشفتہ سر انسان کی دیرینہ تڑپ کا اندازہ نہیں ہو رہا جو اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی ماں کو بے گناہ عمر قید کی سزا دلوانے والوں کو عبرت ناک موت سے ہمکنار کرنے کے لئے بے چین و مضطرب ہے؟"

میرے آتشیں لہجے سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ میرا پورا وجود جلن کا شکار تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور رگوں میں لہو جیسے لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔

"او .... آئی سی .... تو گویا ہمارے لئے ایک آتش فشاں تیار ہو چکا ہے۔" اس بار دوسری جانب سے نظر حیات کی تضحیک آمیز زہریلی آواز ابھری۔

"میرے سینے میں پورا آتش فشانی جزیرہ آباد ہے کتے! .... بہت جلد تو اور تیرا یار غار شاہ میر اپنے بھیانک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔" میں دانت بھینچ کر غرایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اپنی بکواس بند کرو .... اور یہ بتاؤ تم نے نگینہ کو کیوں یرغمال بنا رکھا ہے؟'' نظر حیات نے کر
آواز میں پوچھا۔

''تمہارے کرائے کے تینوں ٹٹو میرے پاس آئے تھے اور منہ کی کھا کر لوٹ چکے ہیں۔ کسی اور
بھیجو۔ یا پھر خود آ جاؤ۔'' میں نے بھنا کر کہا تو دوسری طرف نظر حیات کو ایک بھیانک خاموشی نے جیسے
نگل لیا۔

''کیوں .... سانپ سونگھ گیا اس خوش کن اطلاع پر؟'' میں دل ہی دل میں اس کی بے بسی اور
خاموشی پر پھنکارا تو نظر حیات نے شاید خجل ہو کر رابطہ ہی منقطع کر ڈالا۔

میں نے بھی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور چند ثانیے اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتا رہا۔ اسی کوشش کے
دوران مجھے نگینہ کا خیال آیا اور میرے اعصاب فکرمندی کے باعث چٹخنے لگے۔ اس کی گمشدگی میرے لئے
پریشانی کا سبب تھی۔ لمحاتی غور کے بعد میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ میر کا نمبر ملا لیا۔ گھریلو ملازم نے
فون ریسیو کیا تھا۔

''شاہ میر سے بات کراؤ۔'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''آپ کون؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میں .... نادر علی خان بول رہا ہوں۔'' میں نے اپنا نام بتایا تو مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا
گیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد شاہ میر کی چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ وہ غراتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔

''تم .... تم .... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا نادر!''

''یہ میرا تم پر ادھار ہے .... اور میں اسے بہت جلد اتارنے کے لئے بے چین ہوں۔'' میں نے
بھی اسی لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا تو وہ بری طرح بھنا گیا اور دانت پیس کر بولا۔

''تم نے میری بیٹی نگینہ کو اغواء کرنے کی جرأت کیسے کی؟''

''یہی سوال پوچھنے کے لئے میں نے فون کیا تھا .... کیا واقعی نگینہ ....؟''

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ''انجان بننے کی کوشش فضول ہے .... بہت جلد پولیس تم
تک پہنچنے والی ہے۔ وہ خود ہی میری بیٹی کو برآمد کر لے گی۔'' یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کے بعد میں اپنا میگارد ریوالور اور چند فاضل راؤنڈ ساتھ لے کر
گرین لاج سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں آندھی طوفان کی طرح جیپ دوڑاتا ہوا راولپنڈی کی طرف
بڑھا چلا جا رہا تھا۔

نگینہ کی پراسرار گمشدگی میرے لئے پریشانی کا سبب تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس میں بھی نظر حیات اور شاہ
میر کی کوئی چال ہو۔ یہ تو طے تھا کہ نگینہ کے منظر سے ہٹنے میں ان کا مفاد پوشیدہ تھا۔ کیونکہ صدف مرڈر
کیس اب حیرت ناک طور پر قادر علی خان مرڈر کیس میں تبدیل ہو چکا تھا اور یہ انہونی محض نگینہ کی راست
گوئی کے باعث ممکن ہو سکی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں'' کے مصداق میرے دشمن
خود اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔

عدالت نے اگرچہ فوری طور پر نظر حیات اور شاہ میر کو نظر بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے مگر میں
ان ابلیس صفت بھیڑیوں کی خونخوار اور مکارانہ چالوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ انہوں نے پہلا کام یہ
کیا ہوگا کہ نگینہ کو غائب کر کے اس کا الزام میرے سر تھوپ دیا جائے۔ مگر نگینہ کو بازیاب کروانے کی خاطر
تین بدمعاشوں کی جارحانہ آمد میرے اس مفروضے کی سراسر نفی کر رہی تھی۔ یعنی اگر نگینہ کی پراسرار

اچانک گمشدگی میں شاہ میر وغیرہ کا ہاتھ تھا تو وہ اس طرح اپنے کرائے کے بدمعاشوں کی خدمات نہ لیتے
بلکہ براہ راست پولیس کو میرے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔ لہٰذا میرے ذہن میں ایک ہی
بات آئی تھی کہ نگینہ کی پراسرار گمشدگی خود نگینہ کا اپنا ہی عمل ہو۔ یعنی وہ خود ہی خاموشی کے ساتھ کہیں
روپوش ہو چکی ہو۔ مگر کہاں؟ یہ جاننے کے لئے جتنا میں بے قرار تھا، شاید اس کا باپ بھی نہ ہوگا۔

میرا خیال تھا کہ اس اُلجھی ہوئی صورت حال پر گفتگو اور مشاورت کے لئے حامد صمدانی ایڈووکیٹ
سے ملنا ضروری تھا۔ لہٰذا میرا رخ انہی کی طرف تھا۔

میں اپنی جیپ آندھی طوفان کی طرح اُڑاتا ہوا سیدھا ایڈووکیٹ حامد صمدانی کی رہائش گاہ پر پہنچا۔

''خیریت تو ہے؟ .... کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

جواباً میں نے ساری صورتِ حال سے انہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا جسے سن کر ان کی پیشانی پر بھی تشویش
آمیز سلوٹیں اُبھر آئیں۔ چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ بولے۔

''میرا خیال تو یہی ہے کہ نگینہ اپنی مرضی سے ہی کسی سہیلی کی طرف چلی گئی ہے۔''

''میں آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی۔
لیکن ....'' میں کچھ کہتے کہتے رکا تو وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے کسی فوری خیال کے تحت بولے۔

''کیا تمہیں نگینہ کی قریبی سہیلیوں کے بارے میں علم ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تو مجھے کوئی خاص علم نہیں۔ پھر بھی میں کوشش کر کے
دیکھ لیتا ہوں۔''

''تم سے ایک فاش غلطی ہو گئی نادر میاں!'' وہ اچانک بولے تو میں نے چونک کر پوچھا۔

''کیسی غلطی انکل؟''

''تم نے جب ان تینوں بدمعاشوں پر قابو پا لیا تھا تو انہیں چھوڑنا نہیں تھا بلکہ پولیس کے حوالے کر
دینا تھا۔ اس طرح ''قادر علی مرڈر کیس'' اور بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی انکل!'' میں نے کہا۔ ''مگر اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ تینوں
لٹو کتے نہیں بلکہ کرائے پر ''ہائر'' کئے گئے تھے جو اپنا بیان بھی بدل سکتے تھے اور لاتعلقی ظاہر کرنے میں
بھی دیر نہ لگاتے۔''

''ہاں .... تمہاری یہ بات تو درست ہے۔'' بالآخر اُنہیں میری بات سے متفق ہونا پڑا۔

''نظر حیات اور شاہ میر نے نگینہ کے اغواء کا الزام میرے سر تھوپ کر میرے خلاف پولیس کارروائی
کی دھمکی بھی دی ہے۔''

''پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ محض ضابطے کی کارروائی کرے گی اور خالی ہاتھ لوٹ جائے گی۔ مگر
ہاں! ....'' وہ اتنا کہہ کر ذرا رک کے پھر فکرمندی سے بولے۔ ''اس سے پہلے کہ نگینہ اپنے قاتل باپ اور
نظر حیات کے ہتھے چڑھ جائے، تمہارا اس تک پہنچنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح اس نے اچانک
کورٹ میں اس دن اپنے باپ کے خلاف گواہی دیتے ہوئے ان کے ارادوں اور منصوبوں کو ملیامیٹ کر
دیا تھا، اسی طرح یہ بازی ہمارے ہاتھوں سے نکل بھی سکتی ہے۔''

میں ان کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ شاہ میر اور نظر حیات آج سے پچیس برس پہلے والے اپنے
تاریک جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے نگینہ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ باپ ہونے کے ناتے اگرچہ شاہ
میر اپنی بیٹی نگینہ کا منہ بند کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنا سکتا تھا۔ مگر نظر حیات کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا سکتا تھا کہ وہ کمینہ خدانخواستہ نگینہ کے خلاف کوئی سفاکانہ قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔

میں مزید تھوڑی دیر حامد صمدانی صاحب کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

اب نگینہ کو میں نے بہرطور تلاش کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنوں کے ہاتھوں ذہنی اور متوقع جسمانی اذیتوں کا شکار ہو۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں اس وقت چاندنی چوک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پنڈی آرٹ گیلری کے سامنے والی سڑک سے گزر رہا تھا۔ موبائل کا بزر سنتے ہی میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ سے بندھے چرمی کیس سے موبائل نکال کر کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب سے منیجر مشتاق گوندل کی گھبرائی ہوئی متوحش آواز اُبھری۔

''سر جی!.....وہ.....آ.....آگ.....ٹال کو آگ لگ گئی ہے۔''

میں سناٹے میں آ گیا۔ ''کیسے آگ لگی؟.....کب؟'' میں نے پوچھا اور جیپ سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔

''سس.....سر جی! دن دیہاڑے اچانک کچھ نقاب پوش لمبی سی وین میں آئے تھے۔'' وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ ''انہوں نے .....اسلحے کے زور پر ہم سب کو باہر نکال دیا۔ پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے پٹرول کے گیلن لکڑیوں پر چھڑک کر انہیں دیا سلائی دکھا دی۔ اس کے بعد وہ ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر لوٹ گئے۔ بڑے آدمی تھے جی وہ بدمعاش۔'' وہ آخر میں اپنا مخصوص تکیہ کلام ادا کئے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''تم نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی؟'' میں نے دانت بھینچ کر پوچھا۔

''جی ہاں.....وہ تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔''

''مردان شاہ کہاں تھا؟''

''وہ اس وقت تو وہیں تھا۔ مگر جب ڈھاٹا پوش اپنا کام کر چکنے کے بعد فرار ہو گئے، تو وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بڑا آدمی تھا جی۔''

''بکواس بند کرو۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل آف کیا اور جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

پنڈی سے مری کا فاصلہ 64 کلومیٹر یعنی 40 میل تھا۔ یہ چالیس میل کا فاصلہ میں نے تیز رفتار ٹان اسٹاپ ڈرائیونگ کرتے ہوئے صرف نصف گھنٹے میں طے کیا تھا۔ کشمیر پوائنٹ سے میں نے جیپ مال روڈ کی طرف موڑی اور مری کی خوب صورت ترین عمارت یعنی سنگ مرمر کے بنے G.P.O کے سامنے سے گزر کر مال روڈ پر ڈال دی۔ پھر ''باغِ شہیداں'' سے شارٹ کٹ لیتا ہوا سیدھا اپنے ٹال کے نزدیک پہنچا تو دور ہی سے آگ اور دھوئیں کے کثیف بادل دکھائی دے گئے۔

وہاں فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی سرتوڑ کوشش میں سرگرم نظر آیا۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کا جم غفیر بھی نظر آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے بریک لگائے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں جلدی سے نیچے اُترا اور اپنے ٹال سے بلند ہوتے بھیانک شعلوں اور کثیف دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

اپنے ٹال کو جلتا دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے دشمنوں نے مجھے مالی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ کیونکہ ٹال میں بیش قیمت لکڑی بھاری مقدار میں موجود تھی، جو سب جل کر راکھ

رہی تھی۔ لکڑی جس قدر بیش قیمت ہوتی ہے، آگ بھی اسی قدر جلد پکڑتی ہے۔ اور جب تک آگ اچھی طرح نگل نہ لے، بجھنے کا نام نہیں لیتی۔

آگ بڑے بڑے شہتیروں کو تیزی سے نگل رہی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی مقدور بھر دشمنوں میں لگا ہوا تھا۔

میں جیسے سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ پھر ٹال کے حیران پریشان مزدور مجھے دیکھ کر میری طرف لپکے۔ ان میں منیجر مشتاق گوندل بھی تھا۔ اس کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ بلکہ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھی سوس کی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''مردان شاہ کدھر ہے؟'' میں نے بہ آواز بلند پوچھا تو کوئی بھی اس کے بارے میں نہ بتا سکا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لئے۔

میں نے مزدوروں کو وہیں موجود رہنے کی تاکید کی اور منیجر مشتاق کو لئے سیدھا تھانے پہنچا۔ ایس۔ایچ۔او کی نشست پر ایک موٹا، بھاری توند والا سب انسپکٹر سالم پتھر کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔ میز پر رکھی ایک پلیٹ میں بچی کھچی چوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری طبیعت ویسے بھی مکدر ہونے لگی تھی۔

''میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔'' اس کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں، میں نے کہا۔ پھر خود پر قابو پانے میں ناکامی کے بعد بے اختیار بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! براہِ کرم .....ذرا ہڈیاں چبانا بند کریں تو کچھ توجہ ادھر بھی ہو جائے۔''

اس کا ڈیوٹی کے دوران اس کراہت آمیز انداز میں کھانا مجھے ویسے ہی بری طرح کھل گیا تھا۔ تاہم میرے طنزیہ جملوں کی کاٹ نے اس خرانٹ سے سب انسپکٹر کی چولیں ضرور ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے ''سپڑ.....سپڑ'' چلتے ہوئے منہ کو بریک لگ گئے تھے۔

''کیا بات ہے.....؟'' انداز لٹھ مار تھا۔

''رپورٹ لکھوانی تھی میں نے .....میرے ٹال کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''باہر برآمدے میں ہی محرر موجود ہے۔ جا کر پہلے این سی کٹوا دو۔'' وہ بے پرواہی سے بولا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بچے کھچے پتھر کو ایک بار پھر بھنبھوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ میں غصے سے بل کھانے لگا۔

''بڑے آدمی ہیں جی.....'' میرے ساتھ کھڑے منیجر مشتاق گوندل نے ہولے سے بڑبڑا کر کہا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے ٹال کو کن لوگوں نے آگ لگائی ہے۔ اس لئے میں سیدھا آپ ہی کے پاس آیا تھا تاکہ آپ ملزموں کے خلاف فوری کارروائی کریں۔'' میں نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے مگر قدرے بلند آواز میں کہا تو وہ بھی بھنائے ہوئے لہجے میں بولا

''اچھا.....اچھا، سمجھ گیا .....زیادہ اونچا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھو۔'' وہ نہ بھی کہتا تو میں خود بیٹھنے والا تھا۔

اس نے گھنٹی بجا کر اردلی کو ہیڈ محرر کو اندر بھیجنے کا حکم دیا۔ پھر بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میرے ساتھ بیٹھے منیجر مشتاق کی طرف دیکھا اور پھر میرا نام پوچھا۔

''نادر علی خان۔''

''یہ کون ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ میرا منیجر ہے۔ مشتاق گوندل۔"

"تمہیں کس پر شبہ ہے؟"

"مجھے شبہ نہیں، سو فیصد یقین ہے انسپکٹر صاحب! کہ یہ بزدلانہ حرکت کن لوگوں کی ہو سکتی ہے۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"ہاں تو بھئی، ان کے نام بھی ہوں گے ..... بتاؤ، کون تھے وہ؟"

میں نے اس کے استفسار پر کہا۔ "نظر حیات اور شاہ میر۔"

وہ یہ نام سن کر یوں اچھلا جیسے میز کے نیچے سے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہیں ..... یہ کن لوگوں کے نام لے رہے ہو تم؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیوں ..... کیا انہیں گرفتار کرنے پر پابندی عائد ہے؟" میرا لہجہ پھر طنزیہ ہونے لگا۔

"ان دونوں کے تو پہلے ہی کورٹ نے نظر بند کرنے کے احکامات جاری کر رکھے ہیں۔" وہ میرے کٹیلے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

صدف مرڈر اور بعد میں قادر علی خان مرڈر کیس کے حوالے سے میری شہرت محکمہ پولیس میں پھیل چکی تھی اور چونکہ شہر کے ایک بڑے بیوروکریٹ اعظم خان صاحب کا میری پشت پر ہاتھ تھا اس لئے انسپکٹر نے مجھ سے نہ صرف بات کرنے کی زحمت گوارا کی تھی بلکہ میرے کڑوے کسیلے جملوں کو بھی پی گیا تھا۔

بہرطور میں نے اس کے جواب میں طنزیہ حیرت سے کہا۔ "تو کیا ان دونوں کو اپنی رہائش گاہ تک محدود کر کے آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ کوئی جرم نہیں کر سکتے؟"

"خیر ..... ایسی بات بھی نہیں۔" وہ ہیچر مچر کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "دیکھئے نادر صاحب میرا مشورہ مانیں، آپ نامعلوم شر پسندوں کے خلاف پرچہ کٹوا دیں ..... میں آج سے مجرموں کی تلاش کا کام شروع کر دیتا ہوں۔ ان کے گرفتار ہوتے ہی آپ کے مطلوبہ مخالفین بھی خود بہ خود دھر لئے جائیں گے۔ یہی اصول اور طریقہ کار بہتر رہے گا۔"

اس نے آخر میں سمجھانے والے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ تاہم بولا۔ "ٹھیک ہے ..... آپ اپنی ضابطے کی کارروائی نمٹانے کی کوشش کریں۔ میں بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

نصف گھنٹے بعد میں تھانے کی عمارت سے نکلا اور اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔

"سر جی! ..... میرا بھی آپ کی طرح سو فیصد یہی خیال ہے کہ یہ کام نظر حیات اور شاہ میر کے آدمیوں نے ہی کیا ہوگا۔" میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھائی تو میرے برابر والی نشست پر بیٹھے ہوئے منیجر مشتاق گوندل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور جیپ دوبارہ اپنے ٹال کی طرف موڑ دی۔

فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے میں "کامیاب" ہو چکا تھا۔ کیونکہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو جانے کے بعد آگ کا ایندھن جو ختم ہو چکا تھا۔

پورا ٹال شمشان گھاٹ کا منظر پیش کر رہا تھا ..... ہر طرف سلگتے اور دھواں اگلتے کوئلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

میں نے حسرت و یاس سے یہ سارا منظر دیکھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ ٹال میرے

مرحوم باپ قادر علی خان کی نشانی تھا، جس نے یقیناً بہت محنت و مشقت کر کے اس کاروبار کو فروغ دیا تھا۔ ان کے بعد ماموں حیدر گل نے اسے سنبھالا تھا۔ ان کے جیل جانے کے بعد اس کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی مگر ..... افسوس! اپنے دشمن کی زد سے میں اپنے اس اہم ذریعہ معاش کو بھی نہ بچا سکا تھا۔

اچانک مجھے مردان شاہ کا خیال آیا۔ وہ میرا ایک پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یوں اس وقت پر اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جبکہ اس کے باقی سارے ساتھی مزدور میرے شریکِ غم بنے یہاں موجود تھے۔ وہ بھی بہت غمگین اور مضطرب نظر آ رہے تھے۔ یقیناً ٹال کی تباہی کو وہ اپنا نقصان سمجھ اور منا رہے تھے۔

"سر جی! ..... اب کیا ہوگا؟ یہ بے چارے مزدور تو بے روزگار ہو جائیں گے۔" میرے قریب کھڑے منیجر مشتاق نے مسکین چہرے کے ساتھ کہا۔ دیگر مزدوروں کی یاس بھری نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ان میں سے ایک مزدور نے منیجر مشتاق سے کہا۔

"منیجر صاحب! اللہ ہمارے نادر میاں کو زندگی دے۔ آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم تو مزدور ہیں۔ کہیں نہیں سے کما کر گزارا کر لیں گے۔"

"منیجر .....!" میں نے مشتاق کو پکارا۔

"جی، سر جی!" وہ ایک دم بولا۔

"ان سارے مزدوروں کا حساب کتاب اسی طرح چلتا رہے گا۔ انہیں تنخواہ کے علاوہ روز کا مزدوری بھتہ ملنا چاہئے۔ مجھ سے چیک بک پر سائن لے لو۔"

میرے اس فیصلے پر سارے مزدور بہ آواز بلند بولے۔ "ہرگز نہیں چھوٹے مالک! ..... ہم اتنے خود غرض نہیں ہیں جو بغیر کام کئے اپنی جیب بھریں۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم ہر دکھ اور مشکل وقت میں آپ کے ساتھ ہیں۔"

ان کی بات سن کر مجھ پر جذبات انگیز رقت طاری ہونے لگی۔ پھر میں نے مردان شاہ کا پوچھا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"وہ بڑے مزے سے اپنے گھر بیٹھا ہوگا۔ اور کہاں ہو سکتا ہے وہ۔" منیجر مشتاق نے کڑوے لہجے سے کہا تو ایک جوان مزدور نے اس کی تردید کرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے منیجر صاحب! شاہ صاحب اتنے خود غرض نہیں ہیں۔ وہ ضرور ان معاشوں کے تعاقب میں گئے ہوں گے۔" میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا مگر مجھے اس کی بات غلط محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے ..... مردان شاہ تم میں سے کسی کو ملے تو اسے میرے پاس "گرین لاج" بھیج دینا۔" میں نے ان سے کہا۔ پھر منیجر مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مشتاق! تم کل صبح میرے پاس پہنچ جانا۔"

اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور میں دوبارہ جیپ میں سوار ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت مختلف راستوں اور سمتوں میں بٹا ہوا تھا۔ نگینہ کی پراسرار گمشدگی، ٹال کی تباہی، پھر نگینہ کی طرف سے یہ پریشانی کہ نظر حیات اور کبیر کے علاوہ خود اس کا باپ شاہ میر بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تلاش میں جتے ہوئے تھے۔ یہ امر میرے لئے مزید تشویش کا باعث تھا۔ کیونکہ ان دونوں بلکہ بہ شمول کبیر تینوں کا نگینہ کو اٹھانے کا مقصد نیک نہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ''گرین لاج'' کی طرف محوِ سفر تھا کہ معاً موبائل پر مجھ سے فضل چاچا نے رابطہ کیا۔ وہ پریشان تھے۔ بولے۔

''نادر بیٹا! یہاں گرین لاج میں ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس آئی تھی۔ وہ تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی میں اس اطلاع پر چونکے بغیر بولا۔ ''بے فکر رہو بابا! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس نے تلاش کے سلسلے میں گرین لاج کا ضرور چپہ چپہ چھان مارا ہوگا۔''

''بیٹا! انہیں شبہ تو یہی تھا کہ نگینہ ادھر ہی ہوگی۔'' فضل چاچا نے کہا۔ ''مگر نادر بیٹا! بات صرف ہی نہیں ہے۔'' وہ آخر میں اسرار بھرے لہجے میں بولے اور اس بار میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا مطلب چاچا؟ پھر اور کیا بات تھی؟'' میں نے پوچھا تو وہ پُرتشویش لہجے میں بولے۔

''پولیس باوجود اس کے تمہیں ہر صورت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ ان کے پاس تمہاری گرفتاری کا باقاعدہ وارنٹ ہے۔ ویسے تم کہاں سے بول رہے ہو بیٹا؟''

انہوں نے آخر میں پوچھا۔ اور جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں کچھ ہی دیر میں گرین لاج پہنچنے والا ہوں تو وہ یکدم متوحش لہجے میں بولے۔

''نن.....نہیں بیٹا! ابھی یہاں مت آنا۔ تت.....تم کہیں دور نکل جاؤ۔ مجھے حالات اچھے نہیں آ رہے۔''

فضل چاچا کے پُرتشویش لہجے پر میں بھی پریشان سا ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب پولیس کو ''گرین لاج'' میں نگینہ کا سراغ نہیں مل سکا تھا تو پھر وہ مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتی تھی؟ اس کا مطلب تھا کہ بات صرف نگینہ کو بازیاب کرنے کی حد تک ہی محدود نہ تھی، کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس سے بھی بڑھ کر اہم تھی اور وہ کیا بات تھی؟ ..... میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ میں نے یکدم جیپ کو بریک لگا دیئے۔ ٹائر زور سے چرچرائے اور ویرانے میں جیپ کھڑی ہوگئی۔ میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ سڑک کے دو رویہ چیڑ اور صنوبر کے گھنے درختوں پر شام کی کلاہٹ اُترنے لگی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جانے اور انجانے دشمن مجھ سے زیادہ تیزی کے ساتھ میرے خلاف کوئی جال بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایسا جال جو مجھے ہر طرح سے گرفت میں لے کر بس کر ڈالے۔ نگینہ کا پراسرار ''غیاب''، ٹال کی تباہی اور اب پولیس کا میری تلاش میں گرین لاج آنا..... معاملہ میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کدھر جاؤں۔ ''گرین لاج'' کے سوا میرا اور کہیں بھی ٹھکانہ نہ تھا۔

میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کم وقت تھا۔

مری کے یہ خواب ناک اور ہرے بھرے جنگل رات ہوتے ہی ہیبت ناک اندھیاروں میں ڈوب جاتے تھے۔ چھ بجے کے بعد ٹریفک تقریباً معطل ہو جاتی تھی۔ کوئی اِکا دُکا پرائیویٹ گاڑی کبھی کبھار دیکھنے میں آ جاتی تو اور بات تھی۔ ورنہ تو آس پاس کا پورا ماحول خوفناک جنگل میں بدل جاتا تھا۔

بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سردست میرا ''گرین لاج'' جانا مناسب نہ تھا۔ مگر پھر کہاں جاؤں؟ ابھی میں اس ادھیڑ بُن میں مصروف تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی۔ بیک ویو مرر سے نظریں ہٹا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے سر نکال کر عقب میں دیکھا تو اکلوتی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی موٹر بائیک تھی جس کی لحہ بہ لحہ قریب آتی ہوئی مخصوص

آواز اب واضح سنائی دینے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

بائیک میرے قریب سے گزری۔ اور پھر یکلخت اس کے پچھلے ٹائر کی چرچراہٹ اُبھری۔ میں چونک گیا اور آنکھیں سکیڑ کر بہ غور بائیک سوار کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بائیک سوار واپس موڑ کاٹ کر میری جیپ کی طرف ہی بڑھنے لگا اور پھر جیسے ہی وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ مردان شاہ تھا۔

میں جلدی سے دروازہ کھول کر جیپ سے اُتر آیا۔ وہ بھی مجھے پہچان چکا تھا اور اپنی موٹر سائیکل سے اُتر کر وہ میری طرف لپکا۔

''سلام صاحب!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر تیزی سے پوچھا۔ ''مردان شاہ! تم ..... خیریت تو ہے؟..... کہاں جا رہے تھے اس وقت؟''

''میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا..... گرین لاج۔'' اس نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں..... خیریت؟'' میں نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ پُرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا مضطرب بھی نظر آ رہا تھا۔ ''مجھے آپ کا پیغام ملا تھا۔'' وہ اپنے مضطربانہ جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر مجھے آپ کا پیغام نہیں ملتا، تب بھی میں آپ کے پاس ضرور آتا۔ مگر سر!..... آپ..... آپ یہاں، اس ویرانے میں کیوں کھڑے تھے؟''

''پہلے تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''سر! گرین لاج چلتے ہیں۔ وہاں میں ساری تفصیل آپ کو بتا دوں گا۔''

''نہیں، میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم بتاؤ، کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے گرین لاج نہ جانے کی وجہ فی الوقت اسے نہیں بتائی اور اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔

''سس..... سر جی! آپ..... آپ کی ..... جان کو بہت شدید خطرہ ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''بات کیا ہے آخر؟ ..... کچھ بتاؤ تو۔''

ابھی مردان شاہ نے کوئی جواب دینے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک ہمارے عقب سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو تیز رفتاری سے اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا، مردان شاہ اس روشنی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔ پھر فوراً گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سر جی! دشمن آ رہے ہیں ..... جلدی کریں، نکل چلیں یہاں سے۔''

میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔

''وقت کم ہے سر!..... خدا کے لئے جلدی کریں۔ آ..... آپ کی جان سخت خطرے میں ہے۔'' وہ دوبارہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر پھرتی سے اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مردان شاہ تیزی سے اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پوری قوت سے اسٹیئرنگ کو گھماتا چلا گیا۔ ٹائروں کی تیز چرچراہٹ اُبھری اور جیپ نے یوٹرن لے لیا، اس کے ساتھ میں نے ایکسیلیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ جیپ کسی زخمی درندے کی طرح اسی سمت بڑھی جس طرف سے وہ روشنی نمودار ہوئی تھی۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مردان شاہ بھی شاید اپنی بائیک پر میرے عقب میں آ رہا تھا۔ اسے میرے سیدھا نکل جانے کی بجائے سامنے سے آنے والی گاڑی کی سمت بڑھنے پر ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے دونوں ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظریں ونڈ اسکرین کے پار سامنے
ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر مرکوز تھیں۔ فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ نے اپنی بائیک
جیپ کی آڑ میں لگا رکھی تھی۔ میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور اعصاب تن گئے تھے۔
لیمپس، ایک انٹرکولر ٹربو کے تھے جس نے ذرا قریب پہنچتے ہی اپنی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ وہ چا
میرے برابر سے گزر سکتے تھے۔ مگر میری ہلکی ہوتی رفتار کو دیکھ کر اس گاڑی کے ڈرائیور نے بھی اپنی
کم کر دی تھی۔ وہ سڑک کے عین درمیان میں تھے۔ یقیناً وہ میری گاڑی کا راستہ روکنا چاہتے تھے۔
یک ٹک گھورتی ہوئی سنسناتی نظروں نے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں اس میں سوار مسلح افراد کی
دیکھ لی تھی، جن کے تیور مجھے خطرناک ہی نظر آئے تھے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔
رک گئے۔ یقیناً وہ گاڑی سے باہر نکل کر مجھ پر فائرنگ کرنا چاہتے ہوں گے۔ اسی لمحے میں نے
فیصلہ کیا اور یک لخت اپنی جیپ کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسٹیئرنگ کاٹا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ
زن سے ٹربو انٹرکولر کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ دشمنوں کی جیپ کے سوار ہکا بکا اپنے ہتھیار سنبھا
گئے۔ میں تو نکل آیا تھا لیکن مجھے اپنے عقب میں آتے ہوئے مردان شاہ کی فکر لاحق ہوئی۔ مَیں
بیک ویو مرر میں دیکھا۔

وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ اپنی بائیک کو تیزی سے دوڑاتا ہوا میری دائیں جانب
جیپ کے بالکل متوازی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ گویا ہم دونوں دشمنوں کا راستہ کاٹ کر نکل آئے تھے لیکن
کے باوجود مجھے مردان شاہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔

اسے راستہ دینے کے لئے میں نے اسے ذرا سی سائیڈ دی اور جیپ کو پوری رفتار سے دوڑانے
ساتھ ہی میری نظریں عقبی منظر پیش کرنے والے مرر پر بھی متحرک تھیں۔ دشمنوں کی انٹرکولر بھی اب
تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے تعاقب میں دوڑی آ رہی تھی۔

دفعتہً عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنا سر
جھکا لیا۔ جیپ کے عقبی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز اُبھری اور کئی گولیاں ''زٹا زٹ'' کی آواز کے ساتھ جیپ
باڈی میں پیوست ہو گئیں۔ مجھے مردان شاہ کی طرف سے زیادہ تشویش تھی کیونکہ وہ بے چارہ بائیک پر تھا۔
میرے خیال میں اسے سڑک کی بجائے تاریک جنگل میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ مجھے
تھا کہ دشمن اسے نظرانداز کر کے میرے ہی تعاقب میں بدستور لگے رہیں گے۔ لیکن وہ جاں نثار شخص
شاید تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ میں اسے چلا کر متنبہ بھی تو نہیں کر سکتا
کیونکہ ایک تو میری جیپ کی رفتار بہت تیز تھی، دوسرے مجھے اس پر پوری طرح کنٹرول کرنا پڑ رہا
سڑک بے شک کشادہ سہی لیکن مجھے موڑ بھی کاٹنے پڑ رہے تھے۔ پھر وہ بائیک پر تھا اور میں جیپ
میری حتیٰ الامکان کوشش یہی تھی کہ وہ میری جیپ کے آگے ہی رہے۔ اور یہ اس نے عقل مندی کی
تھی۔ مگر باوجود اس کے، ایک بائیک کا انجن میری جیپ کی رفتار کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ
وہ اکثر پیچھے رہ جاتا تھا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں رک کر دشمنوں کا مقابلہ کروں لیکن حالات
کا تقاضا تھا کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ چنانچہ فی الوقت راہِ فرار اختیار کرنا ہی زیادہ
تھا۔ عقب سے دشمنوں کی فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ ادھر مردان شاہ کے میرے متوازی
ہو کر آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی جیپ کو فائرنگ کی زد سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے
دائیں بائیں کرنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔

پھر فوراً ہی شاید مردان شاہ کو اس بات کا احساس ہوا اور اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
موڑ پر اپنی بائیک اندھیرے جنگل میں موڑ دی۔ سڑک کا یہ موڑ نسبتاً تنگ ثابت ہوا۔ میں نے جیپ
رفتار قدرے کم کرتے ہوئے اسٹیئرنگ موڑا تو جیپ موڑ کاٹنے کے دوران کچے میں اُتر گئی۔ میں نے
اسٹیئرنگ گھما کر جیپ کو سڑک پر لانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح لہراتے ہوئے میرے قابو سے
ہو گئی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور پھر وہ الٹ
مجھے ایک لمحے کو پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیپ دھماکے کے ساتھ لیفٹ سائیڈ پر گری تھی
خاصی دور تک چکنی سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔ ونڈ اسکرین کے ایک چھناکے سے ٹوٹنے کی آواز کے
ساتھ ہی میرے حواس بھی مختل ہونے لگے۔ شکر تھا کہ انہوں نے میرا ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔
میں نے حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ رکھے تھے۔ اسی لئے اُلٹنے پلٹنے سے بچ گیا تھا۔ مگر بہرحال جیپ
الٹنے سے مجھے سر میں چوٹیں آئی تھیں۔

جیپ خاصی دور تک گھسٹتے رہنے کے بعد تھم گئی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دے کر اپنے مختلف
منتشر ہوتے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور مقدور بھر پھرتی کے ساتھ سیٹ بیلٹ کھول کر اپنے وجود کو آسمان
کی طرف اٹھے ہوئے دوسرے دروازے کی کھڑکی سے باہر سڑک پر اچھالنے میں بہ مشکل کامیاب ہوا۔
اسی دوران میں نے دیکھا، دشمنوں کی گاڑی بھی سر پر پہنچ کر زوردار چرچراہٹ کے ساتھ رک چکی تھی۔
ممکنہ خطرے کے پیش نظر تیزی سے اپنی الٹی ہوئی جیپ کی آڑ میں رینگ گیا اور پھرتی کے ساتھ اپنا
میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

میرے سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور مجھے اپنے چہرے پر خون کی لکیریں سی رینگتی محسوس
ہو رہی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ مجھے دشمنوں پر فائر کرنے کا موقع ملتا، یک بیک کئی رائفلیں ایک ساتھ
گرجیں۔ گولیوں کا ریلا جیپ کی طرف آیا اور جیپ کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ کسی وقت بھی کوئی بھولی بھٹکی
گولی فیول ٹینک میں پیوست ہو کر دیسی ساختہ بم کی طرح گاڑی کو اُڑا سکتی تھی۔ اس لئے میرا ''برننگ
پوائنٹ'' سے فوری طور پر دور ہو جانا اشد ضروری تھا۔ دشمنوں کی اندھا دھند فائرنگ سے صاف ظاہر ہوتا
تھا کہ وہ مجھے بہرصورت ہلاک کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ میرے عقب میں جنگل تھا۔ میں تھکے
ہوئے چیتے کی طرح پلٹا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچتا بچاتا، کہنیوں کے بل رینگتا تاریک جنگل میں
داخل ہو گیا۔ میں نے اب اپنا میگارد ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور ایک درخت کی آڑ میں تاریکی کا حصہ بن کر
کھڑا ہو گیا۔

بالآخر وہی ہوا۔ دفعتہً کسی گولی نے فیول ٹینک کو لیک کر دیا اور چشم زدن میں ایک سماعت شکن
دھماکے سے آگ بھڑک اُٹھی......... پوری جیپ دھڑا دھڑ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ میں نے بہ غور
دشمنوں کی طرف دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔

انہوں نے اب فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر ڈالا تھا۔ میں نے بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک
خاصا مضبوط اور تنومند شخص بھی تھا جو زیادہ پُرجوش اور سرگرم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا
ایک کرخت صورت شخص تھا۔ اپنے دیگر تین ساتھیوں کی لیڈنگ شاید وہی کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے ہاتھ
کے اشارے سے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ چاروں گنیں تانے جلتی سلگتی جیپ کے گرد چکر
لگانے لگے۔

''شکار نکل گیا ہے۔'' اسی کرخت صورت شخص نے دانت پیس کر اپنے تینوں ساتھیوں سے کہا۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتا تو یہاں سے ان پر گولیاں داغ سکتا تھا۔ مگر سردست میرا اس طرح دم سادھے کھڑے رہنا بہتر تھا۔

''اس طرف سے جنگل میں داخل ہو جاؤ .... وہ اُدھر ہی گیا ہو گا۔'' اس نے چلاتے ہو غیظ لہجے میں کہا۔ پھر اس کے تینوں ساتھی جنگل کی طرف تیزی سے بڑھے۔ ان کے پاس تھیں۔ میری کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ میں نے ابھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ یہی سمجھے تھے کہ میں تاریک جنگل میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ جب اس کے تینوں ساتھی اندر تار غرق ہو گئے تو میں نے سڑک پر چوکس کھڑے کرخت صورت بدمعاش کو دیکھا۔ اس کے بعد میں میگارد جیب میں ٹھونسا اور قد آدم جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا دوسری جانب سے اُبھر کر یکدم سڑک پر دشمنوں کی انٹرکولر کی آڑ میں آ گیا اور ذرا سر اُبھار کر سامنے دیکھا تو وہ کرخت صورت بدمعاش قریب ہی اپنی گن تانے چوکس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور پشت میری سمت۔ اسے چھاپنے کا ارادہ کیا اور انٹرکولر کی آڑ لیتا ہوا دبے پاؤں اس کے عقب میں اُبھرا۔ اس دوران میگارد نکال کر دوبارہ اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے عقب میں آ کر میگارڈ اس کی گدی سے لگا کر میں سانپ کی طرح پھنکارا۔

''خبردار!......... کوئی حرکت مت کرنا .... ورنہ گولی مار کر بھیجہ اُڑا دوں گا۔''

وہ جیسے یکدم ساکت کھڑا رہ گیا۔

''اپنی گن پھینک دو .... جلدی.........'' میں نے چنگھاڑتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔ اپنی گن دور سڑک پر اچھالی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جھکائی دے کر اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی پوری سے میرے پیٹ میں رسید کر دی......... میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میرے رکوع کے بل جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنا رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ وہ وحشی درندے کی طرح غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ نے چشم زدن میں خود کو سنبھالا اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے جھپٹ پڑا۔

ڈیل ڈول اور قد و قامت کے لحاظ سے ہماری برابر کی ٹکر تھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز ظاہر تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے معاملات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ابتدائی دو حملوں نے مجھے خاصا پہنچایا تھا۔ مگر اس تکلیف نے میرے اندر ایک جنوں خیز لہر کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے خالص طریقے سے اڑنگا لگا کر سڑک بوس کر ڈالا اور اچھل کر اپنے دونوں گھٹنے سکیڑ کر اس کے پیٹ پر دیئے۔ اس کے حلق سے بھینسے کے ڈکرانے جیسی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں اب اس کے پیٹ اور سوار ہو گیا تھا جبکہ اس کی موٹی گردن میرے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں آ چکی تھی۔ میں اس کا ٹینٹوا چلا گیا۔ اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کا مقابل ہم پلہ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے دفاع میں ایک جھٹکے کروٹ بدلی اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میرے پہلو کے بل گرتے ہی اس نے ایک جھٹکے میری گردن پر کمزور پڑتی گرفت کو چھڑا لیا اور ساتھ ہی اپنی داہنی ٹانگ کی بھرپور ضرب میرے رسید کرنا چاہی تو میں نے بھی فوراً اپنے پیٹ کو اس کی قیامت خیز ضرب سے بچاتے ہوئے اپنے گھٹنے سکیڑ لئے اور بائیں ہاتھ کا مکا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ یہ مکا کسی عام انسان کا نہیں بلکہ ایک اسٹیمنا رکھنے والے اسپورٹس ایتھلیٹ کا تھا۔ نتیجتاً اس کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا اور اس کی زخمی ناک بھل بھل خون بہہ کر اس کے چہرے کو مزید دہشت انگیز بنا رہا تھا۔ یہ ایک بھرپور ضرب تھی جس

چند ثانیے کے لئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز مردان شاہ کی موٹر بائیک کی تھی۔

وہ جلدی سے اُترا اور بائیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔

''آ......... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟''

''ہاں .... میں ٹھیک ہوں......... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلنا ہے۔ اس کے ساتھی میری تلاش میں جنگل کی طرف جا چکے ہیں۔'' میں نے سڑک پر بے سدھ پڑے دشمن کی طرف دیکھ کر اس سے کہا۔

اس کے بعد میں نے اپنا میگارد اٹھایا اور مردان شاہ نے دشمن کی گن پر قبضہ جمایا۔ ہم دشمن کی انٹرکولر میں سوار ہوئے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ مردان شاہ نے دشمن کو ہلتے جلتے دیکھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کے آہنی کندھے سے اس کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگا کر اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنی بائیک کو بھی انٹرکولر کے عقبی دراز ے سے اندر پھینک چکا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی ہوئی تھی۔ مردان شاہ نے بے ہوش دشمن کی تلاشی لینے کے بعد اس کے وجود کو عقبی نشست پر اچھال دیا تھا اور خود بھی وہیں جم کر براجمان ہو گیا۔

میں نے جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے گیئر بدلا، کلچ چھوڑ کر ایکسیلیٹر دبایا تو اچانک میں نے جنگل سے مضروب دشمن کے تینوں مسلح ساتھیوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر ہم پر نگاہ پڑتے ہی چشم زدن میں انہیں حقیقت حال کا ادراک ہوا۔ انہوں نے پھرتی سے اپنی گنیں ہم پر سیدھی کی ہی تھیں کہ انٹرکولر کا طاقت ور انجن غرایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے اچھل کر کمان سے نکلے تیر کی طرح طوفانی رفتار سے آگے بڑھی۔ ان تینوں نے ہم پر بے دریغ گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں مگر انٹرکولر کا لاجواب پک اپ موشن پلک جھپکتے ہی ہمیں دشمنوں کی فائرنگ سے بچاتا ہوا دور لے گیا۔

''سر! یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' سکون کی چند گھڑیاں میسر آتے ہی عقب سے مردان شاہ کی آواز ابھری۔ اس کا اشارہ بے ہوش یرغمالی دشمن کی طرف تھا۔

''مجھے حیرت ہے سر! کہ آپ نے لاہور کے ''گجر چوک'' کے ایک بدنام زمانہ غنڈے کو کس طرح آسانی سے قابو کر لیا۔'' اس کا تبصرہ ابھی باقی تھا۔

میں نے سڑک پر اپنی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کون ہے یہ؟ .... کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''یہ ہسٹری شیٹر بدمعاش بلال عرف کالا ناگ ہے۔''

''بلال عرف کالا ناگ.........؟'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا۔

''ہاں سر! یہ نہایت سفاک اور خطرناک آدمی ہے بلکہ بہت بڑا گینگسٹر بھی ہے۔ بڑے بڑے پیسے والے لوگ اسے اپنے غیر قانونی ہتھکنڈوں کے لئے ''ہائر'' کرتے رہتے ہیں۔''

''اب یہ ہمیں بتائے گا کہ اس نے کس کے اشارے پر یہ دھماچوکڑی مچائی ہے؟'' میں متاثر ہوئے بغیر دانت بھینچ کر بولا۔

''سر جی! اب آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' معاً مردان شاہ نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اسے سب سے پہلے اپنے ''گرین لاج'' نہ جانے کی وجہ بتائی، پھر اس سے پوچھا مجھے کون سی اہم خبر دینا چاہتا تھا؟

''سر جی! پھر ایسا کرتے ہیں، آپ میرے ساتھ ہی غریب خانے پر چلے چلئے۔ وہیں اطمینان باتیں ہوں گی۔''

''مگر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے۔ اور ہمیں اس مردار بلال عرف کالا ناگ کا منہ بھی ہوگا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''گھر میں میرے بوڑھے باپ ایک بہن کے سوا اور کوئی نہیں۔ رہی بات اس بلال عرف کالا ناگ کا منہ کھلوانے کی تو ضرورت کیونکہ میں سب جانتا ہوں کہ کس کے اشارے پر یہ سب ہو رہا ہے۔''

''کیا ٹال کو آگ لگوانے میں اس کا ہاتھ تھا؟''

''بالکل.....اسی بدبخت نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گن پوائنٹ پر پہلے ہمیں باہر اس کے بعد ٹال پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔'' وہ بتانے لگا۔ ''جب یہ لوگ اپنی کارروائی کے واپس لوٹنے لگے تو میں نے ایک دوست کی موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ پھر ان کے ٹھکا پہنچ کر میں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو بھی سن لی تھی۔ بلال کالا ناگ آپ کے دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کا مشترکہ غلام ہے اور یہ گل اس بدبخت نے ان کے پر کھلایا تھا۔''

''ہوں.....'' میں نے ہونٹ بھینچ کر طویل پُرسوچ ہنکاری بھری۔

''اور سر!.....'' وہ مزید بتانے لگا۔ ''نظر حیات اور شاہ میر ہی کے اشارے پر اب یہ خبیث عرف کالا ناگ آپ کو بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ یہ ناپاک منصوبہ بنانے کے بعد یہ لوگ آپ کی ''گرین لاج'' روانہ ہوئے تھے۔ مگر میں ان خونی ہرکاروں سے پہلے آپ کے پاس پہنچ کر آپ کو کرنے آ رہا تھا۔''

''ان کا وہ ٹھکانہ بتاؤ جہاں تک تم نے ان کا تعاقب کیا تھا اور ان کی آپس میں ہونے والی بندی کے بارے میں آگاہی حاصل کی تھی۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا تو اس نے مجھے ان کے ٹھ کا تفصیلی محل وقوع وغیرہ بتا دیا۔

''یہ ان کا خاص الخاص ٹھکانہ ہے سر جی!'' ٹھکانے سے متعلق تفصیل بتانے کے بعد مردان پُرجوش لہجے میں بولا۔

''تم ایک کام کرو مردان شاہ!'' میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''جی سر! حکم کریں۔'' وہ جاں نثارانہ مستعدی سے بولا۔

''پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ یہ کام میں خود ہی انجام ڈالتا۔ تم ایسا کرو کہ بلال عرف کالا ناگ کو اسی وقت متعلقہ تھانے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو وہاں رپورٹ لکھوا چکا ہوں۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں سر! میں اس کتے کو ابھی وہیں لے جاتا ہوں۔ مگر آپ.....؟''

''میری فکر ابھی چھوڑو ..... میں تمہیں مذکورہ تھانے کے ذرا قریب ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ کام بہت ہوشیاری اور چابک دستی سے انجام دینا ہوگا۔''

''سر! کیا اس طرح پولیس ہم سے انصاف کر پائے گی؟ ..... میرا مطلب ہے آپ کی غیر موجودگی میں؟'' وہ بولا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بغیر کسی ثبوت اور میری عدم موجودگی میں یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔

''میری مانیں تو سر! اس رذیل کے ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی گہری کھائی میں.....'' مردان شاہ نے ادر سے لہجے میں ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ ''یہ ہوش میں آ رہا ہے سر!'' اچانک دان شاہ نے مضطرب سی آواز میں کہا۔ میں نے یکدم گاڑی سڑک کے کنارے تاریکی میں روک دی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

بلال عرف کالا ناگ کے بے سدھ وجود میں حرکت پیدا ہونے لگی تھی۔ مردان شاہ نے ہاتھ میں ہوئی گن اس پر تان لی اور میں نے بھی اپنا میگارد ہاتھ میں لے لیا۔ انجن میں نے گاڑی روکتے ہی کر دیا تھا۔

''اسے باہر دھکیلو۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چاندنی میں اتر گیا۔

بلال عرف کالا ناگ اب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ مردان شاہ نے اسے گن پوائنٹ پر باہر لیل کر نیچے اُتار دیا۔

شفاف آسمان پر دمکتے چاند کی روشنی میں اس کا خون آلود چہرہ بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ خون اس کی لی ہوئی ناک سے بہتے رہنے کے بعد چہرے پر جم کر خشک ہو چکا تھا۔ وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے ہم نوں کو خاموشی سے گھورے جا رہا تھا۔

''بلال عرف کالا ناگ! تم نے میرے ٹال کو آگ لگائی اور پھر مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اپنے ساتھیوں سمیت روانہ ہوئے۔ کیوں، غلط کہہ رہا ہوں میں؟'' میں نے غضب آلود لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ میری معلومات اس کے لئے حیرت کا باعث ہوں گی۔ مگر اس نے مجھے حیرت سے چار کر دیا۔ میرا سوال سننے کے بعد بھی وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتا رہا پھر بڑی ڈھٹائی سے دانت ں کر بولا۔

''ہاں..... پھر.....؟''

مجھے اس کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری پر طیش آ گیا۔ میں نے جوشِ غیظ سے مغلوب ہو کر اپنے میگارد کی ل نال اس کے بدہیئت دہانے میں حلق تک ٹھونس دی اور سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں بلال عرف کالا ناگ!..... اور تو بھی مجھے اچھی طرح جان لے۔ ہرا نام نادر علی خان ہے۔ چند ٹکوں کے عوض جن لوگوں نے تجھے میرے پیچھے لگا رکھا ہے، وہ عنقریب ہرے ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ بول، اب تیرا کیا حشر کروں؟''

اس کی چندی چندی آنکھوں میں استہزائیہ مگر سفاک چمک لہرائی، جس میں انگاروں کی تپش بھی نال تھی۔

میں نے اسے بولنے کا موقع دینے کے لئے اس کے مکروہ دہانے سے نال واپس کھینچ لی تو وہ نفرت سے گردن موڑ کر تھوکنے کے بعد بولا۔

''نادر علی خان! ابھی کالا ناگ اتنا سستا نہیں ہوا کہ کوئی اسے چند ٹکوں کے عوض خریدنے کی جرأت کر سکے اور نہ ہی میرے دشمن اتنے سستے ہوئے ہیں کہ میں انہیں محض موت جیسی معمولی سزا سے دوچار

کرنے کی بے وقوفی کرتا ہوں۔ ہاں، تمہارے اس دم چھلے نے.....'' اس نے گن تانے کھڑے مردان شاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''شاید ہمارا تعاقب کر کے ہماری ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن علی خان! میں تمہیں ہلاک کرنے کی بے وقوفی کی نیت سے تمہارے پاس نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ تمہاری اور بربادی کا نوحہ سنانے کے لئے تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

مجھے اس کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے اس کا لہجہ انگیز لہجہ بناوٹی یا جھوٹا محسوس نہیں ہوا تھا۔

''کیوں؟.....تمہاری مجھ سے بھلا کیا دشمنی ہے؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

''دشمنی نہیں.....خونی دشمنی کہو نادر!'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''کیوں کہ تم نے میرے ملک سردار خان کا خون کیا تھا۔''

میں اس کے اس چونکا دینے والے سنسنی خیز انکشاف پر ایک لمحے کے لئے سن سا ہو کر رہ گیا تھا

''ملک سردار خان میرا بڑا بھائی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تیری ماں شبینہ اور ماموں گل کا نمک خوار بھی تھا.....مگر تم نے بے دردی سے اس کا خون کر ڈالا۔'' وہ میری کیفیت سے بے خبر اپنی رو میں کہے جا رہا تھا۔

''اس نے ایک بے گناہ لڑکی صدف کو قتل کرنے کے احکام جاری کئے تھے۔'' اس بار مجھ سے رہا نہ گیا۔

''مگر یہ کام اس نے تمہاری ماں اور تمہارے ماموں حیدر گل کے حکم پر ہی کیا تھا۔'' کالا ناگ غرایا

''یہ بہت لمبی کہانی ہے.....تمہارا اس.....''

وہ اچانک میری بات کاٹ کر غیظ آلود لہجے میں بولا۔ ''مجھے کسی لمبی کہانی سے کوئی سروکار نہیں۔ ہاں، تم جتنی اُونچی اُڑان بھرنے کی کوشش کر رہے ہو، عنقریب زخمی چڑیا کی مانند پھڑ پھڑاتے ہوئے کھائی میں گرنے والے ہو۔ میں یہی تماشا دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ اسی لئے اب میں تمہارے دشمنوں سے مل چکا ہوں۔''

اس سفاک گفتگو پر میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا اور سینے میں ہلچل سی مچنے لگی تھی

''سر جی! حکم کریں.....اس کالے ناگ کو اب زندہ چھوڑنا ہمارے مفاد میں نہیں ہوگا۔'' مردان شاہ جواب تک خاموش تھا، دانت پیس کر مجھ سے بولا تو کالا ناگ نے صرف ایک بار سنسناتی نظر سے اسے گھورا، پھر اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر خاموش سی سفاک مسکراہٹ اُبھری۔ میں نے مردان شاہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کالا ناگ سے کہا۔

''میں تمہاری دلیری کی داد دیتا ہوں اور بہادر دشمن کی دل سے قدر کرتا ہوں.....تم نے یہ آ کر کے مجھے اس اقدام پر مجبور کر دیا ہے کہ میں تیرا گھمنڈ توڑنے کی خاطر تجھے زندہ چھوڑ دوں تاکہ دوبارہ تیرا میرا سامنا ہو تو تجھے تیری اصل اوقات پر لا کر بھیانک انجام سے دوچار کروں۔''

''ہا.....ہا.....ہا.....'' میری خونخوار دھمکی پر اس نے ایک بدمست قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ''تم اپنی خیر مناؤ اور مجھے اپنی تباہی کے خوش کن منظر سے لطف اندوز ہونے دو۔ کیونکہ پولیس نے نہ صرف میرے سوہنے بھائی ملک سردار خان کی لاش برآمد کر لی ہے بلکہ وہ آلہ قتل بھی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے جس پر تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔ کتنا مزہ آئے گا جب میں ماں بیٹے اور ماموں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھوں گا۔ اور ہاں، یاد رکھنا، تم تک تمہاری مرحلہ وار تباہیوں کی خبریں میں خود پہنچاتا رہوں گا۔''

میں اس کے اس لرزا دینے والے انکشاف پر یکدم سناٹے میں آ گیا تھا۔ ''اور ہاں.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنسنی خیز انکشافات کے انداز میں بولا۔ ''بے فکر رہو.....تم تینوں غداروں کی تباہی کے بعد میں سکون سے آرام سے جیل کے اندر ہی سب سے پہلے تمہاری غدار ماں اور ماموں حیدر گل کو خود موت کی نیند سلا دوں گا۔ اس کے بعد تمہاری باری۔ ہا.....ہا.....ہا.....''

وہ وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹوٹی ناک اور زخموں کی شدت کے باعث پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس کے ہلکورے لیتے بدن کا تمسخرانہ انداز مجھے بری طرح سلگا گیا۔ پھر جیسے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ شاید دانستہ مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا۔ مجھے اس کی اس چال کا دیر سے پتہ چلا کہ وہ گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود کیوں اتنی دلیری دکھا رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی تو وہ دانستہ قریب کھڑے مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا اور دوسرے ہی لمحے جیسے ایکا ایکی اس کے مضمحل وجود میں پارا دوڑ گیا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹ کر مردان شاہ پر جھپٹا اور بیک وقت اپنی ایک لات میرے میگارد والے ہاتھ پر بھی جڑ دی۔ میگارد میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسری طرف اس نے مردان شاہ سے گن جھپٹتے ہی اسے اس کے زور پر دور دھکیل دیا اور میں نے دیکھا کہ مردان شاہ سے چھینی ہوئی گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہی ٹریگر دبایا۔ اس کے ٹریگر دبانے سے صرف ایک بل پہلے میں نے اس کی پشت پر لات رسید کر دی تھی۔ اس کی خوفناک گن سے فائر کی خوفناک آواز اُبھری مگر عین وقت پر میری لات اس کی پشت پر پڑنے کی وجہ سے نہ صرف اس کا نشانہ خطا ہو گیا بلکہ وہ خود بھی ڈکراتا ہوا مردان شاہ کے اوپر جا پڑا۔

مردان شاہ نے فوراً بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کی گن پر دونوں ہاتھ جماتے ہی گھٹنے کی زوردار ضرب اس کی ناف کے نیچے رسید کر دی۔

کالا ناگ کے حلق سے بیل کے ڈکرانے جیسی ہیبت ناک آواز برآمد ہوئی مگر اس نے گن نہ چھوڑی۔ مردان شاہ اس کی گن پر ہی اپنے دونوں ہاتھ جما کر اچھلا اور اپنی دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ پر ٹکا دیں۔ نتیجتاً کالا ناگ جھکتا چلا گیا۔ مردان شاہ نے عام روایتی سا داؤ بروقت آزمایا تھا لیکن کالا ناگ بھی ایک کائیاں تھا۔ اس نے مردان شاہ کے بوجھ کا سہارا لیا اور دو تین زوردار پھریاں لگا کر مردان شاہ کو دھکا دیتے ہوئے دور اچھال دیا۔ گن کالا ناگ کے ہاتھوں میں ہی رہ گئی۔ اس موقع پر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس پر جست لگا دی۔ میری دونوں ٹانگیں فلائنگ کک کے انداز میں اس کے چہرے پر پڑیں اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تاک کر ایک لات اس کی گن پر رسید کی تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

میں گن اٹھانے کے لئے لپکا۔ اور جیسے ہی گن اٹھا کر اس کی طرف گھوما تو وہ خبیث اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ میں نے گن کا رخ گاڑی کی کھڑکی سے نظر آتے کالا ناگ کی طرف موڑا۔ مگر تب تک وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ گن نے آتشیں قہقہہ اُگلا مگر گولیاں دور ہوتی انٹر کولر کے شیشوں کو توڑنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

میں اس کی بیک ریڈ لائٹ کو دور ہوتے بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں مردان شاہ بھی ہانپتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ حرام زادہ تو نکل بھاگا سر!" وہ دانت پیس کر بولا۔

"ہاں....." میں نے مختصراً کہا۔

"سر! اب ہم واپس کس طرح چلیں گے؟" وہ پریشانی سے بولا۔

"پیدل چلنے کے علاوہ اور دوسری کوئی صورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ شہر یہاں سے دور نہیں ہے۔"

میں نے اپنا میگارد تلاش کر کے اسے اپنے قبضے میں کیا اور بلال عرف کالا ناگ سے چھینی ہو دور تاریک جنگل میں پھینک دی۔

"تمہاری موٹر بائیک تو گاڑی میں ہی رہ گئی۔" میں نے چلتے ہوئے اس سے کہا۔

"ہاں ..... مگر مجھے پرواہ نہیں اس کی۔ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔" وہ بولا۔ پھر ذرا فکر انداز میں بولا۔ "سر! اب کیا ہوگا؟ حالات آپ کے لئے تو بہت خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ او یہ بدبخت بلال جیسا خطرناک ناگ۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے دوسری فکر کھائے جا رہی میرے دشمنوں نے مجھے قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں میں جکڑنا شروع کر دیا ہے۔"

"سر! آپ فکر نہ کریں..... میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔" مردان شاہ فوراً بولا۔ "آپ کریں، میرے ساتھ میرے ہی گھر چلے چلیں۔ جب تک حالات موافق نہیں ہو جاتے، آپ کا اب نکلنا صحیح نہیں۔"

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ پولیس نے "گرین لاج" صرف نگینہ کی تلاش میں چھاپہ نہیں مارا تھا بلکہ وہ مجھے ملک سردار خان کے قتل کے جرم میں گرفتار کر ارادہ رکھتی تھی۔ مجھے کالا ناگ کے سنسنی خیز انکشافات نے خاصی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے بڑے بھائی ملک سردار خان کی لاش اور آلہ قتل، جس پر یقیناً میرے ہی فنگر پرنٹس ہو سکتے تھے، کے ہونے کا جو انکشاف کیا تھا، میں اسے جھوٹ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو بھلا کالا ناگ کس طرح معلوم ہوتا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا تھا؟

میں دماغ پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ممکن ہوا تھا؟ میں مرحلہ حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں چلتے چلتے یکدم رک گیا مردان شاہ بھی رک گیا تھا۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ شاید اس نے میرے چہرے کے پُرسوچ اور تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس وقت کہاں گم تھا۔

مجھے یاد آنے لگا کہ جب میں نگینہ کے اغواء اور قتل کے شبہے میں ملک سردار خان کا تعاقب کر ہوئے (اس دوران میں نے اس پر قابو بھی پا لیا تھا) پرانے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تھا اور ملک سردار نے موبائل پر اپنے ساتھی غفورے کو "لڑکی" کو ٹھکانے لگانے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ وہ جسے میں نگینہ سمجھے ہوئے تھا، صدف تھی۔ غفورا اس کا گلا دبوچ کر اسے ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اس نے ملک سردار خان کے سفاکانہ حکم کے مطابق نگینہ کا قتل کر ڈالا ہے تو میں اپنے ہوش و حو میں نہ رہا تھا اور غصے کی شدت سے دیوانہ ہو کر میں نے ملک سردار خان کی پیشانی میں گولی مار دی تھی پستول وہیں پھینک کر دیوانہ وار غفورے کی خبر لینے دوڑ پڑا تھا۔ مگر وہ خبیث اس وقت وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب میں کیبر سے نمٹ کر باہر نکلا تو ملک سردار خان کا

میرے ہاتھ سے نکلا ہوا پستول وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ ملک کی لاش غائب ہونے پر میں خاصا پریشان تھا مگر بعد کے واقعات کے باعث وہ سب میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ تاہم اب کالا ناگ کے سنسنی خیز انکشاف کے بعد کہ پولیس ملک سردار خان کی لاش آلہ قتل سمیت برآمد کر چکی ہے، مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ ملک سردار خان کی لاش کو آلہ قتل سمیت غائب کرنے میں ضرور کبیر کا ہی ہاتھ ہوگا۔ جس نے اسے میرے خلاف ترپ کا پتا سمجھ کر وہیں کہیں ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ اس کے بعد اس نے دو کام کئے۔ ایک تو کالا ناگ کو میرے خلاف بھڑکایا، دوسرے پولیس کو لاش سمیت آلہ قتل فراہم کر کے میرے پیچھے لگا دیا۔

ساری صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی اور میرا دماغ سنسنانے لگا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے گردش کرنے لگا تھا۔

"مردان شاہ! حالات واقعی جان لیوا حد تک خطرناک ہو گئے ہیں۔" ساری صورت حال سمجھ میں نے کے بعد میں نے مردان شاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ارے سر! آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بس آپ اب میرے ساتھ چلیں ے گھر۔" وہ پُرجوش ہو کر بولا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے۔

"مردان شاہ! تم نے پہلے ہی میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری دشمنی آگ تم تک پہنچے....."

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سر؟" اس نے بے اختیار میری بات کاٹ ڈالی تھی۔ "میں نے تو پ کا نمک حلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ پر کوئی احسان تو نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے ہم تمام دوروں پر جو احسانات کئے ہیں، ان کے سامنے میری کوشش کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہیں سر! میں پ کو اس آڑے وقت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔

میں چند ثانیے خاموشی سے چلتا رہا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو مردان شاہ! پھر تم مجھے تنہا مجھو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں حق پر ہوں اور راہِ حق کے مسافروں کی اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ کیا ہوا کہ میرے وں نے اپنی مکاری سے مجھے پریشان کر دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ بالآخر فتح میری ہی ہوگی۔ تم میرے لئے دعا کرتے رہنا کہ خدا مجھے اس راہ پر قائم رکھے۔"

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر جھکایا آنکھوں کے گوشوں کو آستین سے صاف کیا۔ تب میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم رونے لگے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی سر! یہ غربت کے آنسو ہیں۔ آپ نے واقعی آج مجھے میری اوقات یاد دلا دی کہ نوکر، نوکر ہی ہے۔ اپنے مالک کے دکھ سکھ کا ساتھی نہیں بن سکتا۔" اس نے عجیب رقت آمیز جذباتی لہجے میں کہا۔

میرا دل پسیج گیا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"ارے یار مردان شاہ! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟ ..... میں نے تجھے اپنا نوکر کب سمجھا ہے؟ تو تو دوست ہے۔ ایک وفادار اور جاں نثار دوست۔"

میری بات پر یکدم اس کا آزردہ چہرہ کھل اُٹھا۔

"بس سر! میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں، میں آپ کی خاطر جان لڑا دوں گا۔"

مردان شاہ ایک محنت کش اور شریف النفس نوجوان تھا۔ مگر اس کے اندر وفا اور غیرت بھی کو‌ٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تب ہی تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ٹال کو آگ لگانے والوں کا تعا‌قب کیا تھا۔ راولپنڈی کے بدنامِ زمانہ غنڈے اور گینگسٹر کالا ناگ سے ٹکر لی تھی۔ مگر میں مردان شاہ کو خطرناک دشمنی کی آگ میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ میرے شانہ بشانہ چلنے پر بضد تھا۔ نا‌چار میں نے بھی چپ سادھ لی۔ بالآخر ہم گرتے پڑتے کشمیر پوائنٹ کے قریب سالار ریسٹ ہاؤس پر پہنچ گئے۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ''سالار ریسٹ ہاؤس'' کے گرد ایک گول سڑک تھی، یہاں بے شمار ہوٹل اور ریسٹورنٹ خانے تھے۔ جو اس وقت بند پڑے تھے۔ یہیں سے مال روڈ شروع ہوتا تھا جس کے انتہائی سرے پر میرا ٹال تھا جو اب جل کر محض خاک کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ مردان شاہ کا گھر البتہ یہاں سے پیدل کے فاصلے پر تھا۔

ہم ذرا دیر اس مقام پر سستانے کے لئے رکے اور پھر چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں مردان شاہ کے گھر پہنچ گئے۔

مردان شاہ کا گھر چھوٹا مگر پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے ساتھ دیوار کی دوسری جانب ایک پٹ والا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ اس پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔

بیٹھک کے دروازے پر تالا نظر آنے کی وجہ اس وقت سمجھ میں آ گئی جب مردان شاہ نے اپنی جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا۔ یقیناً رات دیر سے گھر لوٹنے کے خیال سے ہی اس نے یہ تالا لگایا ہوگا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ بیٹھک بہت مختصر مگر صاف ستھری تھی۔ چند کرسیوں کے علاوہ ایک چھوٹی چارپائی بھی اس کمرے میں موجود تھی۔ اس نے کھٹکا دبایا تو بجلی کا بلب روشن ہو گیا۔

میں ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ مجھے ایک چھوٹا دروازہ دکھائی دیا تھا جو غالباً اندر صحن میں کھلتا تھا۔

''سر جی! یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں .... مگر ....''

''مردان شاہ!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ہولے سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کو چھوڑو ان کی میری نظروں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔ اور ہاں، مجھے ''سر'' بھی مت کہا کرو۔''

''مم .... مگر .... سر!'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

''جب خود کو تم میرا دوست سمجھتے ہو تو پھر دوست ہی سمجھو .... صرف نادر خان۔ سمجھے؟ اب بیٹھو۔''

''میں آپ کے لئے کھانے پینے کو کچھ لے آؤں۔'' اس نے اندر صحن میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو میں نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر تمہیں آرام کرنا ہے تو تم جا سکتے ہو۔''

''نہیں .... مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ آپ بھی پریشان ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر یکا یک پُرجوش سے لہجے میں بولا۔ ''ایسا کرتے ہیں، میں چائے بنا کر لے آتا ہوں .... پھر سر جوڑ کر آگے کا کوئی لائحہ عمل سوچتے ہیں۔''

مجھے اس کی بات معقول لگی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مردان شاہ چونکہ صدقِ دل کے ساتھ میرا دست راست بن چکا تھا اس لئے اسے اپنے حالات کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا چائے پینے کے دوران میں اسے آہستہ آہستہ اب تک کے سارے حالات سے بلاکم و کاست آگاہ کرتا چلا گیا۔ وہ بڑے غور اور توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ کم و بیش پون گھنٹے کے بعد وہ گہری سانس لے کر پُرعزم لہجے میں بولا۔

''میں آپ کے اس اعتماد کی دل سے قدر کروں گا کہ آپ نے مجھے ایک دوست کے ناتے ہی نہیں بلکہ بھائی سمجھتے ہوئے اپنے معاملات سے آگاہ کیا ہے۔ آپ اب بے فکر ہو کر آرام کریں۔ صبح تازہ دم ہو کر سوچیں گے کہ ہمیں سب سے پہلے قدم کون سا اٹھانا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ پھر وہ ٹرے اور کپ سمیٹے چلا گیا۔ چارپائی پر بستر موجود تھا۔ میں لائٹ آف کر کے اس پر دراز ہو گیا۔

مردان شاہ کے ساتھ نے مجھے ذہنی طور پر کافی سہارا دیا تھا۔ میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ پریشان کن خیالات کے باوجود گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

❄ ❄ ❄

مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر تک سویا۔ اچانک کسی نے مجھے بری طرح جھنجوڑا اور ایک کرخت آواز میری سوتی جاگتی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''اُٹھو! .... اُٹھو!''

میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنے اطراف مستعد پولیس والوں کو دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ تعداد میں پانچ چھ رہے ہوں گے جن کی قیادت انسپکٹر اعجاز شمس کر رہا تھا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جسے عدالت نے میرے باپ قادر علی خان مرڈر کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں، گینڈے جیسی جسامت کا ایک خاصا بھاری بھرکم روایتی پولیس آفیسر تھا۔

''نادر علی خان! خود کو پولیس کی حراست میں سمجھو۔ مجھے امید ہے تم قانون شکنی نہیں کرو گے۔'' مجھے جاگتا پا کر وہ پاٹ دار آواز میں بولا اور میں نے خاموشی کے ساتھ گرفتاری دے دی۔

جب مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گھر کے باہر کھڑی موبائل میں سوار کیا جا رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص دونوں ہاتھ جوڑ کر اعجاز شمس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً مردان شاہ کا بوڑھا باپ ہی ہو گا۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے انسپکٹر سے کہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! مم .... میرا بیٹا بے قصور ہے۔ اسے چھوڑ دو .... وہ مجھ بوڑھے کی لاٹھی ہے اور ایک جوان بہن کا واحد سہارا ہے۔''

اس کی فریاد کا انسپکٹر اعجاز شمس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ میرا جگر چھلنی ہو گیا۔ موبائل کی طرف اٹھتے میرے قدم رک گئے اور میں انسپکٹر اعجاز سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ بے شک مجھے گرفتار کر لیں مگر مردان شاہ کو چھوڑ دیں۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اس کا باپ درست کہہ رہا ہے۔''

میری بات پر اس نے ایک طنزیہ نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور روایتی پولیس والے لہجے میں بولا۔ ''ایک مجرم کو پناہ دینے والا بہت بڑا قصور وار ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ دو پولیس والے مجھے دھکیلتے ہوئے موبائل تک لے گئے اور میں مردان شاہ کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میری ہتھکڑی کی زنجیریں ایک سپاہی نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ موبائل ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو عقب میں مردان شاہ کا بوڑھا باپ روتا چلاتا رہ گیا۔ مردان شاہ کی آنکھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے ضعیف باپ کی حالت پر بھیگنے کو تھیں کہ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور سر نیچے جھکا دیا۔ میرا دل کٹنے لگا۔ اسے میرا ساتھ دینے کی پہلی اور کڑی سزا بھگتنا پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے اپنی فاش غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ کالا ناگ مجھے مردان شاہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اس نے ہی بعد میں کسی طرح پولیس کو میرے بارے میں مطلع کر دیا ہوگا۔

میرے دشمن ایک مربوط طریقے سے آپس میں نتھی ہو چکے تھے اور بڑے منظم انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ روابط استوار کئے مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ سرگرم حیات کا بیٹا کبیر تھا جو میرا رقیب بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی نے سب سے پہلے کالا ناگ کو اپنے ساتھ شامل کیا ہوگا۔ موبائل تیز رفتاری کے ساتھ مال روڈ پر دوڑی جا رہی تھی۔ پھر سالار ریسٹ ہاؤس کے چوراہے سے وہ پنڈی جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

موبائل اپنا راستہ تیزی سے طے کر رہی تھی اور میری سوچوں کو بھی گویا پر لگ گئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مردان شاہ کے گھر پر پولیس کی آمد کے پیچھے کبیر اور کالو کی مخبری کارفرما تھی۔ کبیر مجھ پر اس وقت سے نظریں رکھے ہوئے تھا جب نگینہ سے میرے "معاملاتِ دل" کا آغاز ہوا تھا۔ اسی باعث اس نے میرے ماضی کو کھنگال ڈالا تھا اور اس کے ذریعے نگینہ کو مجھ سے متنفر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک طرف کبیر تھا، جو نگینہ کی خاطر میرے خلاف میدانِ عمل میں اُترا ہوا تھا۔ دوسری طرف حیات پھر شاہ میر اور اب کالو......... گویا مجھے اب چاروں طرف سے دشمنوں نے گھیر لیا تھا۔ اب تک انہیں مسلسل کامیابیاں مل رہی تھیں اور اس کی وجہ ان سب کا بیک وقت میرے خلاف محاذ پر اُتر آنا تھا۔ مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔

ملک سردار خان کا میرے ہاتھوں قتل مری سے تقریباً پچاس کلومیٹر پنڈی کی حدود میں ہوا تھا اور متعلقہ تھانے کی جو حدود آتی تھی، وہاں انسپکٹر اعجاز شمس کی قانونی عمل داری تھی۔

تھانے پہنچتے ہی مجھے اور مردان شاہ کو فی الفور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"یہ......... اچھا نہیں ہوا نادر صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔" مردان شاہ جیل کی سیلن زدہ دیوار سے اپنی پشت ٹکا کر ننگے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ تم بھی بے قصور دھر لئے گئے۔" میں نے کہا۔ "میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ......"

"نہیں نادر صاحب! ایسا نہ کہیں۔" وہ اچانک میری بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میں تو جلد یا بہ دیر چھوٹ ہی جاؤں گا۔ مگر آپ کا معاملہ مجھ سے زیادہ نازک ہے۔"

"اللہ مالک ہے......... دیکھیں، آگے کیا ہوتا ہے۔"

ذرا دیر گزری تو دو پولیس والے مجھے ہتھکڑیاں ڈالے انسپکٹر اعجاز شمس کے کمرے میں لے آئے۔ وہاں پہنچ کر میں بری طرح ٹھٹکا۔

"انسپکٹر اعجاز شمس کی میز کے سامنے ان دونوں افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ وہ دونوں کبیر اور کالا ناگ تھے۔

مجھے ہتھکڑیاں لگے دیکھ کر کالا ناگ اور بالخصوص کبیر کے چہرے پر مسرت انگیز لہر اُبھر آئی تھی۔ ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بڑی مکاری سے توصیفی لہجے میں بولا۔ اس کا مخاطب انسپکٹر اعجاز تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"واہ انسپکٹر صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ لاش اور آلہ قتل برآمد ہو جانے کے بعد یہ خونی شخص آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مگر........."

اس کی بات قریب بیٹھے اس کے دم چھلے کالا ناگ نے اچک لی۔ وہ ایک نفرت بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولا۔

"اپنے انسپکٹر شمس صاحب کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ انہوں نے تو بڑے بڑے مجرموں کا پتہ صاف کر رکھا تھا کبیر صاحب! مجھے ہی دیکھ لیں، مجھ جیسے کو نکیل ڈال کر آخر شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر ہی دیا ہے۔"

مجھے اس مردود کی آواز زہر لگ رہی تھی۔ میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ البتہ اندر ہی اندر میں بری طرح سلگ رہا تھا۔ کالا ناگ جیسے خطرناک بدمعاش کو تھانے میں دیکھ کر مجھے قدرے حیرت سی ضرور ہوئی تھی۔ انسپکٹر اعجاز شمس اور کالو کا معاملہ کچھ عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں کے تبصرے پر انسپکٹر اعجاز شمس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ایک پُرغرور اور تفاخر آمیز مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ میز سے اپنا سیاہ رول (بید) ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف چند قدم بڑھا۔ اس کے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہی کبیر اور کالا ناگ بھی ایک دم سے کھڑے ہو کر میری طرف رخ کر کے انسپکٹر شمس کے قریب کھڑے ہو گئے۔

اب وہ تینوں برے کی طرح چبھتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھورے جا رہے تھے۔

"نادر علی خان! تم سمجھتے تھے کہ تمہارا بھیانک جرم قانون کی نظروں سے پوشیدہ رہے گا........." معاً انسپکٹر شمس نے سیاہ رول کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ پھر ہنکارا لے کر دوبارہ بولا۔ "تم اپنے جرم کا اقرار کرو گے یا پھر اس کے لئے ہمیں روایتی تشدد سے کام لینا ہوگا؟"

اس کے انداز پر جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایک سوال میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"ملک سردار خان کی لاش تم تک کیسے پہنچی؟"

میرے سوال پر انسپکٹر کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ اُبھری۔ کہنے لگا۔ "کسی بھلے مانس نے گمنام اطلاع دی تھی۔"

میں اس کے جواب پر الجھے بغیر جان گیا کہ یا تو وہ کبیر کا نام چھپا رہا تھا یا پھر یہ گمنام اطلاع کسی اور نے ہی دی تھی۔

"اب کوئی سوال نہیں۔ صرف میری بات کا جواب دو۔" انسپکٹر شمس مجھے خاموش پا کر اس بار ذرا کرخت لہجے میں بولا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ مجھے ہی نہیں بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی قانونی شکنجے میں پھنسانے کے لئے دشمنوں نے دہری چال چلی تھی۔ اگر میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا یا بالفاظ دیگر میں اپنے دفاع میں قتل کا سبب یہ بتاتا کہ میں نے ملک سردار خان کا قتل اس اشتعال انگیزی میں کیا تھا کہ اس نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی (صدف) کے قتل کے احکامات اپنے مفرور ساتھی ٹھوڑے کو جاری کئے تھے تو مجھے لامحالہ یہ بھی بتانا پڑتا کہ ملک سردار خان کو یہ سفاک حکم کس نے دیا تھا۔ یوں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور پڑ جاتا۔ پھر ہم تینوں بھی قانون کے شکنجے میں بری طرح

پھنس جاتے۔ میں نے لمحاتی سوچ بچار کیا، پھر پُر اعتماد انداز میں انسپکٹر کو دیکھ کر بولا۔

"یہ قتل میں نے نہیں کیا۔"

"ہوں....." انسپکٹر اعجاز شمس کے حلق سے بے اختیار طویل ہنکارا برآمد ہوا۔

"یہ..... یہ جھوٹ بول رہا ہے انسپکٹر صاحب!" اچانک کالا ناگ پھٹ پڑا۔ "یہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ یہ باتوں سے نہیں مانے گا۔"

"تم چپ رہو کالو!" معاً انسپکٹر اعجاز شمس نے اسے ٹوکا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "تو گویا تم ایسے نہیں مانو گے؟" اس کے لہجے میں سفاکانہ سرسراہٹ تھی۔

میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ "مجھے حیرت ہے انسپکٹر صاحب! کہ آپ نے محض ایک گمنام کال پر لاش برآمد تو کر لی مگر آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا ہے؟"

"آلہ قتل پر تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"کیا اتنی جلدی فنگر اسپیشلسٹ نے رپورٹ بھی دے دی؟" میرے لہجے میں ہلکا طنز در آیا تھا۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں نادر!" وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "تمہارے اس کا ایک چشم دید گواہ بھی یہاں موجود ہے۔"

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھٹکا۔

"کبیر صاحب! ذرا بتاؤ اسے کہ تم نے بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کیا دیکھا تھا؟" وہ قریب کھڑے کبیر سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا اور میں سناٹے میں آ گیا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مارتے دیکھا تھا۔" کبیر میری طرف گھورتے ہوئے انسپکٹر سے کہا اور میں سفید جھوٹ پر ششدر رہ گیا۔

"تفصیل بتاؤ۔" انسپکٹر بدستور میرے چہرے پر اپنی چبھتی ہوئی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا اور کبیر تفصیل بتانے لگا۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کی ماں اور ماموں حیدر گل نے ہم سے جانے کون سی پرانی دشمنی کے بدلے میری چھوٹی معصوم بہن صدف کو اغواء کروایا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کام بھی اسی سفاک نے ہی انجام دیا ہوگا۔ چوں کہ میں اس کا دست راست رہ چکا تھا لہٰذا میں اس کے خفیہ ٹھکانوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس رات بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا اس پرانے ریسٹ ہاؤس پر پہنچا تو یہ میرے سامنے ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مار کر فوراً اندر بھاگا تھا۔ تب تک اس کا ساتھی غفورا، جو ابھی تک مفرور ہے، اس ظالم کے حکم پر میری بہن صدف کا گلا دبا کر معصوم کو ہلاک کر چکا تھا اور..... اور....." کہنے کے بعد وہ مگر مچھ کے آنسو بہانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنی بہن کے قتل پر وہ ایکا ایکی غمزدہ ہو گیا ہو۔

"یہ سراسر بکواس کر رہا ہے انسپکٹر صاحب!" میں چلّا کر بولا۔

"خاموش!" اعجاز شمس نے دھاڑ کر کہا۔

"انسپکٹر! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود محکمہ جنگلات کے کنزرویٹو آفیسر شاہ کی بیٹی نگینہ کو اغواء کیا تھا..... اور....."

"بس..... اب تم سچ کو جھوٹ میں بدلنے کی کوشش مت کرو۔" انسپکٹر میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں آج ہی فنگر پرنٹس کی رپورٹ تیار کروا کر تمہیں دکھائے دیتا ہوں۔ تمہاری ساری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی ناک کے راستے بہہ نکلے گی۔"

"انسپکٹر! آپ صرف اس سے ایک سوال تو پوچھ لیں کہ اگر اس نے ملک سردار خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو پھر اب تک خاموش کیوں رہا؟..... اسے تو اسی وقت پولیس کو میرے خلاف پر رپورٹ لکھوا دینی چاہئے تھی۔" میں نے کبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر سے پُر جوش لہجے میں کہا تو اس کی بجائے کبیر نے اس کا جواب دیا۔

"تمہارے جیسے سنگ دل انسان کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا..... کیونکہ تم نے ملک سردار خان کا قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کہیں چھپا دی تھی اس لئے میں پہلے لاش اور آلہ قتل برآمد کرنا چاہتا تھا اور میں بدستور تمہاری ٹوہ میں رہنے لگا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔"

میں خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے میری ایک فاش غلطی سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی یہ بات تو بہرحال مبالغہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ میری بدستور ٹوہ لئے ہوئے تھا۔

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نگینہ پراسرار طور پر غائب تھی۔ جبکہ صدف مرڈر کیس کا ایک اہم مجرم غفورا ہنوز مفرور تھا۔ میں نے اب تک کبیر اور بلال عرف کالا ناگ کے گٹھ جوڑ سے متعلق جو بھی محتاط اندازے قائم کئے تھے، وہ سب ایک ایک کر کے درست ثابت ہو رہے تھے۔

کبیر اپنا ٹرمپ کارڈ بڑی کامیابی کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اور میں بری طرح سے دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس نے مجھے یہ دھمکی دینے کے بعد کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ کے بعد وہ مجھ سے اچھی طرح نمٹے گا، مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا تھا۔

❋❋❋

دشمن نہ صرف مجھے بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اپنا ٹارگٹ بنا چکے تھے۔ بلکہ میں ان کی ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر تھا۔

حالات گنجلک ہو چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، کیا ہو گا؟ اور میں کیا کروں؟ نگینہ کی طرف سے مجھے الگ فکر و تشویش لاحق تھی۔ میری گرفتاری کے بعد تو دشمنوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ اسے بہ آسانی تلاش کرنے کے بعد اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے مجھے عین وقت پر گرفتار کروایا گیا تھا۔ یہ ساری سازش قادر علی خان مرڈر کیس کو اپنے حق میں بدلنے کی تھی جو میرے دشمن بڑی کامیابی اور شاطرانہ ذہنیت کے ساتھ کر رہے تھے۔

حوالات میں، میں نے ساری تفصیل اپنے اندیشوں کے ساتھ مردان شاہ کو بتا دی تھی۔

"میرا آزاد ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے نادر صاحب!" مردان شاہ نے دبے دبے جوش سے کہا۔ میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ وہ پھر بولا۔ "مگر میں اپنے لئے نہیں، آپ کے لئے رہا ہونا چاہتا ہوں نادر صاحب! میں آپ کے خلاف دشمنوں کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، کسی طرح نگینہ بہن کے ساتھ غفورے کا بھی سراغ لگاؤں۔"

میں اس کی ذہانت اور زود فہمی پر عش عش کر اٹھا اور جوشِ مسرت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ "مردان شاہ! تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔ یہی دو افراد دشمنوں کی چال الٹنے کا باعث بن سکتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن نادر صاحب! میرا خیال تھا کہ غفورے سے زیادہ نگینہ بہن کا سراغ لگانا ضروری ہوگا۔" پُرخیال لہجے میں بولا۔ "جبکہ غفورا اُلٹا آپ کی والدہ اور ماموں حیدر گل کے لئے مصیبت بھی بن سکتا کیونکہ....." وہ اچانک کچھ کہتے کہتے دانستہ رکا تو میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں مردان شاہ! تم یہ کہنا چاہ رہے ہو نا کہ غفورے نے تو میری ماں اور ماموں حیدر گل کے ایما پر صدف کا خون کیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔"

وہ خاموش مگر مستفسرانہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں ..... جب میرے دل سے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف سے یہ غلط فہمی نکل گئی کہ انہوں نے ہی میرے باپ کا خون کیا تھا تو میں نے ایک موقع پر ماموں حیدر گل سے اس لیے بارے میں بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے دیرینہ انتقام کی آگ میں ایک بے گناہ معصوم لڑکی کو کیوں مروا دیا تو ماموں حیدر گل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری ماں کو اکثر و بیشتر سمجھاتا رہتا کہ وہ اپنے شوہر (میرے باپ قادر علی خان) کے انتقام کی آگ صرف اس کے اصل قاتلوں (نظر جہاں اور شاہ میر) تک ہی محدود رکھے۔ کوئی بے گناہ اس کی بھینٹ نہ چڑھے۔ لیکن جب میری ماں نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے قاتلوں نے اس کے بیٹے یعنی مجھے بھی اس کی ماں کے خلاف کر دیا ہے تو نے آتش انتقام میں مغلوب ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اور ملک سردار خان کو صدف خون کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ مگر ماموں حیدر گل کے سمجھانے پر وہ اپنے فیصلے پر ہوئی تھیں اور انہوں نے یہ احکامات واپس لے لئے تھے مگر افسوس تب تک دیر ہو چکی تھی۔" یہاں تک کر میں خاموش ہو گیا۔

وقت انجانے وسوسوں اور اندیشناک لمحات کی خبر دیتا ہوا بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس نے اس روز لاش کا پوسٹ مارٹم اور آلہ قتل پر فنگر پرنٹس کی رپورٹ تیار کروالی تھی۔ چونکہ ہمارا کیس پہلے ہی عدالت میں چل رہا تھا، لہٰذا اس معاملے کو بھی صدف اینڈ قادر علی مرڈر کیس کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا۔

ماں اور ماموں حیدر گل بھی میری طرح جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید تھے۔ میری گرفتاری کی خبر ان تک بھی ضرور پہنچ چکی ہو گی۔ بلکہ صرف ان تک تو بعد میں پہنچی ہو گی، پہلے تو آزاد لوگوں تک پہنچی ہو گی کیونکہ مجھ سے سب سے پہلے ملاقات کے لئے آنے والے اعظم خان تھے۔

"یہ ..... یہ سب کیسے ہو گیا نادر بیٹے؟" وہ پریشان ہو کر بولے۔

میں نے مختصراً انہیں ساری روداد بیان کر دی۔ وہ چند ثانیے کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"انکل! آپ میری فکر چھوڑیں اور خدا کے لئے کسی طرح نگینہ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کہیں اس کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔"

"نادر بیٹے! معاملہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہو چکا ہے۔ سارے شواہد تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے تو کیس کے جیتنے کی اُمید پیدا ہوئی تھی۔ اب اس تازہ صورتِ حال نے سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ دشمنوں نے بڑی گہری چال چلی ہے۔ رہی بات نگینہ کو تلاش کرنے کی تو میرا خیال ہے، اب یہی آخری امید بنتی ہے کہ اس کا پتہ چل جائے۔"

"جی ہاں انکل!" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن انکل! آپ کسی طرح مردان شاہ کی ضمانت

بندوبست کر دیں۔ یہ رہا ہوتے ہی نگینہ کی تلاش میں لگ جائے گا۔"

"ہاں ..... ویسے میں انسپکٹر اعجاز شمس سے مل کر ہی آ رہا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں، کم از کم مردان شاہ کو رہا کروا دوں۔" وہ بولے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔

منیجر مشتاق گوندل بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ مردان شاہ کا بوڑھا باپ اور بہن بھی آئی تھی۔ مجھے ان دونوں پر بے انتہا ترس آ رہا تھا۔ تاہم میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا کہ مردان شاہ کا جرم زیادہ سنگین نہیں ہے۔ وہ دو ایک روز میں رہا ہو جائے گا۔"

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ اعظم خان صاحب کی اس سلسلے میں کوششیں رنگ لائیں اور مردان شاہ کو شخصی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میرا عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لے کر تفتیش شروع کر دی گئی۔

ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب بھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ بھی موجودہ اور اچانک بگڑی ہوئی خدوخال صورت حال پر خاصے متفکر اور پریشان نظر آ رہے تھے۔

تاہم انہوں نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں ہرگز اقبالِ جرم نہ کروں۔ اس دوران وہ کوئی نکتہ سوچنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے بھی اعظم خان صاحب کی یہ بات دہراتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ میری گرفتاری کے معاملے کو صدف مرڈر کیس یا بالفاظِ دیگر قادر علی خان مرڈر کیس سے نتھی کر کے میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو میں نے ٹھوس لہجے میں ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب سے یہ کہہ ڈالا۔

"وکیل صاحب! آپ کوشش کیجئے گا کہ مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ ہی رکھتے ہوئے مقدمہ چلایا جائے۔"

وہ میری بات پر حیران و پریشان نظر آنے لگے اور پھر اسی لہجے میں بولے۔ "مگر نادر! اس طرح تو تم بری طرح قانون کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔"

"میرا اللہ مالک ہے وکیل صاحب!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرا کیس کمزور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس متاثر ہو۔ آپ بس اپنی ساری توجہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو رہا کرانے پر مرکوز رکھئے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسانِ عظیم ہو گا۔"

میرے حتمی فیصلے پر وہ پریشان ہو کر صرف اتنا بولے۔ "مگر ..... تم .....!"

"میں اپنی الگ راہ دیکھ لوں گا۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔"

ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب فکرمند چہرے کے ساتھ مجھے تسلی دے کر واپس لوٹ گئے۔

ادھر عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لینے کے بعد انسپکٹر اعجاز شمس کے تیور کچھ خطرناک سے نظر آنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ اعظم خان کے درمیان میں آنے سے وہ کچھ خیال کرے گا۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ تیسرے روز مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مگر اس کے کمرے میں نہیں بلکہ عقوبت خانے میں۔ جہاں کا منظر ہی دل پر دہشت طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔

دیواروں کا پلستر اُکھڑا ہوا تھا اور سیلن زدہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کراہت کا احساس ہوتا تھا۔ چھت قدرے بلند تھی۔ جس کے وسط میں لوہے کی فولادی چرخی کے ساتھ موٹا سا رسہ جھول رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ کوئی مذبح خانہ تھا جہاں قصائی بکرے ذبح کر کے اسے چھت سے جھولتے ہوئے رسے سے الٹا لٹکا کر اس کی کھال کھینچتے ہوں۔ روح فرسا اذیت گاہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو میں اندر سے لرز اُٹھا تھا۔

کمرے میں انسپکٹر اعجاز شمس کے علاوہ مجھے لانے والے دو سپاہی اور ایک نیم برہنہ سا کالا بھجنگ قصائی صفت جلاد بھی کھڑا مجھے اپنی لال انگارا آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔

عقوبت گاہ کے گھٹے گھٹے اور سیلن زدہ ماحول سے میرا جی الٹنے لگا۔ ایک عجیب سی ناگوار بدبو سے دماغ پھٹنے کے قریب ہو رہا تھا۔ معاً انسپکٹر اعجاز شمس گونجیلی آواز میں مجھے مخاطب کر کے بولا۔

''نادر! میں آخری موقع دے رہا ہوں تمہیں۔ اپنا جرم سیدھی طرح قبول کر لو۔ بہ صورت دیگر یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔'' اس کا اشارہ قریب کھڑے قصائی صورت جلاد کی طرف تھا مجھے بڑی بے چینی سے خونخوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے شل پڑتے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے انسپکٹر شمس سے کہا۔

''انسپکٹر! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو تم میرے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کرنا چاہتے ہو۔ ایک پڑھا لکھا شہری ہوں۔ ہمارا مقدمہ عدالت میں.........''

''بکواس بند کرو اپنی۔'' اچانک ہی وہ میری بات کاٹ کر خونخوار آواز میں دہاڑا۔ ''تم نے آخری شریفانہ موقع بھی گنوا دیا۔ مگر اب بس.........'' وہ یہ کہتے ہوئے جلاد کو ایک مخصوص اشارہ کر کے غصے سے اپنا پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اب وہاں میرے اور جلاد کے علاوہ صرف دو سپاہی موجود تھے۔ انسپکٹر اعجاز شمس کے عقوبت گاہ سے نکلتے ہی جلاد کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک اُبھری اور پھر اس نے پھٹی پھٹی سی، کھردری آواز میں سپاہی سے کہا۔

''اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔''

فوراً میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ گرانڈیل جلاد میری طرف بڑھا اور مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر چھت سے جھولتے ہوئے رسے کی طرف دھکیلا۔ پھر اس رسے سے اس نے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ اب میری دونوں ٹانگیں ننگی اینٹوں والے فرش سے تقریباً دو فٹ بلند تھیں۔ میں گویا ہوا میں معلق ہو چکا تھا۔

جلاد نے میری قمیض کو مٹھی میں دبوچ کر ایک جھٹکے سے پھاڑ ڈالا اور پھر ایک دیوار کی میخ سے جھولتے ہوئے ناگ کے چھوٹے پھن سے مشابہہ سیاہ رنگ کے چرمی بیلٹ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اگلے ہی لمحے دم بہ خود ماحول میں ''شڑاپ'' کی پھنکارتی ہوئی آواز اُبھری۔ چرمی بیلٹ میرا پیٹھ پر پڑی اور اذیت کی ایک قیامت خیز لہر نے مجھے سرتاپا مرغ بسمل کی طرح تڑپا دیا۔ میرے حلق سے جگر پاش چیخ اُبھری تھی۔

میں کبھی ان کڑے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے اپنی پیٹھ کی کھال نچتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ ایک ضرب لگانے کے بعد وہ ذرا ستائے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھ پر پے در پے تابڑ توڑ ضربات کی بارش کر دی گئی۔ کمرہ میری اذیت ناک چیخوں، چرمی بیلٹ کی مہیب ''شڑاپ شڑاپ'' اور وحشی جلاد کے ہانپنے کی آواز سے گونجنے لگا۔ میں درد و اذیت کے مارے ادھ موا ہونے لگا۔ میرے حواس ناقابل بیان اذیتوں کو مزید سہنے کی تاب کھونے لگے تھے اور میرا ذہن اندھیاروں میں ڈوبنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر اپنے حواس کھو بیٹھتا، میں نے ہمت کر کے اپنے جسم کی ساری توانائی کو دہانے میں سمیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

''بس کرو.........خدا کا واسطہ بس کرو.........انسپکٹر کو بلاؤ.........میں اپنا جرم قبول کرتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلاد کا ہاتھ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح رک گیا۔

لیکن مجھے نیچے نہیں اتارا گیا تھا۔ البتہ ایک سپاہی معنی خیز مسکراہٹ سے جلاد کی طرف دیکھتا ہوا اذیت گاہ سے نکلتا چلا گیا۔ میں ہوا میں جھولتا، ہانپنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری تو میری نیم وا آنکھوں نے انسپکٹر اعجاز شمس کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تضحیک آمیز انداز میں بولا۔

''بس نادر میاں!.........اتنی سی دیر میں سارے کس بل نکل گئے؟''

''انسپکٹر!'' میں اپنی جسمانی اذیتوں کو جوشِ جنوں کے پہاڑ تلے دباتے ہوئے لہورنگ لہجے میں بولا۔ ''بے شک میں نے ملک سردار خان کا قتل کیا تھا۔ مگر انسپکٹر! یہ کسی بے گناہ کا قتل نہیں تھا۔ بلکہ ایک سفاک انسان کا قتل تھا۔'' میں اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کے بعد میری قوت برداشت ختم ہو گئی۔ مجھ پر یکایک ہی غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میرا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❄ ❄ ❄

میری دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سلاخوں کے پیچھے پایا۔ میں اوندھے منہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ حواس بیدار ہوتے ہی مجھے جسمانی ٹیسوں کا بھی احساس ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے درد بھری کراہیں خارج ہو گئیں۔ قید خانے کے باہر راہداری میں بلب کی بیمار سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ میں نے دانتوں تلے اپنی تکلیف کو دبایا، پھر اپنے مضروب جسم کو حرکت دی۔ معاً مجھے درد انگیز ٹیسوں کے ساتھ اپنے زخموں پر ٹھنڈک کا بھی احساس ہوا۔ میں نے بہ مشکل اپنے وجود کو گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ٹکایا اور ایک ہاتھ پشت پر لے جا کر زخم پر لگایا تو مجھے چکناہٹ کا احساس ہوا۔ تب مجھے اندازہ ہوا تھا، انسانیت سوز تشدد کے بعد میرے زخموں پر کوئی مرہم وغیرہ بھی لگا دیا گیا تھا۔

کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا جس کے اوپر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا گلاس بھی اوندھا دھرا ہوا تھا میں اپنے حواس بحال کرنے کے بعد گھڑے کی طرف بڑھا اور گلاس اندر ڈال کر پانی بھرا اور اپنے لبوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد مجھے اپنے اندر کڑواہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر میں جلدی جلدی دو گلاس غٹ غٹ چڑھا گیا۔

میرا اوپری بدن ابھی تک برہنہ تھا۔ ذرا دیر گزری تو ایک سنتری آیا۔ اس کے ہاتھ میں پرانے کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیانی خلا سے ہاتھ اندر لے جا کر وہ میری طرف اچھال دیا اور بولا۔ ''اسے پہن لے.........ذرا دیر بعد تجھے پھر انسپکٹر صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔

میں لباس تبدیل کر چکا تو دو سنتری مجھے لینے آ گئے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر سیدھا انسپکٹر اعجاز شمس کے کمرے میں لے گئے۔

وہ اپنی میز کے عقب میں دھری بھاری بھرکم کرسی پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میز پر دھری تھیں اور وہ ہاتھ میں سیاہ رنگ کا رول پکڑے ہوئے تھا جس سے وہ ہولے ہولے اپنی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو ''تھپتھپا'' رہا تھا۔

اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میری نگاہیں میز کے وسط میں پیپر ویٹ کے نیچے دبے ایک اسٹامپ پیپر پر پڑیں جس کے نیچے ایک عدد قلم بھی رکھا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس پر اپنے دستخط کر دو۔" وہ بہ دستور اپنی برماتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر مرکوز رکھے ہوئے کرکرا کر بولا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارا اقبالی بیان ہے۔ جس میں تم نے اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

میں نے کچھ سوچ کر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ انسپکٹر کا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔ اس نے فوراً سیدھا ہو کر وہ دستخط شدہ اسٹامپ پیپر اٹھا لیا اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہوں ..... اب میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی رہوں گا۔" دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف گھورتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ مگر مجھ پر اس کے لہجے کی سنسنی خیزی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے واپس لوٹا دیا گیا۔

❄❄❄

سات روز بعد میری عدالت میں پیشی ہوئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اس دن عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ گویا میرے کیس کو بھی قادر علی خان مرڈر کیس کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی گئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کے چہروں پر از حد تشویش و پریشانی کے آثار تھے۔ انہیں میری گرفتاری اور وجۂ گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔

سماعت شروع ہوئی تو وکیل صفائی نے اپنے دھواں دھار دلائل کے زور پر میرے معاملے کو، ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ قرار دلوا دیا۔ یوں قادر علی خان مرڈر کیس کی شنوائی تو اس روز نہ ہو سکی البتہ جب میرے سلسلے میں سماعت شروع ہوئی تو میں نے فوراً پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

چونکہ میں با ضابطہ طور پر ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب کو اپنا وکیل صفائی مقرر کر چکا تھا چنانچہ جیسے ہی استغاثہ نے اقرارِ جرم والا دستخط شدہ بیان جج کے سامنے پیش کیا اور مجھ پر جرح کا آغاز ہوا تو میں نے سپاٹ لہجے میں اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ اس اسٹامپ پیپر پر میرے ہی دستخط ہیں تو بھری عدالت جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" وکیل استغاثہ نے میرے کٹہرے کے قریب آ کر بھنائے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "ایک طرف تم صحتِ جرم سے انکار کر رہے ہو اور دوسری طرف، اسٹامپ پیپر پر اپنے دستخط کی حلفیہ تصدیق بھی کر رہے ہو، جس میں تمہارا اقرارِ جرم درج ہے۔"

میں نے پُر اعتماد لہجے میں جج صاحب کی طرف دیکھ کر از راہِ احترام کہا۔ "جج صاحب! میں وکیل استغاثہ سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت مل سکتی ہے؟"

جج صاحب نے موٹے، سیاہ فریم کے عقب سے میری طرف دیکھ کر گمبھیر لہجے میں مختصراً کہا۔

"اجازت ہے۔"

میں نے طنزیہ نظروں سے اپنے کٹہرے کے سامنے کھڑے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

"وکیل صاحب! معذرت کے ساتھ ..... اگر آپ کو ایک کمرے کی چھت سے جھولتے رسے کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیا جائے۔ پھر آپ کی قمیض پھاڑنے کے بعد چمڑے کے کوڑوں کی قیامت خیز برسا

کر دی جائے تو میرا خیال ہے، آپ اس روح تک بلبلا دینے والے انسانیت سوز تشدد کے آگے مجبور ہو کر ایسے خود ساختہ اقبالِ جرم کے اسٹامپ پیپر پر ضرور اپنے دستخط کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ وکیل استغاثہ میرے کڑوے جملوں پر طیش میں آ جائے گا۔ مگر وہ بھی بڑا کائیاں تھا۔ جانتا تھا کہ غصہ دکھانے یا جوابی تلخ کلامی کرنے سے مجھے ہی فائدہ ہو گا تو وہ مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نادر میاں! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو پولیس میرے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔"

اس کی بات پر میں نے فوراً جج صاحب کو مخاطب کر کے اپنی صفائی میں کہا۔ "جج صاحب! وکیل استغاثہ نے میری بات کی سچائی خود ہی تسلیم کر لی کہ اگر کسی شریف انسان پر ایسا بھیانک اور انسانیت سوز تشدد کیا جائے تو وہ مجبور ہو کر بالآخر اپنے ناکردہ جرم کو قبول کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ کیا میں کوئی عادی مجرم ہوں؟..... کیا میرا ریکارڈ کسی تھانے میں موجود ہے؟..... میری قمیض اتار کر دیکھئے جج صاحب! آپ کو میری پیٹھ پر ہنٹروں کے سرخ نشانات نظر آ جائیں گے۔"

میری بات پر عدالت میں جیسے سانپ سرسرا گیا۔ وکیل استغاثہ پریشان سا نظر آنے لگا۔ وکیل صفائی ہمدانی صاحب نے فوراً میری قمیض اتروانے کی عدالت سے اجازت چاہی۔ میری قمیض اتار کر میری مضروب پیٹھ جج صاحب اور حاضرین عدالت کی طرف موڑ دی گئی۔

کمرۂ عدالت میں بھنبھناہٹ گونجنے لگی تو جج صاحب نے ہتھوڑی مار کر حاضرین عدالت کو خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ قریب کھڑا انسپکٹر اعجاز شمس مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ جج صاحب نے بہ غور میری پیٹھ پر سرخ لکیروں کو دیکھا، اس کے بعد مجھے قمیض پہنا دی گئی۔ میرے دستخط شدہ بیان کو ذرا خارج کر دیا گیا۔ پھر جرح کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ جس میں آلہ قتل اور فنگر پرنٹس کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔

یہاں وکیل صفائی نے میرے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ میری ماں اور میرے دشمن چونکہ مشترکہ ہیں اور جس طرح میری ماں کے ہاتھ میں آلہ قتل دے کر اس پر اس کے شوہر کو قتل کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا ہے، بالکل ایسی ہی چال دشمنوں نے اب میرے ساتھ بھی چلنے کی کوشش کی۔

جج نے اگلی پیشی تک کے لئے فیصلہ محفوظ کر لیا اور عدالت برخواست کر دی اور ساتھ ہی عدالت نے انسپکٹر اعجاز شمس کو بھی ایسا انسانیت سوز تشدد کرنے پر سختی کے ساتھ تنبیہہ کر ڈالی۔

"نادر! میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی دم لوں گا۔" حسب توقع جب مجھے انسپکٹر اعجاز شمس کے حکم پر عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ مجھ سے دانت پیس کر بولا۔ میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ محض زبانی دھمکی دے پایا تھا جس سے اس کی بے بسی کا صاف پتہ چلتا تھا۔ شاید اسے میرے پُر پُرزوں کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

میں نے لوہے کو لوہے اور زہر کو زہر سے کاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دشمن ہر طرح کے اوچھے ہتھکنڈے آزما رہے تھے۔ میں نے بھی اب انہی کے انداز میں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب نے مجھے اب اس بات کی بھرپور تسلی دی تھی کہ میرے خلاف کیس کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ دشمن اگر ہیرا پھیری کرنے کے گر جانتے تھے تو ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

مجھے مردان شاہ کا بے چینی سے انتظار تھا جسے میں نے ہر صورت میں نگینہ کا سراغ لگانے پر مامور کر رکھا تھا۔ وہ رہا ہونے کے بعد اب تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔

اگلی دو تین پیشیوں کے بعد مجھے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں ہمدانی صاحب نے ایک افسوس ناک خبر سنائی تھی کہ دو پیشیوں کے باوجود نگینہ کی پراسرار گمشدگی نے کیس کو کمزور کر ڈالا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ نگینہ کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا گیا تھا اور اس کے باپ شاہ میر نے بھی کہا تھا کہ اس کی بیٹی کو پاگل پن کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ اکثر وہ گھر بھی چھوڑ کر کئی کئی روز کے لئے غائب ہو جاتی تھی۔

میں گرین لاج آ چکا تھا۔ حالات میرے حق میں تو موافق ہو گئے تھے۔ مگر ماں اور ماموں حیدر کے خلاف بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔

میں نے رہا ہوتے ہی سب سے پہلے مردان شاہ کے گھر کا رخ کیا۔ اس کے بوڑھے باپ نے یہ ایک خط دیا جو مردان شاہ نے میرے نام لکھا تھا۔

''وہ خود کہاں ہے بابا؟ اور یہ خط.....؟'' میں کچھ کہتے کہتے رکا۔

وہ بولا۔ ''بیٹا! میں خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ نہ جانے وہ اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ آج اسے دوسرا دن ہے۔ یہ خط اس نے مجھے تمہیں دینے کے لئے کہا تھا۔''

میری پیشانی پر اُلجھنوں کا جال سا پھیل گیا۔ بہرطور میں نے خط لیا اور وہاں سے چلا آیا۔ پھر راہ میں کھڑے کھڑے میں نے بے چینی کے ساتھ وہ خط نکال کر کھولا اور پڑھنے لگا۔

''نادر صاحب! خدا کرے آپ جلد رہا ہو جائیں۔ یہ خط میں آپ تک پہنچا بھی سکتا تھا مگر آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔ لہٰذا میں نے سوچا اگر آپ کی جلد رہائی ممکن ہو گئی تو آپ ضرور میرے گھر آئیں گے اس لئے یہ خط میں نے اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کر دیا کہ جب آپ خود آئیں تو وہ اسے آپ کے حوالے کر دیں۔

نادر صاحب! میں نے جیل سے رہا ہوتے ہی فوراً سانپوں کے ٹولے کبیر اور کالا ناگ کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی۔ خدارا نادر صاحب! ذرا حوصلے سے میری بات بہ غور سنئے گا۔ نگینہ بہن ان دونوں خبیثوں کبیر اور کالا ناگ کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ وہ اپنے باپ شاہ میر سے بد دل ہو کر اپنی سہیلی غزالہ کے ہاں رہنے لگی تھی۔ پتہ نہیں وہ ان دونوں خبیثوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئی تھی۔ بہرحال ایک روز جب میں کبیر اور کالا ناگ کا تعاقب کرتے ہوئے نتھیا گلی سے باڑیاں گیا جہاں میں گھنے جنگل کے درمیان ایک کاٹیج تک پہنچا، وہاں میں نے سن گن لینے کی بہت کوشش کی مگر مجھے زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ میں فقط اتنا ہی جان سکا تھا کہ نگینہ بہن کو انہوں نے یہاں پر یرغمالی بنا رکھا تھا اور اب یہ لوگ اسے نہ جانے کس مقصد کے تحت نامعلوم برف پوش وادیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے بہت سے مسلح ساتھی بھی موجود تھے۔ بہرطور مجھے جیسے ہی ان کے منصوبے کا علم ہوا تو میں نے اس وقت پولیس کو مطلع کرنے کا سوچا۔ مگر ایک تو میرے پاس وقت کم تھا دوسرے اس طرح نگینہ کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ نہایت خطرناک نظر آ رہے تھے اور یہ پورا گینگ کالا ناگ کا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی روانگی میں چند گھنٹے تھے۔ میں نے آپ کو مطلع کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہوں۔ بہرحال جیسے تیسے یہ خط لکھ کر میں اپنے گھر پہنچا اور یہ خط اپنے باپ کو دے کر اسی وقت واپس لوٹ گیا۔ نادر صاحب! حوصلہ رکھئے گا۔ میں انشاء اللہ ضرور کامیاب لوٹوں گا۔''

آپ کا جاں نثار ساتھی.....مردان شاہ

خط پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دل جیسے پھٹنے کے قریب ہو گیا اور رگوں میں لاوا دوڑنے لگا۔ شدتِ غیظ سے میرا وجود لرزنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیات پر قابو پایا۔

اول تو میرے لئے یہ خبر ہی لرزا دینے والی تھی کہ نگینہ کبیر اور کالا ناگ جیسے کمینے اور سفاک درندوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ دوسرا یہ کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو لئے کس مقصد کی خاطر نامعلوم برف پوش وادیوں کی طرف محوِ سفر تھے۔ صورتِ حال جتنی نازک اور خطرناک تھی، اتنی ہی پراسرار بھی۔ یقیناً مردان شاہ بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل سکتا تھا۔ مگر وہ بہرحال کبیر اور کالا ناگ جیسے خطرناک پیشہ ور ہرکاروں کے مقابلے میں تنہا تھا۔

مگر سوال اب یہ پیدا ہوتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ ان لوگوں کو باڑیاں سے روانہ ہوئے دو دن بیت چکے تھے مگر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب بیٹھنے والا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے گرین لاج پہنچا۔ مختصر تیاری باندھی۔ اس وقت دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ فضل چاچا باغیچے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے میری سمجھ میں جو راستہ آیا، میں نے وہی اختیار کرنے کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں نے باڑیاں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ اور ابھی ''گرین لاج'' سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

نہ جانے کیوں فون کی گھنٹی سن کر مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا۔

ٹرن.....ٹرن.....ٹرن..... ٹیلی فون کی گھنٹی کرخت آواز میں بج رہی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میرے بس میں ہوتا کہ میں اُڑ سکتا تو اُڑان بھر کر باڑیاں جا پہنچ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ برق رفتاری سے اس طرف روانہ ہو جاؤں۔ مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے روک دیئے تھے۔ لمحاتی توقف کے بعد میں ایک فیصلے پر پہنچا اور تیزی سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف لپکا

''نادر علی.....!'' میری تمام تر حسیات میری سماعتوں میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان دو الفاظ ذریعے ہی میں نے ایڈووکیٹ حامد صمدانی صاحب کی آواز کو پہچان کر کہا۔

''جی.....وکیل صاحب!.....خیریت.....؟'' میرے لہجے میں ہیجان تھا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔ میرے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

''پولیس نے ''صدف مرڈر کیس'' کے ایک اہم مفرور ملزم غفورے کو گرفتار کر لیا ہے۔'' انہوں سنسنی خیز انکشاف کیا۔

میں ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گیا، پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کک.....کب.....کہاں سے.....؟''

''رات دو بجے کے قریب مانسہرہ میں ''بٹ راسی'' کے جنگل کی ایک بستی سے اسے گرفتار کیا ہے۔'' ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے مختصراً تفصیل بتائی۔

''کون سی پولیس کا کارنامہ تھا یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پنڈی کے متعلقہ تھانے کی پولیس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔'' وہ بتانے لگے۔ ''انسپکٹر اعجاز شمس مخبر نے یہ اطلاع پہنچائی تھی۔ تم جانتے ہو نا کہ انسپکٹر شمس ہی کو عدالت نے صدف اینڈ قادر علی خان مشترکہ کیس کا تفتیشی آفیسر مقرر کر رکھا ہے؟''

''جج.....جی ہاں.....مگر.....'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''تم محتاط رہنا نادر!'' انہوں نے تنبیہہ کی۔ ''غفورے کا بیان تمہاری سمت موڑنے کی پوری کوشش جائے گی۔'' چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ متفکر لہجے میں بولے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے ذرا سنبھالا لے کر قدرے مختلف انداز میں بولے۔ ''اب بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ خیر.....میں سنبھا کی کوشش کروں گا اس کیس کو۔''

غفورے کا پولیس کے ہاتھ آ جانا.....ماں اور ماموں حیدر گل کے لئے ہی نہیں بلکہ خود میر لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غفورا ملک سردار خان کا آدمی تھا۔ اسی نے ملک سردار خان حکم پر صدف کی جان لی تھی۔ اس وقت میں دشمنوں کے بہکاوے میں آ کر اپنی ماں اور ماموں کا دشمن ہوا تھا جبکہ ملک سردار خان نے انہی دو کی خواہش کی تعمیل میں غفورا کے ہاتھوں معصوم صدف کا قتل کرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے نگینہ کو جان سے مارنے کا حکم دیا ہے اس لئے میں نے ملک سردار کو بھی جہنم واصل کر دیا تھا۔

ایسا لگا تھا کہ اس خونی کھیل میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسنے جا رہا تھا۔ خونی کھیل کی ابتداء میرے باپ کے بے گناہ قتل اور بعد میں میری بدنصیب ماں جس کے قتل کو جھوٹے الزام میں جیل کی کال کوٹھڑی کے پیچھے دھکیلنے والے ان دونوں شیطانوں نظر حیات اور شاہ میر ہی نے کی تھی۔

زلزلے، طوفان اور سیلاب ..... انہیں قہرِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر کون جانے، بد اعمالوں کے ساتھ نیک لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ ہمارے دشمن نظر حیات کی بیٹی صدف کا بے گناہ قتل بھی خطا کاروں کے ساتھ بے قصور مارے جانے والا معاملہ ثابت ہوا تھا۔

اگرچہ صدف میرے دشمنوں کی بیٹی تھی، لیکن میں بہرحال اس کے قتل کے حق میں نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ میری ماں کے ساتھ تو اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہوا تھا، اس کا انتقام کی آگ میں اس حد تک آگے بڑھ جانا فطری ردِ عمل تھا۔

بے چاری.....اپنے ناکردہ جرم کی پاداش میں اپنی جوانی کے قیمتی سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گزار چکی تھی اور اصل مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔ اور پھر یہی نہیں، دشمنوں نے بعد میں اس کے بڑھاپے کے سہارے کو بھی چھیننے کی کوشش کی اور اس کے بیٹے کو اپنی ہی دکھی اور بدنصیب ماں اور ماموں کے خلاف ورغلانا بھی چاہا۔

کون تھا.....؟ جو اس غم زدہ اور دکھوں کی ماری ہوئی ایک ماں کے دل کے زخموں کا احساس کرتا کہ دنیا نے تو اسے اپنے شوہر کا قاتل سمجھا ہی تھا، اس کے بڑھاپے کے سہارے، اس کے بیٹے یعنی میرے دل میں بھی یہ زہر بھر دیا گیا کہ اس کے باپ کی قاتل اس کی ماں ہے۔ ایسے خطرناک اور چال باز دشمنوں کے خلاف میری ماں کے دل کی آتشِ انتقام اس قدر بھڑک اُٹھی کہ اسے اپنے دشمنوں کی موت بھی ایک معمولی سزا محسوس ہونے لگی تھی۔ تو وہ بھی انہیں پہلے اسی طرح ذہنی اذیتوں سے دوچار کرنا چاہتی تھی۔

یہ سارے خیالات لمحوں میں میرے ذہن سے گزرتے چلے گئے۔ میں نے سر جھٹکا اور اپنی موجودہ حالت میں واپس آ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس واقعے کی اطلاع اعظم خان صاحب کو ضرور دے دینی چاہئے کہ وہی اس کے کیس کو دیکھ رہے تھے۔

''نادر بیٹے!.....تم بالکل فکر نہ کرو۔'' ساری بات سننے کے بعد انہوں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''غفورا ہمارا آدمی ہے.....وہ ہمارے خلاف اپنی زبان بند رکھے گا۔''

''مگر.....خان صاحب.....!''

''نہ.....نہ.....خان صاحب نہیں۔'' انہوں نے پُرشفقت لہجے میں مجھے ٹوکا۔

''سوری.....انکل! میں یہ کہہ رہا تھا کہ غفورا انسپکٹر اعجاز شمسی جیسے قصائی کے سامنے اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ دوسری طرف چند ثانیے خاموشی چھائی رہی پھر آواز اُبھری۔

''نادر بیٹے! میں نے کہا نا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا تم اپنے انکل کو معمولی آدمی سمجھتے ہو؟'' ان کے لہجے کی پراسراریت نے مجھے عجیب سی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

''تم دیکھتے جاؤ نادر!.....میں کرتا کیا ہوں۔ دشمن اگر ہمارے ساتھ شاطرانہ کھیل، کھیل سکتا ہے تو

ہم بھی اس کا منہ توڑ جواب اس کے انداز میں دینا جانتے ہیں۔ تم بتاؤ، نگینہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟

"میں ابھی ابھی اسی کی تلاش میں جا رہا تھا۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟" وہ قدرے چونک کر بولے۔ "کیا نگینہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے؟"

ان سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر میں نے انہیں مردان شاہ اور اس کے خط کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ وہ یہ سب سن کر پُرسوچ انداز میں بولے۔ "نگینہ کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ یہی ایک ہے .... ہمارے سارے مسائل کا حل .... جس کی بناء پر نہ صرف دشمنوں کو قانون کے شکنجے میں جکڑا جا سکتا ہے بلکہ تمہاری ماں اور ماموں بھی جیل سے رہا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں نگینہ کو تلاش کرنے کی پُرخطر مہم پر جانے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن تمہارا تنہا جانا کسی طور بھی مناسب نہ ہو گا .... میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں .... وہ ...."

"نہیں انکل!" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ "آپ فکرمند نہ ہوں! مجھے اکیلا جانے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دشمنوں کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں گا۔"

"پلیز بیٹے! ضد مت کرو۔" انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انکل! .... آئی ایم سوری .... مجھے جانے دیجئے۔ میرے پاس وقت پہلے ہی بہت کم ہے۔ آپ پلیز غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی کوشش کیجئے گا۔" میں نے بڑے اصرار سے کہا۔

"اچھا بیٹا .... خدا تمہاری مدد کرے .... تم بے فکر رہو .... میں غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی پوری کوشش کروں گا۔" وہ آخر میں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے اور پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور جلدی سے رکھا اس کے بعد تیزی سے باہر نکلا۔ اپنی جیپ تباہ ہونے کے بعد میں نے شوروم سے کرائے پر سیکنڈ ہینڈ جیپ ہائر کر لی تھی۔ چنانچہ ذرا دیر بعد ہی میری جیپ آندھی طوفان کی مانند اُڑی چلی جا رہی تھی۔

❄ ❄ ❄

تقریباً نصف گھنٹے کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں "کلڈنہ چوک" پر آ گیا۔ دائیں طرف "جھیکا گلی" اور چھ کلومیٹر کے بعد "گالف کورس" سے سیدھا راستہ بھوربن کی طرف جاتا تھا۔ یہ روٹ مجھے طویل پڑتا اس لئے میں نے شارٹ کٹ راستہ اپناتے ہوئے جیپ بائیں طرف موڑ لی۔ "باڑیاں" پہنچ کر "خیرہ گلی" کی طرف مڑ گیا۔ میرے دائیں بائیں بلند و بالا سبزہ زار پہاڑ تھے۔ سڑک کے اطراف صنوبر کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ چار کلومیٹر کے بعد "چھانگلہ گلی" شروع ہو گئی جو 400 فٹ بلندی پر تھی۔ اس قدر بلندی پر میری جیپ کی رفتار مجھے کسی وقت بھی قصرِ فنا میں دھکیل سکتی تھی۔ لیکن میرے سر پر نگینہ کو کبیر اور کالا ناگ جیسے درندوں کے چنگل سے بچانے کا اس قدر جوش آمیز جنون سوار تھا کہ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

خدا خدا کر کے "گلہڑہ گلی" ختم ہوئی۔ گلیات کا سلسلہ ختم ہوا۔ میں مردان شاہ کے بتائے ہوئے کے مطابق کلوڑی، باگنا کے درختوں والے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب میری جیپ پختہ سڑک اتر کر ناہموار راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر بعد مجھے سامنے ہی ایک اُجلے زار پر دیودار .... کہو کے پیڑوں کے بیچ .... کتھئی رنگ کا چوبی کاٹیج نظر آ گیا۔ میں یہاں پہلے آ چکا تھا۔ میرا کاروبار ہی ایسا تھا کہ مجھے اپنے ٹال کی لکڑیوں کے لئے ان علاقوں کی طرف نکلنا پڑتا تھا۔ یہ کاٹیج درحقیقت کسی دور میں سرکاری ریسٹ ہاؤس رہ چکا تھا۔ بعد میں اسے ایک ریٹائرڈ کنزرویٹو آفیسر نے خرید کر سیاحوں کے لئے پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت وہ مجھے بالکل اُجاڑ اور ویران نظر آ رہا تھا۔ میں نے جیپ گیٹ کے قریب جا کر روکی۔ چار اطراف مختلف النوع پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔

کاٹیج کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی بوسیدہ حالت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے طور پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا یا پھر اس کا مالک دنیا میں نہیں رہا تھا۔

گیٹ کا ایک پٹ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ جبکہ دوسرا بھی گرنے کے قریب تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اندر جابجا جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ سالخوردہ چوبی دیواروں میں جابجا رخنے نظر آ رہے تھے جہاں ابابیلوں اور دیگر پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ متروک احاطے میں اَدک، چنار اور سلور خر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں اپنے اطراف میں نظریں دوڑاتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔

ابھی میں نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک وہ کھل گیا۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک خاستری چہرے والا دُبلا پتلا شخص کھڑا مجھے اپنی زرد آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے شدید قسم کا یرقان تھا یا ویسے ہی اس کی آنکھیں پیلی زرد تھیں۔ البتہ میں اسے دیکھ کر بولا۔

"یہاں .... اور کون رہتا ہے؟"

اس نے ایک نظر سرتاپا مجھے بغور اپنی زرد آنکھوں سے گھورا، پھر اپنی شخصیت سے ہم آہنگ عجیب آواز میں مستفسر ہوا۔

"تم کو کس سے ملنا ہے؟"

"میرے یہاں کچھ دوست ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دو روز پہلے کی بات ہے، تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟" میں نے بلا تامل پوچھا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، ابھی تین چار روز پہلے کی بات ہے .... چار پانچ چھڑے چھانڈ لونڈے آئے تھے۔"

"ہاں ...." میں جلدی سے بولا۔ اور پھر اسے کالا ناگ اور کبیر کے حلیے بتا کر پوچھا کہ وہ دونوں بھی ان "لونڈوں" میں شامل تھے؟ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے اعصاب تن گئے۔

"ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہو گی؟" میں نے مضطربانہ انداز میں جلدی سے پوچھا۔ میری بات پر وہ جواباً کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں .... ایک لڑکی تو تھی .... مگر وہ بے ہوش تھی .... اسے اونچے لمبے، کالے شخص نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"وہ .... وہ سب کدھر گئے ہیں؟" میں نے تیز تیز چلتی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

"پتہ نہیں .... مگر ایک روز بعد ہی وہ صبح تڑکے ایک لمبی سی جیپ میں روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ میں نے ان کی آپس میں ہونے والی باتیں سنی تھیں۔ وہ کسی "بڈھیار" کے علاقے کا ذکر کر رہے تھے .... میرا خیال ہے وہ وہیں گئے ہوں گے۔"

اس نے بتایا اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"بابو جی! مجھے وہ کچھ ٹھیک آدمی معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے پورا شک ہے کہ انہوں نے اس بے چاری لڑکی کو ضرور اغواء کیا ہو گا۔"

"ہاں۔ تم صحیح کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں اپنی جیپ کی طرف
یہ سارے علاقے نتھیا گلی کے بیرونی علاقے تھے۔

میں جس بھرپور امید کے ساتھ یہاں آیا تھا وہ پوری ہو چکی تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی
جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"بڈھیار" یہاں سے زیادہ دور نہ تھا مگر راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے میں ایک لمبا چکر
بڈھیار کی طرف روانہ ہو گیا۔

شکر تھا کہ موسم خوشگوار تھا۔ ورنہ تو یہ سارا علاقہ بارانی تھا..... مگر میں موسم کی "خوشگوار
سلسلے میں زیادہ دیر تک پُرامید نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے موسموں کے تیور بدلنے میں زیادہ
لگتی تھی۔

بہرطور..... میں تنگ اور دشوار گزار راستوں پر اپنی جیپ کو مہارت سے دوڑاتا ہوا بالآخر
کے قریب جا پہنچا۔

"نتھیا گلی" کی طرح یہاں بھی کنڈال اور عباسی اقوام کے لوگ آباد ہیں جو ہندکو اور پہاڑی
کا امتزاج بولتے تھے۔ لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو یہاں کس مقصد
لائے ہوں گے؟ میری تشویش میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے کسی حد تک یہ تسلی تو تھی
جاں نثار ملازم دوست مردان شاہ، کبیر اور کالا ناگ کے شیطانی ٹولے کے تعاقب میں ہو گا۔ مگر
اس کے میرے دل کو کسی طور بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تھوڑی بہت پہاڑی زبان آتی تھی اور باقی
میں اشاروں کی بین الاقوامی "زبان" سے پوری کر سکتا تھا۔ میں نے "بڈھیار" کا سارا علاقہ چھان
لیکن مجھے کہیں بھی شیطانی ٹولے کا سراغ نہ مل سکا۔

خیرہ گلی کے اس متروکہ کاٹیج کے زرد آنکھوں والے چوکیدار ٹائپ شخص سے میں نے ان کی جیپ
رنگ وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا۔

لہٰذا میں نے یہاں پہنچ کر مقامی لوگوں سے سرمئی کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر جیپ میں سوار
افراد کے بارے میں استفسار کیا تھا..... لیکن کوئی بھی مجھے اس کے متعلق نہیں بتا پایا تھا۔ اب تو
پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ نگینہ سے متعلق انجانے وسوسوں اور پُرتشویش اندیشوں کے چیونٹے میرے
بدن پر رینگنے لگے۔

مجھے رہ رہ کر یہی خیال کسی ناگ کی طرح ڈسے جا رہا تھا کہ کہیں کالا ناگ کا یہ شیطانی ٹولا میرا
کو کسی قسم کا جانی نقصان نہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ کبیر بھی ان کے ہمراہ تھا اور وہ بہرحال
قتل کرنے کے حق میں نہ ہو گا۔ لیکن کالا ناگ سفاک انسان تھا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ مجھے
اذیتوں میں مبتلا کرنے کے لئے خطرناک انتقامی قدم میرے خلاف اٹھا سکتا تھا اور مجھے سب سے
تشویش بھی کبیر کی بجائے کالا ناگ کی طرف سے تھی۔

میں نے سوچا..... کہیں ایسا تو نہ تھا کہ ان کا یہاں آنے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہو اور وہ کہیں
گئے ہوں..... اس خیال نے مجھے مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے اور کالا ناگ کے
ٹولے کے درمیان پورے اڑتالیس گھنٹوں کا فاصلہ تھا..... یہ "فاصلہ" جغرافیائی حدود کا بھی ہو
اور وقت و حالات کا بھی..... میرے دل و دماغ پر بری طرح وحشتیں سوار ہونے لگیں۔

بالآخر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ نئے سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجھے خیرہ گلی اور بڈھیار کے درمیانی راستے پر واقع پہاڑی بستیوں
زیادہ باریکی سے کھنگالنا ہو گا۔

چنانچہ یہ فیصلہ کر کے میں نے جیپ واپس موڑ دی۔

سڑک پر دو رویہ سبزہ زار کے درمیان پتلی نہری لکیر کی طرح ترائیوں میں اُتر رہی تھی۔ دائیں بائیں
شاہ بلوط درختوں سے بھینی بھینی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میرے حواس پر نگینہ کی طرف سے
تشویش پریشانی سوار تھی۔ آسمان پر تیرتی ہوئی بادلوں کی ٹکڑیاں ابھی برف رنگ کی تھیں مگر وہ کسی بھی
لمحے سیاہ گھنگھور گھٹاؤں میں بدل سکتی تھیں۔

میں نے ترائی میں دائیں جانب واقع کھریل کے چند جھونپڑی نما گھر دیکھ کر جیپ ایک درخت کے
قریب روک دی اور نیچے اُتر آیا۔

درخت پر بیٹھا ہوا ایک سرخ سر کا مرغاب بھرا مارتا ہوا اُڑا۔ سیٹی بجا کر ایک نیلے پروں والا Thrust
بھی بالکل میرا سر چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے جیپ کے دروازے وغیرہ لاک کئے اور سڑک کے کنارے
واقع کھریل کے جھونپڑے نما گھروں کی طرف پیدل بڑھا۔ یہاں ایک دو گھروں کے سامنے کچھ جوان
لڑکیاں بالیاں جنگلی مٹر اور نیلے پائن توڑ رہی تھیں۔ وہ مقامی لباس میں تھیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس
میں چہلیں کرنے لگیں اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگیں۔ میں ان الہڑ لڑکیوں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر
آگے بڑھ گیا۔ وہ دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

ایک گھر سے میں نے پچاس پچپن سالہ ایک سرخ و سپید عمر رسیدہ شخص کو نکلتے دیکھا۔ میں فوراً اس کی
طرف بڑھا اور اسے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"بابا!..... کیا تم نے آج سے دو تین روز پہلے یہاں سے کسی لمبی سی سرمئی رنگ کی جیپ کو گزرتے
دیکھا تھا؟"

وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈال کر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ "بابو صیب! یہاں سے روزانہ ہی طرح
طرح کی موٹر کاریں گزرتی ہیں۔ کچھ یاد نہیں پڑتا۔"

میں نے اپنے سوال کی ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "بابا! میرا مطلب تھا کہ آپ نے نہیں تو
یہاں کسی اور نے دیکھی ہو وہ جیپ؟"

"اگر دیکھی بھی ہوتی تو ہم کیا بتا سکتے تھے کہ وہ کدھر گئی؟" وہ بولا۔ "ویسے بات کیا ہے آخر؟"

"بابا! دراصل وہ لوگ خطرناک مجرم تھے جو ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں سے گزرے تھے۔" اسے
سچ بتانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کے چہرے پر ذرا چونکنے کے آثار نمودار ہوئے اور وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "بیٹا! پھر تو تمہیں
پولیس کو اطلاع کرنی چاہئے تھی۔ یہ کام وہ زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتی تھی۔"

"میں نے رپورٹ درج کروا رکھی ہے اور پولیس بھی انہیں ڈھونڈ رہی ہے ..... لیکن میں اپنے
طور پر بھی ان کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ بدبخت بدمعاش ادھر ہی سے گزرے تھے؟" اس نے کچھ سوچتے
ہوئے اچانک پوچھا۔

"ہاں بابا! میں باڑیاں اور گلہڑہ گلی سے ان مجرموں کا کھوج لگاتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔" میں نے کہا۔
"اور ان کی آخری منزل "بڈھیار" کا یہی علاقہ تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا......... یہ بات ہے۔" وہ یکدم پُر جوش نظر آنے لگا۔ وہ ایک پہاڑی غیرت مند شخص فوراً بولا۔

"آؤ کاکا! میرے ساتھ۔ وزیر خان سے پوچھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وزیر خان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ جنگل کا سرکاری دار تھا۔ میں اس بھلے مانس کے ساتھ چلتا ہوا سڑک پر آ گیا تو اس کی نظر قریب کھڑی میری جیپ پر

"کیا یہ تمہاری جیپ ہے؟" اس نے ذرا رک کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں ہوئے کہا۔

"جی ہاں......... اگر وزیر خان کا گھر دور ہے تو اس جیپ میں چلتے ہیں۔"

"نہیں......... آگے جیپ کا راستہ نہیں ہے۔ پیدل ہی چلنا ہوگا۔ زیادہ دور بھی نہیں جانا پڑ آؤ میرے ساتھ۔" وہ بولا اور پھر سڑک پار کر کے دوسری طرف کے جنگل میں داخل ہو گیا اور میں سے اس کے عقب میں چل پڑا۔

سڑک کے دوسری طرف کا یہ جنگل نسبتاً گھنا اور گنجان تھا۔ یہاں کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی تھی دیودار اور چیڑ کے درختوں کے درمیان کھیت کھلیان ضرور نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو بھی میں کرتے دیکھا تھا۔ لگ بھگ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد سامنے ایک خوبصورت چوبی ریسٹ دکھائی دیا۔ ریسٹ ہاؤس چیڑ اور اخروٹ کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ عقب میں بڑا خوبصورت افزا سبزہ پھیلا ہوا تھا جس کے پار برف پوش پہاڑیوں کے تاج دُھوپ میں چمکتے دکھائی دے رہے ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچے۔ ریسٹ ہاؤس پر عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔

"اوئے وزیرے!" احاطے پر نصب گیٹ کے قریب پہنچ کر عمر رسیدہ شخص نے آواز دی۔ لیکن بار کی آوازوں پر بھی جب اندر سے کوئی برآمد نہ ہوا تو وہ بڑبڑایا۔

"جندرا (تالا) بھی نہیں لگا ہوا۔ لگتا ہے یا تو وہ حرام خور اندر سو رہا ہے یا پھر گھر چلا گیا ہے دیکھتا ہوں اندر جا کر۔"

وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وزیر خان اندر ہی تھا اور سو رہا تھا۔ وہ عمر رسیدہ شخص ذرا دیر بعد سے لوٹا تو اس کے ہمراہ ایک درمیانی قامت مگر مضبوط تن و توش کا لمبا شخص بھی تھا۔ اس کی عمر کے قریب ہوگی۔ اس نے ایک بوسیدہ سا لمبا "چیسٹر" پہن رکھا تھا۔ کسی شہری آفیسر کا انعام نظر آ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بے چارہ شاید رات بھر پہرے کے بعد دن میں پوری کر رہا تھا۔

"یہ ہے وزیرا......... اب تم خود ہی پوچھ لو۔" وہ عمر رسیدہ شخص مجھ سے بولا۔ "اور ہاں کاکا! اگر اس نے بھی تمہیں نہیں بتایا تو پھر سمجھو اور کوئی بھی تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے وزیر خان کی طرف دیکھ کر پہلے معذرت خواہانہ انداز اپنایا سوال دہرا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذرا سوچنے کی کوشش کرے گا لیکن میرا سوال سنتے ہی وہ فوراً بولا

"ہاں بابو صیب! .... شاید دو دن پہلے ہی کا ذکر ہے۔ ایک لمبی سی جیپ اس طرف آئی تو

میرے دل کی دھڑکنیں یک لخت بے ترتیب ہونے لگیں اور میں خوش امیدی کے سہارے بے قراری بولا۔ "ہاں......... ہاں......... وہی۔"

"اس میں چار پانچ افراد بھی سوار تھے۔ ایک لڑکی بھی تھی ان کے ساتھ۔ جو شاید بے ہوش تھی یا پھر

"وہ بتانے لگا۔ میرے سینے میں بے طرح ہلچل مچنا شروع ہو گئی۔ میں بے چینی سے اس کے آگے بتانے کا منتظر رہا۔

"وہ لوگ ادھر ہی آئے تھے۔ لیکن وہ رکے نہیں تھے۔" وہ صراحت بیان کرنے لگا۔ "میں اس وقت باغ میں گوڈی کر رہا تھا۔ میں نے ذرا کھڑے ہو کر احاطے کی دیوار سے باہر جھانکا تھا، وہ سیدھا آگے نکل گئے تھے۔"

"کہاں؟"

"اس طرف........." اس نے ریسٹ ہاؤس کے عقب میں سبزے سے ڈھکے ہوئے میدان کے بیچ بیچ سے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ہونٹ بھینچ کر چند ثانیے کے لئے کچھ سوچنے کے بعد مستفسر ہوا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ آگے کون سا علاقہ ہے؟"

"میرے خیال میں پچیس، تیس کلومیٹر کے فاصلے تک تو کوئی آبادی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میدان کے پار کائل، پڑتل اور دیودار کے ایک وسیع و عریض اور گھنے جنگل کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد برف پوش وادیاں ہیں۔ وہ لوگ اس سے آگے نکل گئے ہوں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اتنا بتا کر وہ رخصت ہونے کی نیت سے جماہیاں لیتے ہوئے ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی مسلنے لگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور خود واپس سڑک کی طرف چل پڑا۔

میرے سینے میں زبردست پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ جہاں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک کالا ناگ اور کبیر وغیرہ کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا، وہیں اگرچہ آگے بھی مجھے کامیابی کی امید پیدا ہونے لگی تھی۔ لیکن میرے اور ان کے درمیان اڑتالیس گھنٹوں کا جو طویل وقفہ تھا اس نے مجھے ہنوز بے قرار اور پریشان کر رکھا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وزیر خان نے مجھے ان کی گزرگاہ کا جو راستہ بتایا تھا، وہ ایک قدرتی "ٹریک" تھا جو دشوار گزار بھی ہو سکتا تھا لیکن چونکہ کالا ناگ بھی اس ٹریک سے گزر چکا تھا لہٰذا میں نے بھی وہی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ اس ساری دوڑ دھوپ میں تقریباً پانچ چھ گھنٹے صرف ہو چکے تھے اور اب سہ پہر کے تین بجے کا عمل تھا۔ میں جلدی سے جیپ پر سوار ہوا اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا......... ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد میں نے جیپ بائیں جانب جنگل میں موڑ دی۔ پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر میں وزیر خان والے ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے بتائے ہوئے ٹریک پر روانہ ہو گیا۔

میری بھوک پیاس تو کب کی اُڑ چکی تھی۔ چاہتا تو میں بہتے ہوئے قدرتی چشمے سے تھوڑا پانی پی سکتا تھا لیکن میرے سر پر نگینہ کو تلاش کرنے کی دُھن بری طرح سوار تھی اور میں اس مقصد کے لئے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

راستہ تنگ تھا اور کہیں کہیں ڈھلوان ہونے کے باعث مجھے جیپ کی رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ لیکن

جہاں ذرا بھی راستہ سیدھا ہوتا، میں ٹاپ گیئر پر پورا ایکسیلیٹر دبا دیتا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک طوفانی بگولے کی طرح سے آگے بڑھتی مگر ذرا دور تک تیز رفتاری کے بعد اچانک کوئی نہ کوئی موڑ آ جاتا۔

راستہ مزید دُشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلواں سبز جنگل تھا تو دوسری طرف گہری ترائیاں اور کھائیاں تھیں۔ کئی ''دھوکا'' دینے والے موڑ بھی آ رہے تھے۔ یعنی ایسے موڑ جو بظاہر دور سے پینتالیس ڈگری کے محسوس ہوتے تھے لہٰذا ڈرائیور دھوکا کھا کر گاڑی کی رفتار مطلوبہ حد تک ذرا کم کر کے جیسے ہی کاٹنے لگتا تو نزدیک پہنچنے پر پتہ چلتا کہ موڑ کے فوراً بعد سڑک تقریباً ''یوٹرن'' لئے ہوئے ہے اور گاڑی کا کھائی میں گرنا لازمی امر ہوتا۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی خطرناک قسم کی جلد بازی کا شکار تھا اور میرا واسطہ بار بار ایسے خطرناک موڑ سے پڑ رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موڑ پر میں نے جیسے ہی اپنی جیپ موڑی، آگے یک دم کھائی آ گئی۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ایکسیلیٹر چھوڑ دیا۔ نتیجتاً جیپ کھائی میں گرنے سے تو بال بال بچ گئی مگر ناہموار سڑک پر اُلٹی اور پھر خود ہی سیدھی ہو گئی۔

شکر تھا کہ میں نے بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لئے سر پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ ونڈ اسکرین ایک چھناکے سے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے سامنے دیکھا، جیپ کے اگلے دونوں ٹائر سڑک سے اتر کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جھول رہے تھے اور جیپ نصف کھائی میں اور نصف سڑک پر کھڑی ہولے ہولے جھول رہی تھی۔ میں پوری جان سے لرز اٹھا اور اپنی جگہ پر ساکت بیٹھ رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ جیپ کا توازن ذرا بھی بگڑتا تو وہ ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا لڑھکتی اور میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچا تھا۔ چند ثانئے بعد میں نے نہایت دھیرے دھیرے سیٹ بیلٹ کھولی اور آہستگی کے ساتھ دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا اور جیپ سے باہر نکلتے ہی میں نے بے اختیار گہرے گہرے سانس لئے۔ اس کے بعد بہ غور جیپ کی اس خطرناک ''SEESAW'' پوزیشن کا جائزہ لینے لگا۔

بہت مشکل صورتِ حال تھی۔ میں جیپ کو ریورس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر سوار ہونا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں وہ اسٹارٹ ہوتی بھی کہ نہیں۔ اگر اسٹارٹ ہو بھی جاتی تو ریورس گیئر ڈال کر اسے پیچھے کرنے کا خطرہ مول لینے کا مطلب خودکشی بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے کچھ مقامی آدمیوں کی تلاش تھی جو میرے ساتھ جیپ کو پیچھے کی طرف دھکیلنے میں میری مدد کر سکتے۔ لیکن دور دور تک پرندوں کی چہکار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم نیچے بہت دور ترائیوں میں چند کھپریل کی ڈھلوانی چھتوں کی چمنیوں سے دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے عقب میں کوسوں دور ''میراں جانی'' کی برف پوش چوٹی دھوپ میں چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں بے بسی کے باعث جھنجلا گیا اور خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ اب جلد بازی کا کیا فائدہ کہ اب میں یوں ویرانے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔

رسٹ واچ میں وقت دیکھا، سہ پہر کے چار بج کر پندرہ منٹ ہونے لگے تھے۔ سردیوں کے دن یوں بھی تیزی سے ڈھلتے ہیں اور شمالی برف پوش علاقوں میں تو سرِ شام ہی رات کا گماں ہونے لگتا ہے۔ مجھے اب یہ بھی فکر کھانے لگی کہ یہ سارا جنگلاتی علاقہ تھا۔ رات ہوتے ہی خطرناک جانوروں کے نکلنے کا خطرہ الگ دامن گیر ہو رہا تھا۔ ان علاقوں میں دیگر چھوٹے موٹے جانوروں کے علاوہ جنگلی بھیڑیوں اور ریچھوں کے اپنی کمین گاہوں سے نکلنے کا خطرہ بھی تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری پریشانی اور بے قراری میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا میگارد جیپ کے ڈیش بورڈ کے خانے میں موجود تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ سبک خرام ہواؤں میں سردی کی لہر بڑھنے لگی تھی۔ میں نے یوں تو موسم کے پیشِ نظر نرم اُونی سویٹر اور ایک لمبا سا چیسٹر پہن رکھا تھا اور ایک اُونی ٹوپی بھی چیسٹر کی ایک اندرونی جیب میں موجود تھی۔ البتہ دستانوں سے میں محروم تھا۔ چیسٹر کے کالر میں نے کانوں تک کھڑے کر لئے تھے۔ دور مغرب میں برف پوش چوٹیوں کے عقب میں سورج جھکنے لگا تھا۔ آسمان پر چھائے بادلوں کے برف رنگ آوارہ ٹکڑے آپس میں مدغم ہونے لگے تھے۔ ہواؤں کی تیزی میں اضافہ اور خنکی کی کاٹ کو محسوس کرتے ہی مجھے موسم کے تیور خطرناک ہونے کا اندازہ ہونے لگا۔

تب میں نے ایک خطرناک رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ مجھے دھواں دھار بارش ہونے کا خدشہ ہونے لگا تھا اور ان علاقوں میں بارشوں کے بعد برف باری کا امکان لازمی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں میرے لئے یہ خطرناک رسک لینے کا بھی موقع ہاتھ سے چلا جاتا۔

میں نے جیپ میں سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسٹارٹ ہونے سے انکار نہ کر دے۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آہستگی کے ساتھ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ پھر آگے پیچھے ہلنے لگی۔ میرے آگے موت کی صورت میں ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی اور پیچھے تب میں زندگی .... مگر اس وقت موت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی کو گھمایا۔

''چز...... زززز......'' کی آواز اُبھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس وقت ڈوبتے سورج کے سامنے کثیف بادلوں کی چادر سی تن گئی جس نے پوری وادی کو اندھیرے میں لے لیا۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی مگر دوسری بار بھی انجن محض گھر گھرا کر خاموش ہو گیا۔ میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

بارش کے آثار بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ وادی میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ چرند پرند بھی دبک گئے تھے۔ بادل گھنیرے ہونے لگے تھے۔ بس اب کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہونے والی تھی۔

میں جیپ کا بونٹ اٹھا کر بھی تو خرابی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ جیپ کا اگلا نصف حصہ تو گہری کھائی پر معلق تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور تیسری باری چابی گھما دی۔ جیپ کا انجن گھر گھرانے لگا اور دوسرے لمحے غرا کر بیدار ہو گیا۔ میرے اندر مسرت کی بجلی چمکی۔ اب خطرناک مرحلے کا آغاز ہونا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ انجن کے بیدار ہوتے ہی جیپ نے بھی اور زیادہ اوپر نیچے حرکت شروع کر دی تھی۔ اگر جیپ اُنیس بیس کے ذرا سے بھی فرق سے آگے کو جھک جاتی تو اس سے آگے کا تصور لرزا دینے والا تھا۔ میں نے کلچ پر پاؤں رکھا اور ریورس گیئر ڈالا۔ اس کے بعد ایکسی لیٹر پر ذرا ذرا دباؤ ڈالتے ہوئے کلچ چھوڑنے لگا۔

جیپ کے انجن کی تیز ہوتی گھر گھراہٹ، ہتھوڑے کی طرح میرے سینے پر پڑ رہی تھی۔ جیپ کے پچھلے دونوں ٹائر گھومے۔ جیپ نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ آگے سے کھائی کی طرف جھکنے لگی۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق، سیدھا کھائی میں جانے والا تھا۔ مگر میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور دوسرے ہی لمحے جیپ نے پیچھے حرکت کی۔ چند انچ پیچھے حرکت کرتے ہی میں نے ایکسی لیٹر پورا دبا دیا......... جیپ زوردار غراہٹ کے ساتھ سڑک پر آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھ دیا اور جیپ کو نیوٹرل کرنے کے بعد بے اختیار گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ٹھٹھراتی ہوئی
باوجود میری پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد
گیئر ڈال کر جیپ کا اسٹیئرنگ موڑا اور آگے روانہ ہو گیا۔

❄❄❄

اچانک آسمانی بجلی زوردار آواز کے ساتھ کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وادی میں
پھیلنے لگا تھا۔ میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ احتیا
ساتھ ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹنے کے بعد کاٹ دار ہوائیں میرے چہرے سے ٹ
تھیں۔ شکر تھا کہ بارش کا زور زیادہ نہ تھا مگر سڑک پر اب پھسلن ہونے لگی تھی۔ میں جیپ کو تیس
کی اسپیڈ سے زیادہ چلانے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ میں ذرا دیر پہلے ہی ایک انتہائی خطرناک
سے بچ نکلا تھا اس لئے مجھے اتنا بھی غنیمت ہی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب میری کارکردگی بارش اور را
مایوس کن حد تک بہت گھٹا دی تھی۔

میں نہایت مہارت کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بارش کا ایک ہموار سلسلہ جاری تھا۔ راستہ
ناہموار اور کچا ہوتا جا رہا تھا اور بارش کے پانی نے کیچڑ جیسی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ایک بار
کاٹنے کے دوران میری جیپ پھر گول گھوم گئی۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے
مطلوبہ سمت موڑا۔ اس موڑ کے بعد آگے کا راستہ مجھے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ذرا سیدھا مگر عمودی نظر
جب جیپ چڑھائی چڑھنے لگی تو نصف راستے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ ٹائر گول گھوم کر رہ گئے۔ کیچڑ
سے جیپ دوبارہ نیچے کی طرف سرکنے لگی تھی۔ میں نے فوراً ایکسیلیٹر سے پاؤں ہٹا دیا اور بریک دبا
اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں جیپ آگے بڑھانے کے لئے ایکسیلیٹر دباتا تو وہ بجائے چڑھائی
کے پیچھے ہونے لگتی اور ساتھ ہی اس کا زاویہ بھی بدلنے لگتا۔

میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ میری کارکردگی ایک بار پھر صفر پر آ گئی تھی۔ بارش کا سلسلہ جار
میں نے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے جیپ کو "بیک" کیا۔ میں نے بریک دبا رکھا
میں نہ آگے جا سکتا تھا، نہ ہی پیچھے۔

میری پیش قدمی ایک بار پھر رک گئی تھی۔ مگر اس مرتبہ میں پہلے سے زیادہ مشکل کا شکار تھا۔
ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بہ غور سامنے کیچڑ زدہ راستے کا جائزہ لیا تو مجھے
طرف پہاڑی کے ساتھ ساتھ والا حصہ کم کیچڑ والا محسوس ہوا۔ میں نے اسٹیئرنگ مذکورہ سمت میں گ
اور بریک سے پاؤں ہٹا کر کلچ پر رکھ دیا، پھر ایکسیلیٹر دباتے ہوئے کلچ چھوڑنے لگا۔

جیپ کا انجن غرانے لگا۔ چاروں پہیے پھسلنے کی حد تک گھومنے لگے۔ جیپ آگے بڑھنے کی
عقب سے رخ بدلنے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے جیپ ذرا پیچھے کھسکنے کے بعد چند انچ آگے بڑھی
نے ایکسیلیٹر پورا دبا دیا۔ میری فور وہیل ڈرائیو جیپ کے چاروں پہیے تیزی سے گھومنے لگے اور
دھیرے دھیرے آگے سرکتی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں جیپ کو پہاڑی کے بالکل ساتھ ملا کر
بڑھانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ راستہ نسبتاً کم کیچڑ زدہ ہونے کی وجہ سے میری جیپ نے
رینگ رینگ کر اپنی مقررہ رفتار پکڑ لی۔ اب چاروں پہیے سو کی اسپیڈ سے کیچڑ میں پھسلتے ہوئے گھو
تھے۔ مگر جیپ تیس، چالیس کی رفتار سے زیادہ نہیں دوڑ پا رہی تھی۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔
اس اعصاب شکن ڈرائیونگ نے مجھے تھکا مارا تھا لیکن جستجو اور جوشِ جنوں نے اس کی پروا

آخر میں اسی طرح مہارت اور مشاقی سے چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب جیپ پوری طرح
کنٹرول میں تھی۔ بارش کے چھینٹے ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے اندر پڑ رہے تھے اور میرا چہرہ بھیگ
رہا تھا۔ مگر میں کب ہار ماننے والا تھا۔ جیسے تیسے میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

پھر مزید دو گھنٹوں کی اس خطرناک اور اعصاب شکن ڈرائیونگ کے بعد میں ایک قدرے مسطح قطع پر
پہنچ گیا۔ سامنے برف پوش پہاڑیاں میرا راستہ روکے ہوئے تھیں۔ اپنے بلند و بالا اور طویل حجم کی وجہ
سے وہ دیکھنے میں تو بالکل قریب ہی محسوس ہوتی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ ان کا فاصلہ ابھی کئی میلوں کی
مسافت پر تھا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے جیپ روک دی تھی۔ کالے بادل خوب برسنے کے بعد ٹکڑیوں
میں بٹنے لگے تھے۔ نتیجتاً وسطی راتوں کے چاند کا رُخِ روشن اوٹ سے نمودار ہونے لگا تھا۔ رات اپنے
جوبن پر تھی۔ بھیگی راتوں کے چاند کی روشنی نے خاموش اور تاریک وادی کو منور کر دیا تھا۔

جیپ اسٹارٹ تھی۔ میں قرب و جوار میں نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے میلوں دور تک تاریکی کا راج
تھا۔ میں نے جیپ دوبارہ آگے بڑھا دی۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ آخر نگینہ کو ان برف
پوش ویرانوں میں لانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ میرے اُلجھے ہوئے خیالوں میں بار بار یہی سوال اُبھر رہا
تھا کہ اگر کبیر اور کالا ناگ نے نگینہ تک رسائی حاصل کر ہی لی تھی تو وہ اسے کہیں بھی یرغمال بنا کر رکھ سکتے
تھے۔ بھلا آبادی سے کوسوں دور اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا میرے پاس
کوئی جواب نہیں تھا۔ ابھی بہ مشکل دو تین کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اچانک جیپ کا انجن گھرگھرا
کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دوبارہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جب فیول بتانے والی
سوئی پر نظر پڑی تو بے اختیار میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سوئی E یعنی اینڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔

دشوار گزار راستوں کی وجہ سے جیپ کا پٹرول مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی کھپ چکا تھا۔ میرے
سامنے ایک فاضل گیلن تھا۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میرے دائیں جانب گھنا جنگل تھا جبکہ بائیں
جانب مختصر سے سبزے سے ڈھکا ہوا میدان تھا اور پار جنگل تھا جس کے عقب میں برفیلی پہاڑیاں تھیں
جن کی ڈھلوانوں پر سبزہ بکھرا ہوا تھا۔ چاند کی طلسماتی روشنی میں چہار اطراف بڑا خوبصورت اور اسرار بھرا
منظر نظر آ رہا تھا۔

میں نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا کہ پٹرول کا فاضل گیلن اُلٹ چکا
تھا اور جیپ کے اُلٹنے اور پھر سیدھا ہونے کے بعد گیلن کا ڈھکنا بھی غالباً جھٹکوں کی وجہ سے لوز ہو چکا تھا
جس میں سے سارا پٹرول رس کر ختم ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گرا ہوا گیلن اُٹھایا مگر وہ خالی تھا۔ میں
نے جھنجلا کر جیپ کا عقبی دروازہ زوردار دھماکے سے بند کر دیا۔

سردی کی کاٹ بڑھنے لگی تھی۔ بارش کے بعد برف باری بھی متوقع تھی۔ مجھ پر جھنجلاہٹ اور بے بسی
طاری ہونے لگی تھی۔ اپنی جدوجہد کے رائیگاں جانے کا احساس میرے لئے روح فرسا تھا لیکن میں نے
ہر رکاوٹ کو عبور کرنے کا عزم کر رکھا تھا لہٰذا میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ سے اپنا میگارڈ نکال کر
جیکٹ کے اندر رکھا۔ ایک چھوٹی ٹارچ پہلے ہی میری جیب میں موجود تھی جسے میں نے آگے پیدل روانہ
ہونے سے قبل وقت نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

❄❄❄

اچانک میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے بل کھاتا کیچڑ زدہ راستہ، دُور تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ مجھے درحقیقت اپنے عقب
غراہٹوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ میں نے یک دم پلٹ کر دیکھا تو بری طرح چونک پڑا۔ میرے
میں چند جنگلی بھیڑیوں پر مشتمل ایک غول چلا آ رہا تھا۔ ان کی خونخوار آنکھوں میں گرسنہ چمک
رُکتا دیکھ کر وہ بھی رُک گئے اور اپنے جبڑے کھولے میری طرف دیکھتے ہوئے غرانے لگے۔ چاند کی روشنی
ان کے خونخوار ادھ کھلے جبڑوں سے شکاری دانتوں کی وحشیانہ جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے
ہی اپنا ایک ہاتھ چیسٹر کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا تو بھیڑیوں کے غول نے فوراً حرکت
غراتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پھرتی سے میگارڈ نکال لیا
تاخیر بھوکے بھیڑیوں کے غول پر ایک فائر کر ڈالا۔ رات کے دم بخود اور بھیگے ہوئے سناٹے میں گولی
کی دھماکے دار آواز دور تک وادی میں گونجتی چلی گئی۔ ایک بھیڑیا گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا جبکہ
اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ میں نے دوبارہ قدم آگے بڑھا دیئے مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بھیڑیوں
نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ خود رو جھاڑیوں اور گھنے چھتنار پیڑوں کی آڑ لئے، بدستور میرے تعاقب میں تھے۔ میرے
فاضل راؤنڈ بھی تھے جبکہ میگارڈ کے چیمبر میں اب سات میں سے چھ گولیاں بچی تھیں مگر میں انہیں
نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اب تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ جنگلی بھیڑیے اپنے
ساتھی کا بھیانک انجام دیکھ کر اب میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے لیکن بھوک نے
"شکار" کی بُو سے دور جانے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے کسی مقام پر گھیرنے کی کوشش میں تھے اور
ہولے ہولے غراتے ہوئے میرے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ میں بھی محتاط روی کے ساتھ اپنے
بائیں اور عقب میں گردن موڑے، گاہے گاہے ان پر نظر رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ایک مقام پر دو بھیڑیوں نے بیک وقت دائیں بائیں جانب سے مجھ پر غراتے
چھلانگیں ماریں۔ مجھے گولی چلانے کا موقع تو نہ مل سکا البتہ میں پھرتی کے ساتھ ایک دم نیچے بیٹھ
دونوں بھیڑیئے فضا میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور میں تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے
ساتھیوں کی بے باک جرأت پر باقی بھیڑیئے بھی بے درنگ غراتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں
نمودار ہو گئے۔ مجھ پر چھلانگ مارنے والے دونوں بھیڑیئے دوبارہ خوفناک غراہٹوں کے ساتھ
طرف لپکے۔ بھیڑیوں کے اس غول نے مکاری کے ساتھ مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اب فائر
کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی طرف لپکتے ہوئے ان دونوں بھوکے بھیڑیوں
اوپر دو فائر کر ڈالے۔ وہ دونوں کریہہ غراہٹوں کے ساتھ ڈھیر ہو گئے۔ باقی بھیڑیئے دوبارہ تتر بتر
لگے تو میں نے طیش میں آ کر ان پر بھی ایک گولی چلا دی۔ چوتھا بھیڑیا بھی خاک چاٹنے لگا۔
کہ یہ کم بخت میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی کوشش کریں گے اس لئے میں نے کسی محفوظ
تک جلد سے جلد پہنچنے کے لئے اب تقریباً دوڑنا شروع کر دیا۔

بچے کھچے بھیڑیوں نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا، پھر اس کے بعد وہ یا تو واپس لوٹ گئے
پھر وہیں دبک کر اپنے ہی مردہ ساتھیوں کو چٹ کرنے کے ارادے سے رُک گئے تھے۔ میرے
کے چیمبر میں اب صرف تین گولیاں باقی بچی تھیں۔

آگے ڈھلوانی راستہ آ گیا۔ میں نے ذرا ٹھہر کر مدھم چاندنی میں نیچے قدرے ترائی میں دیکھا
ذرا دور ایک سطح مرتفع پر کاٹیج نما گھر کا ہیولا دکھائی دیا۔

اس دور افتادہ اور ویران جنگلی علاقے میں اس کاٹیج کی موجودگی میرے لئے باعث حیرت نہ تھی۔ یہاں وادیوں میں ایسے کئی کاٹیجز اور ریسٹ ہاؤسز دیکھنے میں آتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا اور ساتھ ہی سامنے کاٹیج پر بھی اپنی نظریں مرکوز رکھی تھیں۔

جب ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ کاٹیج برسوں سے ویران پڑا ہوا ہو۔ یہ خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا مگر ابھی درست حالت میں تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں کیچڑ میں چاند کی روشنی میں مجھے کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشانات نظر آئے۔ میں ان نشانوں پر چلتا ہوا سیدھا کاٹیج کے بیرونی احاطے کے گیٹ تک جا پہنچا۔ یہ احاطہ جنگلی اور خاردار جھاڑیوں سے بنایا گیا تھا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور کاٹیج کے مرکزی دروازے تک جا پہنچا اور بری طرح ٹھٹکا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ آس پاس ویرانی مسلط تھی۔ پستول جیب میں رکھ کر میں نے ٹارچ نکال لی اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی کا دائرہ کمرے کی تاریکی کو بڑی حد تک دور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا......... وہ منظر اتنا ہی کراہت آمیز تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔

❄❄❄

یہ خوفناک منظر دیکھ کر ایک لمحے کو میں اپنی جگہ سن کر ہو رہ گیا تھا۔ پھر فوراً ہی میں نے خود پر قابو پایا اور بہ غور لاش کی صورت اوندھے منہ پڑے وجود کو دیکھنے لگا۔ وہ کسی کی لاش ہی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ اسے بے پناہ تشدد کے بعد بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا کیونکہ لاش کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔

ایک روح فرسا خیال کے تحت میں بے اختیار آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے میں نے جب لاش کا چہرہ دیکھنے کے لئے اسے پشت کے بل سیدھا کیا تو میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا......... وہ میرے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی لاش تھی......... غم و غصے سے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ میرے دماغ میں گویا آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ میں نے اپنی ذہنی حالت پر بہ مشکل قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مردان شاہ کی لاش کا معائنہ کیا۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

جسم پر جابجا زخموں کے نشانات تھے۔ سر اور چہرہ بھی بری طرح ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنا تھا۔ غم کے شدید احساس تلے بے اختیار میری آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں۔ بہ غور جائزہ لینے پر مجھے اتنا تو اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ ساری وحشیانہ کارروائی چند گھنٹے پہلے ہی کی گئی تھی جو بلاشبہ کالا ناگ کے خونی اور سفاک گروہ ہی کی ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آنسو ضبط کئے۔ گہرے رنج و غم کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھر کر اُٹھ کھڑا ہوا پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک میری نگاہ مردان شاہ کی لاش کے قریب پڑی جہاں اس کا سر تھا۔ وہاں مجھے خون سے لکھے چند آڑے ترچھے لفظ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا قریب آ کر جھکتے ہوئے ٹارچ کی روشنی وہاں ڈالی اور بہ غور ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ لفظ آڑے ترچھے ضرور تھے مگر ذرا سی کوشش کے بعد میں "مشن پور" پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس لفظ کو پڑھنے کے بعد میرے سینے میں ہلچل مچ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ لفظ مردان

سماہ نے اپنی اذیت ناک موت سے ذرا دیر پہلے اپنے لہو سے اُنگلی کی مدد سے لکھا ہوگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کا خط ملتے ہی میں چین سے ہرگز نہیں بیٹھوں گا اور جلد یا بدیر اس تک ضرور پہنچوں گا۔ وہ جان کی بازی ہارتے ہوئے مردان شاہ کی آخری کوشش تھی بلکہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا، نگینہ کو کالا ناگ اور اس کے ساتھیوں کے چنگل سے نکالنا آسان نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی جان پر کھیل کر ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جس کے نتیجے میں اس کی جان تک چلی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مجھے میرے دشمنوں کی آئندہ منزل سے آگاہ کر گیا تھا۔ مجھے مردان شاہ کی دوستی اور اس کی ہمتوں پر رشک ہونے لگا۔ ایسے بے لوث، جری اور دُھن کے پکے لوگ اب بھلا کہاں ملتے ہیں۔

مجھے دشمنوں کے آئندہ ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا اور مجھے بلا تاخیر وہاں روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ تاہم مردان شاہ کی تشدد زدہ لاش کو یوں بے گور و کفن چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک میری نظریں مردان شاہ کی مردہ آنکھوں پر پڑیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے جلدی کرنے کی التجا کر رہی ہوں۔ ”نادر صاحب! میں تو اپنی جان ہار چکا ہوں اور اب آپ تاخیر کر کے میری قربانی کو رائیگاں نہ جانے دیں۔ آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ نادر صاحب! ..... نادر صاحب!.....“ مجھے یہ صدا مردان شاہ کے روئیں روئیں سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

یہ گونج اتنی بڑھی کہ میں بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مردان شاہ کے جسد خاکی کو الوداعی نگاہ ڈالی اور باہر نکل آیا۔

میرا اندازہ تھا، مکش پور اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں پیدل چل کر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ جیپ میں اگر پٹرول ہوتا تو یہ فاصلہ شاید چند منٹوں کا رہ جاتا۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا کہ میں نے پٹرول کے گیلن کو مضبوطی سے کیوں نہ باندھ کر رکھا تھا۔

میں نے کاٹیج کا دروازہ بند کر دیا تاکہ جنگلی جانور اندر گھس کر مردان شاہ کی لاش کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ پھر میں تیز قدموں سے مکش پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہر طرف چٹکی ہوئی چاندنی میں جیپ کے ٹائروں کے نشانات میری راہنمائی کر رہے تھے۔ اس وقت یوں رات گئے ویران جنگلوں کی خاک چھاننے والا، میں کسی دیوانے ہی کی اس وقت تفسیر بنا ہوا تھا۔

میرے اطراف میں شب کا پراسرار اور پُرسکوت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات دبے پاؤں آخری پہر میں سرک رہی تھی۔ میں نشانات دیکھتا ہوا قدم بہ قدم آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ معاً میں ایک آواز پر ٹھٹک کر رک گیا، پھر اپنی تمام سماعتوں کی مدد سے شب کے اس سناٹے میں کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میری سماعت نے وہ آواز سن لی۔ وہ کسی انجن کی مخصوص گھر گھراہٹ تھی۔ چند ثانئے بعد ہی مجھے سامنے روشنی اُبھرتی نظر آئی جسے دیکھتے ہی میں نے دائیں جانب کی قدآور جنگلی جھاڑیوں میں دبک کر روشنی کی سمت نظریں جما دیں۔ کچھ ہی دیر بعد گرے کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر میرے پاس سے اُچھلتی ہوئی گزر گئی۔ میری آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔ مجھے یاد تھا کہ ”گلگلی“ والے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں زرد آنکھوں والے چوکیدار نے مجھے اسی جیپ کا اشارہ دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے دشمن ابھی ابھی میرے سامنے بلکہ برابر سے گزرے تھے۔ اس بار ان کی منزل جانے کہاں ہوتی؟

میرے بدن میں جیسے جوش و غضب کسی بجلی کی مانند دوڑ گیا۔ میں جھپٹتا ہوا جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور بے تحاشا جیپ کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جانتا تھا کہ یہ میری بچگانہ کوشش تھی۔ میں جیپ کی رفتار کا مقابلہ محض اپنی ٹانگوں کے زور پر ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ بل کھاتے کچے راستے پر جیپ تیز رفتاری سے نہیں دوڑ سکتی تھی لیکن اس کی رفتار اتنی بھی کم نہیں ہوتی کہ میں محض اپنی دو ٹانگوں کی قوت سے اسے پکڑ سکتا یا اس کے ساتھ چل سکتا۔ لمحاتی غور کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں راستے کی بجائے براہِ راست درختوں سے ڈھکی ڈھلان پر چل پڑوں تو جیپ سے آگے بھی نکل سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ شب کی تاریکی اور اونچا نیچا ڈھلوان۔ چند ہی لمحوں بعد میرا سانس بری طرح پھول گیا تاہم میں اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ مسلسل نیچے کی طرف اُترتا رہا۔ میری یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی اور میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جس طرف سے جیپ آ رہی تھی۔ میں وہیں کھڑا ہو کر گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے بے حال نفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے جیپ نظر آنے لگی۔ وہ ہچکولے کھاتی میری طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ میرے پاس اب جیپ کو رکوانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر میں نے میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اس جیپ کا ٹائر برسٹ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر کہ اگر اس میں میرے دشمن سوار ہوئے تو وہ محتاط ہو سکتے تھے۔ کیونکہ نفری اور اسلحے میں وہ مجھ پر بہرحال فوقیت رکھتے تھے اور میرے پاس اسلحے کی صورت میں صرف ایک میگارد تھا اور اس میں بھی اب صرف تین گولیاں ہی باقی بچی تھیں۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ جلدی فیصلہ کرنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک بڑا سا نوکیلا پتھر تلاش کر لیا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر میں جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ جوں ہی وہ جیپ ذرا قریب پہنچی تو میں نے اوٹ سے ذرا اُٹھ کر پوری قوت سے وہ پتھر جیپ کی ونڈ اسکرین پر دے مارا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ایک دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوبارہ جھاڑیوں میں دبک گیا۔ جیپ رک چکی تھی۔ میں بہ غور دھڑکتے دل سے جیپ کی طرف گھورے جا رہا تھا۔ پھر میں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں حرکت کی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جیپ کے سوار نیچے اُتر کر ضرور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا؟..... ایسا ہی ہوا۔ میں اب جیپ کے ذرا قریب دائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرک آیا تھا۔ میری نظریں جیپ پر مرکوز تھیں۔ جیپ کے دروازے کھلے اور میں نے بیک وقت چار پانچ مسلح افراد کو اترتے دیکھا اور پھر ان میں سے دو افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں اور رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہونے لگی۔

وہ کالا ناگ اور کبیر حیات تھے۔ باقی تین یقیناً ان کے ”غلام“ رہے ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں۔

”یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“ معاً کالا ناگ نے غراہٹ سے مشابہہ آواز میں کہا۔ ساتھ ہی وہ بڑی خوفناک نظروں سے آس پاس کی جھاڑیوں کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھا۔ موت کا کھیل شروع ہونے والا تھا مگر مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ جانے یہ بدبخت لوگ اسے کہاں چھوڑ آئے تھے؟

اپنے بدترین اور سفاک دشمنوں کا یقین کر لینے کے بعد اب میں بے دھڑک ان سے ٹکرانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

”چلو چھوڑو یار! ..... جانے دو۔“ معاً کبیر کی بیزار کن آواز اُبھری۔ ”ہوگا کوئی پاگل۔ چلو، دیر ہو رہی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ کالا ناگ نے پھنکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ حرکت کسی پاگل کی نہیں ہو

سکتی۔ بھلا اس ویرانے میں کوئی پاگل کہاں سے آ گیا؟"

"پاگل ان ویرانوں میں ہی تو ہوتے ہیں۔" کبیر نے ایک قہقہے کے دوران کہا۔

ہاں .... یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ واقعی ایک پاگل اس وقت ان سب کو جہنم واصل کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے دانت پیس کر سوچا۔

کالا ناگ نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ اس نے اپنے تینوں خونی ہرکاروں سے تحکمانہ انداز میں کہا اور پھر وہ تینوں مستعدی کے ساتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک تو عقب کی جھاڑیوں میں راستے کی دوسری جانب غائب ہو گیا جبکہ باقی اس طرف بڑھنے لگے جہاں اس وقت میں دبکا ہوا تھا۔

دونوں شکاری نما شکاروں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ میں ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں ٹارچوں کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے جیسے ہی میرے ذرا قریب پہنچے میں بے آواز، سینے اور کہنیوں کے بل پر رینگتا ہوا ان کے عقب میں آ گیا اور اچانک ہی کھڑا ہو کر میں نے خاموشی سے ایک گردن دبوچ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ حلق سے "اوغ" کی صورت میں آخری ہچکی اُبھری۔ اس کا دوسرا ساتھی جھپٹ کر پلٹا تو میں اس وقت تک مردہ شکار سے گن چھین چکا تھا تاہم ابھی میں فائر کرنے کی بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی دوسرا شکاری بدک کر میری طرف متوجہ ہوا میں نے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جھولتے اس کے مردہ ساتھی کو اسی پر دھکیل دیا۔ وہ جب تک اپنی گن کا رخ میری طرف کرتا اس کا ساتھی اس سے جا ٹکرایا۔ مردہ ساتھی کی لاش سے اچانک ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ لڑکھڑا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش کرتا، میں نے اس کے ساتھی سے چھینی ہوئی گن کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمایا اور اس کا سر چٹخ گیا۔ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرتے ہوئے اس کے حلق سے ایک زوردار مکروہ چیخ اُبھری تھی۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر میں دوبارہ گن سنبھالے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

میں نے دیکھا، لینڈ کروزر کے قریب کھڑے کالا ناگ اور کبیر چیخ کی آواز پر بری طرح چونکے تھے اور پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنی جیبوں سے نہایت پھرتی کے ساتھ پستول نکال لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں جھاڑیوں کی طرف چوکنا نظروں سے گھورنے لگے۔ کالا ناگ کے سیاہ چہرے پر غضب کی وحشت طاری تھی البتہ کبیر خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

کالا ناگ نے چلّا کر اپنے انہی دونوں ہرکاروں کو پکارا جنہیں میں ڈھیر کر چکا تھا مگر جواب نہ پا کر وہ بھی اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ غالباً وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ آگے بڑھے یا وہیں کھڑا رہے۔ البتہ چلّانے پر اس کا تیسرا ہرکارہ ان کے عقب سے نمودار ہوا۔ پھر کالا ناگ نے کبیر کو وہیں رکے رہنے کا کہا اور اپنے ساتھی ہرکارے کے ساتھ جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ میرا دل اب گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ پہلے میں نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نہایت آہستگی سے ایک طرف کو رینگ گیا۔ مجھے پوری تسلی تھی کہ اب یہ لوگ میرے آہنی پنجوں سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا میں کالا ناگ اور اس کے اکلوتے ہرکارے کو اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا چھوڑ کر چشم زدن میں دوسری طرف رینگ گیا۔ پھر کچے راستے پر اُبھر کر میں نے فوراً جیپ کے عقب میں آنے کی کوشش کی تو اچانک وہاں کھڑے کبیر کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے میری جھلک دیکھتے ہی بلا تامل مجھ پر گولی چلا دی۔ مجھے اگر جیپ کی آڑ میں آنے پر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو گولی مجھے شکار کر سکتی تھی۔ لیکن اب صورتِ حال خطرناک رخ اختیار کرنے والی تھی۔ کبیر میری جھلک پر گولی داغنے کے بعد پھرتی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ میں اس کی چالاکی بھانپ گیا۔

شکار اور شکاری کے درمیان چوہے بلی کا خطرناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے جیپ کی آڑ لیتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ کبیر بنیادی طور پر ایک بزدل مگر لومڑی کی طرح عیار اور مکار شخص تھا۔ جبکہ کالا ناگ دشمن کے مقابلے پر بے دھڑک اُتر آتا تھا۔ لہٰذا یہی سبب تھا کہ کبیر کی چلائی ہوئی گولی کی آواز پر وہ جہاں کہیں بھی تھا، فوراً ہی اپنے "اکلوتے" ہرکارے کے ساتھ واپس پلٹا تھا۔ کبیر کی جھلک بھی مجھے نظر آئی تھی۔

اب وہ تینوں جان چکے تھے کہ ان کے مدمقابل کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ مردان شاہ کی قربانی کے باوجود انہیں اندازہ ہو گا کہ میں کسی بھی وقت ان کے مقابل آ سکتا تھا۔

وہ تینوں مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ میرے پاس ان میں سے ایک کی چھینی ہوئی ایم پی فائیو رائفل تھی۔ یہ ایک زبردست آتشیں ہتھیار تھا، جس کے میگزین کلپ کے ساتھ ایک اور فاضل گولیوں کا کلپ بھی منسلک تھا۔

میں نے شکار کو تاکنے کے لئے اپنی پوزیشن بدلی اور جیپ کے ساتھ لگے حرکت کی تو اچانک مجھے جیپ کے اندر ایک اور وجود کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے چونک کر ذرا شیشے سے اندر دیکھا اور پھر جیسے دوسرے ہی لمحے میں سانس لینا بھول گیا۔ اس وقت اعصاب شکن سناٹے کو گولیوں کے ایک برسٹ نے ختم کر دیا۔

میں غیر ارادی طور پر نیچے جھک گیا۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی جیپ کے اندر ایک تیز نسوانی چیخ اُبھری۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی میں نے جیپ کے اندر نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑے نسوانی وجود کو دیکھا تھا، وہ حقیقت تھی یا میرا خواب؟......... لیکن میری جاگتی آنکھیں خواب نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ہاں .... وہ میرے وجود کا حصہ نگینہ ہی تھی۔

نگینہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی جیسے میرا پورا وجود جوالا مکھی بن کر رہ گیا تھا......... برسٹ فائر ہونے کے فوراً بعد میں نے ایک بار اندر موجود نگینہ کو دیکھا اور یہ تسلی ہونے کے بعد کہ وہ صحیح سلامت تھی، میں نے یکدم زمین پر لیٹ کر جیپ کے نیچے سے سامنے دیکھا تو اچانک ہی مجھے تیزی کے ساتھ کروٹ بدلنا پڑی۔ ایک اور برسٹ نیچے سے مجھ پر داغا گیا تھا۔ شکر تھا بروقت میری نگاہ کالا ناگ کے اس اکلوتے ہرکارے کی پوزیشن پر پڑ گئی تھی جو خود بھی زمین پر سینے کے بل مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کی خوفناک سنسناہٹ مجھے اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گزرتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پھرتی سے کروٹ بدلتے ہی دوبارہ شست باندھی اور مذکورہ ہرکارے پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ ایک کربناک چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا تو سامنے ہی مجھے کبیر دکھائی دیا۔ وہ پستول ہاتھ میں تھامے بڑے محتاط انداز میں جیپ کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جیپ کے سامنے والے حصے کی طرف سرک رہا تھا۔ میری نظروں نے کالا ناگ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ کبیر کو جیپ کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں اس کا مقصد سمجھ چکا تھا۔ وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے اس کی عجلت آمیز بے وقوفی سے فائدہ اٹھایا اور نہایت پھرتی اور ہوشیاری کے ساتھ پلٹا۔ پھر موقع تاک کر میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی۔ پستول چھوٹ کر دور جا پڑا اور اس کے ہاتھ سے خون جاری ہو گیا۔ وہ جب تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنبھلتا، میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے گن پوائنٹ پر لے چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا رہ
اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا زخمی ہاتھ تھامے کھڑا کراہ
''کبیر!..... کہاں ہے تمہارا وہ کتا کالا ناگ.....؟'' میں نے اسے لہو رنگ نظروں
گھورتے ہوئے غرا کر پوچھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری عقابی نظریں آس پاس گردش کر رہی تھیں
ناگ کے پراسرار ''غیاب'' پر میں پریشان ہونے لگا تھا۔ وہ بہت مکار اور شاطر انسان تھا۔ ضرور خطر
بھانپ کر کہیں خاموشی سے گھات لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر میں اب اس کی تلاش میں وقت ضائع نہیں
چاہتا تھا۔ کبیر البتہ میرے سوال پر محض لکنت زدہ آواز میں ہکلا کر رہ گیا تھا۔ کالا ناگ کے اچانک حم
کروار کرنے کے ممکنہ خطرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں فوراً کبیر کو ڈھال بنانے کی خاطر اس پر جھپٹا
اسے بازو سے دبوچ کر فوراً جیپ کی طرف آ گیا اور غرا کر کبیر سے بولا۔

''دروازہ کھولو!..... جلدی۔''

اس نے فوراً اپنے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں جلدی سے جیپ میں سوار ہوا
پھر ایک نگاہ عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑی نگینہ کو دیکھا۔ وہ ہذیانی چیخ مارنے کے بعد شاید دوبارہ بے ہو
ہو چکی تھی۔ چونکہ اب کبیر میرے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اس کا منہ کھلوانا کافی تھا لہٰذا میں اگنیشن سوئچ
لگی چابی کو اب گھمانے ہی والا تھا کہ اچانک کھڑکی سے ایک سیاہ نال میری کنپٹی سے آ لگی اور ساتھ
ایک پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

''جیپ سے نیچے اُتر آؤ نادر.....!'' یہ کالا ناگ تھا۔ میرے وجود میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ
جانے کس وقت رینگتا ہوا جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف آن دھمکا تھا۔ میں نے بے
پر بیٹھے بیٹھے ذرا گردن موڑ کر کالا ناگ کو سنسناتی نظروں سے گھورا۔ اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر
سفاک مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ادھر میرے برابر میں بیٹھے ہوئے کبیر نے دانت پیستے ہوئے میری گن
قبضہ جما لیا تھا۔ میں دروازہ کھولنے لگا تو کالا ناگ مجھ پر پستول تانے ہوئے یکلخت چند قدم پیچھے ہ
گیا۔ میں خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا اور بے خوفی سے تن کر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔
دونوں ایک دوسرے کو چند ثانیے خوں ناک نظروں سے گھورتے رہے۔ اس اثناء میں کبیر بھی مجھ سے چھ
ہوئی گن تھامے نیچے اُتر آیا تھا اور میری طرف گھورتے ہوئے اس نے کالا ناگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کالا ناگ!..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گن میرے سینے
طرف تان لی۔

کبیر!.....'' اچانک کالا ناگ نے اسے تنبیہہ آمیز لہجے میں پکارا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آ
ابھی تو میں نے اسے لرزہ خیز مناظر کا نظارہ کروانا ہے..... ورنہ تو میں جب چاہوں اسے بڑے آ
سے موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔''

''میں اتنا تر نوالہ نہیں ہوں کالا ناگ!'' اس کی خوش فہمی پر میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''بہتر
ہے کہ میں اس وقت دشمنی کی جس آگ میں سلگ رہا ہوں، اسے میرے اور میرے دشمنوں تک ہی محد
رہنے دو۔ اس کا دائرہ تم خود تک نہ بڑھاؤ۔ ایسا نہ ہو، پھر مجھے اپنے دشمنوں کے عبرت ناک انجام
شروعات تم سے کرنا پڑ جائے۔'' میرے لہجے کی گھن گرج اور ارادوں کی تپش کو محسوس کرنے کے باوج
کالا ناگ کے سر سے خوش فہمی کا بھوت نہیں اُترا تھا..... وہ مارے طیش کے اپنے دانت پیستا ہوا
قدم آگے بڑھا اور میرے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پستول کی نال میری پیشانی سے لگا دی

مگر میری آنکھوں میں خوف کی ایک ذرا رمق تک نہ اُبھری تھی..... اس نے سیفٹی کیچ ہٹایا، ٹرائیگر پر
انگلی رکھ دی۔

''اب کیا کہتے ہو؟..... چلاؤں گولی؟'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرے ساتھی مردان کا قتل کس نے کیا ہے؟'' میں اس کی خوفناک دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر اس
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

میرے استفسار پر اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ اُبھری تھی۔ ''تمہارا ساتھی ویسے
تو بڑا جی دار۔ لیکن افسوس، اس نے مجھ سے ٹکر لینے کی بے وقوفی کی..... اور..... اس نے خود
اپنی جان اپنے ہاتھوں میں رکھ کر میرے حوالے کر دی۔''

اس کے منہ سے اپنے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی ہلاکت کا یقین ہوتے ہی جیسے میرے پورے
وجود میں قہر و غضب کی بجلیاں دوڑ گئیں۔ اب کالا ناگ جیسے سفاک اور سنگ دل درندے کا بھیانک
انجام مقدر بن چکا تھا۔

''گولی چلاؤ کالا ناگ!..... اسے یہیں ختم کرو۔ یہ اب ہمارے لئے بہت خطرناک بن چکا
ہے۔'' قریب کھڑے کبیر نے ہذیانی انداز میں چلا کر کالا ناگ سے کہا۔

''کاش..... میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا نادر!..... کاش.....'' وہ غیظ آلود لہجے
میں دانت پیس کر بولا اور دوسرے ہی لمحے اس نے پستل میری پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس کا آہنی
دستہ میری کنپٹی پر مارنے کی کوشش کی لیکن میں، جو اُس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا، اس کا
ارادہ بھانپتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کے پستول والے
ہاتھ کے وار کو روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا زور دار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ بے اختیار
لڑکھڑاتا ہوا کبیر سے جا ٹکرایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کبیر نے سنبھل کر مجھ پر برسٹ فائر کر
ڈالا لیکن میں تب تک اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیوں کی باڑ لینڈ کروزر کی باڈی
میں پیوست ہو گئی۔ میں تب تک کبیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنی گن کا رخ میری طرف
کرنا چاہا مگر اس وقت کالا ناگ درمیان میں آ گیا۔ میں بھی ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اس کی ناک پر پڑنے والے میرے ایک ہی گھونسے نے اس کی شکل بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ خون بھل بھل
اس کی ناک سے بہہ رہا تھا، جس نے اس کے کریہہ چہرے کو مزید بھیانک بنا دیا تھا۔ کبیر ششدر رہ
گیا۔ کالا ناگ کی وحشت ناک نظریں میرے چہرے میں خنجروں کی طرح پیوست تھیں۔ پھر وہ خرخراتی
آواز میں مجھ سے بولا۔

''نادر علی خان! آج میں اپنے زورِ بازو پر تیرا یہ غرور خاک میں ملا کر رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے
کبیر سے کہا۔ ''کبیر! تم گاڑی اور لڑکی کو لے کر روانہ ہو جاؤ..... لیکن خبردار! نادر پر گولی ہرگز مت
چلانا۔ کیونکہ یہ میرا شکار ہے۔''

میں اس کی بات پر بے چین ہو گیا۔ پھر کالا ناگ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس وحشی
ٹائر کی ٹکر سے خود کو بچانے کے لئے پھرتی سے پینترا بدلنا چاہا لیکن وہ پہلے سے ہی میرے ارادے کو
بھانپ گیا اور راہ ہی میں رخ بدل کر مجھ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے کاندھے کی بھرپور ضرب میرے سینے پر
لگائی۔ ضرب میری توقع سے زیادہ ٹھوس اور طاقت ور ثابت ہوئی۔ نتیجتاً میرے قدم زمین سے اُکھڑ
گئے اور میں جیپ سے جا ٹکرایا۔ ادھر کبیر نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونا

چاہا تو میں کالا ناگ کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا مگر کالا ناگ میری راہ میں آ گیا۔ میں نے اس کے
لات رسید کرنے کی کوشش کی تو وہ خود کو میری لات سے بچانے کی بجائے اپنی جگہ۔ جم کر کھڑا ہو
پھرتی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ٹانگ کو پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں نے ایک ٹانگ پر اچھ
فضا میں ایک طوفانی انداز کی کروٹ لی اور اس ٹانگ کی بھرپور ضرب کالا ناگ کے جبڑے پر رسید کر
اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری اور اسے میری ٹانگ چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے اپنے قد
پر سیدھے کھڑے ہوتے ہی اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس بار جم کر اچھلتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں
کے سینے پر رسید کر دیں۔ وہ غراہٹ سے مشابہہ کراہ خارج کرتا ہوا کئی قدم دور جا گرا۔ میں خو
بگولے کی طرح پلٹا اور جیپ میں سوار ہوتے ہوئے کبیر کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور گن چھی
اسے پرے دھکیل دیا۔ گن میرے ہاتھوں میں آتے ہی کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا جبکہ کالا ناگ
اب سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا، میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے بولا۔

''نادر علی!..... میں دشمنی بھی اپنے معیار کے لوگوں سے رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میر
اس معیار کو برقرار رکھو گے۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے گن دور جھاڑیوں میں اچھال دی تو وہ خوش
بھرپور لہجے میں بولا۔ ''واہ نادر!..... تم نے آج کالا ناگ کی دشمنی کی لاج رکھ لی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں گھور کر زہر بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن..... کالا ناگ! تم میری دشمنی کے معیار کے نہیں ہو۔ ہتھیار میں نے تمہارا قرض چکا
کے لئے پھینکا ہے۔''

لاہور کے معروف ''گجر چوک'' کے بدنام زمانہ بدمعاش کالا ناگ کے سینے میں میرے تضحیک آ
الفاظ خنجر کی طرح پیوست ہوئے تھے۔

''آج تو تیرا یہ گھمنڈ توڑنا ہی پڑے گا..... کیونکہ تو پہلا شخص ہے جس نے کالا ناگ کو یوں لفظ
کی مار سے ذلیل کرنے کی جرأت کی ہے۔'' وہ غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے بولا اور پھر وحشی سانڈ
طرح مجھ پر جھپٹا۔ ہم دونوں دست و گریباں ہو گئے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو دھکا دے کر چند قدم پیچ
لڑکھڑا گئے۔ تب کالا ناگ نے اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر اپنے ہاتھوں کے پنجے کھول دیئے۔
میرے ساتھ شاید حقیقتاً پنجہ آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کی ''پنجہ آزمائی'' کی یہ دعوت
قبول کر لی اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے اس کے پنجوں میں پھنسا دیئے۔

اب ہمارے درمیان خالصتاً جسمانی طاقت کا مقابلہ تھا۔ وہ اگر توانا اور گرانڈیل تھا تو کم میں بھی
تھا۔ میں اسے پنجوں کے بل دھکیلتا ہوا چند قدم آگے تک لے گیا تو دوسرے ہی لمحے وہ اپنے جسم کی پو
طاقت کو گویا پنجوں میں منتقل کر کے جواباً مجھے عقب میں دھکیلتا ہوا جیپ تک لے گیا اور میری پشت جیپ
سے جا لگی۔ اب وہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بلاشبہ وہ طاقت کا پہاڑ تھا
مجھے اپنی انگلیاں چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں چاہتا تو اپنی ایک لات کا آزادانہ استعمال اس
پیٹ پر کر سکتا تھا لیکن میں بھی اسے اسی طرح ''پنجہ آزمائی'' کی صورت میں جواب دینا چاہتا تھا۔ چنا
میں نے بھی اپنے وجود کی ساری قوت کو گویا پنجوں میں منتقل کر کے زور آزمائی شروع کی اور وہ بھی پو
قوت صرف کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کی پیشانیاں ایک دوسرے سے آن ملیں اور لاوا اُگلتی نظریں ا
دوسرے کی آنکھوں میں تیر کی طرح پیوست ہو گئیں۔ بالآخر میں اس کے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عرصہ مروڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے حلق سے وحشیانہ چیخ خارج ہو گئی اور پھر اس نے اپنے سر کی
زوردار ٹکر میری ناک پر جڑ دی۔ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں کے آگے
اندھیرا سا چھا گیا۔ کالا ناگ نے بجلی کی سی سرعت سے اپنے دونوں پنجوں کو میری آہنی گرفت سے چھڑا لیا
پھر جب تک میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹک کر تاریکی کی چادر جھٹکنے کی کوشش کی، کالا ناگ نے
اپنے دونوں ہاتھوں کی تالی میری دونوں کنپٹیوں پر پیٹ ڈالی۔ میرا دماغ ایک بار پھر جھنجھنا گیا۔ وہ شاید
میری طاقت اور دیسی ساختہ لڑائی بھڑائی کے انداز اور مہارت سے بہ خوبی واقف ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی
کہ کالا ناگ نے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر مجھ پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ تب میں نے موقع
پا کر اس کا اپنے چہرے کی طرف اُٹھتا ہوا گھونسا اپنے ایک ہاتھ پر روکا، پھر اسی ہاتھ سے بہ سرعت
اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔ وہ کراہ آمیز چیخ کے ساتھ گھوما تو میں نے گھٹنے کی ضرب اس کی ریڑھ کی
ہڈی پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے دلخراش چیخ اُبھری اور وہ پیروں پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے کراٹے
کے انداز کا ایک اور وار اس کی دائیں پسلی کی ہڈی پر کیا تو وہ اذیت ناک چیخ کے ساتھ زمین پر اوندھے
منہ لیٹ کر ہانپنے لگا۔ کالا ناگ، جسے اپنی طاقت اور دہشت پر بڑا غرور تھا، میں نے اسے بالآخر خاک
چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے کبیر کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے خائف رہتا تھا۔ اب جو اس نے
لاہور کے معروف گجر چوک کے بدنام زمانہ دہشت گرد غنڈے کالا ناگ کو میرے ہاتھوں زمین بوس
ہوتے دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی زمین بوس کالا ناگ کی طرف
دیکھتا تو کبھی میری طرف۔

دوسرے ہی لمحے بدحواس ہو کر گھبرائے ہوئے ''جنگارے'' کی طرح جھاڑیوں میں جا گھسا۔ میں
جیپ کی طرف پلٹا اور بے تابانہ انداز میں جیپ کی عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ نگینہ کے
چہرے پر اتھاہ سناٹے کی سی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر محوِ خواب
نظر آ رہی تھی۔ میرے سینہ سوزاں میں دھڑکتے ہوئے دلِ مجبور نے گواہی دی کہ ہاتف تقدیر نے نگینہ کو
میرے نصیب میں لکھ دیا ہے اور اسے اب مجھ سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔ میں نے اس کا
تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا تنفس ہموار تھا۔ دل کی دھڑکنیں معمول کے مطابق تھیں۔ میں اس کے گال
ہولے ہولے تھپتھپاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دو تین بار کسمسا کر
آنکھیں کھولنے اور کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ مجھے اب اس کی
طرف سے تشویش ہونے لگی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے نگینہ کسی گہری نشہ آور دوائی کے زیر اثر ہو۔ اور اگر
ایسا تھا تو اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے کوئی بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اسٹارٹ کر کے
ایک دم ہی جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

دور مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اطراف میں پھیلے ہوئے جنگل نوع
بنوع خوش الحان پرندوں کی مدھر چہچہاہٹ سے گونجنے لگے تھے۔

مردان شاہ کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ یہ لوگ شاید ''مکش پور'' سے واپس لوٹ رہے تھے۔
سارے حالات واضح ہو جانے کے باوجود میرے اندر کی خلش ختم نہیں ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں ابھی تک
یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو ''مکش پور'' کس ارادے کے تحت یرغمال بنا کر لے گئے تھے؟

پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان خبیثوں نے کورٹ میں آئندہ ہونے والی ''متوقع'' فیصلہ کن پیشی م باپ شاہ میر اور نظرِ حیات کے خلاف گواہی دینے سے معذور رکھنے کے لئے نگینہ کو یرغمال بنایا تھا۔ ان کی نگینہ سمیت ''مکش پور'' کے راستے غیر متوقع اور اچانک واپسی نے مجھے سوالات اور سوچ کی اید پراسرار کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ پھر نگینہ کی طویل خواب ناک سی بے ہوشی خاصی پراسرار تھی۔

تقریباً آدھ پون گھنٹے کی دشوار گزار ڈرائیونگ کے بعد مجھے اپنی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔ میں کروزر قریب لے جا کر روک دی۔ لینڈ کروزر کے اندر موجود میں نے پٹرول کے دو گیلن دیکھ لئے پتہ نہیں وہ بھرے ہوئے تھے کہ خالی۔ بہرطور کسی خیال کے تحت میں جیپ سے اُترا اور عقبی درواز کر دونوں جیری کین اٹھا کر دیکھے تو ان میں ایک بالکل خالی تھا جبکہ دوسرا ذرا وزنی تھا۔ وہ نصف تھا۔ میں نے اسے ہی کافی جان کر اٹھایا اور اپنی جیپ کے قریب آ کر اسے فیول ٹینک میں انڈیلنے لگا

اس کے بعد میں نے لینڈ کروزر کے اندر سے بے ہوش نگینہ کے وجود کو اٹھایا اور اپنی جیپ کی سیٹ پر آہستگی سے لٹا دیا اور اپنی لیدر کی نرم جیکٹ اتار کر نگینہ کے اوپر ڈال دی۔ پھر اس کی پیشا اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میری کائنات میرے سامنے تھی، مجھ سے قریب تھی، اتنا قریب کہ میں نے ا پیشانی پر اپنی مہرِ محبت ثبت کر دی تھی۔ وہ چند لمحے نہایت جاں فزا تھے۔ میں سب کچھ فراموش کر دیا تاہم یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ اس کی مدہوشی نما نیند کا خیال آتے ہی میں عالم فراموشی حقیقت کی تلخ دنیا میں لوٹ آیا۔ مجھے اس کو طبی امداد فراہم کرنے کے لئے جلد ہسپتال پہنچانا تھا۔ ذرا بعد میں اپنی جیپ پر واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔

❄ ❄ ❄

جاڑے کی گلابی دھوپ وادی میں پوری طرح پھیل چکی تھی۔ میں اب پنڈی جانے والی سڑک رواں تھا۔ نگینہ کو حاصل کرنے کی جہاں مجھے ازحد مسرت ہو رہی تھی، وہیں مردان شاہ کی موت پر دا ہو رہا تھا۔

شہر کی حدود شروع ہو چکی تھی۔ میں نگینہ کو سب سے پہلے ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا اور میں نے ا کیا۔ سینٹرل ہسپتال میں ایک ڈاکٹر سے میری واقفیت تھی۔ اس کی مدد سے نگینہ کو فوری طور پر نگہداشت کے شعبے میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور میں آئی سی باہر نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ میں اس کی اطلاع فوری طور پر اعظم خان اور ایڈووکیٹ صمدانی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے میں نگینہ کی حالت کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا دیر بعد آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور میرا واقف کار ڈاکٹر منصور پُرسوچ چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ ہی اس کی طرف لپکا۔

''نن.........نگینہ، اب کیسی ہے ڈاکٹر صاحب! آخر اسے ہوا کیا ہے؟ ....وہ......... ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' میں اضطرابی کیفیت میں تلے اوپر بے ربط سوال پوچھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر منصو دھیرے سے میرا شانہ تھپتھپایا، پھر تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے مگر ....خیر.........آؤ.........'' وہ بات ادھوری چھوڑ ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

''مگر کیا ڈاکٹر صاحب.........؟'' میں نے متفکر بے چینی سے پوچھا۔

وہ اپنی چیئر پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنی سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''ویسے تو کوئی خطر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔'' میرے نشست سنبھالنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''مگر پیشنٹ کی مسلسل بے ی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں نے طاقت وغیرہ کے انجکشن شروع کر دیئے ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ سکتی ہے۔ بہ صورت دیگر کسی نیورو فزیشن سے رابطہ کرنا پڑے گا۔''

''تو ابھی ان سے کنسلٹ کر لو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ پیشنٹ کے وائٹل سائنز آلات پر لگا دیئے ہیں اور انہیں مانیٹر کیا جا رہا ہے۔'' وہ میں خاموش ہو گیا۔ تب اس نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو ان کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ ....میرا مطلب ہے، کوئی شدید ذہنی صدمہ وغیرہ.........؟''

میں اسے کیا بتاتا۔ محض اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہو سکتا ہے کوئی ایسی ہی بات ہو۔ پھر میں دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ میرا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا جہاں سے مجھے حامد صمدانی ایڈووکیٹ کو فون کرنا تھا۔

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' انہوں نے میری زبانی نگینہ کی بازیابی کا سن کر پُرجوش آواز میں کہا۔ میں نے انہیں مردان شاہ کی موت اور پھر کالو اور کبیر سے ہونے والے مقابلے کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ ''لیکن نادر میاں! نگینہ کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟ میں بھی وہیں پہنچتا ہوں۔ اور ہاں.........ابھی اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔''

ان کے استفسار کے جواب میں، میں نے انہیں ہسپتال کا پتہ اور ڈاکٹر منصور کا نام وغیرہ بتا دیا۔

پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے اعظم خان کے نمبر ملائے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے اپنے ہاں آنے کی نصیحت کی۔ اعظم خان وہ واحد ہستی تھے جنہیں میں ساری تفصیل سے لفظ بہ لفظ آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نگینہ کو اس کے ہوش میں آنے سے پہلے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں فون پر ہی تفصیل سے آگاہ کرنا شروع کیا تھا کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور گمبھیر لہجے میں بولے۔

''تم ایسا کرو.........اس کے باپ کو ایک گمنام کال کر کے نگینہ کا بتا دو کہ وہ کون سے ہسپتال میں ہے۔ اور تم خود ادھر آ جاؤ۔'' ان کی بات پر میں نے بتایا کہ میں ایڈووکیٹ حامد صمدانی کو بھی فون کر چکا ہوں اور وہ کسی بھی وقت ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔

''ٹھیک ہے.........پھر میں بھی وہیں پہنچتا ہوں.........او کے!''

❄ ❄ ❄

میں آئی سی یو کے سامنے چکنے کوریڈور پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ گاہے گاہے میری نگاہیں دروازے کے شیشے سے دوسری طرف بستر پر لیٹی نگینہ کا طواف کرنے لگی تھیں۔ وہ میرے دل کی دھڑکن تھی۔ میرا سب کچھ تھی وہ۔ جانے اس کے ساتھ ان خبیث شیطانوں کالا ناگ اور کبیر نے کیا سلوک کیا تھا؟

مجھے مردان شاہ کی موت کا خیال آیا تو میرا دل غم سے بھرنے لگا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ میں اس کے بوڑھے باپ کو اس اندوہناک خبر سے آگاہ کر سکتا۔ کالا ناگ نے میرے سامنے اس بات کا اقرار کر کے کہ مردان شاہ کے پُرتشدد قتل میں اس کا ہی ہاتھ تھا، اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی تھی۔ لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کبیر کا بھی مردان شاہ کے قتل میں ہاتھ ہوا تو میں اسے بھی عبرت ناک انجام سے دوچار کر کے ہی رہوں گا۔ بلکہ یہی نہیں، اگر میری نگینہ کے ساتھ خدانخواستہ کوئی دل دُکھانے والی بات ظاہر ہوئی تو میں نے ان دونوں کو ہی زندہ نہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرلیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ایڈووکیٹ حامد صمدانی وہاں آ پہنچے۔ جب ہی ڈاکٹر منصور آئی سی یو میں مریض کا معائنہ کر کے باہر نکلا۔ اس نے خوش کن خبر سنائی کہ نگینہ کو ہوش آ چکا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا لیکن جانے کیا بات تھی، میرا دل نا معلوم سی بے چینی میں مبتلا تھا۔

نگینہ کو وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں اور ایڈووکیٹ حامد صمدانی اس کے پاس تھے۔ اس دوران اعظم خان بھی آ گئے۔ ان کے ہمراہ ایک باڈی گارڈ بھی تھا، اس کا نام شیر دل تھا۔

سب سے پہلے میں نے نگینہ کے سرہانے آ کر اسے پکارا۔

''نگینہ.....!''

وہ پوری طرح ہوش میں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نا معلوم خوف سمٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی مگر اس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر ذرا سی بھی شناسائی رمق نہیں اُبھری تھی۔

وہ ہراساں سے لہجے میں بولی۔ ''مم..... میں..... کہاں ہو؟''

ڈاکٹر منصور وہیں موجود تھا۔ میرے بولنے سے پہلے وہ مسکرا کر نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آپ ہسپتال میں ہیں..... اور بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کا نام.....؟''

''مم..... میرا نام..... نن..... نگینہ.....!''

''آپ اپنے ڈیڈی کا نام بتائیں گی؟'' ڈاکٹر منصور شاید اس کی ذہنی کیفیت جاننے کی غرض سے سوالات کر رہا تھا۔

''پپ..... پپا!..... وہ کہاں ہیں؟..... مم..... مجھے پپا کے پاس لے چلو۔'' وہ بے قراری سے بولی۔

''ہاں، ہاں..... آپ کے پپا کو بھی ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔ آپ ان کا نام تو بتائیں؟'' ڈاکٹر نے ملائمت آمیزی سے کہا۔

''ان کا نام..... شاہ میر ہے۔''

نگینہ نے اپنے پپا کا نام بتایا تو ڈاکٹر منصور ایک گہری اور طمانیت بھری سانس لے کر ہم سے مخاطب ہوا۔ ''یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''لل..... لیکن ڈاکٹر صاحب! یہ..... یہ مجھے نہیں پہچان رہی..... کیا اس کی یادداشت.....'' میں نے مضطربانہ پریشانی سے کہا تو ڈاکٹر منصور بولا۔

''ان کی یادداشت بالکل درست ہے۔ البتہ کسی وجہ سے طویل بے ہوشی کے باعث ان کے دماغ پر ہو سکتا ہے اب تک خوابیدہ اثرات ہوں۔ ذرا دیر بعد جب ان کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گا تو یہ قریبی افراد کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پہچاننے لگیں گی۔

مجھے ڈاکٹر منصور کی بات پر زبردست ذہنی شاک پہنچا تھا۔

مجھ سے زیادہ قربت نگینہ کی اور کس سے ہو سکتی تھی.....؟ اگر وہ اپنا نام بتا سکتی تھی، اپنے پپا کو پہچان لے سکتی تھی تو پھر مجھے اب تک کیوں نہ پہچان سکی؟ ..... مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر نگینہ کو مخاطب کیا۔

''نن..... نگینہ!..... مم..... میں تمہارا..... نادر۔ کیا تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟''

تھی، شاید اس بار وہ مجھے پہچان لے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جہاں کبھی میرے لئے شناسائی کا ایک جہان ہلکورے لیتا رہتا تھا اور اب وہاں گم نام جزیروں کے سناٹے اترے ہوئے تھے۔

اس کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی بہاریں کھل اُٹھتی تھیں ..... لیکن اب وہاں اجنبیت کی خزاؤں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''تت..... تت..... تم کون ہو؟''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

''نگینہ!..... مم..... میں کون ہوں؟'' میں نے زخمی لہجے میں اس کا استفسار دہرایا۔ ''نگینہ! تم مجھے نہیں پہچان رہیں..... میں..... تمہارا نادر۔''

''پلیز، مجھے پپا کے پاس جانے دو..... خدا کے لئے..... ورنہ..... ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔'' نگینہ نے سسک کر ملتجیانہ انداز میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کو شہتیر چیرنے والے آرے کے نیچے رکھ دیا گیا ہو۔

معاً کسی نے عقب سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ٹیک اِٹ ایزی نادر!..... حوصلہ رکھو۔'' یہ اعظم خان تھے۔

''آ..... انکل!..... نن..... نگینہ..... مجھے پپ..... پہچان نہیں رہی..... بالکل نہیں پہچان رہی ہے اعظم انکل!'' میں کرب انگیز لہجے میں بولا۔

میری حالت اس وقت ایک ایسے دُکھی بچے کی سی ہو رہی تھی جس کا کوئی قیمتی کھلونا کھو گیا ہو۔

''حوصلہ رکھو نادر میاں!'' قریب موجود ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے بھی ازراہِ تشفی کہا۔ ''تم نے ڈاکٹر منصور کی بات نہیں سنی؟ ..... ابھی نگینہ بیٹی کا ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ تمہیں بھی پہچاننے لگے گی۔''

ادھر اعظم خان، نگینہ کے سر پر ازراہِ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگے کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے اس کے پپا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔

پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی آواز میں بولے۔ ''میرا خیال ہے، مجھے شاہ میر کو اطلاع دینا پڑے گی۔''

''مگر.....'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو ایڈووکیٹ حامد صمدانی بھی اعظم انکل کی تائید میں مجھ سے بولے۔

''ہاں نادر!..... یہی زیادہ بہتر رہے گا۔ تم واپس 'گرین لاج' لوٹ جاؤ..... باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔''

''آؤ نادر! میرے ساتھ چلو۔'' اعظم انکل نے ہولے سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے بجھی نگاہ نگینہ کے چہرے پر ڈالی کہ شاید وہ بے اختیار مجھے پکارے۔ لیکن اس کے چہرے پر شناسائی کی ایک رمق بھی نہ اُبھری تھی۔

ناچار میں اپنے دُکھی دل کے ساتھ اعظم انکل کے ہمراہ اس کے کمرے سے نکل گیا۔

اعظم انکل کی کار ہسپتال کے احاطے میں موجود تھی۔ انہوں نے مجھے کار میں بٹھایا اور میری جیپ کی چابیاں مجھ سے لے کر اپنے ڈرائیور کو دے دیں۔ ڈرائیونگ انہوں نے اپنے گارڈ کے سپرد کی تھی اور خود میرے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔

میں سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے خاموش بیٹھا تھا۔
میرے ذہنی خلجان کو محسوس کرتے ہوئے اعظم انکل نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔
میرے اندر ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ آندھیوں نے جیسے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں رکھا تھا۔ دل و دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل اپنی دگرگوں کیفیات پر قابو پاتے ہوئے حالاتِ گزشتہ کا جائزہ لینا شروع کیا تو ہر بار ایک ہی سوال مجھے شدت سے بے چین اور مضطرب کر رہا تھا کہ نگینہ آخر مجھے کیوں نہیں پہچان پا رہی ہے؟ ..... باپ شاہ میر کے بارے میں یہ بتانا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر منصور کہ نگینہ کی یادداشت بالکل درست کام کر رہی ہے۔ تو پھر اس نے مجھے پہچاننے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟ ..... کوئی ایسی بات تھی، اور کوئی ایسا راز جو کسی سے ظاہر کر رہا تھا۔ نگینہ کے ساتھ کچھ کیا گیا تھا؟ ..... اور یہ بھی اسی دوران ہوا تھا جب کالا ناگ اور نے نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے ہاں یرغمال بنایا تھا اور پھر نگینہ کو اغواء کر کے فوری طور پر ان شیطانوں کے ٹولے کا برف پوش وادی مکش پور لے جانا اور پھر وہاں سے نیم بے ہوشی کے عالم میں نگینہ کو واپس لوٹنا کسی پراسرار معاملے کی نشاندہی کر رہا تھا۔
ڈاکٹر منصور کا یہ کہنا کہ چند گھنٹے بعد جب نگینہ کے دل و دماغ سے دھند دھیرے دھیرے چھٹے گی تو وہ مجھے خود ہی پہچان لے گی، طفل تسلی کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم پھر بھی میں نے امید دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔
میں نگینہ کو اس کے باپ شاہ میر کے سپرد کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن نگینہ کی ذہنی حالت، پھر اس خود یہ اصرار کرنا کہ وہ اپنے باپ کے پاس جانا چاہتی ہے، یہ سن کر مجھے مجبوراً اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا اور وہاں ایڈووکیٹ حامد صمدانی اور اعظم انکل کا بھی یہی کہنا تھا۔ اس لئے میں نے بھی چپ سادھ لی۔ بے اختیار ان پریشان کن خیالات کے بھنور سے اُبھر کر اپنے برابر میں براجمان اعظم خان سے کہہ ہی ڈالا۔
''انکل!..... کیا ان حالات میں نگینہ کو باپ شاہ میر کے حوالے کرنا درست تھا؟''
''ہاں۔'' انہوں نے بلا تامل جواب دیا۔ ''اس صورت میں یہی مناسب تھا۔ تمہارے لئے بھی نگینہ کے لئے بھی۔''
''مگر انکل! نگینہ نے بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دی تھی ..... اور یہ گواہی دینے کے بعد وہ اپنے باپ سے اس قدر متنفر ہو چکی تھی کہ اپنے گھر جانے کی بجائے وہ خاموشی سے اپنی قریبی سہیلی کے ہاں شفٹ ہو گئی تھی۔ اور پھر وہیں سے اسے کالا ناگ اور کبیر نے اغواء کیا تھا۔'' میں نے اُنہیں یاد دلانے کی غرض سے کہا۔
''میں سب جانتا ہوں۔'' وہ ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔
''تو پھر آپ کو اب نگینہ کی اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ آخر اب پھر وہ کیوں اپنے باپ کے جانے پر بضد ہے؟'' میں نے کہا۔
''یہ اس کا ایک فطری ردعمل ہے۔'' وہ بولے۔ ''کیونکہ بہ قول تمہارے وہ کسی ایسے سنگین حالات سے گزری ہے جو اس کے دل و دماغ پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے گھر ہی کو اپنے لئے محفوظ پناہ گاہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔''
''لیکن انکل! میرا دل اس بات کی نفی کر رہا ہے۔'' میں نے اچانک اسرار بھرے انداز میں کہا۔ انہوں نے پہلی بار قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور مختصراً کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا مطلب؟''
جو بات میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھی، اسے اعظم انکل کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے یہ موضوع بدلنے کی غرض سے ان کی توجہ ایک اور اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''انکل!..... دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ نگینہ نے میرے باپ قادر علی خان مرڈر کیس کے سلسلے میں بھری عدالت کے اندر میری ماں کے حق میں اور اپنے باپ کے خلاف گواہی دینے کے بعد کہ آج سے پچیس سال قبل میرے باپ کو میری ماں نے نہیں بلکہ اس کے باپ شاہ میر اور نظر حیات نے قتل کیا تھا۔ تو ایسے میں اب نگینہ کو اس کا باپ شاہ میر کیا ورغلانے کی کوشش نہیں کرے گا کہ وہ اس کے خلاف اپنی گواہی واپس لے لے؟''
''ہاں ..... اس کا امکان تو سو فیصد ہے۔'' اعظم انکل تائیدی لہجے میں بولے۔ ''لیکن میرا خیال نہیں ہے کہ نگینہ اس کی بات مانے۔''
ان کی بات پر میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اعظم انکل میری پریشانی بھانپ کر بولے۔
''تم بے فکر رہو ..... نگینہ کی پہلی گواہی کافی ہے۔ چند دنوں بعد کیس کی پیشی ہے۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا ہو گا؟''
اچانک مجھے غفورے کا خیال آیا۔
''انکل!..... غفورے کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا؟''
''ہاں ..... میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اسے پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ اپنی آواز بند رکھے جو اس کے لئے بہتر ہو گا۔ بعد میں اسے چھڑانے کی میں نے اسے تسلی بھی دے دی۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ لیکن میری اُلجھن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔
مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ اعظم انکل کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شاید نظر حیات اور شاہ میر جیسے شاطر اور عیار شیطانوں کی سفاکانہ اور مکارانہ چالوں سے واقف نہ تھے۔
شاہ میر اور نظر حیات اب میری ماں اور ماموں حیدر گل سے اتنے خوف زدہ نہ تھے جتنا کہ انہیں میری طرف سے خوف تھا۔ حالاتِ گزشتہ کی رستا خیزی سے انہیں بہ خوبی اس حقیقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میں نے اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی مظلوم ماں کو بے گناہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں عمر قید کی سزا بھگتنے والے سازشیوں کی سرکوبی کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی اور کفن سر پر باندھ رکھا تھا۔
میری اب تک کی کارکردگی دونوں خبیثوں کے سامنے تھی۔ یہی بہت تھا کہ اس نے اپنے اسی خوف سے اپنی نیندیں حرام کرنے کے متوقع ڈر کی بناء پر انہوں نے میرے خلاف بھی یہ سازش کی تھی کہ مجھے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ایک حد تک ورغلانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میرے سینے کی آگ اور ارادوں کی مضبوطی کا انہیں بہ خوبی اندازہ تھا اور انہوں نے یہ بھانپتے ہوئے بڑی چالاکی کے ساتھ میرے عزائم اور ارادوں کے بادبانوں کا رخ میری اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی۔
اچانک میں خیالات سے چونکا۔ کار اعظم انکل کی رہائش گاہ کے سامنے رک گئی تھی۔

❋ ❋ ❋

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعظم انکل کی رہائش گاہ میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد میں نے واپس ''گرین لاج'' کا قصد کیا۔ اس دوران اعظم خان نے حالات سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔

سب ٹھیک ہونے کا اطمینان کر لینے کے بعد ہی انہوں نے مجھے اپنے مکان سے رخصت کرنے کی اجازت دی تھی۔

میں اپنی جیپ میں ''گرین لاج'' کی طرف گامزن تھا۔ میرے دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہونے لگی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

گرین لاج پہنچا تو چاچا فضل اور سکینہ نے مجھے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ میرا ارادہ تھوڑی دیر وہاں قیام کرنے کے بعد مردان شاہ کے باپ کی طرف نکلنے کا تھا۔ اسے مطلع کرنا ضروری تھا ورنہ بے چارہ بیٹے کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں گھل گھل کر مر جاتا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے کس طریقے سے یہ جانکاہ خبر سنانی تھی۔

وہ ایک غریب شخص تھا۔ اپنے بیٹے کے قاتلوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنا اس کے بس میں نہ تھا اور نہ میں اسے پوری بات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مردان شاہ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا میں خود عزم صمم کر چکا تھا۔

چنانچہ ذرا دیر بعد میں پھر روانہ ہو گیا۔

مردان شاہ کے گھر پہنچا تو اس غریب کو بیٹے کے انتظار میں ہی پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی بوڑھی آنکھوں میں امید کے چراغ جل اُٹھے۔

''مم.....میرا پتر مردان کہاں ہے صیب!.....کک.....کہیں پھر.....اسے پولیس نے تو گرفتار نہیں کر لیا؟''

میں چند ثانئے خاموش کھڑا اس کا چہرہ تکتا رہا۔ بوڑھے کے عقب میں ایک لڑکی کی بھی جھلک نظر آئی۔ وہ دوپٹے کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھائی کا انتظار کر رہی تھیں اور نم ناک سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔

''صیب!.....آ.....آپ چپ کیوں ہو؟ ..... بتاتے کیوں نہیں؟ .....میرا پتر مردان کہاں ہے؟''

مجھے خاموش پا کر معاً ہی بوڑھے نے دوبارہ تفکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔

مجھ میں بالکل ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ابھی میں انہیں یہ اندوہناک اطلاع دوں۔ میری آواز جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ بالآخر میں نے سوچا کہ کیا ضروری تھا انہیں ابھی یہ غم ناک خبر سناؤں کہ وہ جس کے منتظر تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی کے غم کا مداوا میں کر سکتا تھا۔ بعد میں مناسب وقت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں حقیقت بتانے میں کوئی عار نہ تھی۔

میں نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور راستہ دینے پر میں اندر صحن میں آ گیا۔ پھر اس سے بولا۔

''بابا! مردان کو اچانک ایک ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا ہے اور بہت جلد لوٹ آئے گا۔''

یہ بات کہہ کر اس سے نظریں چرانے لگا۔

''صیب!.....مردان پتر نے ہمیں نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔'' بوڑھے نے پریشان ہو کر پوچھا۔

تو میں نے اسے خط کا حوالہ دیتے ہوئے یاد دلایا کہ مردان نے اس خط میں اس کا ذکر کیا تھا کہ اسے اچانک نکلنا پڑ گیا تھا اور اب میں یہ اطلاع اس کے بوڑھے باپ کو دے آؤں۔

مگر بوڑھے کی پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

''بابا! میں بھی تمہارے بیٹے کی طرح ہوں۔'' پھر میں نے قریب کھڑی بدنصیب مردان شاہ کی بہن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

''بہن! اپنے بابا کو تسلی دو۔ میرے ہوتے ہوئے تم دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میرے لہجے کی اپنائیت پر وہ بولی۔ ''بھائی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا بھائی کہاں ہے؟ آ.....آپ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ آپ کا احسان ہو گا ہم پر۔''

میں نے دوبارہ محبت آمیز لہجے میں اس سے کہا۔ ''میری بہن! میں نے تجھے صرف منہ سے بہن نہیں کہا ہے بلکہ سمجھا بھی ہے۔ آپ بے فکر رہو ..... میں بہت جلد اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔ بس حوصلہ رکھو۔'' کہنے کے بعد اب مجھ سے مزید جھوٹ نہیں بولا گیا۔ تاہم میری باتوں سے دونوں باپ بیٹی کو کسی قدر تسلی ہو گئی۔ پھر میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

چند دن بعد ماموں حیدر گل کے مقدمے کی تاریخ تھی۔ مجھے بھی کورٹ میں حاضری کا سمن مل چکا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ وکیلوں کی دھواں دھار جرح کا آغاز ہوا۔ غفورے کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اعظم انکل کے کہنے کے عین مطابق غفورے نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

پھر جب نگینہ کو پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت بے ترتیب ہونے لگیں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حالت غیر ہونے لگی تھی کہ اس نے نگاہ بھر کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر جب اس سے اس کے باپ شاہ میر کے خلاف پہلے والی گواہی دہرانے کا کہا گیا تو نگینہ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی اسے اس بات کا علم تھا کہ اس نے اپنے باپ کے خلاف بھری عدالت میں کوئی گواہی دی تھی۔

میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ نگینہ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میرے اندر بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ مگر وکیل صفائی ایڈووکیٹ صمدانی نے عدالت کے ریکارڈ میں موجود نگینہ کی پہلے والی گواہی پر زور دیتے ہوئے دلیل دی کہ نگینہ اب اپنے باپ کے ورغلائے میں آئی ہے اور اس لئے وہ پہلے والی گواہی واپس لینے پر مجبور ہوئی ہے۔

اس کے جواب میں مخالف پارٹی کے وکیل استغاثہ نے نگینہ کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا تو وہیں صفائی نے اس کے جواب میں ڈاکٹر منصور سے حاصل کیا ہوا میڈیکل سرٹیفکیٹ جج کے سامنے پیش کر دیا۔

یوں عدالت نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کو باعزت بری کر دیا۔

مجھے جہاں ماں اور ماموں حیدر گل کے رہا ہونے کی خوشی تھی، وہاں نگینہ کی اچانک ذہنی کایا کلپ پر دکھ بھی تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ کے ساتھ ضرور کوئی پراسرار واقعہ پیش آیا تھا۔ اور اس میں کالا باغ اور کبیر کی برف پوش وادیوں میں اس پراسرار مہم کا دخل تھا جب وہ نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے گھر سے اٹھا کے ''مکش پور'' کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر کچھ باتیں حذف کر لی تھیں جن کا میں ان سے ذکر کر چکا تھا۔ البتہ نظر حیات اور شاہ میر کی نظر بندی کے احکامات پھر سے عدالت نے واپس لے لئے تھے۔ یوں تفتیشی آفیسر انسپکٹر اعجاز شمسی کے گلے میں ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش کرنے کا طوق ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔

قرائن سے یہی نظر آتا تھا کہ کیس کو اب داخل دفتر ہی کیا جانے والا تھا۔
اور میں بھی خود یہی چاہتا تھا کہ میں نے اب اپنی عدالت میں ان دونوں خبیثوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزمِ صمیم کرلیا تھا۔

❋❋❋

''گرین لاج'' میں اس وقت جشن کا سماں تھا۔ اعظم خان بھی موجود تھے۔
''گرین لاج'' کی عرصے سے روٹھی ہوئی رونقیں بحال ہوگئی تھیں۔ مگر میرا دل اُداس تھا۔ ماں بارمتا بھرے انداز میں پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ماموں حیدر گل بھی خوش تھے میں ماں کی آنکھوں سے آتش انتقام کی وہ چنگاریاں بھانپ لی تھیں جو میرے سینے میں بھی بھڑک رہی تھیں غالباً وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ سارے معاملات بظاہر درست ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے دشمنوں کے خلاف نئے سرے سے کمربستہ ہوں۔ لیکن میری ماں کو شاید اپنے دشمنوں کی ''خطرناکی'' کا پورا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دشمنوں کی خطرناک چال بازیوں اور سازشوں کا جال ہمارے گرد کس قدر مضبوط اور گنجلک ہو چکا ہے۔ اور جب تک میں ان کی سازشوں کو سمجھتا اور اس کا سراغ لگاتا، ہو سکتا تھا تب تک دشمنوں کا خونی شکنجہ ہمارے گرد تنگ ہو جاتا۔

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ ماموں حیدر گل ٹال کے معاملات اور اس کی تعمیر کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی حکمت عملی سے منیجر مشتاق گوندل کو آگاہ کرنے میں مصروف تھے جب کہ ماں، اعظم خان اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف ایک مربوط حکمت عملی جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں اُبھریں۔ ہم سب چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔

سامنے کالا ناگ اپنے آٹھ دس مسلح ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میرے سارے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

''خبردار!..... کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔'' کالا ناگ نے وحشت انگیز لہجے میں دہاڑ کر کہا۔ اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ سفاکی اور چہرے پر غیظ و غضب الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔

ہم سب سناٹے کی حالت میں کھڑے رہ گئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کالا ناگ سمیت وہ نو افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک ہتھیار اور آنکھوں میں ہمارے لیے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کالا ناگ کے پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ مجھ سمیت سب ل اس دیدہ دلیری پر حیران تھے۔ مجھے اپنے اطراف کچھ عجیب سا سناٹا محسوس ہو رہا تھا جس میں کالا ل اور اس کے ساتھیوں کی پھنکار سے مشابہہ سانس کی آوازیں بری طرح گونجتی سنائی دے رہی تھیں ب دم بخود تھے۔ اس بھیانک سناٹے کو کالا ناگ نے اپنی سرد اور سفاک بلند آواز سے توڑا۔

''خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی بھی غلط حرکت اس کی آخری رکت ثابت ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پستول کو خطرناک انداز میں اوپر سے نیچے کی طرف جنبش بھی ی تھی۔

میری نظریں کالا ناگ کے وحشت ناک چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سفاکانہ چمک ے عیاں تھا کہ وہ کسی کو بھی ہلاک کرنے سے دریغ نہیں کرنے والا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ ایسے ں اس کے ساتھ ذرا سی بھی جوشیلی گفتگو اسے مزید مشتعل کر سکتی تھی۔ ماں اور ماموں حیدر گل سمیت ظم خان اسے نہیں جانتے تھے۔ تاہم سب سے پہلے ماموں حیدر گل کو ہی اپنا سکتہ توڑنا پڑا۔ انہوں نے کالا ناگ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو؟..... اور تمہاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''دشمنی!.....'' کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پھنکار کر ماموں حیدر گل سے کہا۔ دشمنی تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ یہ معاملہ تو بہت آگے کا ہے۔ اور یہ سوال کہ میں کون ہوں، یہ تو تمہیں تمہارے اس چہیتے بھانجے نے بتا ہی دیا ہوگا۔ نہیں بتایا تو اب سن لو..... کیونکہ تم لوگوں کا اتنا حق تو ہے کہ مرنے سے پہلے میرے بارے میں جان لو..... میرا نام بلال عرف کالا ناگ ہے۔''

کالا ناگ کا نام سن کر ماں اور ماموں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ کیونکہ میں انہیں اس خبیث کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔

''میرے نام کے علاوہ یقیناً تمہارے بھانجے نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ.....'' اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی بک بک جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے وفادار، نمک خوار ملک سردار خان کا بھائی ہوں، جسے اس کی وفاداریوں کا صلہ موت کی صورت میں دیا گیا تھا۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میری ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور متانت سے پُر دھیمے لہجے میں بولی۔

''بے شک وہ سب ہماری غلط فہمی کے سبب ہوا..... لیکن اس میں تمہارے بھائی ملک سردار خان کی غلط بازی کا بھی دخل تھا۔''

''غلط فہمی..... ہونہہ!'' کالا ناگ نے غیظ برساتی نظروں سے ماں کو گھورتے ہوئے خونخوار

غراہٹ سے کہا۔ "یہ غلط فہمی نہیں تھی۔ بلکہ میرے پیارے بھائی کے ساتھ تم لوگوں کی کھلی غداری
دغاباز عورت!"

اپنی ماں کے بارے میں کالا ناگ کے یہ الفاظ میرے لئے ناقابل برداشت تھے۔ میں غیظ
لہجے میں کالا ناگ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کالا ناگ! میری ماں کے بارے میں یہ الفاظ تمہیں
پڑ سکتے ہیں۔"

میری اس مداخلت پر کالا ناگ نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا مگر دوسرے ہی لمحے اس
بیت ہونٹوں پر بڑی زہریلی اور کینہ پرور مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

"میں اسی موقع کا تو منتظر تھا نادر علی خان! جس کے لئے میں نے تمہاری زندگی کی چند گھڑیاں
دی تھیں۔ مگر آج یہ مہلت سمجھو پوری ہونے والی ہے۔ آج تم اپنی دغاباز ماں اور ماموں کی بر
موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں طرف کھڑے ایک پستہ قد مگر
جیسے طاقت ور جسم کے مالک ساتھی سے کہا۔ "بشیر چیرا! ....اس عورت کی پیشانی پر میرے انتقام کا
سرخ نشان بنا ڈالو۔"

یہ حکم سنتے ہی بشیر چیرا کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک اُبھری اور اس نے اپنے پستول کی نال
ماں کی جانب کیا۔ میں نے ماں کو بچانے کے لئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی مگر چونکہ
حیدر گل ماں کے زیادہ قریب تھے۔ وہ آگے آ گئے۔ گولی چلنے کا دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا اور گولی
کی بجائے ماموں حیدر گل کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ماں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں ماموں کو سنبھالنے کے لئے لپکا۔ اس وقت کالا ناگ نے مجھ
پر گولی چلا دی۔ ماں کے حلق سے اُبھرنے والی کرب انگیز چیخ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میری آنکھوں
سامنے لاوا ابلنے لگا۔ میں نے زخمی ماموں حیدر گل کے بے سدھ پڑتے وجود کو چھوڑا اور لپک کر
تھام لیا۔ کالا ناگ وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔

"نادر! ....میرے بھائی کے قاتل! ....دیکھو یہ منظر ....سنبھالو اپنے پیاروں کی لاشیں
تاکہ میرے سینے کی آگ ٹھنڈی ہو۔ ہا......... ہا......... ہا........."

"کالا ناگ ....!" میں حلق کے بل اتنی زور سے دہاڑا کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔ "میں
زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کراہتی ہوئی ماں کو فرش پر ڈالا اور کھڑے ہو کر
غضب بھری نظروں سے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو گھورنے لگا۔ ان کے باقی مسلح ساتھی گنیں تانے
کھڑے تھے۔

"ہٹ جاؤ آگے سے نادر علی!" کالا ناگ دھاڑ کر بولا۔ "میں تمہاری ماں اور ماموں کی خون
لاشوں کو تڑپتے اور پھڑکتے دیکھنا چاہتا ہوں ....ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔ ہٹ جاؤ
لہو رنگ منظر سے انتقام کی آگ بجھانے دو۔" وہ وحشیانہ لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ مگر میرا دل
آندھیوں کا مسکن بن چکا تھا۔ جہاں سوائے غضب ناکیوں اور وحشتوں کے کچھ اور نہ تھا۔

"بشیر چیرا! اسے ہٹاؤ آگے سے۔" کالا ناگ نے گرج دار آواز کے ساتھ اپنے ساتھی سے کہا
چیرا اپنے پستول کے زعم میں دانت کچکچاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی دائیں
کی ضرب سے مجھے پرے دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ پکڑ
دی۔ اس نے جھلا کر غیر ارادی طور پر گولی چلا دی۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور گولی میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالکل قریب سے گزر گئی۔ اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گھبرا کر اس کی ٹانگ چھوڑ دیتا۔ مگر مجھ پر تو کوئی اور کیفیت طاری تھی۔
ت یا تختہ ...." انسان جب یہ سوچ لے تو پھر اس کے لئے کچھ بھی عجب اور حیرت ناک نہیں رہتا۔
زر، خوف اور سراسیمگی اس سے دور ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی بے خوفی سے بشیر چیرا کی ٹانگ پوری قوت
سے مروڑی اور پھر اپنی تمام تر توانائیوں سے اسے کالا ناگ کی طرف دھکیل دیا۔ اس کش مکش نے کالا
ناگ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اس لئے وہ اچھل کر ایک
طرف ہٹ گیا اور بلند آواز میں دھاڑا۔

"ان سب کو خون میں نہلا دو۔"

ٹھیک اسی وقت چھرے دار کارتوس چلنے کے دو اوپر تلے گونج دار دھماکے ہوئے اور اس کے باقی مسلح
ساتھیوں میں جیسے کھلبلی مچ گئی۔ ان میں سے کئی گولی چلانے کی حسرت دل میں لئے کریہہ چیخوں کے
ساتھ زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ ان کے گرتے ہی عقب میں مجھے چاچا فضل بندوق تھامے کھڑا نظر
آیا۔ وہ بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق میں بڑی پھرتی کے ساتھ کارتوس لوڈ کر رہا تھا۔ جنگلی اور خونخوار
درندوں کو پھاڑ دینے والے "ڈم ڈم" کارتوسوں کے چھروں کے بھیانک اور ہلاکت خیز "پھیلاؤ" نے
گویا کلاشنکوف کے برسٹ کا کام کر دکھایا تھا۔ باقی دو تین ہرکارے جو قریب ہونے کی وجہ سے چھروں
کی زد میں نہیں آ سکے تھے، وہ سنبھلے اور پلٹ کر فضل چاچا پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ گولیوں کی
بھیانک تڑتڑاہٹ میں فضل چاچا کی دلخراش چیخیں گونجیں اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑاتا ہوا زمین پر ڈھے
گیا۔ ادھر کالا ناگ نے سنبھل کر مجھ پر گولی چلا دی۔ میں پہلے ہی اس کی خوفناک جنبش کو بھانپ چکا تھا
لہٰذا تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً پستول اس
کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔

ادھر بشیر چیرا نے میرے دیئے ہوئے دھکے سے فوراً سنبھلنے کی کوشش کی تھی اور وحشیانہ غراہٹ کے
ساتھ میری طرف گھوما۔ ٹھیک اسی وقت فضا میں اوپر تلے تین دھماکے ہوئے۔ فضل چاچا پر گولیاں
برسانے والے وہ تینوں خونی ہرارے مجھ پر بھی فائرنگ کرنے کے لئے پَر تول رہے تھے۔ لیکن انکل اعظم
خان نے اس ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر بڑی پھرتی سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع افتاد
نے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو بوکھلا سا دیا تھا۔ تاہم بشیر چیرا نے مجھے اچانک اپنے پستول کے ذریعے گن
پوائنٹ پر لے لیا اور چلا کر اعظم انکل کی طرف دیکھ کر بولا۔

"خبردار! ....گولی مت چلانا۔ ورنہ میں اسے بھون ڈالوں گا۔"

میں اپنی جگہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ میرا رواں رواں جوشِ غیظ کے باعث کپکپا رہا تھا۔ میرا بس نہیں
چل رہا تھا کہ میں ان دونوں خونی قاتلوں کی بوٹیاں نوچ لوں۔

بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ اعظم خان اور بشیر چیرا دونوں ہی ایک دوسرے پر پستولیں تانے
کھڑے تھے جبکہ میں ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی نہتے کالا ناگ
نے اپنے اکلوتے مسلح ساتھی بشیر چیرا کے قریب سرکنے کی کوشش کی تو اعظم خان نے چلا کر اس سے کہا۔

"خبردار کالا ناگ! ....اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا۔ تم اس وقت میرے نشانے پر ہو۔"

اعظم خان کی تنبیہہ پر کالا ناگ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

"جب تک نادر تمہارے ساتھی کے نشانے پر ہے، تم اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی بے وقوفی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرو گے۔"

اب میں بشیر چیرا کے رحم و کرم پر تھا جبکہ کالا ناگ اعظم خان کے پستول کی زد پر تھا۔

"نادر! ..... تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔" معاً بشیر چیرا کی عقابی آنکھوں نے میرے چہرے کے جارحانہ تاثرات سے کسی "متوقع" حرکت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اب وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف سرکنے لگے تھے۔ وہ شاید اب راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس اعصاب شکن ماحول میں ماں کی تکلیف دہ کراہوں کی گونج خاصی بلند تھی۔ وہ دونوں فرار کے لئے پر تول رہے تھے مگر میں انہیں اس کی اجازت دینے والا نہیں تھا۔ اس طرح گویا اعظم خان کی برادری و برمحل کارگزاری ضائع ہو جاتی۔ ان کی نظریں کالا ناگ پر ٹکی ہوئی تھیں جبکہ بشیر چیرا مجھ پر پستول تانے میری طرف قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے دھیرے دھیرے اُلٹے قدموں سرک رہا تھا۔ ان دونوں کو کھسکتا دیکھ کر مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ مگر شاید اعظم خان کی سوچ مجھ سے مختلف تھی۔ وہ موت خون خرابے سے بچنے کے لئے ان کے نکل جانے سے متفق نظر آ رہے تھے۔ انہیں زیادہ فکر و پریشانی زخمیوں کی حالت زار پر ہو رہی تھی۔ میں بے بسی سے کھڑا کالا ناگ اور اس کے سفاک ساتھی بشیر چیرا کو دروازے تک پہنچتے دیکھتا رہا۔ پھر جونہی وہ دروازے سے باہر نکلے، میں ماں کی طرف لپکا۔ اعظم خان دروازے کی طرف بڑھے اور پھر ان دونوں کے غائب ہو جانے کا اطمینان کرنے کے بعد زمین پر آڑے ترچھے پڑے کالا ناگ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں بھی ابھی چند زخمی تھے۔ اعظم خان نے سب سے پہلے ان کی گنوں کو پیر سے ٹھوکر مار کر پرے کیا۔

میں نے ماں کے قریب فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کالا ناگ کی چلائی ہوئی گولی ان کے دائیں شانے پر لگی تھی جہاں سے بھل بھل خون جاری تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر میرے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ماں کے ہونٹ کپکپائے۔

"نن ..... نادر بیٹا! گل کی خبر لو۔"

میں تڑپ کر قریب بے سدھ پڑے ماموں حیدر گل کی طرف بڑھا۔ وہ آخری سانسوں پر تھے۔

"مم ..... ماموں! ..... ماموں! ..... مم ..... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" مجھے احساس نہیں تھا کہ قلمی انداز کا یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر ان کے لبوں پر ارتعاش پیدا ہوا۔

"نن ..... نادر بیٹا! مم ..... میں تمہیں اس خونی جنگ سے بچانا چاہتا تھا۔ مم ..... مگر آہ..... سب کچھ ختم ہو گیا۔" انہوں نے بہ مشکل یہ آخری جملے ادا کئے تھے اور پھر ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ میری سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئیں۔ دکھ اور کرب کی لہر کسی گولے کی طرح میرے سینے سے حلق میں آ کر ایک لمحے کو اٹک گئی۔ ایک لمحے بعد میرا سارا غم ایک چیخ کی صورت میں میرے لبوں سے برآمد ہوا۔

"ماموں .....!"

میری بلند آواز سن کر ماں اپنی جگہ لرزی اور پھر اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ میں ماں کی طرف لپکا اور اسے بے سدھ دیکھ کر میرا سینہ جلنے لگا۔ میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور مجنونانہ انداز میں دروازے کی طرف لپکا۔ اعظم خان میری اچانک اور مجنونانہ پیش قدمی کا مفہوم سمجھتے ہی پکارے۔

"نادر! ..... رک جاؤ۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دونوں خونی دور جا چکے ہوں گے۔ ہمیں

ماں) کو فوراً ہسپتال پہنچانا ہوگا۔"

میں رک گیا۔ اعظم خان اپنے سیل پر پولیس سے رابطہ کرنے لگے۔

❋ ❋ ❋

ماں کی جان بچ گئی تھی۔ انہیں پنڈی کے ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ ماموں حیدر گل اور فضل چاچا کو سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی تھی۔ زندہ بچ جانے والے بدمعاشوں کو تحویل میں لے کر ان سے پوچھ گچھ اور ساتھ ہی کالا ناگ اور اس کے قریبی ساتھی بشیر چیرا کی تلاش بھی جاری تھی۔ میں غم سے بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کی موت کا یہ اندوہناک سانحہ معمولی نہ تھا۔ انہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی۔ ان کی اگر اپنی اولاد ہوتی تو وہ یقیناً اسے بھی اتنا ہی چاہتے۔ انہوں نے حقیقی معنوں میں مجھے اولاد کی طرح پالا تھا۔ جس کا ایک واضح ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے شروع ہی سے مجھے ان خونی اور دیرینہ معاملات سے دور رکھنا چاہا تھا اور خود ہی خاموشی سے میرے باپ کے دشمنوں اور قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے کوششیں کرتے رہے تھے۔ البتہ میری ماں کا معاملہ مختلف تھا۔ چونکہ وہ بذاتِ خود ماضی کی اس خوں ناک اور کرب انگیز داستان کا ایک اہم کردار تھیں اس لئے ان کے وجود میں بھڑکتی ہوئی آتشِ انتقام کا اندازہ ہی لگا سکتی تھیں۔ یا پھر میں ..... لیکن ماموں حیدر گل کے برعکس، ماں مجھے ایک ایسے جی دار بیٹے کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں جو ان کے ممتا بھرے دودھ کا حق ادا کرتے ہوئے ان پر ڈھائے گئے ستم کا ظالموں سے حساب لے۔ یہی سبب تھا کہ میری وجہ سے ماموں اور ماں کے درمیان کبھی کبھی تلخی بھی ہو جایا کرتی تھی۔

کیونکہ ماموں حیدر گل نے اپنی مظلوم بہن کا یہ قرض ایک غیرت مند بھائی کی صورت میں اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا اور بالخصوص مجھے اس خونیں معاملے سے کوسوں دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ماں کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا کہ اس طرح مجھے لاعلم رکھنے سے میں اپنی ماں اور ماموں سے بد دل ہو سکتا ہوں۔ اور واقعی، یہی ہوا تھا۔ میں نادانستگی میں اپنے ہی ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کے ہاتھوں کھلونا بن کر اپنی ہی ماں اور ماموں کا دشمن بن بیٹھا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ پہلے تو میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں کھلونا بنا اور پھر حالات اتنے بگڑ گئے کہ میرے ماموں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور ماں شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئی تھی۔

کالا ناگ اپنی جگہ کچھ بھی سمجھتا رہے تاہم یہ حقیقت تھی کہ اس کے بھائی ملک سردار خان کا قتل ہماری کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ مجھے اسے قتل کرنا پڑا۔ وہ صدف کا قاتل تھا ..... کبیر کی بہن صدف ..... اور میں نے یہ سمجھ کر کہ اس نے نگینہ کو مار ڈالا ہے، اسے بھی موقع پر ہی اس کے جرم کی سزا دے دی تھی۔ گویا صدف اور ملک سردار خان کی ہلاکتیں محض غلط فہمی کے ساتھ گھن کے پسنے والا معاملہ تھا۔

صحیح اور غلط کی بحث سے قطع نظر بہرحال ماموں حیدر گل کی دشمنوں کے خلاف غلط پالیسیوں کا نتیجہ آج ماموں کے بے دردی سے قتل ہونے کی صورت میں نکل چکا تھا اور ماں مرتے مرتے بچی تھی۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمارے چاروں دشمنوں کا ٹولا یکجا ہو چکا تھا۔ شاہ میر، نظر حیات، کبیر اور کالا ناگ۔

کالا ناگ نے اب تک مجھے بہت زک پہنچائی تھی۔ وہ میرا مقروض بن چکا تھا۔ اس خبیث اور بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک سالخوردہ سی میز پر جا بیٹھا تھا۔ اوپری منزل تک جانے کے لئے ایک گوشے میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں بھی میں نے کچھ اوباش اور عیاش فطرت افراد کو کچھ عورتوں کے ساتھ اوپر نیچے آتے جاتے دیکھا۔ یہ ''عورتیں'' گھریلو نہیں تھیں، کسی پرائیویٹ اڈے یا محلے سے ''ہائر'' کردہ تھیں۔

''کیا پیش کروں جناب؟'' معاً ایک ویٹر نما شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں، میری میز کے قریب آ کر بولا۔

''چائے لے آؤ۔'' میں نے کہا۔ وہ الٹے پاؤں پلٹا اور ذرا ہی دیر بعد سیدھے پیروں چائے کا کپ لئے دوبارہ نازل ہو گیا۔ اس برق رفتار سروس پر مجھے مطلق حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ صرف چائے ملتی تھی اور اس لئے بروقت ملتی تھی۔

''اور کچھ.....؟'' وہ چائے کی پیالی میرے سامنے میز پر دھرتے ہوئے بولا۔ میں نے چائے لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''مثلاً.....؟'' میں نے بھی معنی خیز مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اپنی ناک پر دستک دینے لگا۔ عورت کی عیاشی فراہم کرنے کا یہ ایک عام مروجہ اشارہ تھا جو اکثر راہ چلتے عورتوں کے دلال، کسی نئے آنے والے گاہک یا مسافر کو کرتے تھے۔

''اچھا.....'' میں نے ہولے سے کہا۔ پھر بولا۔ ''لیکن مجھے کچھ اور چاہئے۔''

''وہ بھی مل جائے گا.....آپ حکم تو کریں۔'' وہ فدویانہ مستعدی سے بولا۔

''کچھ پینا پلانا تھا.....اور خریدنا بھی۔'' میں نے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔

''سب کچھ ملے گا۔ آپ چائے ختم کریں، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے راستہ بتانا تھا اور یہ اوباش ویٹر خود ہی میرا راستہ بنا رہا تھا۔ میں نے چائے کے چند گھونٹ بھرے۔ چائے اچھی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دوبارہ لوٹا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا چاہئے؟''

''وزنی پانی۔''

''کیسا وزنی پانی؟''

''چرس، افیم.....اگر ہیروئن بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔''

''سب کچھ ملے گا.....ویسے آئے کہاں سے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اندرون سندھ سے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.....مال کیسے لے جاؤ گے؟ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک مال لے جانا مشکل ہے۔''

''یہ میرا دردِ سر ہے.....میں تو نتھیں (عورتیں) بھی لے جاتا ہوں۔''

''ان کی اور بات ہے.....وہ تو چلتا پھرتا مال ہے۔ خیر، اگر استاد سے یہ معاہدہ بھی کر لو تو تمہارے دونوں کام آسان ہو جائیں گے۔'' اس نے مشورہ دیا اور ''استاد'' کے ذکر پر فوراً میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں اسے مزید ''ٹرانس'' میں لینے کی غرض سے خوش ہو کر بولا۔

''اچھا.....اگر یہ کام ہو جائے تو سمجھو، تمہارا کمیشن بھی ختم۔ مگر استاد سے کیسے ملا جائے؟'' میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے آخر میں مطلب کی بات کی۔

وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ ''ابھی چلو.....مگر میرا کمیشن.....؟''

رحم انسان نے پہلے میرے جاں نثار دوست مردان شاہ کو مکش پور کے ایک ویران کاٹیج میں بے دردی سے قتل کیا۔ میری جانِ جاناں نگینہ کو وہ درندہ صفت میرے کینہ پرور رقیب کی ملی بھگت سے جانے کس گھناؤنے اور پراسرار مقصد کے لئے لے کر روانہ ہوا تھا۔ پھر جب ایک سنسنی خیز مار ما بعد ان کی مکش پور سے واپسی ہوئی تو نگینہ کی ذہنی رو بڑے ہی عجیب اور پراسرار طور پر پلٹ چکی میرے علاوہ سب کو پہچان رہی تھی۔ میں تو اس کے لئے جیسے سراسر اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیا راز اور مجھے اس راز سے پردہ اٹھانا تھا۔ جبکہ اس راز سے کبیر اور کالا ناگ ضرور واقف تھے۔ چنانچہ میں نے کبیر کے منہ سے اگلوانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

دوسری بڑی زک مجھے کالا ناگ نے ماموں حیدر گل کا قتل کر کے پہنچائی تھی۔ چنانچہ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ دشمن ایک منظم ٹولے کی صورت میدان میں اتر آئے تھے اور اب بھی ان کا فوری طور پر منہ توڑ جواب دینے کے لئے میدانِ کارزار میں خم ٹھونک کر بے خطر کود بصورت دیگر دشمنوں کے حوصلے بلند ہو سکتے تھے۔ جبکہ میری ماں کی جان کو بھی بدستور خطرہ لاحق تھا وقت کا تقاضا تھا۔ اس کے لئے مجھے سب سے پہلے کالا ناگ اور اس کے دست راست بشیر چیرا ضروری تھا۔

ماں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اعظم خان نے پولیس گارڈز کی خدمات حاصل کر لی ماں کی حفاظت کے پیش نظر اپنے ہی چند مسلح آدمیوں کو ہسپتال کے اردگرد تعینات کر دیا تھا۔

یہاں سے بے فکر ہونے کے بعد میں نے فوراً لاہور کا رخ کیا۔ مگر اس سے پہلے میں متعلقہ کے ریکارڈ کیپر کی مٹھی گرم کر کے اس سے کالا ناگ کے گجر چوک والے اڈے اور ٹھکانے کی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ ہسٹری شیٹر تھا اور کئی مقدمات میں ملوث ہونے کے باوجود ضمانت پر گھوم رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے جب میں ایک تیز رفتار اور نان اسٹاپ فلائنگ کوچ کے ذریعے پہنچا.....میرے پاس اپنا قابل اعتماد ہیگارد موجود تھا۔ میں نے گرم شال اس طرح اوڑھ رکھی اس نے میرا سر اور چہرہ خاصی حد تک ڈھانپ لیا تھا۔ میری حالت کسی فلو کے مریض کی سی تھی وقت میرے اندر لاوا سا پھوٹ رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتے کرتے دل و دماغ میں زبردست ہلچل ہوئی تھی۔ میں کالا ناگ اور بشیر چیرا سے ماموں حیدر گل کی موت کا بدلہ لینے کے لئے بری طرح رہا تھا اور اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ ہوش میرے عنقا تھے اور جوشِ جنوں فزوں تر۔

ایک رکشے کے ذریعے میں سیدھا ''گجر چوک'' پہنچا۔ میری معلومات کے مطابق ''زمیندارہ'' کالا ناگ کی مستقل کمین گاہ تھی۔

میں مذکورہ ہوٹل کے قریب پہنچا تو مجھے بادی النظر میں یہ ہوٹل عام سا کوئی چائے خانہ معلوم عمارت بھی خاصی پرانی ہی نظر آ رہی تھی۔ البتہ اس کا رقبہ وسیع تھا۔ یہ دو منزلہ ہوٹل تھا۔ اوپری شاید اقامتی کمرے بنے ہوئے تھے جن کی اُکھڑے ہوئے پلستر والی دیواروں کی بالکونیوں سے پٹ والے دروازوں کی قطار صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے وہاں گاہکوں کی خاصی تعداد کو دیکھا۔ سب ہی مجھے بے کار، بدمعاش اور بدقماش نظر تھے۔ ہوٹل میں اندر داخل ہو کر میز سنبھالنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں صرف چائے سرو تھی۔ کھانے وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شاید یہ دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا ایک سستا اقامتی اس لئے یہاں صرف چائے چلتی تھی۔ تاہم مجھے اور بھی کچھ ''چلنے'' کے لوازمات بہ کثرت نظر آئے

میں نے سو کے دو نوٹ نکالے۔ اس نے منہ بنا لیا۔ میں نے مزید سو کے دو نوٹ نکالے۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک اُبھری۔ اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈالے، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"اُٹھو!.........آؤ میرے ساتھ۔"

اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لئے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ چکر دار سیڑھیوں سے اوپر پہنچ کر ہم طویل بالکونی میں آ گئے اور کمروں کے دروازوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے سے ذرا پہلے بائیں جانب مڑ گئے۔ یہ ایک مختصر راہداری تھی جس کے دائیں بائیں سیلن زدہ سے بدبودار غسل خانے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اندازاً دس بارہ قدموں کے بعد ایک زینہ نظر آیا۔ میں اس بڑی بڑی مونچھوں والے ویٹر کے عقب میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اب ہم ہوٹل ٹاپ (چھت) پر کھلے آسمان تلے کھڑے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھ فٹ اونچی دیوار بھی تھی۔ یہاں ایک ہال کمرے کا دروازہ نظر آیا۔ کچھ اور لوگ بھی دروازے کے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

یہ "خاص" گاہک تھے۔ اور "خاص" شغل کے لئے انہوں نے ان کے بیٹھنے کا یہاں "ٹاپ" پر بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ان پر ڈالی۔

کل چار پانچ میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر میز کے گرد چار سے پانچ کرسیاں تھیں۔ شراب بھی چل رہی تھی اور سگریٹوں میں بھری ہوئی چرس کے لمبے لمبے کش بھی لگائے جا رہے تھے۔ ان میں دو ایک لڑکے کے ساتھ "اس بازار" کی عورتیں بھی تھیں۔ حالانکہ دیوار پر غالباً کوئلے سے جلی مگر ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں لکھا بھی تھا۔ "عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

یہاں ایک ویٹر بھی ان بدمست گاہکوں کو سرو کرنے میں مصروف تھا۔ وہ مونچھل ویٹر مجھے لئے سیدھا ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے شال کے اندر اپنے رینگتے ہوئے ہاتھ سے میگارڈ کی موجودگی کا اطمینان کیا اور ہال کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے کو "ہال" میں نے اس لئے کہا تھا کہ یہ دوسرے کمروں کی بہ نسبت بڑا تھا۔ ورنہ تو اس میں "ہال" والی کوئی بات نہ تھی۔ اٹھارہ بائی بائیس کا لمبا چوڑا کمرہ تھا۔ یہاں دائیں بائیں دو چار پائیاں اور سالخوردہ سے صوفے بھی دھرے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اس کے پیچھے ایک ریوالونگ چیئر تھی۔ چیئر پر ایک ہٹا کٹا سرخ آنکھوں والا بدمعاش ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب دیوار سے لگے صوفے پر دو افراد بیٹھے تھے۔

"اوئے.........یہ کون ہے؟" سرخ آنکھوں والے نے میرے ساتھ آئے ویٹر کو گھورتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا۔ جبکہ میں اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنے "شکار" کو وہاں موجود نہ پا کر مجھے مایوسی ہوئی۔

"استاد!.........یہ بہت بڑا سیٹھ ہے۔ اندرون سندھ سے آیا ہے۔ اسے مال خریدنا ہے۔"

ویٹر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا تو سرخ آنکھوں والے نے میری طرف بہ غور برماتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

"لعل خان.........!" میں نے غلط نام بتایا۔ سرخ آنکھوں والے نے ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کر کھرکھراتی آواز میں بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا چاہئے؟"

"افیم اور چرس چاہئے۔" میں نے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔ "اگر ہیروئن کی ڈلیوری بہ آسانی ہو سکے تو وہ بھی تھوڑی بہت خرید لوں گا۔"

"تمہیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا تھا؟" وہ شک آمیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"میرا ایک ہندو سیٹھ دوست ہے.........لاہور سے گریزی کا مال سندھ لے جاتا ہے.........اس نے ہی بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

اُس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک طویل کش لیا۔ دھوئیں کے کثیف مرغولوں میں چرس کی ناگوار بو تھی۔ "سندھ سے تو ہمارے بہت سے گاہک آتے ہیں۔" وہ تفاخر آمیز رعونت سے بولا۔ "خیر، ہم تمہیں بھی مایوس نہیں کریں گے۔ چرس اور افیم کی ڈلیوری چاہو تو ہم کروا دیں گے.........لیکن ہیروئن سپلائی کروانا مشکل ہے۔ آج کل ایکسائز پولیس نے بہت سختی کر رکھی ہے۔" اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔

میں نے اپنے مقصد کی خاطر بحث کو طول دینے کی غرض سے اپنی سوئی ہیروئن کی "تسلی بخش" سپلائی پر اٹکا دی۔ لہٰذا مسکرا کر بولا۔ "استاد! اگر آپ چرس اور افیون کی سپلائی کر سکتے ہو تو ہیروئن کیوں نہیں کر سکتے؟"

"کر تو سکتے ہیں.........مگر اس میں خرچہ بہت آتا ہے۔ کرائے سے تین گنا زیادہ بھتا دینا پڑ جائے گا۔ ادا کرو گے تم؟"

"ہاں دو.........ابھی کر دوں گا ادائیگی۔" میں نے فوراً کہا۔ "اور ہاں، میں ذرا جلدی میں ہوں۔ کیش ساتھ لایا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں گرسنہ چمک اُبھری۔ پھر اسی وقت اس نے دراز سے ایک سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر وہ انتہائی مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"استاد! اندرونِ سندھ سے ایک گاہک آیا ہے، مال کے ساتھ۔ تسلی بخش ڈلیوری چاہتا ہے۔ خرچہ بھی زیادہ اٹھائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا۔ پھر بولا۔

"مگر استاد!.........وہ کہہ رہا ہے کہ میں کیش ساتھ لایا ہوں اور اسے لوٹنے کی ذرا جلدی ہے۔" وہ مؤدبانہ بولا۔ "نہیں استاد! بس ایک بار ہی پولیس آئی تھی۔ اسے میں نے ٹھنڈا ٹھار کر کے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ دوبارہ چھاپے کا امکان تو نظر نہیں آتا۔ یوں بھی ہماری نمک حلال بھیڑیں تھانوں میں موجود ہیں۔ جیسے ہی کوئی بات ہوتی ہے، وہ ہمیں خبر کر دیتے ہیں۔"

"یہی بہتر رہے گا استاد!.........اب بے غم ہو کر خود ہی آ جائیں تو اچھا ہے.........ٹھیک ہے۔"

اس نے سیل آف کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "تمہارا کام ہو گیا۔ استاد خود یہاں پہنچ رہا ہے۔"

میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ جی میں تو آئی کہ "آنے والے" استاد کا نام پوچھ لوں۔ لیکن میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم چالاکی سے بولا۔ "کیا یہاں پولیس کے چھاپے بھی پڑتے ہیں؟"

وہ میری بات پر ہنسا۔ "لگتا ہے تم کچے کھلاڑی ہو۔ یہ چھاپے تو روز کا معمول ہیں۔ ہوتا کچھ بھی نہیں۔ ہم بڑی تیاری رکھتے ہیں۔ فکر نہ فاقہ، عیش کر کاکا۔" یہ کہہ کر وہ بھونڈے انداز میں ہنسا اور مجھے ایک بھرا سگریٹ پیش کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اپنی بے چینی کو دباتے ہوئے بولا۔

"کتنی دیر میں پہنچ جائے گا تمہارا استاد؟"

ابھی میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ اچانک اس کا موبائل فون گنگنایا۔ اس نے لپک کر اپنا سیل فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کچھ پوچھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تمہیں مال کتنا چاہئے؟''

میں چونکا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے کچھ سمجھتے ہوئے دانستہ زیادہ مقدار بتائی۔ ''تمیں کلو افیم، پچیس کلو چرس اور تین کلو ہیروئن۔''

سرخ آنکھوں والے گماشتے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سیل فون پر یہ تعداد دوہرا دی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ٹھیک ہے استاد!.......... پھر یہی بہتر رہے گا۔ ہم ابھی پہنچتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون آف کر دیا۔

''آؤ میرے ساتھ .... استاد کے پاس چل کر معاملات طے کر لیتے ہیں'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس نے قریب بیٹھے دو افراد سے کہا۔ ''میں ذرا ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتا ہوں .... ٹھیک ہے؟''

دونوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ چلتا ہوا زینے طے کرتا زمیندارہ ہوٹل سے باہر آ گیا۔

ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم روانہ ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ ''کدھر چلے اب؟''

''زیادہ دور نہیں .... استاد کا بنگلہ قریب ہی ہے۔'' اس نے موٹر سائیکل کو مین شاہراہ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''مگر استاد تو خود آ رہا تھا .... پھر یہ اچانک ....'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

''اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے سائیں لوکو! مال کی بنی بنائی کھیپ تمہیں وہیں مل جائے گی۔ اور اس کی سندھ با آسانی سپلائی سے متعلق معاملات بھی وہیں طے ہو جائیں گے۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہے .... لیکن دیر تو نہیں ہو جائے گی؟'' میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کہا۔

''او نہیں یار! .... بلکہ استاد نے تمہیں وہیں اپنے بنگلے پر بلوا کر وقت کی بچت کر دی ہے۔ ورنہ اسے یہاں آتا اور مال کی جتنی کھیپ تمہیں چاہئے، اتنی اڈے پر بھی نہیں تھی۔ اور ہمیں یوں بھی پھر استاد کے ساتھ بنگلے میں جانا پڑتا۔''

''کیا بنگلے میں زیادہ مال گودام ہے؟''

''ہاں .... زمین دوز مال گودام۔''

''بڑا ٹھیکے والا ہے تمہارا استاد .... کیا نام ہے اس بہادر شخص کا؟'' بالآخر مجھے اپنے شکار کا پوچھنے کا موقع ہاتھ آ ہی گیا۔

''نام نہ ہی سنو تو بہتر ہے .... خواہ مخواہ ڈر جاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں غرور تھا۔

''پھر بھی .... بتاؤ تو .... یہ کہہ کر تو تم نے خواہ مخواہ ہی میرے تجسس کو بڑھا دیا ہے۔'' میں نے پُر اشتیاق انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بلال عرف کالا ناگ۔'' اس نے جیسے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور میری رگوں میں خون کی بجائے مثل لاوا بھڑکنے لگی۔ اور ساتھ ہی مجھے تسلی بھی ہو گئی کہ میں بالکل ٹھیک جا رہا تھا۔

''کیوں، سونگھ گیا نا سانپ ....!'' وہ میری یکلخت خاموشی پر فخریہ انداز میں بولا۔

''واقعی، تمہارے استاد کا بڑا ہی خوف ناک نام ہے۔'' میں نے اسے مزید بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ وہاں تنہا رہتا ہے یا بیوی بچے بھی رہتے ہیں ساتھ؟''

''استاد ابھی ان جھنجٹوں میں نہیں پڑا۔ وہاں وہ اپنے گنتی کے چند دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ میرے سینے میں جوش غیظ کی آگ مزید بھڑکنے لگی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ہماری موٹر سائیکل ایک پوش علاقے میں داخل ہو رہی تھی .... یہاں بہت خوبصورت کوٹھیاں اور بنگلے قطار اندر قطار نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر باہر خوب صورت پھلواریاں لگی ہوئی تھیں۔ صنوبر اور سیلون کے ناریل پیڑ بھی نظر آ رہے تھے۔ بید مشک کی بھی بہتات تھی۔ ایک دو بلاک چھوڑ کر ہم ہلکے آسمانی رنگ کے ایک بنگلے کے قریب پہنچے۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے تھے۔ گرم شال سے میں نے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ غیظ و غضب سے میرے دل کی دھڑکنیں سینے کا پنجر توڑے ڈال رہی تھیں۔ گیٹ پر موجود ایک چوکیدار نے ہمیں دیکھتے ہی آہنی گیٹ کا ایک پٹ ذرا وا کر دیا۔ اسے یا تو ہماری متوقع آمد کے بارے میں بتا دیا گیا تھا یا پھر وہ موٹر سائیکل سوار کو جانتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سیدھا اندر لے جا کر بنگلے کے وسطی محراب دار دروازے کے قریب پختہ روش پر روک دی۔

میں نیچے اتر آیا۔ اس نے موٹر سائیکل سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی کی۔ مجھے پورٹیکو میں گرے کلر کی ایک ...ں (سوزوکی) کار کھڑی دکھائی دی۔

میں نے سرسری نگاہ قرب و جوار میں ڈالی اور اس کے ہمراہ چار پانچ قدمچوں والی ماربل چپس کی ...ں سیڑھی چڑھتا ہوا مرکزی دروازے پر پہنچا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ذرا دھکا دے کر وا کر دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ سامنے نشست گاہ کا سنگل پٹ والا دروازہ نظر آیا جس کے اندر مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مجھے لئے اندر داخل ہوا۔ سامنے صوفوں پر تین افراد اور دو تیکھے نقوش والی ...ں بیٹھی تھیں۔ تین مردوں میں سے ایک میرے لئے اجنبی تھا جبکہ دو افراد پر نظر پڑتے ہی میری ...ں میں دوڑتا ہوا خون مثل آتش فشاں لاوا اُگلنے لگا۔ ان میں سے ایک بشیر چیرا تھا جبکہ دوسرا کالا ناگ!

میں نے اپنی گرم شال کے اندر ہی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا میگارڈ نکال لیا۔ پھر جب تک وہ ...تے، میں نے شال الٹ دی۔ کالا ناگ اور بشیر چیرا کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ یک بیک ساکت ہو ... گئے۔ ان دونوں خبیثوں نے اسی طرح ہی اپنے مسلح خونی ہرکاروں کے ساتھ ہماری رہائش گاہ ...ن لاج پر شب خون مارا تھا اور اب میں بھی انہیں اسی طرح جواب دینا چاہتا تھا۔

''کالا ناگ! اب تم بھی اپنوں کو کھوتا دیکھو گے۔''

میں نے جوشِ انتقام سے لرزتی آواز میں کہا تو اس کے دست راست بشیر چیرا نے حرکت کی۔ وہ اپنی ...سے کوئی ہتھیار نکالنا چاہتا تھا۔ میرے سر پر تو خون سوار تھا۔ میں بھلا اسے اب کب موقع دینے والا تھا۔ میرے میگارڈ نے ایک شعلہ اُگلا اور اڑتالیس بور کی گولی نے بشیر چیرا کی پیشانی اُڑا دی۔ صوفے پر ...دونوں لڑکیاں ہراساں ہو کر چیخنے لگیں۔ میرے ساتھ آنے والے زمیندارہ ہوٹل کے استاد نے مجھ

پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ایک لات رسید کر دی۔ وہ کالا ناگ کے قدموں میں جا گرا۔ صوفے پر بیٹھے اس کے دوسرے ساتھی نے خوف زدہ ہوکر بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی جو اس کی ران پر لگی۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ قالین پر گرا اور زخمی ران پکڑے مارے اذیت کے کراہنے لگا۔ وہ دونوں فیشن ایبل لڑکیاں ہسٹریائی انداز میں چیخے جا رہی تھیں۔

''خاموش ہوجاؤ .... ورنہ تم دونوں کو بھی گولی سے اُڑا دوں گا۔'' میں نے ان دونوں کی طرف گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''میری تم لوگوں سے دشمنی نہیں۔ لیکن اگر کسی نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میرے ساتھ آنے والا کالے ناگ کا ساتھی اٹھنے لگا تو میں نے ایک عدد گولی اس پر بھی چلا دی جو اس کے دائیں بازو پر لگی۔ وہ بری طرح کراہ کر رہ گیا اور پھر اس نے حرکت نہ کی۔ کالا ناگ کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بڑی خوفناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس اچانک صورت حال نے ایک لمحے کو اسے بھی کسی حد تک اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ اسے شاید میری اس اچانک کارروائی نے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ میں اس وقت جوشِ انتقام سے مغلوب ہو رہا تھا۔ مد مقابل کی ذرا سی جنبش میری آتش غیظ کے لئے جلتی پر تیل ثابت ہو سکتی تھی۔ میری اس دہشت نے ''گجر چوک'' کے سفاک، شاطر بدمعاش کالا ناگ کو اپنی جگہ سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کالا ناگ!'' میں اسے لاوا اُگلتی نظروں سے گھورتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں صرف گولی سے بات کروں گا۔ نگینہ کے ساتھ تم نے کیا، کیا تھا؟ .... اسے تم کبیر کمش پور کیوں لے کر گئے تھے؟''

میرے سوال پر کالا ناگ کے تنے ہوئے اعصاب جیسے پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ اسے غالباً یہ خوش فہمی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ابھی ہلاک کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی خباثت سے مسکرایا۔ مجھے اس کا یہ انداز بری طرح کھل گیا تھا۔ میں نے میگارد کا رخ پہلے ہی اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کی خوش فہمی دور کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ میں اس کے دائیں شانے کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا......... میں جیسے ہی پلٹا تو میری نظر ایک لٹھ بردار بدمعاش پر پڑی جو خوفناک ارادوں کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے چونکتے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا وہ ڈنڈا اچھال کر دے مارا۔ میں نے پھرتی سے جھکائی دی اور اس پر گولی چلا دی۔ اس وقت میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ وہی بدمعاش تھا جس نے ہمارے لئے اس بنگلے کا دروازہ کھولا تھا۔

میرے تباہ کن میگارد نے ایک دھماکے سے شعلہ اُگلا۔ مگر اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پہلے ہی خود کو جھکائی دے کر دروازے کی طرف اچھال دیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے اصلی دشمن یعنی کالا ناگ کی طرف جیسے ہی پلٹا، اس نے اس لمحاتی وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ بہ سرعت نشست جگہ سے اٹھ کر مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں اس اچانک حملے کی زد میں آ گیا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا دیوار تک گھسٹتا چلا گیا۔

میگارد میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا، اس نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری کنپٹی پر مُکا رسید کر دیا......... میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ آنکھوں کے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے لگی۔ وہ بھی ایک کائیاں تھا جو مجھے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دینا نہ چاہتا تھا۔ سنبھل کر اس نے میرے مقابل لیٹے لیٹے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا میرے پیٹ پر بھی رسید کر دیا۔ اذیت کی جاں کش لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا غیظ جنون میں تبدیل ہو گیا اور میں سب کچھ بھول کر تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کالا ناگ نے بھی کھڑے ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا کھلاڑی پوری شد و مد کے ساتھ بیدار ہو گیا تھا۔ میں غراتا ہوا اس پر جھپٹا۔ بڑی پھرتی سے اپنی دائیں ٹانگ کا اڑنگا لگا کر میں نے اسے دوبارہ زمین بوس کر دیا۔ یہ ایک اسپورٹس فل ایک داؤ تھا۔ میں چونکہ آل راؤنڈر کھلاڑی تھا اور اکثر فٹ بال کھیلنے کے دوران جب مد مقابل ٹیم کا کوئی کھلاڑی فاؤل پلے کرتے ہوئے مجھے اڑنگا لگا کر گرانے کی کوشش کرتا تو میں الٹا یہ داؤ اس پر آزما ڈالتا تھا۔ کالا ناگ جیسے ہی زمین بوس ہوا، میں نے اپنے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر اس کی کنپٹی پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری۔ پھر تو جیسے مجھ پر جنون سوار ہو گیا اور میں نے اسے لاتوں پر رکھ لیا۔ وہ تابڑ توڑ حملوں سے بری طرح گھبرا گیا اور اس کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں اُمڈنے لگیں۔ پھر اس نے تڑپ کر لوٹ لگائی اور جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی، میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے وحشیانہ چیخ اُبھری اور وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ میں نے باؤلنگ کرانے کے انداز میں مختصر سا اسٹارٹ لیا اور دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا اور اچھل کر اپنی ایک ٹانگ اس کے سینے پر جڑ دی۔ یہ ضرب زوردار ثابت ہوئی، جس نے کالا ناگ جیسے گرانڈیل شخص کو بھی فرش سے چند انچ اچھل کر عقب میں دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر دیا۔ اور جب دوبارہ اپنے قدموں پر آیا تو اس کے انداز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اپنی پشت دیوار سے ٹکا کر ہانپنے لگا۔ اس کے ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا جس نے اس کا چہرہ مزید خوفناک، لہو رنگ بنا دیا تھا۔ اچانک میری نگاہ اپنے میگارد پر پڑی۔ میں پھرتی سے اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا اور پھر جیسے ہی اسے اٹھا کر سیدھا ہوا، میں نے کالا ناگ کو دروازے سے باہر بھاگتے دیکھا۔

میں نے دانت پیستے ہوئے اس پر گولی چلا دی مگر میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں بھی اس کی ''یقینی'' موت بنا اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ دفعتاً مجھے گیٹ کے باہر لوگوں کا شور سا سنائی دی۔ اردگرد کے لوگ شاید گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں سن کر وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ مگر میری جنوں خیز نظریں اپنے درندہ صفت دشمن کالا ناگ پر جمی تھیں جو گیٹ کی طرف دیوانہ وار دوڑا چلا جا رہا تھا۔ مجھ پر بھی جیسے خون سوار تھا۔ میں بھی میگارد ہاتھ میں تولے اس کی طرف بھاگا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولی کا ایک اور دھماکا ہوا اور کالا ناگ اذیت ناک چیخ مار کر پختہ فرش پر گر پڑا۔ گولی اس کی پشت پر لگی تھی۔

اچانک باہر پولیس سائرن کی آواز اُبھری۔ شاید کسی قریبی مکین نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے دائیں جانب وسیع لان کے پار ایک گلیارا نظر آیا، جو بنگلے کی مشرقی دیوار اور باؤنڈری وال کے عین درمیان میں واقع تھا۔ میں نے میگارد قمیض کے نیچے کمر کے گرد بندھے ہولسٹر میں اڑسا اور مذکورہ سمت کی طرف دوڑا۔ گلیارے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی میں نے سامنے دیکھا۔ یہ مختصر گلیارا ذرا آگے جا کر بائیں جانب بنگلے کی سمت میں گھوم رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اختتام پر پہنچ کر بائیں جانب مڑا تو مجھے سامنے اختتام پر ایک چھوٹا سا ٹوائلٹ روم دکھائی دیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سیڑھیوں کا کام دے سکتا تھا۔ میرے ذہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں فوراً یہ خیال اُبھرا اور پھر لپک کر میں دروازے کے سہارے اوپر ٹوائلٹ کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور نہایت احتیاط سے باؤنڈری وال پر آ کر دوسری طرف باہر کود گیا۔

یہ کوٹھیوں اور بنگلوں کے عقب میں بنی ہوئی گندی گلی (کچرا گلی) تھی۔ کچرے کے ڈھیر پر کود کر میں نے دوڑ لگا دی اور تاریکی کا فائدہ اٹھاتا ہوا دور تک دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر ایک طویل چکر کاٹ کر میں شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک آٹو رکشہ روکا اور بوہڑا چوک چلنے کا کہہ کر اس پر سوار ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بوہڑا چوک پر تھا۔ یہاں تیز رفتار بسوں اور ویگنوں کا اڈا تھا جو مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی طرف جاتی تھیں۔ مگر میں نے بس کی بجائے تیز جانے والی ایک تیز رفتار ہائی ایس ویگن کا انتخاب کیا۔ بیس منٹ بعد اس کی روانگی کا نمبر آیا تو اس نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں جلد سے جلد لاہور سے نکل جانا چاہتا تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک میں راولپنڈی پہنچ چکا تھا بس اسٹاپ سے میں سیدھا ہسپتال کی طرف گیا جہاں ماں داخل تھی۔

ماں کو اب انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہاں نرسیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ جس وقت میں روم میں داخل ہو رہا تھا تو ایک نرس ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے باہر نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''آپ کہاں تھے؟.....آپ کی والدہ بار بار آپ کا نام لئے جا رہی تھیں۔''

میں نے مضطربانہ بے چینی سے پوچھا۔ ''سسٹر! خیریت تو ہے نا؟.....ماں کی طبیعت کیسی ہے؟''

''وہ ٹھیک ہیں.....جایئے اندر۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ماں بیڈ پر دراز تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

''نادر!.....میرے بچے!''

میں لپک کر ان کی طرف بڑھا اور ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ماں کے پُرنور چہرے پر میرے لئے محبت کا سمندر موجزن تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان کی آنکھوں میں بھائی کی جدائی کا اندوہناک غم بھی نمایاں صورت جھلملا رہا تھا۔ میں نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر ماں کی پیشانی کو چوم لیا اور ان کا انتہائی کپکپاتا ہوا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ اور اپنے حلق میں اُتری ہوئی غم واندوہ کی رقت کو نگلتے ہوئے بولا۔

''ماں! کیسی ہے تُو؟''

''میرے بچے!.....میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر تُو.....تُو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟'' اس کی نحیف اور کانپتی آواز میں پوچھا۔ ''میں تو تیرے اچانک غائب ہونے پر ڈر رہی گئی تھی کہ کہیں پھر.....ہمارے دشمنوں نے.....تجھے بھی.....''

اس سے آگے ان میں کچھ کہنے کی سکت نہ رہی اور وہ خاموش ہو گئیں۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ماں! تُو کیا اپنے لختِ جگر کو اتنا کمزور سمجھتی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے تر نوالہ ثابت ہو سکتا ہے؟''

''نہیں میرے بچے!.....نہیں۔'' ماں نے ایک دم تڑپ کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں، تُو نے دودھ پیا ہے.....اور تیری رگوں میں ایک بہادر اور غیرت مند باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ سو نے گل کے بعد ایک تیرا ہی تو آسرا ہے مجھے کہ تُو اپنے باپ کے قاتلوں کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا نادر! دشمنوں نے مجھے اب میرے بھائی گل (حیدر گل) کی موت کا زخم دے کر میرے سینے میں

ی کو مزید سلگا دیا ہے۔''

''ماں! ماموں حیدر گل کی موت کا زخم بے شک معمولی نہیں۔'' میں نے اپنی تلخی پر قابو پاتے ہوئے ''لیکن میں نے بھی ماموں کے قاتلوں کو کامیابی کا جشن زیادہ دیر نصیب نہیں ہونے دیا۔ سب کو جہنم ل کر آیا ہوں۔ میرے لہجے کی پُرتپش گھن گرج نے جیسے ماں کے لئے تریاق کا کام کیا۔ اس کے نحیف زار چہرے پر جوشِ مسرت کی بے پایاں سرخی اُبھری اور پھر نہ جانے کس طرح ان کے زخمی ونحیف وجود طاقت کی لہر دوڑ گئی کہ انہوں نے بے تابانہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا سر تھام کر ممتا بھرا بوسہ میری ثانی پر ثبت کر دیا۔ مگر دائیں شانے کے زخم نے انہیں کراہنے پر بھی مجبور کر دیا۔

میں نے ماں کو تھام لیا اور ان کے دائیں شانے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں بینڈ یج بندھی ہوئی تھی۔

''ماں! تُو آرام کر.....ابھی زخم تازہ ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

ماں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے مضروب شانے کی تکلیف پر قابو پایا اور پھر تکیے پر دوبارہ سر رکھ کر بولی۔

''زخم تو پرانا ہو جائے گا بیٹے! اور ٹھیک بھی۔ لیکن اندر.....دل کے اندر کے زخموں کا کیا کریں نادر ؟ کیونکہ وہ دونوں خبیث شیطان اور تیرے باپ کے قاتل.....مجھے جھوٹے الزام میں عمر قید کی ڈلانے والے وہ ازلی دشمن ابھی زندہ ہیں۔''

''ماں! تُو کیا سمجھتی ہے کہ میں ان دونوں کو بھول گیا ہوں؟'' میں نے جوش بھری تمتماہٹ کے ساتھ ''وقت آنے دو ماں! میں ان دونوں دشمنوں کو تیرے قدموں میں لا کر تیری آنکھوں کے سامنے صل جہنم کروں گا ایک دن۔''

''شاباش میرے شیر!.....تُو نے واقعی آج میرے دودھ کا حق ادا کر دیا۔''

''لیکن ماں! میں سمجھتا ہوں، صرف موت ان دونوں کے لئے ناکافی ہو گی۔'' میں نے سنسناتے ے، کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''میں انہیں پُرسکون موت کی نہیں بلکہ بھیانک زندگی کی سزا دوں گا۔ میں ناکی زندگی کو اس قدر سسکا دوں گا کہ انہیں صرف اور صرف اپنی موت میں پناہ نظر آئے گی۔ اور وہ مجھ ے اپنی زندگی کی نہیں بلکہ موت کی بھیک مانگیں گے۔'' میرے لفظوں سے نفرت و انتقام کے شعلے گویا نے پڑ رہے تھے جن کی تپش کی حدت ماں کو جاڑوں کی دھوپ جیسی راحت بخش رہی تھی۔ معاً دازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے ذرا چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اعظم خان کھڑے ہم وں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں ماں بیٹے میں؟'' ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''آیئے انکل!.....تشریف لائیں۔'' میں نے انہیں سلام کیا۔

''یار کاکے! تم کہاں غائب ہو گئے تھے اچانک؟'' انہوں نے قریب آ کر مجھ سے پوچھا۔

انہیں اپنی کارگزاری کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنی گزشتہ رات کی زاری سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میری بات پر وہ کچھ چپ سے ہو گئے۔

''خان صاحب! کہیں پولیس پھر میرے نادر کو نہ گرفتار کر لے.....آپ کچھ کیجئے۔'' ماں نے لہجے میں اعظم خان سے کہا تو وہ تشفی دیتے ہوئے بولے۔

''بہن! تم فکر نہ کرو۔ وہ مفرور بدمعاش تھا۔ میں ابھی متعلقہ تھانے کی پولیس سے رابطہ کر کے انہیں رہ ہوٹل اور گلبرگ والے کالا ناگ کے بنگلے میں منشیات کے گوداموں کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیتا یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سیل فون نکالا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کسی خدشے کے تحت ان سے کہا۔ ''انکل! کیا ڈائریکٹ پولیس سے رابطہ کرنا مناسب ہوگا؟''
میری بات پر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ بے فکر رہو۔ میں پرسنل سیکرٹری کو اس معاملے میں باؤنڈ کر کے ضروری ہدایات دے رہا ہوں۔ وہ خود مناسب انداز سے اسے ڈیل کر لے گا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کسی بہرام نامی سیکرٹری سے سیل فون پر رابطہ کر کے ساری صورتِ حال کے بارے میں اسے بریف کیا اور چند ضروری ہدایات بھی دیں۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ نرس نے وائٹل سائن چیک کیا اور ان کی ریڈنگ بتائی۔ پھر میڈیکل فائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اعظم خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اب ان کی کنڈیشن خاصی حد تک بہتر ہو چکی ہے۔ میں انہیں ڈسچارج کر رہا ہوں۔ البتہ ان کو چوتھے روز بینڈیج ہوتی رہنی چاہئے۔ پندرہویں روز معاملے کے لئے او پی ڈی لا سکتے ہیں۔''

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔'' اعظم خان نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ماں میرے ساتھ مری واپس آ گئیں۔ اعظم خان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ فضل چاچا کے بہیمانہ قتل کے بعد ان کی بیوی سکینہ بے چاری غم سے نڈھال تھی۔ مگر آفرین تھی عورت پر ..... وہ چند روز اپنے گاؤں میں گزار کر ہمیشہ کے لئے ''گرین لاج'' آ گئی تھی۔ اب ماں کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔

انکل اعظم خان واقعی ہمارے لئے ایک فرشتہ صفت انسان ثابت ہوئے تھے۔ ماں نے مجھے ان کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ درحقیقت ماموں حیدر گل کے دوست ہی نہیں، میرے مرحوم باپ قادر علی خان کے پرانے اور بچپن کے دوست تھے اور بلاشبہ انہوں نے دوستی کا حق ادا کیا بلکہ کر رہے تھے۔

اگرچہ بعض سیاسی حوالوں سے ان کی ذات سے متعلق کچھ مشکوک قسم کی سرگرمیوں کی دبے لفظوں بازگشت سنتا رہتا تھا لیکن میں نے اس حوالے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ بہرطور ٹال کو آگ لگنے کے بعد جن دو اشخاص نے اس سلسلے میں میرے کانوں کو سنبھالا دیا تھا، وہ دو افراد تھے۔ انکل اعظم خان اور دوسرا شخص منیجر مشتاق سیال۔ بلکہ بہ قول انکل اعظم خان کے ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں منیجر مشتاق سیال کی شبانہ روز محنت اور توجہ کا دخل زیادہ تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس کی احمقانہ گفتگو اور حرکتوں کے باعث میں اکثر جھلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ جب وہ مری سے پنڈی ہسپتال میں ماں کی خیریت پوچھنے نہ آیا تھا۔ ٹال کے بعد سے میں کچھ ایسے دگرگوں حالات کا شکار رہا تھا کہ اس کی دوبارہ نئے سرے سے تعمیر کا خیال میرے دل و دماغ سے نکل گیا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہتا تھا کہ کب وہ آ کر مجھ سے ٹال کی مرمت و تعمیر کے سلسلے میں چیک وغیرہ سائن کروا کر لے جایا کرتا تھا۔

اسی طرح جب اسے میرے اور ماں کے ہسپتال سے ''گرین لاج'' آنے کی خبر ہوئی تو وہ دوڑا آیا اور ٹال کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں ایک ایک پائی کا حساب مجھے دکھایا۔ اس کی دیانت داری سے پاک تھی۔ بعد میں، میں نے بھی اس کے پُرزور اصرار پر ٹال کا معائنہ کیا تو اس کی وفاداری اور شناسی کا دل سے قائل ہو گیا۔

ایک دن جب میں ٹال کے دفتر میں اپنی ریوالونگ چیئر پر براجمان میز پر جھکا کچھ اعداد و شمار کرنے میں تھا تو اچانک مجھے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے منیجر مشتاق سیال کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جانے کب سے خاموشی کے ساتھ کھڑا مجھے کام میں مگن دیکھے جا رہا تھا۔

''ارے آؤ چاچا جی! ..... کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر قدرے چونک کر ''تم رو کیوں رہے ہو؟'' میں نے اب اسے ''منیجر'' کی بجائے 'چاچا جی' کہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ رجسٹر سینے سے لگائے آگے بڑھا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔ ''چھوٹے صاحب! آپ کو آج دوبارہ اس کرسی پر بیٹھا دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور دکھ بھی..... بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) بھی یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے، بہت اچھے آدمی تھے۔ بڑے لوگ تھے جی۔'' وہ اپنا مخصوص تکیہ کلام نہیں بھولا تھا۔ مگر پھر جیسے اسے فوراً یاد آ گیا ہو کہ مجھے اس کے تکیہ کلام سے سخت چڑ تھی۔ لہٰذا فوراً ہی قدرے شرمندہ ہو کر بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں چھوٹے صاحب!..... آپ بھی ..... بڑے لوگ ہیں۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں ملائمت سے بولا۔ ''چاچا جی! ماموں حیدر گل کے بعد واقعی ٹال سونا سونا لگ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی وجہ سے میرے دل کو کافی سہارا ہوا ہے۔ ورنہ تو میں سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ آپ نے دن رات اپنی جان مار کر اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ بلکہ مجھے تو ہوش بھی نہ تھا اس پر توجہ دیتا۔''

''چھوٹے صاحب جی! برا تو مجھے بھی لگتا تھا۔ آپ پریشان تھے اور میں بار بار آ کر آپ سے چیکوں پر دستخط کروا کر اپنی راہ لیتا تھا۔ مگر کیا کرتا صاحب! مزدوروں کی بیکاری اور ان کے گھروں میں بھوک و فاقوں کو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اللہ بخشے بڑے صاحب کو، ان کے اخلاق و حسن سلوک کی مزدوروں کے دلوں میں بوئی ہوئی عجیب ہی فصل تھی کہ انہوں نے بھی جیسے کہیں دوسری جگہ کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ حالانکہ اکثر بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) اور مزدوروں کے درمیان گرما گرمی بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن باوجود اس کے سارے مزدوروں کو بڑے صاحب سے عقیدت تھی۔ وہ ہر وقت مجھے گھیرے رکھتے۔'' وہ اپنی رو میں بہے جا رہا تھا۔

''ہاں!..... تم نے واقعی مجھ پر ہی نہیں، ان مزدوروں پر بھی احسانِ عظیم کیا ہے۔'' میرے لہجے میں ندامت بھرا اعتراف تھا۔ وہ بولا۔

''نہیں چھوٹے صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔ رقم تو آپ ہی کی تھی، میں نے کیا، کیا بھلا؟''

''تمہاری محنت تھی چاچا جی! اور تمہاری ماموں سے عقیدت تھی۔ تمہارے دل میں مزدوروں کے لئے ہمدردی تھی ..... اور سب سے بڑی بات اس ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں تمہاری دیانت دارانہ نیت تھیں۔''

''دراصل چھوٹے صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہے، کاروبار میں مقابلے کی دوڑ پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ہماری ایک ساکھ بنی ہوئی ہے۔ اگر دیر ہو جاتی تو پارٹیاں ہمیں آرڈرز ہی نہ دیتیں اور ہم بھول جاتیں۔ پھر نئے لوگ آتے رہتے ہیں۔ دوبارہ ساکھ بننا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا۔''

میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر جیسے وہ ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کی خاطر بولا۔

''چھوٹے صاحب! اب آپ کی وجہ سے اس ٹال کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئی ہیں۔ اب انہیں

بحال ہی رہنا چاہئے۔"

"انشاء اللہ..........!" میں نے زیر لب کہا۔

❋❋❋

حالات کسی حد تک معمول پر آئے۔ دل کو دل سے یارا ہوا تو کوئی پیارا یاد آنے لگا۔ لیکن "پیارے" کی یاد نے ہی دلِ بے قرار کو مسوس کے رکھ دیا۔

نگینہ میری پہلی اور آخری چاہت .... میری محبت، میرے دل کا اول و آخری جذبہ۔ نگینہ کی یاد نے میری روح تک کو بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ دل بے چین کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کیا۔

میں اس وقت اپنے آفس میں موجود تھا۔ باہر گلابی جاڑوں کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نگینہ کے گھر کے نمبر پنچ کرنے کے بعد میں دوسری طرف سے کسی کے ریسیور اٹھانے کا منتظر رہا۔ دوسری طرف سے اُبھرنے والی ہر بیل پر میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھتا تھا۔ معاً کسی نے ریسیور اٹھایا۔ میرا دل جیسے رُک گیا۔

"ہیلو..........!" وہی آواز جو کانوں میں رس گھولتی تھی، دل و دماغ میں الوہی محبت کے ساز بجاتی تھی۔ یہ نگینہ کی مدھر آواز تھی۔

میں نے بہ مشکل ایک گہری ہمکاری خارج کر کے دل کی دھڑکنوں کو بحال کیا اور پھر جیسے میرے اندر سے آواز اُبھری۔

"نگینہ..........!"

"آپ کون..........؟" نگینہ کی قدرے چونکتی ہوئی آواز اُبھری اور گویا میرا دل کٹنے لگا۔ یہ کیسی اجنبیت تھی؟ کہاں تو میری ایک آواز پر نگینہ کی آواز میں محبت بھری حلاوت کے گلاب کھل اٹھتے تھے۔ آج تو جیسے اس کی آوازِ بے اعتنا میں لق و دق صحرا آباد تھا۔

"نگینہ! .... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم .... تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟ اپنے نادر کو؟" میں نے زخمی دل کے ساتھ بجھے لہجے میں کہا تو وہ بیزاری سے بولی۔

"اوہو، بھئی آپ آخر کون پاگل ہیں؟ .... بلاوجہ ہی گلے پڑ رہے ہیں۔"

"ہاں .... میں پاگل ہی تو ہوں۔" میں نے ٹوٹے دل سے کہا۔ "پلیز نگینہ! مجھے پہچانو۔ آخر تمہارے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم مجھے ...." میری آواز ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ دوسری طرف نگینہ نے شاید ریسیور رکھ دیا تھا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ریسیور رکھا اور اپنا سر پکڑ لیا۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باریک بینی سے سوچا۔

نگینہ کو آخر کیا ہو گیا تھا؟ .... یہ کیا اسرار تھا؟ .... آخر یہ سب کیا تھا؟ .... اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ سب جو کچھ بھی تھا نگینہ کے مُکش پور جانے کے بعد ہوا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے واپسی پر کبیر کی جیپ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ آخر ان دونوں خبیث شیطانوں نے اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا تھا؟ .... یہ سب کچھ اب مجھے کبیر ہی بتا سکتا تھا اور صرف ایک ہی طرح بتا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں غیظ و غضب کے عالم میں بھینچنے لگا جیسے کبیر کی گردن دبوچ رہا ہوں۔ میں نے فوری طور پر راولپنڈی کا قصد کیا۔

مُکش پور والی مہم کے دوران چونکہ جیپ کا انجر پنجر ایک ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ورکشاپ میں مرمت کے لئے دے رکھا تھا جہاں سے وہ ٹھیک ٹھاک مرمت کر کے بالکل درست حالت میں مجھے واپس مل چکی تھی۔

شام سوا پانچ بجے کے قریب میں اپنی جیپ پر پنڈی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پنڈی پہنچنے تک سرد رات کی تاریکی چہار اطراف پھیل چکی تھی۔ میرے دائیں طرف راول ڈیم کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ آرمی میوزیم کے سامنے سے گزرتا ہوا میں ایوب پارک پہنچا اور یہاں ذرا قریب ہی ایک فاسٹ فوڈ سینٹر کے سامنے جیپ روک دی۔ ایک لڑکا میری طرف لپکا۔ میں نے اسے ایک چکن برگر اور کافی کا آرڈر دیا اور سیٹ کی پشت سے پشت لگائے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ پوش علاقہ جہاں ازلی دشمن نظر حیات کے بیٹے کبیر کی کوٹھی تھی، اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ یعنی "پنج بھاٹا چوک" سے دائیں جانب پوش علاقے کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ کچھ سوچ کر میں نے کھڑکی سے باہر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو بوفے ریسٹورنٹ کے قریب ایک پبلک فون بوتھ نظر آ گیا۔ ابھی دروازہ کھول کر اترنے ہی والا تھا تو وہ نوعمر لڑکا ایک ٹرے میں برگر اور پلاسٹک کے کپ میں کافی اٹھائے میری جیپ کے پاس آن پہنچا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما کر باقی رکھ لینے کا کہا، پھر بولا۔ "مجھے ایک پے انگ کارڈ لا دو گے؟"

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو میں نے سو روپے کا ایک اور نوٹ اسے تھمایا اور ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر جیپ کے بونٹ پر رکھ دی۔ ذرا دیر بعد وہ لڑکا کالنگ کارڈ لئے آ گیا۔ میں نے دس کا ایک اور نوٹ "اجرتِ خاص" کے طور پر اسے تھمایا۔ پھر جلدی جلدی برگر چبانے کے بعد کافی ختم کرنے کا عمل پورا کرنے کے بعد میں ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اگرچہ میرے پاس اپنا موبائل فون بھی تھا لیکن میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بوتھ میں آ کر میں نے نظر حیات کے نمبر پنچ کئے۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ تیسری بیل پر کسی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ یہ آواز میرے لئے اجنبی تھی۔

"کبیر سے بات کرنی ہے .... میں اس کا دوست بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ وہ شاید کوئی گھریلو ملازم تھا، بولا۔

"جی .... چھوٹے صاحب تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کوئی پیغام ہے تو دے دیں۔ آئیں گے تو انہیں بتا دوں گا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی .... مجھے معلوم نہیں۔" وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت فوراً کہا

"اچھا.......... ان کے ڈیڈی گھر پر ہیں؟"

"نہیں جی .... وہ تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں؟"

"کب تک واپس آئیں گے؟"

"کون جی؟ .... بڑے صاحب یا چھوٹے صاحب؟"

"بڑے صاحب کے بارے میں بتاؤ پہلے۔"

"وہ تو جی کل ہی آئیں گے۔ صبح سویرے۔"

"اور چھوٹے صاحب؟"

"وہ تو اپنے کسی دوست کی شادی پر گئے ہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

''اچھا ٹھیک ہے .... شکریہ!'' یہ کہہ کر میں نے جلدی سے رابطہ منقطع کر کے ریسیور ہک پر لٹکا
اور باہر نکل گیا۔ کبیر پر ہاتھ ڈالنے کا یہ بہت سنہری موقع تھا۔ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا
سوچا اور اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ ٹنچ بھاٹا چوک
سے میں دائیں جانب مڑا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ چند بلاک چھوڑ کر میں نے جیپ نظر حیات کے وسیع
وعریض کوٹھی نما بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے روک دی جس کے محرابی ستونوں پر دودھیا گلوب کی روشنی
کے علاوہ وہاں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کے بنگلوں کے چند مکینوں
کو میں نے واک کرتے دیکھا۔ میں جیپ سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ
دی۔ ذرا دیر بعد ایک چمرخ سے شخص نے ذیلی گیٹ کھول کر جھانکا۔ میں نے اس سے پہلے قرب و جوار
میں کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کا اطمینان کرتے ہی اپنی جیب سے بھاری دستے والا میگارڈ نکال کر ہاتھ
میں پکڑ لیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی اس نے اپنا سر باہر نکال کر مجھے پہچاننے یا دیکھنے کی کوشش کی، میں نے اس کی
''صحت'' دیکھتے ہوئے ذرا ''ہولا'' ہاتھ رکھ کر آہنی دستے سے اس کی کنپٹی پر وار کیا اور اس کے حلق سے
''اوغ'' کی مخصوص آواز نکلی اور وہ اندر پختہ روش پر گرا۔

اس کے اٹاغفیل ہوتے ہی میں اندر داخل ہو گیا۔ ذیلی دروازہ بند کر دیا۔ ملازم بے سدھ پڑا تھا۔
میں نے عقابی نظروں سے قرب و جوار میں دیکھا۔ پختہ روش کے دو اطراف لان تھا جہاں ذرا ذرا
فاصلوں پر الیکٹرک پائپوں کے بنے پول نصب تھے جن پر نصب کچھ گلوب روشن تھے۔ پورٹیکو ویران تھا۔
ملازم کے سوا شاید اور کوئی اندر موجود نہ تھا اور فون ریسیو بھی اس نے ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے بے
سدھ ملازم کو کاندھے پر ڈالا اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بظاہر ہے اندر سے کھلا ہوا تھا۔
میں اسے آہستگی سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سامنے شاہانہ طرز کی نشست گاہ تھی۔ بنگلہ ویران تھا۔
میں نے سب سے پہلے بے ہوش ملازم کو ایک صوفے پر ڈالا اور جتنی جلدی مختلف کمروں میں جھانک کر
''کسی دوسرے'' کی موجودگی کی تسلی کر سکتا تھا، وہ میں نے فوراً کر ڈالی۔ اس کے بعد نائلون کی ایک
مضبوط ڈوری نما رسی تلاش کر کے میں نے بے ہوش ملازم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر
اسے ایک تاریک کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں ذرا ستانے کے لئے صوفے پر
بیٹھا۔ پھر اٹھ کر گیٹ کے قریب آیا۔ گیٹ کے اندرونی ستونوں پر نصب ایک الیکٹرک ریموٹ کنٹرول
سسٹم دیکھ کر جان گیا کہ بنگلے کا کوئی بھی مکین (جن کے پاس ریموٹ کنٹرول موجود ہو، باہر سے ہی کار
میں بیٹھے بیٹھے گیٹ کھول کر با آسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے بہرحال خود ہاتھوں سے گیٹ کھولنا
پڑا۔ پھر اپنی جیپ میں سوار ہو کر میں جیپ اندر لے آیا۔

اندر لا کر میں نے جیپ اس طرح دیوار کی آڑ میں کھڑی کی کہ باہر سے آنے والے کی اس پر فوراً
نگاہ نہ پڑ سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں بڑے آرام سے اتر کر دوبارہ اندر نشست گاہ میں آ
کر بیٹھ گیا۔

اب میں اپنے ''شکار'' (کبیر) کا منتظر تھا۔ میرے لئے میدان صاف تھا۔ بہ قول ملازم کے نظر
حیات تو اسلام آباد دفعان ہو چکا تھا اور اس کی آمد صبح سے پہلے ممکن نہ تھی۔ جبکہ کبیر اپنے کسی دوست کی
شادی اٹینڈ کرنے گیا ہوا تھا۔ نائٹ فنکشن تھا، اس لئے اس کی واپسی دیر سے ہو سکتی تھی۔ میں نے
صوفے پر بیٹھے بیٹھے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔ تاہم مجھے اندازہ تھا کہ اس کی
واپسی میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ نہ آیا تب مشکل ہو سکتی تھی۔ یہ سنہری موقع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ سے نکل جاتا۔ وقت کا بھی زیاں ہوتا۔ ماں الگ میرے لئے پریشان ہو رہی ہوتی۔ ویسے تو
نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں اپنے کسی دوست کی دعوت پر ہوں اور دیر ہو سکتی ہے، فون کر دوں گا۔ لہٰذا
گیارہ بج گئے تو ماں سے سیل پر رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک سیل فون کی بیل گنگنائی۔ ماں نے
کیا تھا۔

میں نے سیل کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو ماں! تو پریشان ہو گی۔''

''ہاں میرے لعل تو کہاں ہے؟ .... ابھی تک آیا کیوں نہیں؟'' ماں کے لہجے سے گہری فکرمندی
جھلک رہی تھی۔

''ہاں! میں جہاں بھی ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو میری فکر نہ کر۔ میں اپنے دوست
کے پاس ہوں۔ شاید کل ہی آؤں۔''

''ہاں سے جھوٹ بولتا ہے .... مجھے تیرے لہجے سے مسرت کی بو آ رہی ہے جیسے تو اس وقت
اپنے دشمنوں کے سینے پر بیٹھا مونگ دل رہا ہو۔'' ماں نے عجیب پرجوش لہجے میں کہا تو مجھے ماں کی زود
فہمی پر حیرت ہوئی۔ تاہم میں نے بھی مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ہاں ماں! .... بس ایسا ہی کچھ ہے۔ میں دشمنوں کی نیندیں حرام کرنے میں مگن ہوں۔''

''نادر! میرے لعل! .... اپنا خیال بھی رکھنا۔'' ماں نے ممتا بھری حلاوت سے کہا۔

''تو بے فکر رہ ماں! میں نے ایک بہادر ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میری تو جائے پیدائش بھی
...ھائب جگہ رہی ہے، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا پھر ....''

''ٹھیک ہے میرے بچے! اللہ تیرا حامی و ناصر ہو۔'' ماں نے کہا اور میں نے سیل فون آف کر کے
جیب میں رکھ لیا۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں اب مایوس سا ہو گیا تھا۔
لیکن میں ابھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کبیر کے خلاف بڑی کامیابی کے ساتھ جال
بچھایا تھا جو رائیگاں جاتا نظر آ رہا تھا۔ جب بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تو اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
میں بری طرح بدک گیا۔ ٹیلی فون سیٹ میرے دائیں جانب ایک فینسی اسٹینڈ پر دھرا ہوا تھا۔ دوسری
بیل گنگنائی۔ دم بہ خود سناٹے اور اعصاب شکن خاموشی میں ٹیلی فون کی ہر بار بجنے والی بیل دھماکے کی
مانند میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔

میں کشمکش و پنج میں تھا۔ بالآخر میں نے ذرا کھسک کر صوفے پر بیٹھے بیٹھے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا
میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے کبیر کی آواز ابھری۔

''شمسو! ڈیڈی تو نہیں آئے اب تک؟'' میں فوراً سمجھ گیا، وہ ملازم شمسو تھا جسے میں نے بے ہوش
کرنے کے بعد رسن بستہ حالت میں دوسرے کمرے کے اٹیچ باتھ میں بند کر دیا تھا۔ بہرطور میں نے
حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آواز بدل کر مختصراً کہنے کی کوشش کی۔

''نہیں جی چھوٹے صاحب! وہ تو صبح ہی آئیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔ میں نے اپنے وجود کے پرجوش
جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی! ٹھنڈا گرم پی لیا تھا اس لئے .... آواز ذرا بیٹھ گئی ہے۔''

''تم اپنی ندیدوں والی عادت نہیں چھوڑو گے۔'' وہ بولا۔ ''اچھا سنو! تم گیٹ کو آٹومیٹک لاک کر کے

چلے جاؤ۔ مجھے آنے میں ذرا دیر ہو جائے گی۔"

جواباً میں نے جی اچھا کہا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس کے فون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اس نے دیر سویر ضرور آنا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے شمسو کو چلے جانے کا کیوں کہا تھا؟

میں زیادہ دیر نہیں سوچ سکا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لئے میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ٹھیک ایک بجے باہر مجھے کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح چونکا اور یکدم صوفے سے اُترا۔ دروازے کی طرف دوڑا اور باہر نکلنے کی بجائے اس کی متوازی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

میں نے دیکھا، آہنی گیٹ کے دونوں پٹ دھیرے دھیرے خودکار انداز میں وا ہو رہے تھے۔ اور پھر ایک کار میں نے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ کار کی اگلی نشست پر مجھے کبیر بیٹھا نظر آیا۔ مگر اس کے ہمراہ ایک خوبرو عورت بھی براجمان تھی۔ ظاہر ہے، وہ میرے لئے اجنبی ہی رہی ہو گی۔ میں کبیر کے تنہا آنے کی توقع کئے بیٹھا تھا مگر ایک عورت کو دیکھ کر میں اُلجھ سا گیا۔ میں نے دونوں کو کار سے اترتے دیکھا۔ میں نے عورت کو بہ غور دیکھا۔ وہ مجھے "آنٹی" ٹائپ کی عورت نظر آ رہی تھی۔ عمر اس کی پینتیس چالیس کے قریب ہی نظر آتی تھی۔ اس نے بڑی زرق برق سی سیاہ رنگ کی کامدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز بھی اسی رنگ کا تھا جو اس کے گورے اور بھرے بھرے جسم پر بہت جچ رہا تھا۔ اس نے بیش قیمت جیولری پہن رکھی تھی۔ گھنے بالوں کا جوڑا بنا کر سیاہ مہین جالی میں قرینے سے لپیٹ رکھا تھا۔ پیروں میں اونچی پنسل ہیل والے سینڈل تھے۔ چہرے کے نقش موٹے مگر جاذب نظر تھے۔ اس نے واقعی اپنی سج دھج میں "ایڑی چوٹی" کا زور لگا رکھا تھا۔ خاصی فیشن ایبل اور الٹرا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں سب سے پہلے یہی سمجھا تھا کہ وہ اس کی کوئی دور پرے کی رشتے میں آنٹی لگتی ہو گی۔ لیکن اس وقت میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا، جب کار سے اُترتے ہی وہ نئے نویلے جوش بھرے نوجوان کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر بوس و کنار میں مصروف ہو گئے۔ وہ کبیر سے پندرہ بیس سال بڑی ہی تھی۔ بلکہ دونوں ماں بیٹا ہی نظر آتے تھے۔

میں نے ان پر لعنت بھیجی۔ وہ آپس میں ذرا دیر کی "بے قرار" اٹھکیلیوں کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھے تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ دونوں پیئے ہوئے تھے اور نشے میں بری طرح دھت تھے۔

میں یک دم دروازے سے ہٹ گیا۔ میں چھپنے کے لئے پہلے ہی ایک جگہ منتخب کر چکا تھا۔ چنانچہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مذکورہ گوشے کی طرف لپکا۔ یہ خفیہ گوشہ لمبے چوڑے ریفریجریٹر اور 41 انچ کے پروجیکشن ٹی وی کے عقب میں تھا۔ یہاں فلاور وال بھی تھی اور مصنوعی پھولوں کے تختے بھی تھے۔ ایک جھبس بھرے چنگھاڑتے ہوئے تیندوے کا مجسمہ بھی تھا۔

اب میں وہاں دم سادھے بیٹھ گیا۔ میری ٹھٹکی ہوئی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دروازہ کھلا اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بدمست قہقہے لگاتے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کو باہم پیوست دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر میں نے نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا سیل فون نکال لیا۔ اس میں مووی کیمرا بھی تھا۔ کسی اچانک خیال کے تحت میں نے ان کی مووی بنانا شروع کر دی۔

"میڈم!.........آج تو دل کھول کر پیار کروں گا میں تمہیں۔ بالکل فری اسٹائل!" کبیر کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔

"اچھا.........اتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟" میڈم نما اس عورت نے اٹھلا کر کہا۔

"ہاں میڈم!.........بہت زیادہ.........گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں۔" کبیر کی ہانپتی ہوئی پُرہوس آواز اُبھری۔ اس نے عورت کو خود سے ذرا پرے دھکیلا مگر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ لیا۔ عورت بھی ترنگ میں تھی۔ وہ کمرے کے وسط میں بچھے قالین پر گول گھومتی چلی گئی اور ساڑھی اس کے بھرے بدن سے کھلتی چلی گئی۔ کبیر اس کے نیم عریاں، بھرے بھرے گداز جسم کو بڑی ہوس ناک نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا۔ مگر وہ عورت کھنکتی ہنسی کے ساتھ اس کی پہنچ سے دور ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرس تھا۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

"پلیز میڈم! مجھے اتنا مت تڑپاؤ۔ نکلو باہر۔"

کبیر نے دروازہ پیٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اندر سے عورت کی کھنکتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ذرا ٹھہر جاؤ.........میں پوری تیاری کے ساتھ باہر آتی ہوں۔"

میں صرف خاص خاص "پوز" کے مناظر قید کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس عورت کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت نکلی تو اسے دیکھ کر میرے دل میں بڑی ہلچل ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر مووی ریکارڈنگ آن کر دی۔

کبیر نے اسے دبوچ لیا۔ میں دل کڑا کر کے ان کی یہ شرم ناک مووی ریکارڈ کرتا رہا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ دونوں ہانپتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھے تھے۔ کبیر نے ان کے بالوں کی آوارہ لٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "کہو تو چھوڑ آؤں تمہیں؟" وہ اب شکم سیر جانور کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"کیوں.........اتنی جلدی بیزار ہو گئے؟" عورت نے تھکے تھکے لہجے میں شکوہ کیا۔

"نہیں تو.........مجھے تمہارے شوہر کی فکر ہو رہی تھی۔" کبیر نے جیسے بات بنائی۔

"وہ بوڑھا تو اب تک نیند کی گولیاں کھا کر سو چکا ہو گا۔" عورت نے بیزاری سے کہا۔

"تو کیا صبح جانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں.........پو پھٹے چلی جاؤں گی۔"

"ارے نہیں بابا! صبح تو ڈیڈی آن دھمکیں گے.........اور ملازم بھی آ جائیں گے۔ چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"ہاں.........ذرا تھکن اتار لوں۔" عورت نے کہا پھر ذرا ستانے کے بعد وہ اپنی ساڑھی پہننے لگی۔

"اس لڑکی کا کیا بنا جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے؟.........کیا نام بتایا تھا.........ہاں، یاد آیا، گینہ۔" وہ عورت ساڑھی پہننے کے دوران کبیر سے بولی۔ گینہ کے ذکر پر میرے کان یکدم کھڑے ہو گئے۔ کبیر جواباً مسکرا کر بولا۔

"ہاں.........ہماری عنقریب منگنی ہونے والی ہے اور جلد شادی بھی متوقع ہے۔"

کبیر کی بات پر میرے اندر زلزلے سے اُبھرنے لگے۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھی۔" اس نے آخر میں ساڑھی کا پلو درست

کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں .... پہلے تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی۔'' وہ بتانے لگا اور میں سائیں سائیں کرتی سماعتوں کے ساتھ ہمہ تن گوش رہا۔

''مگر پھر میں نے .... ایک ایسا چکر چلایا کہ .... وہ بے چاری اپنے عاشق نامراد کو ہی دل سے نکال بیٹھی۔''

''اچھا .... ایسا کیا چکر چلایا تم نے؟'' عورت ساڑھی پہننے کے بعد اس کے قریب صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

کبیر بھی ہنوز نشے کی حالت میں تھا، بتانے لگا۔ ''میں اسے اپنے ایک دوست کے ساتھ مکش پور لے گیا تھا۔ وہاں ایک عاروب نامی عامل رہتا تھا جو درحقیقت وادی کیلاش سے تعلق رکھتا ہے .... وہ خود کو کیلاشیوں کا روحانی پیشوا بتاتا ہے۔ مکش پور میں وہ ایک طویل ریاضت کے سلسلے میں رہتا تھا۔ نگینہ کا اس نے میرے ایما پر ایک خاص عمل کے ذریعے برین واش کر ڈالا۔ یوں وہ اپنے محبوب نادر علی کو بالکل فراموش کر بیٹھی۔''

''مگر .... اس طرح تو نگینہ پھر کسی کو بھی نہیں پہچان پا رہی ہوگی؟ مثلاً اپنے مما، پپا وغیرہ کو؟'' عورت نے پوچھا۔

''نہیں .... عاروب نامی اس کیلاشی روحانی پیشوا نے اپنے ایک عمل کے ذریعے اس کا Partially برین واش کیا تھا۔ یعنی اس کے دل و دماغ سے صرف اس کے محبوب کی یاد محو کر دی تھی۔ جبکہ وہ اپنے پپا اور دیگر لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔''

''اوہ.........'' اس نے مصنوعی تاسف کے اظہار میں سر ہلایا اور بولی۔ ''یہ تو تم نے اس کے عاشق اور اپنے رقیب کے ساتھ بہت ستھرا کام کیا ہے .... بلکہ اگر یہ کہوں کہ دونوں کے ساتھ ہی کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ویسے یہ کیا کوئی جادو ہے؟''

''ارے نہیں.........'' کبیر نے لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا۔ ''یہ جادو نہیں بلکہ سائنس ہے۔ تحلیل نفسی یا پھر Suggestion کا کھیل بلکہ کارستانی ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ قدرے فخریہ ہوگیا تھا۔

وہ عورت کچھ نہیں بولی۔ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر یکایک کبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ ایک کمرے کی طرف تھا۔

''کہاں چلے؟'' اس کی ساتھی نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

جواب میں کبیر نے سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی فضا میں بلند کر کے فحش اشارہ کیا اور دروازے کے اندر غائب ہوگیا۔ چند منٹ کے بعد وہ لوٹا تو اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ شاید پانی کے چھینٹے چہرے پر مار کر آیا تھا۔

''چلو .... اب میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' اس نے عورت کو مخاطب کیا تو وہ بھی فوراً صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا نشہ ابھی باقی تھا۔ اس لئے اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ جبکہ کبیر مستحکم قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں ان دونوں کو جاتا دیکھتا رہا۔ میرا مقصد بغیر ہنگامہ آرائی کے پورا ہوگیا تھا۔ نگینہ کی کیفیت کی وجہ مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ نگینہ کے ساتھ ہونے والے عمل کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے جیسے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔

وہ دونوں باہر نکل چکے تھے۔ میں نے اپنے منتشر حواس پر بہ مشکل قابو پایا۔ اگرچہ میرا جی تو چاہ رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا اسی وقت بشیر چیرا اور کالا ناگ کی طرح کبیر کو بھی سفر آخرت پر روانہ کر دوں۔ لیکن کچھ سوچ کر میں نے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو میرے ذہن میں ان کے تعاقب کا خیال آیا۔ میں نے اس پر عمل درآمد کا ارادہ کر لیا۔ لہٰذا جونہی بیرونی دروازہ ان کے عقب میں بند ہوا، میں تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔ دروازے کی جھری سے میں نے دونوں کو کار میں بیٹھتے دیکھا اور پھر فوراً ہی وہ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کی کار جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلی اور پھر گیٹ سرکتا ہوا دوبارہ بند ہونے لگا، میں ایک زقند لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرا رخ اپنی جیپ کی طرف تھا۔ چند لمحوں بعد میں اسے اسٹارٹ کر کے مرکزی گیٹ تک لے آیا تھا۔ میں نے اتر کر گیٹ کھولا اور جیپ سے باہر نکل کر دوبارہ اندر آیا۔ دروازے کے سسٹم کو آٹو پر کر کے میں باہر آیا اور جیپ میں سوار ہو کر بہت دور کار کی سرخ بتی کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ لہٰذا مجھے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سڑک سنسان تھی اس لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اس کی منزل آ گئی۔ میں نے وہ مقام اور علاقہ ذہن نشین کر لیا۔ وہ وہاں اس عورت کو چھوڑنے آیا تھا جس کے بعد وہ واپس ہوگیا۔ اب اس کے تعاقب میں جانا فضول تھا۔ لہٰذا میں مری کی طرف روانہ ہوگیا۔

❋❋❋

سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی میں گرین لاج پہنچ چکا تھا۔ میں تھکن اتارنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں میں ہی میں گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔ صبح میں دیر سے سو کر اٹھا۔ ناشتہ کر کے میں نے ماں کی خیریت معلوم کی۔ وہ مجھ سے گزشتہ رات کی بابت جاننا چاہتی تھیں مگر میں کبیر کی عیاشی کی داستان کس طرح سنا سکتا تھا اس لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے باہر نکل آیا۔ میرا رخ ٹال کی طرف تھا۔

منیجر مشتاق سیال نے ٹال کے سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال رکھے تھے۔ میں نے اسے کمرے میں بلا کر چند کاروباری معاملات پر گفت و شنید شروع کر دی۔ باتوں کے دوران اس نے کہا۔ ''صاحب جی! ایک بات کہنی تھی آپ سے۔''

''ہاں کہو .... لیکن یار! مجھے یہ صاحب جی، چھوٹے مالک نہ کہا کرو۔''

''بڑے لوگ .... کہہ دیا کروں جی؟'' وہ ذرا جھجک کر بولا۔

''اس کی بھی ضرورت نہیں .... صرف نادر۔ ہاں اب بولو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

''نادر میاں! میں ٹال کی رکھوالی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔''

''ہاں کہو۔'' میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اس وقت دو چوکیدار تو اپنا کام کر رہے ہیں نا۔''

''وہ دونوں بڑے آدمی ہیں جی۔'' اس کی بات پر میں نے اسے گھورا۔ ''مم .... میرا مطلب ہے جی، وہ چھوٹے آدمی ہیں .... بب .... بلکہ اصل بات یہ ہے جی کہ وہ تھوڑے آدمی ہیں جی۔ میں چاہتا ہوں .... دو گن مین اور رکھ لیں۔''

اس کی بات پر میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولا۔ ''دیکھیں نا، نادر میاں! پہلے بھی یہاں ایک حادثے سے گزر ہی چکے ہیں۔ دشمنی ہماری ختم نہیں ہوئی۔ ٹال میں لوہے کا سامان تو ہے نہیں، خالص لکڑی ہے .... ایک جلتی ہوئی تیلی پر ایندھن بن سکتی ہے۔ دو چوکیداروں کے ساتھ مسلح افراد کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی موجود ہونا ضروری ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے .... مگر اس کے علاوہ بھی حفاظتی انتظامات پر نظر رکھو۔" میں نے کہا۔

"بہت بہتر جی۔" وہ بولا۔

"اچھا سنو .... میں ذرا جا رہا ہوں کہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے مجھے۔ اور کوئی کام تو نہیں؟" میں نے آخر میں پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا دیر بعد میں اپنی جیپ میں پنڈی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

پنڈی پہنچ کر میں نے براہِ راست اس عورت کے بنگلے کی طرف رخ کیا جس کے ساتھ گزشتہ رات کبیر رنگ رلیاں مناتا رہا تھا اور جس کی ساری مووی میرے موبائل فون میں محفوظ تھی۔ میں نے مذکورہ بنگلے کے قریب سے گزرتے ہوئے دانستہ جیپ آہستہ کی اور گردن موڑ کر نیم پلیٹ پڑھنے لگا۔

نیم پلیٹ پر "جواد احمد" کے الفاظ کندہ تھے۔ 'تو گویا یہ عورت .... جواد احمد کی بیوی تھی۔' میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ اس کے بعد جیپ تیزی سے آگے لے گیا اور سڑک کے کنارے جیپ روک کر اگنیشن سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر نظر حیات کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک کبیر احمد نے اپنے ملازم کو کمرے کے اٹیچڈ باتھ سے برآمد کر لیا ہو گا۔

دوسری طرف سے کبیر نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔ "ہیلو!"

"ہیلو .... کبیر! میرے رقیب! .... پہچانا مجھے؟" اس کی آواز پہچانتے ہی میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا تو دوسری طرف جیسے اسے چپ سی لگ گئی۔

"اتنی جلدی سانپ سونگھ گیا تمہیں؟ ابھی تو بہت سا حساب بے باق ہونا ہے۔" میں نے اس کی خاموشی سے گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کا سکتہ ابھی تک نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ میں نے غیظ آلود لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنے دو کتوں بشیرا اور گجر چوک کے کالا ناگ کا انجام دیکھ ہی لیا ہو گا۔ اور ہاں .... تم نے اپنے بیڈ روم کے اٹیچڈ باتھ سے اپنے ملازم کو برآمد بھی کر ہی لیا ہو گا۔ بے چارہ .... کل رات سے بند تھا، جب تم اپنی رسیدہ محبوبہ کے ساتھ "فری اسٹائل" رنگ رلیاں منا رہے تھے۔" میں نے دانستہ رات کا ذکر کیا تھا۔ اس انکشاف نے بھی اس کے اعصاب کو بھرپور جھٹکا دیا۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی ہکلاہٹ اُبھر آئی تھی۔

"تت .... تو .... وہ .... تم تھے؟"

"ہاں .... میں ہی تھا وہ، جو تمہارے ملازم کو اٹیچڈ باتھ روم میں بند کرنے کے بعد بڑے آرام سے تمہاری اور تمہاری چہیتی محبوبہ .... آں .... نہیں، بلکہ مسز جواد کی رنگین و سنگین کارگزاری کی تصویریں اتارتا رہا تھا۔"

"یہ .... تم .... کک .... کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سن کر میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں .... میں تو یونہی تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے تو وہ بھی نہیں سنا جو تم نشے کی جھونک میں اپنی چہیتی میڈم کو کیلاشی عامل عاروب کے بارے میں بتا رہے تھے، جس سے تم نے نگینہ کی برین واشنگ کا مکروہ اور گھناؤنا کام کرایا تھا۔" میں نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا اور تصور ہی میں اسے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں بھی جیسے اسے شاک پر شاک پہنچانے پر تلا ہوا تھا لہٰذا مزید بولا۔

"یار! میرے رقیب! معاف کرنا .... میں نے تمہارے میڈم کے ساتھ گزارے ہوئے خوب صورت لمحوں کی عکاس تصویریں بھی تیار کرا لی ہیں۔ اب ان کا مصرف سوچ رہا ہوں۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ انہیں ایسی تصویریں چھاپنے والے بدنام اخبارات کو دے دوں جو انہیں شاندار انداز میں شائع کریں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تصویریں نگینہ اور اس کے باپ کو بھجوا دوں تا کہ وہ تمہارے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں .... ایک خیال یہ بھی ہے کہ انہیں جواد کو بھجوا دوں۔ وہ اپنی بے وفا، رنگین مزاج بیوی کے ساتھ تمہیں بھی جہنم واصل کر دے گا۔"

"تت .... تم .... کیا چاہتے ہو؟" میرا جملہ مکمل ہوتے ہی اس کی لرزیدہ آواز ریسیور میں ابھری۔ وہ اگر ہارٹ کا مریض ہوتا تو یقیناً ان باتوں سے اسے زبردست اٹیک ہو چکا ہوتا اب وہ میرے کام کی بات اپنی زبان پر لایا تو میں نے خونخوار غراہٹ سے کہا۔

"صرف دو باتیں .... نگینہ کی مجبوری سے کھیلنے کا خیال بھی اپنے دل میں لانے کی جرأت نہ کرنا۔ نمبر دو .... اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ نگینہ کی یادداشت کی بحالی کس طرح ممکن ہو سکے گی؟" میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

دوسری جانب چند لمحے گہری اور پُرسوچ خاموشی طاری رہی۔ پھر اس کے بعد ایک گہری ہمکاری کی آواز اُبھری اور وہ بولا۔

"نادر علی! .... شاید تم نے میدان مار لیا۔"

اس کی آواز میں اگرچہ شکست خوردگی تھی لیکن مجھے اس میں کینچلی بدلنے والے سانپ کی سی مکاری کی بھی بُو آنے لگی جو شکار کو نگلنے کے لئے دم سادھے پھن سکیڑ کر مٹی میں منہ رکھ دیتا ہے۔

"کام کی بات کرو .... ابھی ایسے بہت میدان کھلے پڑے ہیں۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"ہاں .... مجھے منظور ہے۔" اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔ کہاں تو وہ میری آواز سنتے ہی کسی خارش زدہ کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیتا تھا اور آج اس کے لبوں سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔

"اب آئے ہو تم پہاڑ کے نیچے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ پھر لہجہ بدل کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں ان سب میں سے کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تم صرف نگینہ کی جان چھوڑ دو اور اس پر کئے گئے اپنے گندے عمل کو ہٹانے کا بندوبست کرو۔"

"مم .... میں .... " اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "اچھا .... اچھا ٹھیک ہے۔" شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کی آنا کانی اس کے لئے کس قدر بھیانک ثابت ہو سکتی تھی۔ "مم .... مگر مجھے اس کے لئے تو نگینہ کو وادی کیلاش لے جانا پڑے گا۔ کیونکہ وہ عامل وہیں رہتا ہے۔ وہی اس کا علاج کر سکے گا۔"

"کیوں .... وادی کیلاش کیوں؟" میں نے غرا کر کہا۔ "اس کی ذہنی حالت تباہ کرنے کے لئے تم سب کچھ پورے کر گئے تھے۔ اب اس کی بحالی کے لئے تم مجھے وادی کیلاش کی کہانی سنا رہے ہو؟"

"تم یقین کرو، میں سچ بول رہا ہوں۔" میری غراہٹ کے جواب میں اس کی گھگیائی ہوئی آواز ابھری۔ "عامل عاروب اپنی طویل ریاضت کے بعد واپس کیلاش جا چکا ہے۔ اب اس سے وہیں ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوا، پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "نگینہ چونکہ تمہیں پہچان پا رہی ہے اس لئے میرے کہنے پر وہ گھومنے پھرنے کے بہانے تیار ہو سکتی ہے۔ پھر وہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ کر ہم اس کیلاشی عامل عاروب سے ملاقات کریں گے۔ وہ نگینہ کی ذہنی رو بحال کر دے گا۔"

میرے پاس اس کی بات کا یقین کرنے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مَیں نے کہا۔ "رائٹ! .... مجھے بتاؤ کہ یہ سفر کس طرح اختیار کرنا ہوگا؟"

"بائی ایئر۔" وہ بولا۔ "یہاں سے ہمیں پہلے بائی ایئر پشاور سے چترال جانا پڑے گا۔ وہاں ایک چھوٹے سے چترالی قصبے "ایون" سے گزر کر کیلاش جانا پڑے گا۔ وہاں سے پیدل دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اگر کرائے کی جیپ وغیرہ مل جائے تو یہ سفر آدھے گھنٹے میں بھی طے ہو سکتا ہے۔"

"کیا کیلاش کی وادی، ایون سے اتنی ہی نزدیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں .... ایون کو وادی کیلاش کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔"

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے.........." میں اس کی معلومات سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ "عاروب کیلاش میں کون سی بستی یا قصبے میں ملے گا؟"

"کلاش آگرم میں۔"

"تو تم نگینہ کو لے کر فوری طور پر کب روانہ ہو سکتے ہو؟" میں نے فوراً مطلب کی بات کی۔

"پندرہ بیس دنوں بعد .... پروگرام.........."

"کیا .... پندرہ بیس دن؟" میں اس کی بات کاٹ کر چلاّیا۔ "تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں" میں نے وحشت آمیز لہجے میں کہا۔ "پچیسویں گھنٹے کے شروع ہوتے ہی تمہاری بربادیوں کے سلسلے کا آغاز ہو جائے گا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں تمہیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے، سمجھے!"

میرے سرد اور حتمی انداز نے اسے پریشان کر دیا۔ "اتنے لمبے اور دشوار گزار سفر کے لئے صرف چوبیس گھنٹے .... یہ بہت کم ہیں۔"

"تو پھر ایسا کرو، میرے ٹال پر آ جاؤ۔ اب باقی باتیں وہیں ہوں گی۔"

"ٹھٹھ .... ٹھہرو .... ٹھہرو.........." وہ چلاّیا۔ "کم از کم .... دو دن تو دے دو، میں نے بھی تیاری کرنی ہے اور نگینہ کو بھی رضامند کرنا ہوگا۔"

"کیوں .... نگینہ کو رضامند کرنے میں کیا مشکل ہے؟" میں نے زہریلے طنز سے کہا۔ "وہ تو اب تمہاری منگیتر ہی بننے والی ہے۔ جس کے بعد پٹ سے شادی ہونے والی ہے۔"

"پھر بھی۔ اس قدر جلدی وہ کیسے تیار ہو سکے گی؟.......... مجھے اس کو رضامند کرنے کے لئے بنیادی کام کرنا ہوگا۔" اس نے منت آمیز انداز میں کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا، اس کی بات مان کر وقت کو دُگنا کر دوں مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دباؤ برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے .... میں نے تم سے اس کی برین واشنگ کرانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ تمہارا کیا دھرا ہے۔ اسے تم خود ہی بھگتو گے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ سنپولیا کوئی چال بھی چل سکتا تھا۔ اس لئے میں اسے کم سے کم وقت دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آہستہ روی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ جلد ہی ایک بارونق شاپنگ مال نظر آ گیا۔ اس کے باہر گاڑیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ میں نے جیپ پارک کی اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر ٹہلنے کے انداز میں واپس روانہ ہو گیا۔ میرا رخ جواد احمد کے گھر کی طرف تھا۔

میں اپنی جیپ وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں بے فکروں کے سے انداز میں ٹہلتا ہوا جواد احمد کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر ذرا رکا۔ پھر انٹرکام سسٹم پر نصب کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ میرا خیال تھا کہ اندر سے کوئی ملازم یا چوکیدار وغیرہ باہر نکلے گا۔ ذرا ہی دیر بعد انٹرکام کے اسپیکر سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

میں نے اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گزشتہ شب والی عورت کی آواز تھی۔

"مجھے مسز جواد احمد سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے ملنا ہے؟ .... کس سلسلے میں؟ کون ہو تم؟" اس نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی تھی کہ وہی مسز جواد تھی اور میں اب اس کی آواز بھی اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ وہ وہی تھی جس کے ساتھ کبیر رنگ رلیاں مناتا رہا تھا۔

"جی .... میڈم! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے .... مگر آپ مجھے جانتی نہیں ہیں اور نہ ہی میں آپ کو اپنا نام بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا .... آخر تم ہو کون؟ میں کسی اجنبی سے نہیں مل سکتی۔" اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں کہا۔ یقیناً میرے تعارف نہ کرانے کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے انکار کیا تو میں نے بھی کوئی اصرار کئے بغیر بے پرواہانہ انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں .... آپ نہیں ملنا چاہتیں تو آپ کی مرضی .... میں تو آپ کے فائدے کی بات کرنے آیا تھا۔ بہرحال گڈ.........."

"ٹھٹھ .... ٹھہرو.........." انٹرکام کے اسپیکر سے وہ عورت بولی۔ "آخر تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"معاف کیجئے گا میڈم! .... یہ گفتگو اس طرح انٹرکام پر نہیں ہو سکتی۔ یہ خود آپ کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ بس اتنے اشارے کو کافی سمجھیں کہ میں آپ کے دوست کبیر سے متعلق کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کبیر کے نام نے اس پر کچھ اثر کیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے، میں گیٹ کھلواتی ہوں۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ خود بخود ہی میرے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

چند لمحے بعد ذیلی گیٹ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر مگر صحت مند سی ملازمہ نے اندر کھڑے کھڑے ذرا جھک کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندر آ جائیں۔"

میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ ماربل چپس کی پختہ روش کے دائیں جانب لان میں مسز جواد نظر آئی۔ وہ وہاں موجود بید کی کرسیوں میں سے ایک پر پُرنخوت انداز میں بیٹھی تھی۔ یقیناً مجھے اندر بلانے کے بعد وہ وہاں آ کر بیٹھی ہوگی۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

جاڑوں کی خوشگوار دھوپ لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے غور سے میری طرف تکے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور اُلجھن صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت اس کا شوہر گھر پر موجود نہیں تھا۔ ورنہ کبیر کا حوالہ سن کر مجھے وہ فوری طور پر اندر نہ بلاتی۔ بلکہ کوئی اور وقت یا مقام طے کرتی۔ اس نے نفیس مگر سادہ گھریلو لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فگر نہایت پُرکشش تھا۔

''بیٹھو.....'' میرے قریب پہنچنے پر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں ..... اب کہو، کیا کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟'' میرے نشست سنبھالتے ہی اس نے راست گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت وہ ملازمہ ہمارے قریب کھڑی تھی جو صدر دروازے سے لے کر اس تک لائی تھی۔ میرے اندازے سے وہ ملازمہ کم اور مسز جواد کی راز سہیلی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لمحاتی تجزیہ تھا جو میں نے بیٹھتے بیٹھتے کر لیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی موجودگی میں مطلب کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ملازمہ کی طرف دیکھا اور مسز جواد کی نگاہوں کا مفہوم بھانپ گئی۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے ملازمہ کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا وہ مؤدبانہ انداز میں روانہ ہو گئی۔

میں نے ہولے سے کھنکھار کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟.....اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

وہ پہلے ہی میری طرف سے ایک اضطراب آمیز پریشانی میں مبتلا تھی۔ میرے اس سوال نے اسے مزید کھولا دیا۔ وہ چڑ کر بولی۔ ''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔''

''مگر مجھے اس سے غرض ہے ..... کیونکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں، آخر کبیر جیسے امیر کبیر باپ کے بیٹے نے آپ کو بلیک میل کرنے کا کیوں سوچا؟ .....شاید وہ آپ کو موٹی آسامی سمجھتا ہے اس لئے۔'' میں پراسرار انداز میں دھیرے دھیرے بولا تو وہ بری طرح چونک اُٹھی۔

''بلیک میل؟.....اور وہ بھی کبیر مجھے کرنا چاہتا ہے؟''

''جی ہاں.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور نہایت رازدارانہ لہجے میں مزید بولا

''اس نے آپ کی غیر اخلاقی اور شرم ناک تصاویر تیار کرائی ہیں۔''

میرے الفاظ نے گویا بم دھماکا کیا۔ وہ اپنی نشست پر اچھل پڑی۔ تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر زردی نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں برہمی کی سرخی نظر آنے لگی۔

''کیا بکواس ہے؟ ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مسکراتی نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ کوئی جواب نہ پا کر شاید مزید جھلا گئی مگر اس کا دوسرا سوال نہایت معقول تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس سوال نے بتا دیا کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔

''اس نے مجھے خود بتایا ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تو اس کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔ ''آپ یقیناً گزشتہ شب اس کے ساتھ تھیں، تب اس نے خفیہ کیمرے کی مدد سے عریاں تصاویر بند کی ہیں۔ میں اس کا گہرا دوست ہوں اس لئے اس نے اس کارنامے سے نہایت فخریہ انداز میں آگاہ کر کے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد سے آپ کو بلیک میل کرے گا۔''

''میں ابھی اس سے بات کر کے کنفرم کرتی ہوں۔'' اس نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا اور قریب رکھی دوسری کرسی پر موجود اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تمام تصویریں مع نگیٹو میرے پاس ہیں۔ میں نے دوست کی مدد میں چھرا گھونپ کر یہ کام کر لیا ہے۔''

اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ میری بات ختم ہوئی تو وہ نفرت انگیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

''تو گویا اب تم مجھے بلیک میل کرو گے؟''

''ہرگز نہیں محترمہ!'' میں نے ٹھوس لہجے میں اس کے پریشان حال چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کبیر کی یہ حرکت انتہائی غیر اخلاقی اور مکروہ محسوس ہوئی تھی اسی لئے میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ اور ویسے اگر مجھے آپ کو بلیک میل کرنا مقصود ہوتا تو میں آپ کو یہ بتانے کی بجائے آپ سے موٹی رقم کا مطالبہ کر رہا ہوتا۔''

میری اس بات پر مسز جواد کے چہرے پر ایک تاثر اُبھرا۔ اپنی عریاں تصاویر کے ذکر پر بھی اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔

''لاؤ پھر .....وہ نگیٹو اور تصاویر میرے حوالے کر دو۔'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''بالکل۔ میں وہ آپ کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔'' میں نے اس کے اب سرخ پڑتے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''کیسی شرط.....؟'' اس کی نگاہوں میں شک کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

''آپ کے چہرے پر جو شرم کی سرخی ہے، اس سے بڑھ کر ایک مشرقی عورت کا کوئی زیور نہیں ہوتا۔ آپ اپنی اس شرم کی قسم کھا کر وعدہ کریں کہ آئندہ آپ اپنے نفس پر کنٹرول رکھیں گی۔ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب نہیں ہوں گی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اور اپنی گفتگو کا اثر دیکھنے کے لئے اس کے چہرے پر نگاہوں کو مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

وہ شاید سمجھی تھی کہ میرا وعدہ میرے کسی ذاتی لالچ پر مبنی ہو گا۔ مگر میری اس فرمائش پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر اس کے چہرے اور آنکھوں میں میرے لئے تشکر اور احترام کی جھلک اُبھری۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ عجیب انداز میں بولی۔

''آپ کو میرے وعدے پر کس طرح یقین آئے گا؟'' یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ ''ممکن ہے کہ آپ سے نگیٹو اور تصاویر لینے کے بعد میں پھر اسی روش پر چل نکلوں۔''

''سورج کہاں سے طلوع ہوتا ہے؟'' میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

''مشرق سے۔'' اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی جھلک اُبھری۔

''پورا یقین ہے آپ کو؟''

''ہاں۔''

''بس .....تو سمجھیں مجھے بھی آپ کے وعدے پر اتنا ہی کامل یقین ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ وعدہ آپ نہیں، آپ کے اندر کی عورت کرے گی، جو اس وقت احساسِ ندامت کی سرخی بن کر آپ کے چہرے سے عیاں ہو رہی ہے۔''

میری اس بات پر اچانک ہی مسز جواد کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''میں نے کہا نا .....آپ کے اندر کی عورت ابھی زندہ ہے۔ پلیز، اسے زندہ رہنے دیں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ نیک دل انسان معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم میں آپ کی خواہش شاید پوری نہ کر سکوں گی۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور میں ہکا بکا اس کی صورت تکنے لگا۔ ''کبیر کی حد تک تو میں آپ کی بات مان لیتی

ہوں، کیونکہ اس نے نہایت گھٹیاپن کا ثبوت دیا ہے......... مگر.........“ وہ چپ ہو گئی۔

میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ کئی لمحے گزر گئے اور اس کی خاموشی نہ ٹوٹی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”مگر کیا.........؟“ میرے لہجے میں خود بخود ہی ہلکی سی تلخی در آئی تھی۔

”اس کا جواب آپ کو ابھی مل جائے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ یک لخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے اختیاری طور پر میں نے بھی نشست چھوڑ دی۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر اندرونی عمارت کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ مجھ پر نہ جانے کون سی رو آئی تھی کہ میں بھی اس کے نقش قدم پر پاؤں آگے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ گویا کسی ٹرانس میں تھی اور میں اس کے انداز کے ٹرانس میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پختہ روش عبور کی اور پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ کوریڈور سے گزر کر وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ وہ کمرا ایک بیڈ روم تھا جس کے جہازی سائز بیڈ پر ایک تختی الوجود گہری نیند میں لیٹا نظر آ رہا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک وہیل چیئر رکھی ہوئی تھی۔

وہاں پہنچ کر وہ مڑی اور عجیب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اس سوئے ہوئے شخص کا نام جواد احمد ہے......... معذور اور بے مصرف جواد احمد.........!“ اس کے لہجے میں استہزا کے ساتھ ہلکی سی تلخی بھی تھی۔ میرے سان و گمان میں بھی یہ صورت نہیں آ سکتی تھی۔ میں دم بخود اپنی جگہ کھڑا تھا۔ چند لمحے اس طرح گزرے۔ پھر گویا میں کسی ٹرانس سے باہر نکل آیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ اس کے کرتوتوں کا انجام ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ جب تک ٹھیک تھا، گردن تک عیاشیوں میں غرق رہتا تھا۔ مجھ پر اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں اس کی رفاقت کو ترستی تھی مگر اس کی تمام تر توجہات وہ خوب صورت مگر بد سیرت تتلیاں ہوتیں جو مردوں کو رجھانے اور انہیں نچوڑنے کا فن اچھی طرح جانتی ہیں۔“

میں نے دیکھا، اس کی نظریں فضا میں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں سمجھاتی، بلکتی، اس کی خوشامدیں کرتی مگر اس کی روش نہ بدل سکی۔ پھر اچانک اسے گردن توڑ بخار ہوا جو جاتے جاتے اس کا یہ حال کر گیا کہ اب یہ محض زندہ لاش بن کر رہ گیا ہے۔ جبکہ میں خواہشوں اور جوان اُمنگوں کا چلتا پھرتا، سانس لیتا بھرپور بدن رکھتی ہوں......... اس لئے میں کبیر سے تو دوستی اختیار کر لوں مگر.........“ اس نے سر جھٹکا اور زہر بھرے لہجے میں دوبارہ بولی۔ ”یہ میرا اس خبیث سے انتقام بھی ہے۔“ اس کا اشارہ اپنے شوہر کی طرف تھا۔

اس کی باتوں سے میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ وہ ہمارے معاشرے کے ایک کریہہ رخ کی عکاس تھی۔

”آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”پہلے میرا یہی ارادہ تھا۔ مگر پھر مجھے اس پر ترس آ گیا.........“

”شاید اس کی دولت آڑے آ گئی ہو گی؟“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر طنزیہ انداز میں کہا۔

”آپ کو یہ بے ہودہ خیال کیوں آیا؟“ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ”اس کی جب مجھ سے شادی ہوئی، یہ اس وقت سڑک چھاپ تھا۔ میں اس کی نہ معلوم کس ادا پر فدا ہوئی کہ اسے اپنا شوہر بنا لیا۔ ساری دولت میری ہے جو میرا باپ میرے لئے چھوڑ کر مرا تھا۔“ اس کے چہرے کی سرخی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ غصے کی سرخی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”بہرحال.........“ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میری خواہش تھی کہ آپ محض اپنے نفس کی غلام نہ بنیں۔ لیکن شاید.........“ میں کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

”شاید اسی میں عقل مندی ہے۔“ اس نے میری تائید کی۔ ”البتہ میں آپ کی خواہش کے احترام میں اب کبیر سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ آپ وہ تصاویر میرے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلانے کے انداز میں جواب دیا۔ ”میں وہ تمام چیزیں آپ کو دے دوں گا۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ”آپ انہیں خود ہی ضائع کر دیں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہونے لگا ہے۔“

”میں اس اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ ”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔“

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ یکا یک اسے یاد آیا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ”آپ اتنا سمجھ لیں کہ پہلے میں کبیر کا دوست تھا مگر اب اس کا دشمن ہوں......... خدا حافظ!“ میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے تھے۔

❄ ❄ ❄

میرے پاس دو دن تھے۔ اگرچہ کبیر کو میں نے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس مدت میں اس کے لئے روانگی خاصی مشکل تھی اس لئے اپنے طور پر میں نے اسے دو دن کا وقت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ میں اس امر سے بھی بہ خوبی واقف تھا کہ وہ میرا دشمن تھا اور دشمن کی کسی بات پر اعتبار کرنا کبھی عقلمندی نہیں ہوتی۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوئی بھی چال چل سکتا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ مسز جواد کے ساتھ بنی ہوئی اس کی تصویریں اسے کسی حماقت سے باز رکھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوں گی۔

ایک طرف یہ معاملہ تھا، دوسری طرف مجھے یہ بھی فکر تھی کہ میں اپنی اس آئندہ مہم کے بارے میں ماں کو کس طرح آگاہ کروں۔ کیونکہ یہ تو طے تھا کہ میں نگینہ کو صرف کبیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ وادی کیلاش کا سفر ضرور کرنا تھا۔

ماں اگرچہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھیں تاہم ایسی حالت میں بھی نہیں تھیں کہ میں انہیں تنہا چھوڑ کر کسی نامعلوم سفر پر روانہ ہو سکتا۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ماں کو اس بارے میں آگاہ کروں یا نہ کروں۔ مگر اس رات کھانے پر انہوں نے خود ہی نگینہ کا ذکر چھیڑ کر مجھے موقع فراہم کر دیا۔

”بیٹا! تم نے دیکھ لیا نا......... سانپ کی اولاد سانپ ہی ہوتی ہے۔ نگینہ نے پہلے تو تمہاری محبت کے جوش میں آ کر بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دے کر کیس ہی پلٹ دیا تھا لیکن بعد

میں وہ صاف مکر گئی۔'' ان کے لہجے میں نگینہ کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔

چونکہ انہیں نگینہ کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی نہ تھی اس لئے ان کی سوچ کو بے جا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے نگینہ کی صفائی میں صرف اتنا کہا۔

''نہیں ماں! یہ بات نہیں ہے۔ نگینہ واقعی ایک اچھی، نیک فطرت کی لڑکی ہے۔ اس نے عدالت میں اپنے باپ شاہ میر کے خلاف میری محبت کے جوش میں گواہی نہیں دی تھی بلکہ وہ بذاتِ خود سچ کو سامنے لانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو نادر؟'' ماں نے میری طرف چونک کر دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں ماں!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''نگینہ کے ساتھ درحقیقت ایک بہت بڑی اور پراسرار ٹریجڈی ہوئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ میرا خیال تھا کہ ماں یہ سن کر نگینہ سے متعلق اپنی غلط فہمی ترک کر دیں گی۔ مگر وہ اٹل لہجے میں گہری متانت سے بولیں۔

''نادر!..... کچھ بھی سہی، نگینہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے۔ تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میں دشمن کی بیٹی کو اپنے شوہر کے قاتل شاہ میر کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لوں گی؟..... ہرگز نہیں۔ اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال ہے تو اسے کھرچ کر نکال ڈالو۔''

ماں کی اس بات پر میں گنگ رہ گیا۔ میرے تو یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کی خوشی کو اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھانے میں بھی دریغ نہیں کریں گی۔

''ماں!..... یہ..... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔ میرے یہ الفاظ گہرا کرب لئے ہوئے تھے۔ مگر ماں اسے خاطر میں لائے بغیر سرد اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔

''ہاں نادر!..... میں جو کہہ رہی ہوں، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو حیرت ہے، آخر تُو نے اپنے باپ کے قاتل اور اپنی ماں کو بے گناہ داخل زنداں کرانے والے بے رحم و سفاک دشمن کی بیٹی سے محبت کی پینگیں کیسے بڑھائیں؟..... کیا تُو بھول گیا کہ صرف شاہ میر کی وجہ سے تُو نے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے جنم لیا تھا..... وہی ان سارے مصائب کا ذمہ دار ہے۔ اور ہاں، ابھی تیرے ماموں کی جان بھی اسی وجہ سے گئی ہے۔''

ماں کے لہجے میں جوش غیظ کی گھن گرج تھی۔ چہرہ آتش انتقام سے تمتما رہا تھا۔

''ماں! یہ سب بھلا میں فراموش کر سکتا ہوں.....؟'' میں نے رسان سے کہا۔ ''ماں! میری تو زندگی کا مقصد ہی اپنے باپ کے قاتلوں اور تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ لیکن ماں!..... ذرا سوچو تو، اس میں نگینہ کا کیا قصور ہے؟''

''اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ میرے شوہر کے قاتل کی بیٹی ہے؟'' ماں نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو کوئی قصور نہ ہوا۔'' میں نے کہا۔

ماں چند ثانئے میرے چہرے کو بہ غور، پُرسوچ نظروں سے تکتی رہیں۔ پھر جیسے اندر ہی اندر کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ''نگینہ جب تمہاری زندگی کا حصہ بن جائے گی تو پھر تمہارے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر اوس پڑ جائے گی اور جس طرح آج تم دشمن کی بیٹی کی وکالت کر رہے ہو، پھر اس کے باپ کی وکالت بھی کرنے لگو گے۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا ماں!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ایسا ہوگا نادر!.....اور ضرور ہوگا۔''

''لیکن ماں.....!''

''بس نادر!..... تمہیں آج ہی اور اسی وقت ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔'' ماں نے میری بات کاٹ کر دم بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا..... نگینہ..... یا ماں کا۔''

''ماں! نگینہ میری زندگی ہے۔'' میں تڑپ کر بولا۔

''یہ زندگی تجھے چھوڑنا ہوگی۔'' ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور نشست چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس انداز میں اس قدر سرد مہری تھی کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

چند قدم چل کر وہ ٹھہری اور کچھ سوچتی رہی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں مختلف متضاد کیفیات کا عکس جھلکتا نظر آیا تھا۔ وہ یقیناً میری کیفیات سے اور واردات ہائے قلبی سے بخوبی واقف تھی۔ مائیں تو اولاد کی خوشی کو ہر شے پر مقدم رکھتی ہیں، انہیں ہر حال میں ان کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔ مگر میری ماں میری خوشیوں کی راہ میں حائل تھی۔ شاید اس میں کچھ قصور میرا بھی تھا کہ میں نے اپنے دشمن کی بیٹی سے دل لگا لیا تھا۔ ایک طرف میری ماں کے لئے میری محبت تھی جس کا تقاضا تھا کہ وہ میری پسند کو اپنی پسند سمجھے۔ دوسری طرف وہ نفرت تھی جو نگینہ کے باپ کے کرتوتوں کے باعث اس کے وجود میں پیہم موجزن تھی۔

وہ چند لمحے وہیں خاموش کھڑی رہی۔ پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''نادر! مجھے پوری امید ہے کہ تم میرے حکم سے روگردانی کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی اور برف جیسی سرد کاٹ تھی۔ ''میں اپنے دشمن کی بیٹی کو اپنی نگاہوں کے سامنے چہلیں کرتے ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''مگر ماں!.....'' میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا اور بولی۔ ''اس معاملے میں کسی ''اگر مگر'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''ماں! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔'' میں نے التجا بھرے انداز میں کہا۔ ''میں تیرا بیٹا ہوں۔'' میری آواز میں رقت اُترنے لگی۔

''ہاں.....تُو میرا بیٹا ہے۔ اس لئے تجھے یاد دلا رہی ہوں کہ تُو اپنی ماں کے دشمنوں کو نہ بھول اور یاد رکھ کہ تیرے باپ کے قاتل بھی وہی ہیں جنہوں نے تیری ماں کو زندہ درگور کر دیا تھا۔'' اس کے لہجے میں اس قدر سنسناہٹ تھی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ''غور سے میری بات سن اور ہمیشہ دھیان میں رکھ۔ اگر تو نے میرا کہا نہ مانا تو میں سمجھوں گی کہ تُو قادر خان کی اولاد نہیں ہے۔''

''ماں.....!'' شدتِ کرب سے میری آواز پھٹنے لگی تھی۔ ''مجھے اتنی بڑی گالی تو نہ دے۔''

''یہ گالی تیرے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی ہے۔'' اس نے میرے انداز پر کوئی توجہ دیئے بغیر جواب دیا۔ ''غیرت اور حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ تُو اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام کی منصوبہ بندی کرے کہ.....'' وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ میں اپنی جگہ لرزتا، کانپتا رہا۔

''اب تُو کل تک مجھے فیصلہ کر کے بتا دے کہ تُو کیا چاہتا ہے.....اپنی محبت یا پھر باپ اور ماں کا انتقام؟'' اس نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں بے دم سا ہو کر صوفے پر گر پڑا۔ ماں کے تیر و نشتر جملوں اور تند رویے نے مجھے بے حال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماں اولاد کے معاملے میں اس قدر کٹھور پن اور بے اعتنائی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے ماں سے بے اندازہ محبت تھی۔ مجھے اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ ماں نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ شاید حالات نے ماں کے دل کو سخت بنا دیا ہے۔ اس میں ان کا بھی تو قصور نہیں تھا۔ لیکن بہرحال انہیں اپنے بیٹے پر، مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔ ایسے میں مجھے اب ماموں حیدر گل بہت یاد آنے لگے۔ وہ ہوتے تو آج شاید ماں کو میری طرف سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

انتقام نے ماں کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ ماں نے نگینہ کا اس انداز میں تذکرہ چھیڑ کر مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اور یہی نہیں، ماں نے تو مجھے کل تک کا الٹی میٹم بھی دے دیا تھا کہ میں انہیں ایک فیصلہ کر کے بتا دوں کہ مجھے دونوں میں سے کس کا انتخاب کرنا تھا؟.....نگینہ میری زندگی تھی۔ اسے بھلانے کا تو میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ ماں تو ماں تھی۔ میں اس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

آج مجھے ماموں حیدر گل کی بات کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیوں بار بار میری ماں سے التجا کرتے تھے کہ مجھے اس جنگ سے دور رکھا جائے۔ یہی وہ اہم موضوع تھا جس پر دونوں بہن بھائی (ماں اور ماموں) کے درمیان اکثر تلخ کلامی بھی ہوتی رہی تھی۔ میرے دل و دماغ بری طرح جھنجلا رہے تھے۔

ماں نے مجھے کل تک سوچنے کی مہلت دی تھی۔ جبکہ یہ کٹھن اور ناممکن حد تک مشکل فیصلہ تو مجھ سے صدیوں کی مہلت ملنے پر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہو رہا تھا۔ یہ بہت کٹھن لمحات تھے، جنہوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر دیا تھا۔

ادھر کبیر کو دی ہوئی مہلت کا ایک دن گزر چکا تھا اور کل صبح ہم نے نگینہ کو لے کر چترال اور پھر وادی کیلاش روانہ ہونا تھا۔ مگر اس نئی اور غیر متوقع صورت حال نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ماں کو میں نے نگینہ کی طرف سے بہت قائل کرنے کی کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ ماں نے مزید اس سلسلے میں کوئی بات کرنا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ نگینہ کے ساتھ بڑی گھناؤنی سازش کی گئی تھی۔ اس کا برین واش کر کے مجھے اس سے دور کر دیا گیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اب کبیر اس کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاہ کا بھیانک منصوبہ بنا چکا تھا۔ لیکن میری بروقت حکمت عملی نے اس کے گھناؤنے منصوبے پر کسی حد تک پانی پھیر کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ مجھ پر یہ لازم تھا کہ میں اپنی نگینہ کی ہر ممکن مدد کروں۔ وہ بے چاری کچھ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا بھیانک کھیل کھیلا جا چکا تھا اور کھیلا جانے والا تھا۔

میں اگلے دن ناشتہ کئے بغیر سیدھا ٹال پہنچا۔ ایک تو ویسے ہی میرا ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ میں ماں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ٹال میں اپنے آفس میں آنے کے ذرا دیر بعد میں نے کبیر سے بات کرنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ کے نمبر پنچ کئے تو دوسری جانب سے کبیر کی ملازمہ نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ کبیر کہیں باہر نکل چکا تھا۔ میں نے غصے سے دانت بھینچ لئے۔

کبیر کو دی ہوئی مہلت کا صرف ایک دن باقی تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے وہ نگینہ کو تیار کرنے کے لئے گیا ہو؟

ایک بجے کے قریب میں نے دوبارہ اسے فون کرنا چاہا تو میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی بیل گنگنانے لگی۔ میں نے فوراً ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

''نادر علی خان؟'' دوسری طرف سے استفہامیہ کہا گیا۔ یہ کبیر احمد تھا۔

''ہاں بول رہا ہوں میں .....کل تیار ہو نا پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو تیار ہوں لیکن نگینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بولا تو طیش کی ایک لہر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

''بکواس بند کرواپنی۔تم مجھے بلف کرنا چاہ رہے ہو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔''اگر میری بات پر بھروسہ نہیں ہے تو خود جا کر نگینہ سے مل کر دیکھ لو۔''

''بکواس نہ کرو۔تم اچھی طرح جانتے ہو، میں نگینہ سے نہیں مل سکتا۔آخر ہوا کیا ہے اسے؟'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''کچھ خاص نہیں۔موسمی بخار ہے اسے۔تین چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ بولا۔

''یہ معمولی بات ہے.....تم اسے راضی کرو۔وہ مان جائے گی۔''

میں نے اصرار کیا تو وہ بولا۔''وہ بہت نازک مزاج ہے۔ایسے میں تو اس کے پپا بھی سفر کی اجازت نہیں دیں گے۔''

میں نے محسوس کیا کہ کل کے مقابلے میں آج اس کے لہجے میں ڈر، خوف یا پریشانی نہ تھی۔وہ بہن بے خوفی سے اور بے پرواہانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالوں۔جی تو چاہا کہ اسے ٹیلی فون پر ہی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دوں .....لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ ہو سکتا ہے، یہ خبیث اور ابنِ شیطان ٹیلی فون پر میری گفتگو ریکارڈ کر رہا ہو۔تاہم پھر بھی میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے اس سے کہا۔

''کبیر! میری ایک بات یاد رکھنا۔اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ مت بھولنا کہ تمہاری دُکھتی رگ میرے ہاتھوں میں ہے۔''

دوسری طرف چند لمحے اسرار بھری پُرسوچ خاموشی چھائی رہی۔پھر اچانک ہی اس نے کچھ کہے بنا رابطہ منقطع کر دیا۔مجھے اس کی دیدہ دلیری پر پہلے تو سخت طیش آیا، پھر حیرت آمیز اُلجھن بھی ہوئی۔آخر اسے کس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ میں مسز جواد کے ساتھ بنائی گئی اس کی شرمناک تصاویر سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کبیر، مسز جواد سے ملا ہو۔اگرچہ میں مسز جواد کو آخر میں تاکید کر آیا تھا کہ اس بات کا ذکر کبیر سے ہرگز نہ کرے اور نہ ہی غیے کا اظہار کرے۔بس غیر محسوس طریقے سے اس کے ساتھ قطع تعلق کر لے۔ہو سکتا ہے اس نے کبیر سے میری ملاقات کا ذکر کر دیا ہو؟ مگر مجھے اس کا خدشہ کم ہی تھا۔کیونکہ مسز جواد یہ حقیقت اسے بتا کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں مار سکتی تھی۔

تو پھر آخر کبیر کے لہجے میں آج اتنی بے خوفی اور طمانیت کیوں در آئی تھی؟ ایسا کیا ہوا تھا آخر؟ آج اس کا لہجہ کل کے مقابلے میں اتنا بدلا بدلا کیوں تھا؟ کل تو جیسے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔مگر آج ایسا نہ تھا۔کیوں؟ .....اور اس کیوں کا جواب میری سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ خود کبیر سے جا کر ایک ملاقات کروں یا پھر ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ میں تھوڑے دن مزید انتظار کر کے دیکھ لوں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ میں ان تصاویر کو بہر حال دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔یہ ارادہ میں نے مسز جواد سے ملاقات کرنے کے بعد کیا تھا۔کیونکہ مسز جواد بہر حال کوئی پیشہ ور عورت یا طوائف زادی نہیں تھی۔تلخ حالات اور مجبوری نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا اور میرا مسز جواد سے ملنے کا مقصد بھی یہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ میں اسے بھی ان شرم ناک تصاویر کو طشت از بام کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں۔اور شاید کسی حد تک میں کامیاب بھی ہوا تھا۔چنانچہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شرم ناک ایشو منظرِ عام پر آئے۔میں نے تو محض کبیر کو دھمکانے کے لئے ایسا کہا تھا۔

تو کیا پھر .....کبیر کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا؟ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔لیکن کیسے؟ اُسے بھلا اس بات کا کیونکر اندازہ ہو سکتا تھا؟ جب تک کہ اسے مسز جواد اپنی اور میری ملاقات کے بارے میں نہ بتاتی۔

''تو کیا پھر مجھے مسز جواد سے کنفرمیشن کرنی چاہئے تھی؟' میں نے سوچا اور یہ خیال آتے ہی مسز جواد کا نمبر ملانے لگا۔رابطہ ہونے پر اس کی ملازمہ نے فون اٹھایا۔

''مسز جواد تشریف رکھتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں.....وہ تو دفتر گئی ہوئی ہیں۔''

''دفتر کا نمبر.....؟''

''جی مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولی اور اس نے مجھے مسز جواد کے دفتر کا نمبر بتا دیا۔میں نے اسی وقت وہ نمبر ملایا۔

''میڈم سے بات کروا دیں۔''

''آپ کون.....؟''

''آپ پلیز ان فضول باتوں کو چھوڑیں، مجھے ان سے فوراً ضروری بات کرنا ہے۔میری ان سے فوراً بات کرائیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔'' اس بار لڑکی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھیں، میں ان کا قریبی عزیز ہوں۔''

''کمال ہے۔آپ ان کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے پاس میڈم کا سیل نمبر بھی نہیں ہے۔اور نہ ہی ان کے آفس چیمبر کا ذاتی فون نمبر ہے۔''

لڑکی نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔مگر اس کا بھی دوش نہ تھا اور پھر غلطی میری بھی تھی۔میں نے مسز جواد کو اب تک اپنا نام ہی نہیں بتایا تھا۔میں کیا پیغام دیتا۔چنانچہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور گہری سوچ میں غلطاں ہو گیا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلا قدم کون سا اٹھایا جائے۔کبیر مجھے ڈاج دینے کی کوشش کر رہا ہے۔اب یہ تو وقت ہی بتاتا کہ اس کی نیت میں کیا فتور تھا۔مجھے نگینہ کے اس پراسرار معاملے کے سلسلے میں جلد از جلد اگلا اسٹیپ اٹھانا تھا۔اس گمبھیر معاملے میں جتنی بھی تاخیر نگینہ اور میرے لئے نقصان دہ ہوتی۔

ایک خیال یہ بھی میرے دل میں آیا کہ نگینہ کو اغواء کر کے وادی کیلاش کا رخ کروں۔اگرچہ یہ ایک خطرناک اور دشوار کام تھا۔لیکن میں نگینہ کی بھلائی کی خاطر یہ مشکل کام بھی کرنے کی ٹھان سکتا تھا۔لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت کیلاشی عامل عاروب کی تلاش اور اسے پہچاننے کی تھی۔یوں تو وہ بہ قول نگینہ کے خود کو کیلاشیوں کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا اور مربی بتاتا تھا اور ایسی معروف شخصیت کو تلاش کرنا بھی مشکل نہ تھا۔مگر پھر اسے اس کام پر رضامند کرنا اور نگینہ کو دوبارہ اصل حالت میں لانے کے لئے اقدام کرنا، یہ ایک اور مشکل کام تھا۔البتہ کبیر کی موجودگی میں یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

اُس روز تو میں شام پانچ بجے ہی گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔کبھی موڈ ہوتا تو ''کلڈانہ چوک'' پر کشمیری

چائے پیتا ورنہ بائیں طرف نتھیا گلی جانے والے راستے ہو لیتا تھا۔ مگر آج میں تین بجے ہی ٹال سے اٹھنے کے لئے تیار ہوا اور جیسے ہی دفتر سے باہر ٹال کے احاطے میں کھڑی اپنی جیپ کی طرف بڑھا، ایک سیاہ رنگ کی مرگلہ اندر داخل ہوئی۔ میں ذرا چونک کر رک گیا۔ یہ کار اعظم خان کی تھی۔ وہ ڈرائیور کی برابر والی اگلی نشست پر براجمان تھے اور عقبی سیٹ پر ایک گن مین بھی موجود تھا۔ کار رکتے ہی ڈرائیور اُترا۔ مگر اعظم خان خود ہی دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔ ان کا باڈی گارڈ بھی پیچھے اُتر آیا تھا۔

"انکل! .... آپ .... آئیں، اندر تشریف لائیے۔" میں نے مسکرا کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور مصافحہ کیا۔

"ہاں نادر بیٹا! اچھا ہوا تم مل گئے۔" وہ بولے۔ "ورنہ مجھے گرین لاج جانا پڑتا۔ آؤ، میں نے کچھ ضروری بات کہنی ہے تم سے۔"

ہم اندر آفس روم میں آ گئے۔ میں نے اُنہیں ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کا کہا۔

"نہیں بیٹا! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بیٹھو تم۔" وہ سامنے ایک کرسی سنبھال کر براجمان ہو گئے تو میں جواباً چیئر پر بیٹھ گیا۔

"نادر بیٹے! آج صبح ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ میری نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بولے۔ "وہ امنِ عامہ کے حوالے سے گفتگو کرنے آئے تھے۔ اُنہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ ہماری شاہ میر اور نظر حیات سے پرانی رنجش چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے دوستانہ درخواست کی تھی کہ میں ان کی تادیب سے تمہیں بالخصوص بھابی شبینہ کو آگاہ کر دوں کہ اگر شاہ میر یا نظر حیات کو خوف زدہ کرنے کی کوئی گمنام کوشش کی گئی لاء اینڈ آرڈر کی چویشنز پیدا کی گئی تو تم سے اور بھابی شبینہ سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی اور میں اعظم خان سے بولا۔

"انکل! کیا یہ تادیب آمیز دھمکی صرف ہم ماں بیٹے کے لئے ہی تھی یا.........؟" میں نے طنزیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ میری طرف دیکھ کر خلیقانہ لہجے میں مسکرا کر بولے۔

"کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر آئے تھے اور اس سے پہلے وہ یہی تادیب شاہ میر اور نظر حیات کو بھی کر چکے ہیں۔ تم گھر جا کر یہ بات بھابی شبینہ سے بھی کہہ دینا۔ میں بھی کسی وقت آؤں گا۔ او کے، اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے انکل! یہ کیا......... آپ بیٹھئے تو سہی۔"

"نہیں بیٹا! میں جلدی میں ہوں .... پھر کبھی سہی۔" انہوں نے کہا اور واپس لوٹ گئے۔ میں ثانیے احاطے میں اپنی جیپ کے قریب آ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"بڑے آدمی ہیں جی.........." اچانک منیجر مشتاق سیال نے کھنکھارنے والے انداز میں کہا۔

میں خیالات سے یکدم چونک کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ گھبرا سا گیا۔ "وہ .... مم .... مطلب تھا جی، خان صاحب چائے شائے پیئے بنا ہی چلے گئے۔"

"ہاں .... انہیں جلدی تھی۔" میں نے کہا۔ "اچھا سنو......... میں جا رہا ہوں۔ کوئی بات ہو فون پر بتا دینا۔"

"او جی، میرے ہوتے ہوئے آپ فکر ہی نہ کریں۔ کوئی گل بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاکے۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"کیا؟ .... اب نیا تکیہ کلام اپنا لیا ہے تم نے؟ .... بڑے لوگ چھوڑ دیا؟" میں نے ازراہِ تفنن کہا۔

وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ "آہو جی .... سال نیا، کلام نیا تو تکیہ بھی نیا۔"

"اچھا، اچھا .... اپنے پاس رکھو یہ تکیہ بھی اور کلام بھی۔ میں چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور جیپ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

گرین لاج پہنچ کر میں نے ماں کو انکل اعظم خان کا پیغام دے دیا۔ ان کا بھی وہی رِدِّ عمل تھا جو میرا یہ سن کر ہوا تھا۔ وہ نفرت خیز لہجے میں بولیں۔

"ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر نے ہمارے ٹال میں لگنے والی آگ کے بارے میں اب تک کیا تفتیش کی ہے، جو یوں ڈھکے چھپے انداز میں دھمکیاں پہنچا دیں ہم ماں بیٹے کو؟"

جواباً میں خاموش رہا۔

"نادر! کل صبح ہم دونوں ایس پی وجاہت قریشی سے ملیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ماں رات والی گفتگو نہ چھیڑ دیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم نے خاموشی سے اکٹھے کھانا کھایا اور پھر آرام کرنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اگلے دن علی الصباح ماں تیار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس کے اوپر موسم کی مناسبت سے فر کا کوٹ لے رکھا تھا۔ ان کی شخصیت اس عمر میں بھی جاذبِ نظر اور پُر وقار تھی۔ ہلکا براؤن فر کوٹ ان کی شہابی رنگت پر بہت جچ رہا تھا۔ پہاڑی عورتوں کی طرح ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی پُر جوش چمک اور چہرے پر رعب و دبدبہ تھا۔ کھڑی ناک اور تیکھے چتونوں پر پُر اعتماد سی تمتماہٹ تھی۔ اس وقت وہ بڑی دبنگ اور بھاری بھرکم خاتون نظر آ رہی تھیں۔ میں نے گرین لاج سے روانہ ہوتے وقت انہیں اپنے فر کے کوٹ کے اندر کمر سے بندھے ہولسٹر میں ایک اڑتیس بور کا جرمن ریوالور بھی اُڑستے ہوئے دیکھا تھا۔

گرین لاج سے باہر آ کر انہوں نے مجھ سے جیپ کی چابیاں لیں اور پھر بڑے غصے کے ساتھ جیپ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

میں ان کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گیا۔ انہوں نے جیپ اسٹارٹ کی اور گیئر بدل کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ دور ترائیوں میں پھیلے مرغزاروں پر برف کے بادل سے تیر رہے تھے۔ نیچے صنوبر اور چیڑ کے دو رویہ درختوں کے بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک کے کنارے رات بھر ہونے والی ہلکی برف باری کے آثار دودھیا پٹی کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔

ماں خاصی تیز رفتاری مگر بڑی مہارت سے جیپ دوڑائے جا رہی تھیں۔ کلڈانہ چوک پر آ کر فول گھمایا اور پنڈی کی طرف جانے والی سڑک پر جیپ ڈال دی۔

یوں ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہم دونوں ماں بیٹے نیچے اترے۔ ایس پی وجاہت قریشی اپنے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے اردلی کے ہاتھ پیغام پہنچایا تو انہوں نے فوراً ہمیں اندر بلا لیا۔

ایس پی وجاہت قریشی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے۔ وہ درمیانی قد و قامت مگر اچھی صحت کے مالک تھے۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ہمیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے سامنے رکھی دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ایس پی صاحب! اعظم خان کے ہاتھوں آپ کا اور کمشنر صاحب کا پیغام مجھے موصول ہوا تھا۔'' ماں نے ان سے مخاطب ہو کر گہری متانت سے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمارے دوستانہ پیغام کا نوٹس لیا اور یہاں آنے کی زحمت کی۔'' ایس پی وجاہت قریشی نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''تو اس کا مطلب اگر شاہ میر اور نظر حیات کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو لامحالہ ہمیں ہی زیر عتاب لایا جائے گا۔''

میرا خیال تھا کہ ماں کی بات پر ایس پی صاحب مرونا کچھ بولیں گے۔ مگر انہوں نے بھی یک دم سنجیدہ ہو کر صاف گوئی سے کہا۔ ''ہاں!..... پوچھ گچھ اور تفتیش کے سلسلے میں ہم بھی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ آپ دونوں کی چپقلش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ آن دی ریکارڈ ہے۔''

''تو پھر آپ کے علم میں یہ بات بھی ہو گی کہ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ٹال کو آگ لگا دی گئی تھی اور پولیس نے یہ واقعہ ''نامعلوم شر پسندوں'' کے روایتی عنوان کے کھاتے میں ڈال کر تفتیش شروع کر دی گئی۔ تو کیا شاہ میر اور نظر حیات کو آپ کی تفتیش یا پوچھ گچھ کے عمل سے گزرنا پڑا یا نہیں؟'' ماں کے ان چبھتے جملوں نے ایس پی صاحب کو ذرا جز بز تو کیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولے۔

''ہاں.....متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر اعجاز شمس تفتیش کر رہے ہیں۔''

''آپ نے شاید میرے سوال پر غور نہیں کیا ایس پی صاحب!'' ماں نے دبنگ لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف شواہد نہیں ملے۔'' وہ جواباً بولے۔

''ہوں.....'' ماں نے ایک اسرار بھری ہنکاری بھری، ''اگر یہی آگ شاہ میر اور نظر حیات کی رہائش گاہ کو نگل لے تو.....؟''

''آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں محترمہ شبینہ؟'' ایس پی صاحب نے بہ غور ماں کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ جو دھمکی آمیز پیغام آپ نے اعظم صاحب کے ہاتھوں ماں بیٹے تک پہنچایا تھا، کیا وہ نظر حیات اور شاہ میر تک بھی پہنچایا گیا تھا؟'' ماں نے پوچھا تو جواب میں ایس پی صاحب لمحاتی خاموشی کے بعد مختصراً بولے۔

''ان دونوں تک بھی ہمارا پیغام عنقریب پہنچا دیا جائے گا۔''

ان کی بات پر ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور گویا ہوئیں۔ ''نادر! تم تو کہہ رہے تھے اعظم صاحب نے بتایا تھا کہ ہم سے پہلے ان تک یہ پیغام پہنچایا گیا تھا۔''

ماں کی بات پر میں نے ایس پی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی ہاں ایس پی صاحب! خان صاحب نے یہی بتایا تھا۔ کیا یہ بات درست نہیں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا تھا ان سے۔ البتہ ہو سکتا ہے، کمشنر صاحب نے یہ سوچ کر اعظم صاحب سے کہہ دیا ہو کہ آپ لوگوں تک پیغام پہنچانے کے بعد شاہ میر اور نظر حیات تک بھی فوراً یہ پیغام پہنچا دیا جائے گا۔''

''اور وہ ''فوراً'' اب تک نہیں آئی .....اور شاید آئے بھی نہ۔'' ماں نے استہزائیہ کہا تو میں نے دیکھا، ایس پی صاحب کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔

''دیکھئے خاتون! ہم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ آپ کو اس قسم کے ریمارکس نہیں دینے چاہئیں۔''

''چاہے آپ لوگ جانبداری برتتے ہوئے مظلوم کو ظالم ثابت کرنے پر تل جائیں؟''

''شبینہ خاتون!.....آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔'' ایس پی کو بھی غصہ آ گیا۔ تب میں نے بھی مداخلت کشائی کی۔

''ایس پی صاحب! آپ اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے غلط بات کر رہے ہیں۔ ہمارا ٹال نذرِ آتش کر دیا گیا، پولیس کچھ نہ کر سکی۔ اس کے بعد ہماری رہائش گاہ پر شبِ خون مارا گیا۔ میری ماں بال بال بچی اور میرے ماموں اور ہمارے ایک پرانے ملازم (فضل چاچا) کو قتل کر دیا گیا۔ انتظامیہ نے کیا، کیا اب تک؟.....اُلٹا ہمیں ہی بلیک میل کیا جا رہا ہے؟''

''مسٹر نادر علی خان! تم ماں بیٹا کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے تم لوگوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں؟'' ایس پی وجاہت قریشی نے میری طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لاہور کے گجر نالہ کے زمیندارہ ہوٹل اور گلبرگ کے بنگلے میں جو خون ریزی کی گئی، ہم اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں بتایا بھی گیا کہ یہ خون ریزی کس نے پھیلائی ہے۔ لیکن ہم نے تم ماں بیٹے سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی۔''

مجھے ایس پی وجاہت کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے پوچھا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں، آپ کو یہ اطلاع دینے والے کون تھے؟.....اور انہوں نے اس خون ریزی کا ذمے دار کس کو ٹھہرایا تھا؟''

''یہ ہمارا سیکرٹ ہے..... جسے ہم اپنی نظروں میں رکھ کر کسی بھی وقت خفیہ کارروائی کر سکتے ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''یہ سیکرٹ نہیں ہے ایس پی صاحب! بلکہ چشم پوشی ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ آپ جان گئے ہوں گے کہ جن لوگوں نے آپ کو خون ریزی کی اطلاع بہم پہنچائی، ان کو سب سے پہلے آپ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا کہ آخر انہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیونکہ پولیس، انتظامیہ اور اخباری اطلاعات کے مطابق اس خون ریزی کا شکار ہونے والے انتہائی خطرناک مجرم تھے جو پولیس کو مطلوب تھے۔ پھر تو یقیناً آپ کو خفیہ ذرائع سے اطلاع دینے والوں کا کوئی نہ کوئی تعلق، ان خطرناک مقتول مجرموں سے بنتا تھا۔''

میں نے دانستہ اخبارات کی خبروں کا حوالہ دیا تھا۔ حالانکہ میری نظروں سے شاید یہ خبر گزرنے سے رہ گئی تھی۔ میری بات پر ایس پی وجاہت قریشی نے چند لحظے سنسناتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر لہجے میں بولے۔

''جس کسی نے بھی یہ خوں ریزی پھیلائی ہے، اسے ہرگز اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارا انتظامیہ محض یہ سمجھ کر کہ اس خوں ریزی کی زد میں آنے والے انتہائی مطلوب اور خطرناک مجرم تھے، اس کیس کو داخل دفتر کر دے گی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا چہرہ بالکل میرے چہرے کے قریب لا کر سرد لہجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں گویا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔ ”کیونکہ .... ان میں سے ایک مجرم کالا ناگ زندہ بچ گیا ہے۔“

ایس پی وجاہت قریشی کے اس انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ اور ایک لہر سی میری ریڑھ کی ہڈی میں کن کھجورے کی طرح رینگتی محسوس ہوئی۔ یہ لہر اس خوف کی نہ تھی کہ کالا ناگ زندہ بچ جانے کے بعد میرے خلاف پولیس کو بیان دے گا۔ بلکہ یہ ایک جوش کی لہر تھی کہ کالا ناگ میری گولی لگنے کے باوجود زندہ بچ گیا تھا۔

”کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“ میں نے گمبھیر لہجے میں اپنے اوپر جھکے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”بس تم ماں بیٹے کے لئے یہی کافی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی چیئر پر براجمان ہو گئے۔

میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ کالا ناگ کے زندہ بچ جانے کا سن کر ماں کی بھی کم و بیش میرے جیسی کیفیت ہو رہی تھی۔ ماں نے خاموشی سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد ہم پولیس ہیڈ کوارٹر سے واپس لوٹ گئے۔

میں اور ماں سارے راستے خاموش رہے تھے۔ پھر جب کلڈانہ چوک سے ہم نتھیا گلی اور ڈونگا گلی تک جانے کے لئے جھیکا گلی کا شارٹ کٹ اختیار کرنے لگے تو ماں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے کہا۔

”کالا ناگ کیسے بچ گیا تھا؟ .... تم نے تو کہا تھا کہ بشیر چیرا کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہو چکا ہے؟“

ماں کے لہجے میں مجھے استفسار کم، تادیب زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

”میں خود حیران ہو رہا ہوں ماں!“ میں نے الجھ کر کہا۔ ”میں نے خود اپنی آنکھوں سے کالا ناگ کو پشت میں گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ شاید ڈاکٹروں نے بروقت طبی امداد دے کر اسے بچا لیا ہے۔“

”تم نے ایس پی وجاہت قریشی کا رویہ دیکھا۔ مجھے اس میں جانب داری کی بو آ رہی تھی۔“ ماں نے جیسے میری رائے لینا چاہی۔

”میرا خیال ہے ماں! وہ اپنی جگہ درست کہہ رہے تھے۔“ میں نے پُر متانت لہجے میں کہا۔

ماں نے ذرا گردن موڑ کر قدرے چونکتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں شاید مجھ سے ایسی تردید کی امید نہ تھی۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ماں نے دوبارہ سامنے نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو پورا یقین ہے کہ تمہاری اس خونریز کارروائی کے بعد شاہ میر اور نظر حیات ہم سے بری طرح خوف زدہ ہو چکے ہیں اور یہ جان گئے ہیں کہ اب ان دونوں کی باری ہے۔ اس لئے انہوں نے بڑی مکاری سے کام لیتے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر کو واشگاف لفظوں میں اپنے اس خدشے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے تاکہ انتظامیہ کے ذریعے ہم پر دباؤ ڈال سکیں۔“

”آپ کی یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے۔“ میں نے بدستور سنجیدگی سے مختصراً کہا۔ ”لیکن ماں! .... ہمیں بہرحال دشمنوں کے خلاف سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”سوچنا کیا ہے؟ ....“ ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اب سب سے پہلے شاہ میر کی باری آئے گی۔ میں پولیس انتظامیہ کی بلیک میلنگ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔“

”لیکن باوجود اس کے ہمیں احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ ہماری جوابی کارروائی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہم بھی ان کی زبان میں جواب دینا جانتے ہیں۔ اس لئے وہ اب شاطرانہ چال پر اتر آئے ہیں۔“

”کیا تم نہیں چاہتے کہ نگینہ یتیم ہو ....؟“ ماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ ان کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

”یہ بات نہیں ہے ماں!“ میں نے برا منائے بغیر کہا۔ اور پھر ماں کی توجہ ایک اہم بات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولا۔ ”آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ کالا ناگ زندہ بچ چکا ہے اور وہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے اور یقیناً اس کلیو کو ہمارے دشمن ہمارے خلاف ٹارگٹ بناتے ہوئے پولیس پر کالا ناگ سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے دباؤ ڈال سکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں کالا ناگ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ورنہ ایک بار پھر ہمیں لمبی چوڑی قانونی کارروائی میں پھنسا دیا جائے گا۔“

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میری بات کا ماں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ خاموش ہو کر سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی سرخ و سپید فراخ پیشانی پر اُلجھن اور تشویش کا جال سا بُن گیا تھا۔ تب وہ بولی۔

”یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“

”اسے یقیناً پولیس کے پہرے میں لاہور کے کسی ہسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا ہوگا۔ میں آج ہی لاہور کی طرف روانہ ہونا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے .... مجھے گرین لاج چھوڑ کر تم جیپ لے جاؤ۔“ ماں نے کہا۔ میں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ گرین لاج پہنچے تو ایک چونکا دینے والی خبر ہماری منتظر تھی۔

ٹال سے چند مزدور آئے تھے اور ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پھر ہمارے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے چونکا دینے والی اطلاع ہمیں دی کہ آج صبح پولیس نے ٹال کو سیل کر ڈالا ہے اور منیجر مشتاق سیال کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ٹال پر فاریسٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر نے پولیس نفری کے ساتھ چھاپہ مارا تھا اور وہاں موجود عمارتی لکڑیوں اور شہتیروں کو غیر قانونی جنگل کی کٹائی سے چوری شدہ قرار دیا تھا۔

یہ سن کر میں نے غصے سے اپنے دانت بھینچ لئے۔ دشمن اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

”آخر بغیر ثبوت کے انہوں نے کیسے اتنی بڑی کارروائی کر ڈالی؟“ میں غصے میں بڑبڑایا تو ماں نے زہرخند کے ساتھ طنزیہ کہا۔

”یہ سب تمہاری خوش فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم سمجھ رہے تھے، دشمن خوف زدہ ہو چکا ہے۔ یہ سب دشمنوں کو ڈھیل دینے کی وجہ سے ہوا ہے نادر بیٹے!“

ماں کے ریمارکس نے مجھے مزید جھلا دیا۔ تاہم میں نے کہا۔ ”ماں! پریشان نہ ہو۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں، اصل معاملہ کیا ہے۔“ یہ کہہ کر میں اسی وقت مزدوروں کے ساتھ اپنی جیپ میں مری کی طرف روانہ ہو گیا۔

❋ ❋ ❋

میں سب سے پہلے ٹال پہنچا۔ ٹال کے دیوہیکل چوبی گیٹ کو بند کر کے تالا لٹکا دیا گیا تھا۔ تالے پر سرخ رنگ کی سیل پگھلا کر چپکا دی گئی تھی۔

باہر سارے مزدور حیران و پریشان اور سوگوار کھڑے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور سیدھا متعلقہ

تھانے پہنچا۔

یہاں کا انچارج انسپکٹر شمس تھا۔ یہ وہی جلاد صفت شخص تھا جس نے مجھ پر ایک روز اس تھانے پر انسانیت سوز تشدد کیا تھا۔ نیز مجھے اڈیالہ جیل پہنچانے کا عزم بھی کیا تھا۔ مگر اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔

میں سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ میز پر اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی گھنی مونچھوں تلے زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

''آؤ نادر علی! .... بروقت آئے تم۔'' مجھے اس کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

''آپ نے میرا ٹال کیوں سیل کیا ہے؟ اور ہمارے منیجر مشتاق کو بھی لاک اپ کر دیا ہے۔ آخر کیوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آ کر دانت پیس کر بولا۔

''تمہارے ٹال پر کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کے ایما پر چھاپہ مارا گیا۔ کیونکہ تمہارے ٹال میں چوری کی لکڑی تھی۔

''اس کا کوئی ثبوت ہے؟'' میں نے اپنے اندر کے اُبال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اسے پوچھا۔

''کیا کنزرویٹو آفیسر سے بڑا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟'' وہ بولا۔

''آخر اس کے پاس بھی تو کوئی ثبوت ہو گا انسپکٹر!'' میں نے کہا۔

''ہاں ....تم نے ٹھیکے دار رمضان احمد سے جو خام مال لیا تھا اور اسے چیرنے کاٹنے کے بعد شہتیروں میں بدل دیا تھا، وہ جنگل کی غیر قانونی کٹائی سے حاصل کردہ تھا اور متعلقہ فاریسٹ آفیسر نے اس کی رپورٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کو دے دی تھی۔'' اس نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس حد تک تو یہ بات درست تھی کہ ہم نے کچھ روز قبل رمضان احمد ٹھیکے دار سے خام مال کے دو راکٹ ٹرک خریدے تھے مگر احتیاط کے پیش نظر میرا اصول تھا جو اس سے قبل ماموں کا تھا کہ پے منٹ یکشت مگر تیسرے دن کی جاتی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ رمضان احمد نے ہمیں چوری کی لکڑی فراہم کی تھی۔

''ہو سکتا ہے آپ درست کہہ رہے ہوں۔'' میں نے معاملہ سمجھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ''ہم اسی لئے پے منٹ تین دنوں کے بعد کرتے ہیں۔ میں نے پے منٹ نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ رمضان احمد سے ہمارے معاملات برسوں پرانے ہیں۔ آج تک اس نے ہمیں چوری کا مال فروخت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ساتھ بھی کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔''

انسپکٹر شمس نے اس بات پر زہریلی مسکراہٹ سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''انسان کے ضمیر کو پلٹا کھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے نادر علی خان! ....تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ متعلقہ محکمے (محکمہ جنگلات) سے انکوائری رپورٹ آنے تک مزید گرفتاریاں بھی عمل میں آ سکتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے .... میں تیار ہوں ....لیکن آپ پلیز! ہمارے منیجر کو تو رہا کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ سے ٹال کی سیل کھولنے کی بھی درخواست کروں گا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''بہت مشکل ہے.........حتمی رپورٹ آنے تک کسی کو رہا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ٹھیکے دار رمضان احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شکر کرو کہ تمہیں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئیں۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً کینچلی بدلتے ہوئے نرم گفتاری سے کہا۔ ''آپ کی مہربانی .... لیکن آپ ہمارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منیجر کو تو رہا کر دیں۔ ٹال بے شک سیلڈ رہے۔''

''ٹھیک ہے.........پھر تم اپنے منیجر مشتاق کی جگہ سنبھال لو۔ اسے ہم باہر کر دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ میرے اندر دوبارہ طیش کی لہر اُبھری۔ مگر میری گرم مزاجی سے حالات بگڑ سکتے تھے۔ انسپکٹر شمس کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ہمارے دشمنوں سے مل چکا تھا۔ میرا اتنا خیر خواہ یا ہمدرد نہ تھا کہ اب تک اس نے مجھے ہتھکڑیاں نہیں پہنائی تھیں۔

کیونکہ ابھی جرم ثابت نہ ہوا تھا اور تحقیق جاری تھی۔ چھاپے کے بعد جو گرما گرمی ہونا تھی، وہ ہو چکی تھی۔ بہر طور میں نے اس سے منیجر مشتاق سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی، جو اس نے دے دی۔

میں لاک اپ کی طرف آیا۔ منیجر مشتاق سلاخوں کے عقب میں چپکا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داد و فریاد کے انداز میں بولا۔

''چھوٹے صاحب جی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ .... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''میری سمجھ میں آ رہا ہے۔'' میں پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں آج ہی باہر نکال دوں گا۔''

''اچھا جی، کیا آپ مجھے گردن سے پکڑ کر سلاخوں کے بیچ سے ریشمی تھان کی طرح باہر نکالیں گے؟''

''نہیں بے وقوف! میں تمہاری ضمانت کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''چھوٹے صاحب! ضمانتیں شمانتیں تو عادی مجرموں کی ہوتی ہیں .... میں تو ایک سیدھا سادھا اور شریف بندہ ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی اور تھانے کی عمارت سے باہر آ گیا۔ پھر اپنی جیپ کے قریب آ کر اپنے سیل پر اعظم خان سے رابطہ کرنے لگا، انہوں نے مجھے تسلی دی کہ سرِ دست منیجر کی ضمانت ہی کروا سکتے ہیں......... باقی معاملات بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔ میرے لئے یہی بہت تھا۔

پھر میں نے گرین لاج میں ماں سے بھی رابطہ کر کے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔

دشمنوں نے ہمیں اب ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات دونوں کی ملی بھگت سے ہمارے خلاف ایک ایسی سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو چکے ہیں جس سے وہ دونوں مردود ہمیں، معاشی طور پر بالکل تنگ دست کر سکیں۔ گویا وہ ہمیں اقتصادی اور معاشی طور پر کمزور کرنے کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ پہلے ٹال کی آتش زدگی عمل میں لائی گئی جس سے ہمیں لاکھوں کا نقصان ہوا تھا، پھر ٹال کی نئے سرے سے تیاری ہوئی اور اب ٹال پر چھاپا پڑوا کر اسے سیل کر دیا گیا تھا۔ تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا، وہ ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں خرچ ہو چکا تھا۔

اب روز کی آمدنی سے کچھ رہی ہوئی ادائیگیاں آہستہ آہستہ کر کے عمل میں لائی جا رہی تھیں۔ اگر ٹال اسی طرح کچھ عرصہ مزید سیل رہتا تو ٹھیکے دار پارٹیاں ہمیں مال سپائی کرنا تو بند کر ہی دیتیں، ساتھ ہی پے منٹ وغیرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ان کا دباؤ بڑھتا جاتا۔

ادھر کالا ناگ کے زندہ بچ جانے اور اس کے پولیس کی کسٹڈی میں علاج و معالجے کی اطلاع نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ اور یہی نہیں .... بلکہ ایس پی وجاہت قریشی نے بھی اشاروں کنایوں میں دھمکی آمیز تہدید بھی کر دی تھی، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ جیسے ہی کالا ناگ بیان دینے کے قابل ہوا، مجھے بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں میرا اپنی ماں سے نگینہ کے سلسلے میں الگ اختلاف چل رہا تھا۔ ان پے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درپے پریشانیوں اور اُلجھن آمیز سوچوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔

نگینہ سے متعلق وادی کیلاش کی دشوار گزار مہم بھی اب مجھے التوا کا شکار نظر آنے لگی تھی۔ مجھے کچھ محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں شاہ میر اور نظر حیات کی برق رفتار دشمنی کا خاطر خواہ طریقے سے مقابلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اس کی وجہ کیا تھی؟..... ماں سے میرا نگینہ کے متعلق اختلاف، میری تساہل پسندی پھر..... نگینہ!

بہرطور میں واپس گرین لاج آ گیا۔

سکینہ (فضل چاچا کی بیوہ) نے مجھے بتایا کہ ماں اپنے کمرے میں ہیں اور مجھے بلایا ہے۔

میں ڈرائنگ روم سے ہو کر ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اچانک قریب رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں ذرا چونک کر رکا۔ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے نگینہ کی آواز اُبھری۔

''نادر صاحب.....!'' اس کی آواز سنتے ہوئے مجھے اپنی سماعتوں پر دھوکا ہونے لگا۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے میں نے کہا۔

''نگینہ! میں نادر بات کر رہا ہوں۔ کک..... کیا تم نے مجھے پہچان لیا؟''

میرے مہجور لہجے میں بچوں کی سی امید تھی۔ دوسری طرف سے نگینہ کی سپاٹ آواز اُبھری۔

''مسٹر نادر! تم مجھے اغواء کرنا چاہتے ہو؟'' اس کی بات پر جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔ درد کے ساتھ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا بھی لگا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔

''یہ..... یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟''

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو مسٹر!'' نگینہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو، میں تمہارے گھناؤنے عزائم کے بارے میں آگاہ ہو چکی ہوں۔ اگر تم نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی یا میرے سامنے آنے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں فوراً پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ سمجھے تم؟'' انتہائی نفرت انگیز اور غصیلے لہجے میں اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں پاگل دیوانوں کی طرح ''ہیلو!..... ہیلو!'' کرتا رہ گیا لیکن دوسری جانب مسلسل ٹون کی بے رحم اور سپاٹ آواز پر بالآخر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میرے دل و دماغ کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ نگینہ کے سرد اور غصے بھرے لفظوں کی چبھن برچھیوں کی طرح میرے اندر کو گھائل کیے دے رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات اور نگینہ کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے بدخصلت کبیر نے یہ بات بتا دی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس انداز میں کہ نگینہ اسے اپنی بھلائی کی بجائے اغواء پر محمول کرنے لگی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ کبیر والا مہرہ بھی میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے یہ گھمبیر معاملہ مزید بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ اسے اب میری بلیک میلنگ کی چنداں پروا نہیں رہی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ میں اس کے شرم ناک کرتوت کسی کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔ یقیناً احمقانہ حرکت مسز جواد سے ہوئی ہو گی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود شاید اس سے ذکر کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہونے لگا کہ اس نے یہ بات بھی کبیر سے کہہ دی ہو گی کہ میں یہ راز محض ایک شریف اور معذور شوہر کی بیوی کو راہ راست پر لانے کے لئے آشکارا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

صورتِ حال کچھ اُلجھ سی گئی تھی۔ ماں کا نگینہ سے متعلق الٹی میٹم، ٹال پر چھاپہ اور منیجر مشتاق سیال کی

رفتاری، ایس پی وجاہت قریشی کی پراسرار دھمکیاں، کالا ناگ کا زندہ بچ جانا اور اس کا پولیس کسٹڈی سے ہونا، نگینہ کا گمبھیر مسئلہ اور اب نگینہ کا مجھے سخت لفظوں میں فون کرنا..... یہ تمام واقعات صورتِ حال کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر کیے جا رہے تھے۔ حالات کی پیچیدگی نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دباؤ بڑھنے لگا تھا۔

اس دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے ایک گلاس پانی پیا۔ اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی غرض سے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ تجزیہ کیا کہ ان میں جو سب سے اہم مسئلہ تھا اس پر توجہ دینی چاہئے اور وہ اہم مسئلہ نگینہ کا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں حیرت انگیز طور پر خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دیگر معاملات اعظم صاحب کے سپرد کر کے میں خود کسی نہ کسی طرح نگینہ کو ساتھ لے کر وادی کیلاش کی طرف نکل جاؤں۔ اس کیلاشی عامل عاروب کا مجھے کبیر کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ وہ وادی کیلاش کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا جو کلاشی آگرم میں آباد تھا۔ چونکہ وہ مشہور شخصیت تھا اس لئے اسے وہاں تلاش کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔

''نادر.....!'' اچانک میری سماعتوں سے ماں کی سپاٹ آواز ٹکرائی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ نگینہ کے اچانک اور غیر متوقع فون پر میں بھول ہی گیا تھا کہ ذرا دیر پہلے سکینہ نے مجھ سے کہا تھا کہ ماں نے مجھے بلایا تھا۔

''میں نے تمہیں بلایا تھا.....'' ماں نے اس طرح سپاٹ لہجے میں دوبارہ مجھ سے کہا تو میں شرمندہ ہو کر بولا۔

''معافی چاہتا ہوں ماں! دراصل وہ اچانک ایک فون آ گیا تھا۔''

''کس کا فون تھا؟'' ماں نے بہ غور میرے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ میں بری طرح سٹپٹا گیا مگر پھر فوراً ہی بولا۔

''نگینہ کا۔''

''اوہ.....'' ماں نے ہولے سے کہا۔ ان کی مختصر سی ''اوہ'' میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ ''ظاہر ہے، پھر تو تم نے اپنی ماں کو بھلانا ہی تھا۔'' ماں کے اس کاٹ دار جملے نے مجھے چیر کر رکھ دیا۔

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں تھی۔ دراصل وہ.....'' میں نے کہنا چاہا مگر ماں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''چھوڑو یہ فضول تاویلیں..... تم یہ بتاؤ کہ منیجر مشتاق سیال کی ضمانت کے سلسلے میں تم نے کچھ کیا.....؟''

میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے تھانے جا کر انسپکٹر اعجاز شمس سے ملاقات کی تھی۔''

''تمہیں اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' ماں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو فوراً حامد عمرانی سے ملاقات کرنی چاہئے تھی۔ لیکن تم تو کہیں اور ہی الجھے ہوئے ہو۔ دشمن کی بیٹی نے تمہارے دل و دماغ حتیٰ کہ تمہاری غیرت کو بھی زنگ لگا دیا ہے۔ تمہارے دل سے اپنوں کی بھلائی، باپ کا بے گناہ خون سب کچھ مٹا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تمہارے جیسا گبھرو بیٹا، جس پر مجھے ہمیشہ فخر تھا، دشمنوں کی اس حسین مگر گھناؤنی چال میں آ چکا ہے۔'' ماں کے ان بے رحم فقروں نے مجھے چھلنی کر ڈالا تھا۔ وہ حقیقت نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی سننا چاہتی تھیں۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''ماں! ایسا مت کہو ..... میں کچھ نہیں بھولا ہوں۔ نگینہ دشمنوں کی گہری

سازش کا شکار ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کا برین واش کرا دیا ہے۔"

"ہونہہ......... برین واش۔" ماں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ پھر چند قدم چل کر میرے قریب پہنچ کر مجھے عجیب مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ لمحاتی توقف کے بعد انہوں نے لب کشائی کی اور سنجیدگی سے بولیں۔ "نادر بیٹے! میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے ادھڑے ہوئے پلستر کی سیلن زدہ دیواروں کو گھورتے ہوئے یا ننگی اینٹوں کے غلیظ فرش پر بیٹھ کر ہی نہیں گزارے۔ بلکہ مصائب و آلام کی دھوپ میں جلتی سلگتی رہی ہوں۔ اپنے بہادر اور غیرت مند شوہر کی بیوہ ہونے پر بھی مجھے آج بھی فخر ہے، اس بے گناہ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میں خود کو حالات کی بھٹی میں کھولا کر فولاد میں ڈھالا ہے۔ اس لئے اپنے سینہ سوزاں میں بھڑکتی ہوئی آتش انتقام کا احساس بھی صرف میں ہی کر سکتی ہوں نادر! مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میری انگارا کوکھ میں پلنے والے تخم بہادر نے گوشت پوست کی کوکھ سے نہیں بلکہ کھولتے ہوئے لاوے سے جنم لیا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ اس کے اندر انتقام کی آگ اور جوش غیرت کا سمندر موجزن ہوگا۔ لیکن افسوس......... صد افسوس۔" ماں نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ مگر مجھے اس کے مفہوم تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اپنی ماں کی حالت نے مجھے بھی سسکا دیا تھا۔ میرے لبوں سے بھی سسکتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"ماں!.........بس کر۔"

"میں کیا بس کروں نادر!......... تمہیں تو دشمن کی بیٹی نے محبت کی چوڑیاں پہنا کر نامرد کر ڈالا ہے۔" الفاظ نہیں تھے گویا پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ماں نے میرے کانوں میں انڈیلا تھا۔

میں پھر چلایا۔ "ماں!.........اب بس کر دے۔"

"ہاں.........واقعی مجھے بس کر دینا چاہئے۔ تم تو اب کسی اور دنیا کے باسی ہو چکے ہو۔ جہاں تمہاری ماں کا کوئی گزر نہیں ہے۔ بیٹا! کچھ بھی ہو جائے، مگر تو میرا لخت جگر ہی رہے گا۔ ٹھیک ہے، تجھے اپنی دنیا مبارک ہو۔ ابھی میرے حوصلے جوان ہیں۔ میرا جوشِ انتقام ابھی سرد نہیں ہوا ہے۔ میں تیرے باپ کے قاتلوں سے اپنے بل بوتے پر نمٹنا جانتی ہوں۔ اور یقیناً ان سے اس کا انتقام لے ہی لوں گی۔"

ماں نے اس بار قدرے متحمل لہجے میں کہا۔ پھر خاموشی سے لوٹ گئیں۔

میں اپنی جگہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ میری آنکھوں میں جھلملاہٹ ابھر آئی تھی۔ دل مغموم ہو گیا تھا۔ ماں کے جلتے سلگتے الفاظ نے میرے دماغ کی نسوں تک کو گویا چیر ڈالا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ ماں کو اپنی غیرت اور بہادری دکھا دوں اور شاہ میر اور نظر حیات کو ابھی جا کر گولیوں سے بھون ڈالوں۔ لیکن میں ماں کو کیسے سمجھاتا کہ ایسے انتقام سے کیا فائدہ کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے جبکہ دشمنوں نے تو ہماری لاٹھی پہلے ہی توڑ رکھی تھی۔ انتقام کا مزہ تو تب آتا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ اگرچہ میرے نزدیک دشمنوں کے لئے موت کی سزا بھی معمولی تھی۔ میں انہیں موت سے پہلے موت کے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ ان کی شاہانہ زندگی کو سسکانا چاہتا تھا نہ کہ موت کی نیند سلا کر انہیں سسکتی بلکتی زندگی سے چھٹکارا دلاتا۔ لیکن ماں کو نگینہ کے حوالے سے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اس نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سیلن زدہ فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک تخم بہادر کو ہی جنم دیا ہے۔ کسی مردک کو نہیں۔ نگینہ کے بارے میں ماں کا یہ خیال تھا کہ یہ دشمن کے خلاف میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتش انتقام کو سرد کرنے کی حسین چال تھی اور یہ غلط فہمی ماں کے دل میں اس وقت پیدا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھی جب نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کے خلاف گواہی واپس لے لی تھی اور اس کے پاس رہنا قبول کر لیا تھا، نیز مجھ سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔

مگر یہ اذیت ناک حقیقت صرف اور صرف میں ہی جانتا تھا کہ نگینہ کا اس طرح اچانک ہمارے خلاف پلٹا کھانے کی اصل اور بنیادی وجہ کیا تھی؟

میں مسہری پر گر سا گیا۔ باریک بینی سے حالات کا تجزیہ کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ مجھے جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا چاہئے۔ میں نے ماں کے دل سے نگینہ کے متعلق غلط فہمی نکالنے کا تہیہ کیا۔ میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے دیا تھا۔ میں اب اس پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نگینہ اصل حالت میں لوٹنے کے بعد اپنے قاتل باپ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی اور سیدھی میرے پاس چلی آئے گی۔ لہٰذا یہی بہتر تھا کہ میں فی الوقت تمام باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف اور صرف نگینہ کے پراسرار معاملے پر اپنی توجہ مرکوز کر دوں۔

کبیر والا مہرہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اعظم صاحب سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ وہی ایک واحد شخصیت تھے جو میرا دکھ سمجھتے تھے اور میرے حالات کا ادراک رکھتے تھے۔ انہیں میرے اور ماں کے بیچ حائل ہونے والی ان دیکھی خلیج کا بھی علم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی رہائش گاہ پر جا کر پورے دو گھنٹے تفصیلی ملاقات کی۔ تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد انہوں نے میرے لائحہ عمل کی تائید کی۔

"نادر بیٹے! تم بے غم ہو کر سب سے پہلے نگینہ والا معاملہ حل کرنے پر توجہ دو......... باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔ اور شبینہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" انہوں نے مربیانہ لہجے میں مجھے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ان کی حوصلہ افزائی نے میرے ارادوں کو مہمیز دی اور میں ان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اب ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسلام آباد کے بکنگ آفس سے چترال کے لئے دو ٹکٹ لئے۔ بکنگ میں نے دو دن بعد کی کروائی تھی۔ اب مسئلہ نگینہ کو ساتھ لے جانے کا تھا۔ اس کا حل میں نے سوچ رکھا تھا۔ پھر جس روز صبح میری اسلام آباد ایئرپورٹ سے روانگی تھی، اسی شب میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ میں بذریعہ ہائی ایس مسافر ویگن پر شام چھ بجے پنڈی پہنچا تھا۔

تین چار گھنٹے میں نے مٹرگشت کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گزارے۔ پھر رات نو بجے میں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ لیا اور ایک بار پھر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ میرے پاس بھرا ہوا بیگارڈ پستول تھا۔ میرا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ مگر میں نے اپنے طور سے کسی چھوٹے سے سقم کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

رات کے تقریباً دو بجے میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ پورا شہر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرا رخ شاہ میر کی کوٹھی کی طرف تھا۔ کوئی سواری نہ تھی لیکن میں نے ابتداء ہی سے یہ دانش مندی کی تھی کہ ایسے ہوٹل میں کمرہ لیا تھا جو شاہ میر کی کوٹھی سے پیدل کے فاصلے پر تھا۔

بہرطور میں چلتا ہوا اس پوش علاقے تک پہنچا جہاں شاہ میر کی کوٹھی تھی۔ چند بلاک چھوڑ کر جب میں مطلوبہ کوٹھی کے قریب پہنچا تو ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا۔ کوٹھی کے باہر دو مسلح گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ میں نے اپنے دانت بھینچ لئے۔ کبیر یقیناً میری حکمت عملی کا اندازہ لگا چکا تھا اسی لئے اس نے شاہ میر اور نگینہ کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ (اگرچہ اس نے اصل بات سے انہیں آگاہ نہیں کیا ہوگا)

میں نے اس پر ماتم کرنے کی بجائے صورتِ حال پر قابو پانے کا سوچا۔ میرے پاس اپنا آزمودہ میگارد موجود تھا جس پر میں نے سائلنسر چڑھا رکھا تھا۔ لیکن میں ان حالات میں ذرا سی بھی خون ریزی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سب کام مجھے انتہائی خاموشی، ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ نمٹانا تھے۔ شاہ میر کی کوٹھی پر تعینات ان دونوں مسلح گارڈز پر شور شرابے کے بغیر قابو پانا ضروری تھا۔ ایک قریبی تاریک گوشے میں سمٹ کر میں نے اپنے اطراف کا بہ غور جائزہ لیا۔ ان دونوں گارڈز پر نظریں جما دیں۔

اسٹریٹ لیمپس روشن تھے جس سے آس پاس کا ماحول خاصی حد تک روشن تھا۔ تاہم ان دونوں کے علاوہ دور تک کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ ان کا پہرہ دینے کا انداز بڑا منظم تھا۔ اپنے منجھے ہوئے انداز و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے باقاعدہ تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان کے جسموں پر چست خاکی وردی تھی اور پیروں میں لانگ بوٹ۔ سر پر پی کیپ تھی اور کاندھوں پر حد نظر تک مار کرنے والی ایم پی فائیو رائفلیں تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا جبکہ دوسرا کوٹھی کے سامنے تقریباً بیس قدم دائیں اور پھر بیس قدم بائیں گشت لگاتا۔ اس دوران اس کی عقابی نگاہیں چہار اطراف میں گردش کرتی رہتیں۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی گارڈ گیٹ کے سامنے کھڑا اپنے ساتھی کو ٹریس کر رہا ہوتا۔ اس طرح پھر دوسرے کی باری آتی۔ مجھے اب بیک وقت دونوں پر قابو پانا تھا۔ میں نے بہ غور شاہ میر کی کوٹھی کی آخری حد کا جائزہ لیا۔ تب میں نے دیکھا، جہاں گشت لگانے والے گارڈ کی حد ختم ہوتی تھی، اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر کوٹھی کی بیرونی دیوار کے قریب ایک تنگ سا گلیارا تھا۔ کچھ سوچ کر میں واپس پلٹا اور عقب سے ہوتا ہوا اس تنگ گلیارے میں آ گیا اور دیوار سے چپکا چپکا اگلے سرے تک جا پہنچا۔ پھر ذرا سر ابھار کر دیوار کی آڑ سے دیکھا تو وہ گارڈ اپنا مختصر سا گشت پورا کر کے لوٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔ دونوں گارڈ تھوڑی دیر تک وہاں بچھی دو فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہے پھر اس کے بعد دوسرا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے بائیں طرف کا گشت پورا کیا، پھر گیٹ کے سامنے سے چلتا ہوا میری سمت آنے لگا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پایا اور ایک پتھر اٹھا لیا۔ پھر جیسے وہ گارڈ اپنا دائیں طرف کا گشت پورا کر کے واپس لوٹنے لگا تو میں نے وہ پتھر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ ٹھٹک کر مڑا، پھر اس گلیارے کی طرف دیکھتا ہوا محتاط انداز میں قریب آنے لگا۔ میں مزید اندر کی طرف تاریکی میں ہو گیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ گلیارے کے سامنے پہنچ کر رکا اور اندر کی نیم تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، میں نے اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑتا ہوا مزید قریب آیا تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی گردن ناپ لی اور اپنے میگارد پستول کا فولادی دستہ اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ خارج ہو گئی اور وہ تیورا کر گرا۔ اس دوران اس کا دوسرا ساتھی اسے پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے شاید خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اب اپنے کاندھے سے گن اتار کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھی۔

میں اب اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ”کون ہے یہاں؟ باہر نکلو، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ وہ رائفل کی نال ہلاتے ہوئے دبنگ لہجے میں للکارا۔ مگر میں خاموشی سے تاریکی میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی اندھیرے میں گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”ادھر آؤ .... مجھے سس .... سانپ نے ڈس لیا ہے۔“ میں نے دانستہ ایسی آواز میں کہا کہ وہ شبہ نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک تو اس نے مجھے ابھی تک نہ دیکھا تھا، پھر دوسرے یہ کہ اس سمت میں اس کا ساتھی داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ ضرور اسکا اپنا ہی ساتھی کسی تکلیف میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا ہے۔ یوں وہ میرے اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر کا شکار ہو گیا اور تیزی کے ساتھ گلیارے اندر داخل ہوا تو میں نے اس کے ساتھ بھی پہلے والے جیسا سلوک کیا۔ دونوں کو زیر کرنے کے بعد تیزی سے آگے بڑھا۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پختہ روش کے دائیں بائیں لان تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر چند آہنی پایوں پر دودھیا گلوب روشن تھے۔ میں یہاں پہلے بھی آ چکا اس لئے مجھ سے کوٹھی کا اندرونی محل وقوع پوشیدہ نہ تھا۔ میں گھنے پودوں اور بیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو اچانک مجھے اپنی دائیں جانب ایک ہولناک غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر رک اور آواز کی سمت دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر جسیم کتا کھڑا میری طرف خوفناک چمکتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ السیشن کتا تھا۔ اسے بھونکنے کی عادت سے زیادہ اپنے شکار پر جھپٹنے کی عادت تھی۔ اس کی خونخوار تھوتھنی سے شکاری دانتوں کی خوفناک قطار نمایاں تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، اس نے دوسری بار غرا کر مجھ پر جست لگا دی۔ میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور غیر ارادی طور پر دفاع کے لئے اٹھنے والے میرے دونوں ہاتھوں کا شکنجہ اس کی گردن پر کس گیا۔ اگرچہ میں اس کے اچانک جھپٹنے سے گھاس پر پشت کے بل گر گیا تھا مگر میں نے اس کی گردن پر اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے کی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔ وہ میرا نرخرہ بھنبھوڑنے کے چکر میں تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار میرا نرخرہ اس کے لمبے لمبے شکاری دانتوں میں آ گیا تو اسے ادھیڑنے میں مطلق دیر نہیں لگائے گا۔ نیز وہ اپنے اگلے دو پنجوں سے میرے سینے کو بھی ادھیڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لمبے لمبے، نوکیلے ناخنوں نے میرے سینے کو چھیل کر رکھ دیا تھا۔ پھر جیسے مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں غضب کی پھرتی کے ساتھ اپنے دائیں بازو کو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے ہاتھ کا زور دائیں بازو میں متوازن کرتے ہوئے پہلو کے بل ہو گیا اور اس کی گردن اپنے ”آرم“ کے زور پر دباتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے اُبلنے والی کریہہ غراہٹیں یکلخت معدوم ہونے لگیں۔ اور ذرا ہی دیر بعد وہ ڈھیلا پڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے ایک گہرا سانس خارج کر کے اسے گھنے پودوں کی طرف اچھال دیا۔ میری شرٹ پھٹ گئی تھی اور سینے میں خراشوں کے سبب جلن سی ہو رہی تھی۔ چند ثانیے لمبے سانس لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔

کوٹھی کا وسطی محرابی دروازہ بند تھا۔ البتہ بالکونی کے قریب نیچے کھڑی انٹرکولر چھت پر آ کر میں بالکونی پھلانگ گیا۔ اندر مختصر سے تاریک کوریڈور میں کھلنے والے دروازے کے ذریعے داخل ہو کر میں نے باری باری کمروں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ پہلے دو کمرے خالی تھے۔ البتہ یہ خواب گاہیں تھیں۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ میری شرٹ تار تار ہو چکی ہے۔ ہوٹل واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں خاموشی سے ایک کمرے میں داخل ہوا اور الماری میں خوش قسمتی سے مجھے ایک شرٹ مل گئی۔ اگلے روم میں مجھے زیرو پاور کے بلب کی نیلگوں روشنی میں نگینہ اپنے بیڈ پر گہری نیند سوئی نظر آ گئی۔ اس کو بے خبر سویا پا کر میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ مجھے اس کے سکون میں خلل ڈالنے پر دکھ بھی ہوا۔ لیکن پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ میں یہ سب اسی کی بھلائی کی خاطر کر رہا ہوں۔ وہ محبت کو، مجھے بھلا چکی تھی۔ کبیر جیسا شیطان صفت سنپولیا اس سے عنقریب منگنی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ نگینہ اور میرے ساتھ بہت گھناؤنا فریب تھا اور میں نگینہ کو، اپنی محبت کو بچانا چاہتا تھا، ہر ممکن طریقے سے۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اپنا سائلنسر لگا میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور آگے بڑھا۔ مجھے اپنا دل مضبوط کرنا تھا۔ ذرا بھی جذباتی لڑکھڑاہٹ کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اس کے قریب

پہنچ کر میں نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اور پھر وہ جیسے ہی ہڑبڑا کر اٹھ
میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر غیر ارادی چیخ نہ مار بیٹھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی
آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ ان سرمگیں اور مدھ بھری آنکھوں میں میرے لئے
محبت کا سمندر موجزن ہوتا تھا مگر آج وہ محبت جیسے عنقا ہو گئی تھی۔ بہرطور میں نے دل پر جبر کر کے اسے
خونچکاں نظروں سے گھورا اور غرا کر بولا۔

"خاموش!......... آواز نہ نکالنا۔ ورنہ یہ پستول دیکھ رہی ہو، اس میں سے خاموش گولی نکل کر تمہاری
کھوپڑی میں پیوست ہو جائے گی۔ میں ہاتھ ہٹا رہا ہوں، او کے۔"

اس کی آنکھوں میں سراسیمگی اُتر آئی تھی۔ پھر اس نے ہولے سے اپنا سر ہلایا تھا۔ میں نے آہستہ
آہستہ اس کے دہن سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو وہ گھٹی گھٹی سی، خوف زدہ آواز میں بولی۔

"تت......... تت......... تم کک......... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کی خاطر جبراً اپنے ہونٹوں پر خونخوار مسکراہٹ سموتے ہوئے کہا۔

"مجھے رقم چاہئے۔"

"تت......... تمہیں......... جو کچھ چاہئے......... وہ......... وہ لے لو۔ پلیز! مم......... مجھے چھوڑ
دو۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ "مجھے معمولی رقم نہیں، پورے پینتیس لاکھ درکار ہیں۔ جو تمہارا
باپ تاوان کی صورت میں مجھے دے گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ اٹھو، میرے پاس وقت بہت کم
ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے اٹھا دیا۔

"تت......... تم مجھے کک......... کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

"جہاں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں، وہاں بہت جلد تمہارا باپ نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس
سمیت پہنچ جائے گا۔ چلو میرے ساتھ۔" پھر میں نے کہا۔ "میں تمہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔
مجھے صرف اور صرف دولت سے غرض ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یہ
پستول دیکھ رہی ہو، اس پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ فائر کی ذرا سی بھی آواز نہیں اُبھرے گی اور تم اگلے جہان
میں پہنچ جاؤ گی۔ چلو اب۔" وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی اور یہی میں چاہتا تھا۔

بہرطور میں اسے لے کر جلدی سے باہر آ گیا۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر
کھینچتا ہوا تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑا۔ فی الوقت میں نگینہ پر اپنا یہی تاثر قائم کرنا چاہتا تھا کہ
میں تاوان کی صورت میں اس کے باپ شاہ میر سے ایک خطیر رقم اینٹھنے کے لئے ہی اسے یرغمال بنانا
چاہتا تھا تا کہ وہ بھی خود کو ذہنی طور پر اس کے لئے تیار کر لے اور بلا چوں چرا میرا کہا مانتی رہے۔ یہ
ضروری تھا۔

دور مشرقی سمت اب پوہ پھٹنے لگی تھی۔ نماز فجر کی اذانوں کی روح پرور آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی
تھیں۔ میں اسے لے کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مسافر ویگنوں کے اڈے تک پہنچا۔ یہاں سے
ٹیکسیاں بھی ملتی تھیں۔ لیکن اس وقت نہ کوئی ٹیکسی نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی مسافر ویگن۔ ایک کونے میں
رکنے کے بعد ہم نے اپنی سانسیں بحال کیں۔ میں نے میگارد اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نگینہ کی حالت
اب بھی غیر تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دھمکاتے ہوئے کہا۔

"سنو! میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ بہت دولت مند ہے اور اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔ مگر یاد رکھو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...ں نے بھی سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے صرف پینتیس لاکھ کی اشد
ضرورت ہے تا کہ میں اپنی بیمار اور محبوب بیوی کا بیرون ملک علاج کروا سکوں۔ کیونکہ میں اس سے شدید
...ت کرتا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ وہ ایک موذی مرض کا شکار ہو چکی
ہے، جس کا علاج صرف بیرون ملک میں ممکن ہے۔ یہ سب میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں تا کہ تم میرے
عزائم سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لو اور میرے ساتھ تب تک تعاون کرتی رہو جب تک تمہارا باپ
رقم میرے پاس نہیں لے کر پہنچ جاتا۔" میں نے دانستہ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ میں نگینہ کے قریب
رہ چکا تھا، اس کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنے اندر درد مند دل بھی رکھتی تھی۔ تاہم وہ متجسس
...یت کی مالک بھی تھی۔ جب اسے اچھی طرح میرے عزائم اور میری مجبوری کے بارے میں اندازہ ہو
گیا تو اس نے خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"لیکن......... تم تو مجھے فون کر کے عجیب و غریب باتیں کرتے تھے؟ تم میری نگینہ ہو، مجھے پہچاننے
کی کوشش کرو......... پھر وہ سب کیا ڈراما تھا؟"

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سوال وہ ضرور پوچھے گی۔ لہٰذا میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اپنی جھوٹی
...ت کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا تا کہ تمہیں بہلا پھسلا کر آسانی سے یرغمال بنا سکوں۔ مگر مجھے اب
...دراً یہ طریقہ آزمانا پڑا۔"

اس اثناء میں ایک مسافر ویگن آ کر رکی۔ میں اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے نگینہ کو آخری بار جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اسے یہ سب بتانے کا میرا مقصد یہی تھا کہ
وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ میں اسے اس کی کسی غلط حرکت پر جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کروں
گا۔ اس طرح وہ پوری طرح سے میرے "قابو" میں آ گئی تھی۔

میں اسے ویگن میں لے کر سوار ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ویگن اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔ نگینہ میرے
ساتھ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ خود میرا بھی دل انجانے اندیشوں سے بے طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں یہ شور
کر کے میرا بھانڈا نہ پھوڑ ڈالے۔ مگر خیریت گزری کہ اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اسلام آباد پہنچ کر ہم
ویگن سے اترے تو میں نے اس سے کہا۔

"میری بات غور سے سنو......... اب ہم یہاں سے سیدھا بائی ایئر چترال کی طرف روانہ ہوں
گے۔ سمجھ گئیں تم؟"

وہ میری توقع کے عین مطابق پریشان ہو گئی اور بولی۔ "آخر تم مجھے اتنی دور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟
...ے پپا تمہیں رقم یہاں بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔" میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ "یہاں تمہارے باپ کا
...ر چلتا ہے۔ وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف کارروائی کرا سکتا ہے۔ لیکن
...ال جیسے دور دراز علاقے میں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے کہ میرا اصل ٹھکانا بھی وہیں ہے۔
...اور وہ میرے خلاف کوئی جال نہیں بچھا سکتا۔"

"مجھے تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" نگینہ نے جھنجلا کر کہا۔ میں دل میں مسکرایا مگر سنگدلی
سے غرا کر بولا۔

"تمہیں اس سب سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ میں اپنے تحفظ کے لئے وہی کروں گا جو بہتر
سمجھوں گا۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، فلائٹ کی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے ٹیکسی کروائی، نگینہ کے ساتھ عقبی سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی والے کو ایئر پورٹ چلنے کا کہا۔ ٹیکسی روانہ ہوگئی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں دزدیدہ نظروں سے نگینہ کے چہرے کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اگرچہ اب ہراس کی کیفیت کم ہونے لگی تھی لیکن اب اس کی جگہ ایک اُلجھن آمیز پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اسے غالباً چترال لے جانے والی بات نے اُلجھن میں ڈالا ہوا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ عین طیارے میں سوار ہوتے وقت کوئی گل نہ کھلا دے۔ اگرچہ میں نے اسے خوف زدہ تو کر رکھا تھا مگر میں نے طیارے میں سوار ہونے سے قبل بھی دھمکی کی ایک ''ڈوز'' دینا ضروری سمجھا تھا۔ پھر جیسے ہی ہماری ٹیکسی ایئر پورٹ کے ذرا قریب پہنچی تو میں بری طرح چونک پڑا۔ وہاں مجھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ مجھے یکایک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً ٹیکسی والے کو رکنے کا حکم دیا۔ کم بخت ٹیکسی والے نے بحث شروع کر دی۔

''او جی! ایئر پورٹ تک تو پہنچنے دیں۔''

میں نے فوراً میگارد نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور غرا کر اسے ٹیکسی روکنے کا کہا۔ ٹیکسی کی رفتار تیز تھی۔ کچھ وہ بھی شاید سامنے پولیس کی گاڑیوں کو کھڑا دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بہرطور، وہ پستول اور میرا جارحانہ انداز، اس نے خوف زدگی کے عالم میں یکدم بریک لگا دیئے۔ ٹیکسی کے ٹائر سڑک پر جام ہو کر زور سے چرچرائے۔ پولیس والے یکدم ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ سنگین وقت غیر ارادی طور پر ہونے والی غلطی پر ماتم کرنے کا نہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی سے باہر دھکا دیا۔ پولیس کی گاڑیوں کے قریب کھڑے اہلکاروں نے کچھ بھانپ لیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی ٹیکسی ایک یوٹرن لے کر بڑھا دی۔ آناً فاناً پولیس کی دو جیپیں اور ایک موبائل میرے پیچھے سائرن بجاتی ہوئی لگ گئیں۔ کھیل بگڑ گیا تھا۔

نگینہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔ میں نے غرا کر اسے اگلی نشست پر آنے کا کہا۔ وہ اُچھل کر میرے برابر کی سیٹ پر آ بیٹھی۔ میں ٹیکسی کو اب آندھی طوفان کی طرح اُڑائے لے جا رہا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاہ میر نے اپنی بیٹی کے اچانک اور پراسرار غیاب پر پنڈی سے لے کر اسلام آباد تک کی پولیس انتظامیہ کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ چونکہ کبیر میرے منصوبے اور میرے عجیب و غریب ایڈونچر سے واقف تھا اس لئے باقی ہدایات دینے کی کسر اس نے پوری کر دی ہوگی۔ یہ میری فاش غلطی تھی۔ میں اس حقیقت کو بھلا بیٹھا تھا کہ کبیر نگینہ کو چترال لے جانے والی بات سے آگاہ تھا۔ پولیس نے سب سے پہلے ایئر پورٹ کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ کبیر جانتا تھا کہ ایک تو نگینہ کو اغواء کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا، دوسرے میں اسے اغواء کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ہوسکتا ہے، پولیس کسی اور ہی وجہ سے وہاں موجود ہو اور پھر ٹیکسی کو مشتبہ انداز میں اچانک بریک لگا کر پلٹتے ہوئے دیکھ کر میرے پیچھے لگ گئی ہو۔ بہرطور اب میں اس بگڑی ہوئی صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے ٹیکسی کو خاصی رفتار سے اُڑائے جا رہا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں مخصوص سائرن بجاتی میرے تعاقب میں تھیں۔ انہیں ڈاج دینا لازمی تھا۔ اس لئے میرا شہر کی مصروف شاہراہوں کی بھول بھلیوں میں جانا ضروری تھا۔ میں اس وقت انتظامی سیکٹر کی شاہراہ پر تھا۔ یہاں رش کم تھا اور سڑک بھی سیدھی تھی۔ مجھے تیز رفتاری کے ساتھ ٹیکسی دوڑاتے ہوئے اس پر کنٹرول بھی قائم رکھنا تھا۔ ورنہ کسی قسم کا خطرناک حادثہ نگینہ اور میری جان لے سکتا تھا۔

میں نے ایک موڑ کاٹا۔ نیشنل پارک سے بڑا خطرناک راؤنڈ اباؤٹ ٹرن لیا تو کار دو پہیوں پر آ گئی۔ ...ے حلق سے چیخ نکلی اور وہ میرے اوپر آ گئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے فوراً پرے کیا۔ راؤنڈ ...ٹ سے گھومتے ہی میں شہر کے وسط میں آ گیا۔ یہاں سے نیشنل اسمبلی کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس ...ذرا ہی پہلے ایک تنگ سا ذیلی یا اضافی موڑ دائیں جانب مڑتا تھا۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار کم کر کے اس ...موڑا۔ پھر سپریم کورٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے راول جھیل کی طرف جانے کی بجائے میں ...ٹیکسی ایمبیسی روڈ کی طرف موڑ دی۔ یہاں کئی ایمبیسیز کے دفاتر تھے۔ اس کے بعد ایک طویل رہائشی ...شروع ہوتا تھا۔ یہاں کئی موڑ تھے۔ میں نے فوری طور پر دو تین موڑ کاٹے۔ میں پولیس گاڑیوں کو ...ج دینے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ لیکن پھر جیسے ہی میں نے مین شاہراہ کی طرف نکلنے والے ایک تنگ ...شارٹ راستے کا انتخاب کیا تو اچانک پولیس کی ایک جیپ سائرن بجاتی ہوئی سامنے آ گئی.........

...تصادم یقینی تھا۔ وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں ٹیکسی واپس گھما سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے پولیس ...ٹکرا کر ہی اپنی راہ نکالنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے مجھ پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ...ں نے میرے ساتھ نگینہ کی جھلک دیکھ لی تھی۔ البتہ جیسے ہی انہوں نے میری ٹیکسی کو رُکے بغیر مزید ...ر پکڑتے دیکھا تو جیپ کو یکدم بریک لگا کر پولیس والے بدحواس ہو کر جیپ سے باہر کودنے لگے۔ ...ے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نگینہ حواس باختہ سی دم بخود بیٹھی تھی۔ ...نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔

میری ٹیکسی جیپ کے بونٹ سے ٹکرائی۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر پرے ہٹ گئے۔ ایک دھماکا ...ٹیکسی پولیس جیپ کو دھکیلتی اپنے نکلنے کا راستہ بناتی مین شاہراہ پر آ گئی۔ میں نے جلدی سے گاڑی کو ...ں جانب موڑا تو اچانک عقب سے سائرن کی آواز اُبھری۔ میں نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ وہ ...ں موبائل تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اچانک سامنے ایک مسافر کوچ آ گئی۔ میں نے فوراً بریک ...پاؤں رکھ دیا۔ ٹائر زور سے چرچرائے۔ کوچ کے ڈرائیور نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا۔ میں رانگ سائیڈ پر ... مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پولیس کی تینوں گاڑیوں کو ڈاج دے چکا ہوں۔ لیکن پولیس مجھے گھیرنے ...چکروں میں تھی۔

بہرطور مسافر کوچ نے جیسے ہی مجھے راستہ دیا، میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا دیئے۔ بائیں جانب ...ل ڈیم کی ریلنگ تھی۔ نیچے جھاگ اُڑاتا پانی تھا اور جگہ تنگ تھی۔ میری ٹیکسی ریلنگ توڑ کر کئی فٹ نیچے ...ے جھاگ اُڑاتے پانیوں میں گر سکتی تھی۔ کیونکہ بھاری بھرکم کوچ نے مجھے بہت تنگ راستہ دیا تھا۔ ...میری ٹیکسی ریلنگ کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ دفعتہً مجھے عقب میں سماعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ میں نے ...ارادی طور پر بیک ویو مرر میں دیکھا، کوچ پولیس موبائل سے ٹکرا گئی تھی۔ نگینہ نے اب چلاّنا شروع کر ...تھا۔

''روکو.........روکو.........گاڑی!''

...مں پریشان ہو گیا۔ تاہم میں نے غرا کر کہا۔ ''چپ چاپ بیٹھی رہو!''

...مں اب ویران سڑک پر آ گیا۔ عقب میں اچانک مجھے برسٹ چلنے کی خوفناک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ ...ے حلق سے ہسٹریائی چیخیں بلند ہو گئیں۔ میں نے گھبرا کر بیک ویو مرر میں دیکھا، پولیس کی تیسری ...میرے تعاقب میں تھی اور وہ اب میری کار کے ٹائر برسٹ کرنے کے چکروں میں تھے۔ کھلی اور نسبتاً ...شاہراہ پر آنے کی وجہ سے انہوں نے یہ ہمت کر ڈالی تھی۔ میں ٹیکسی کو زگ زیگ انداز میں

دوڑانے لگا۔ لیکن اس طرح مجھے رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ بہ صورتِ دیگر ٹیکسی کے اُلٹنے کا احتمال تھا۔ میں نے زگ زیگ انداز ترک کرتے ہوئے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنانے لگی۔ میرے پاس سر کھجانے کا وقت نہ تھا، موبائل پر ہونے والی کال کہاں سن سکتا تھا۔ آگے ایک موڑ آ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک خطرناک فیصلہ کیا اور دائیں ہاتھ میں میگارد نکال کر پکڑ لیا۔

موڑ پر ٹیکسی کی رفتار کم کرتے ہوئے میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر پولیس جیپ کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ٹوٹنے کا چھناکا ہر طرف پھیلتا چلا گیا۔ میرے میگارڈ کی خاموش گولی نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ پولیس جیپ کا کیا حشر ہوا؟ مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب وہ میرے تعاقب میں نہ تھی۔ میری ٹیکسی اب شہر کے مضافات میں آندھی طوفان کی طرح دوڑے جا رہی تھی۔ میں شہر کی گنجلک بھول بھلیوں سے دور نکل آیا تھا۔ راستہ صاف تھا۔ میں نے ایک نگاہ اپنے برابر میں ڈری سہمی بیٹھی نگینہ پر ڈالی۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی مجھے اس طرح تکے جا رہی تھی گویا اسے میرے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا ہو۔

''دیکھ لیا تم نے .... مس نگینہ! میں نے سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔ تمہیں خوب اندازہ ہو رہا ہوگا کہ مجھے اپنی بیمار اور موت کی گھڑیاں گنتی ہوئی بیوی سے کس قدر شدید محبت ہے۔ میں اس کی خاطر جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں.........اور تمہیں تمہاری ذرا سی لغزش پر موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہوں۔''

آخری الفاظ پر میں نے دل ہی دل میں ''اللہ نہ کرے'' کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ میں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی قسم کی غلط حرکت کر کے مجھے مشکل میں نہ ڈال دے۔

میں نے دیکھا، نگینہ کے چہرے پر اب عجیب سے تاثرات اُبھرے تھے۔ میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم میں گاہے گاہے دزدیدہ نظروں سے اس کے چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

''تم اپنی بیوی سے واقعی اتنی شدید محبت کرتے ہو؟'' دفعتہً اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں قدرے چونکا، پھر ٹیکسی کی رفتار ذرا کم کر کے ایک گہری ہمکاری لے کر بولا۔

''ہاں .... بہت زیادہ۔'' میں نے کوشش کی تھی کہ میرے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلیں۔

''بہت خوش قسمت ہے وہ .... کیا نام ہے اس کا؟'' نگینہ نے پوچھا تو میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ مجھے اداکاری کا یہ تاثر قائم رکھنا ضروری تھا۔ لہٰذا بولا۔

''نگہت۔''

''اسے کون سی بیماری ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اسے اپنے معاملے میں دلچسپی لیتا دیکھ کر مجھے تعجب نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں اس کے درد مند دل سے اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا ایک بار پھر دروغ گوئی سے کام لے کر آواز کو حد درجہ مغموم بنا کر کہا۔

''اسے برین ٹیومر ہے۔''

''اوہ .... ویری سیڈ۔'' بے اختیار نگینہ کے لبوں سے نکلا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں دکھ ہوا یہ سن کر؟''

''ظاہر ہے، میں بھی انسان ہوں۔'' وہ بولی۔

''لیکن میں تو تمہاری جان کا دشمن ہوں؟'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہاری ایک مجبوری ہے۔'' وہ بے پرواہی سے بولی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا فطری لاابالی پن لوٹ آیا ہو۔ تاہم میں نے کہا۔

''کچھ بھی سہی .... میں ایک انسان کی زندگی بچانے کے لئے دوسرے کی زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے ہوں .... یہ بہرحال غلط ہے۔''

وہ میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ''محبت میں سب جائز ہے۔ تمہیں کم از کم اپنی غلطی کا احساس تو ہے نا۔''

اس کی بات سے اچانک مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری ہونے لگا۔ وہ شاید میری فرضی اور من گھڑت کہانی سے متاثر ہو گئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار مزید کم کر دی۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ کوئی اِکا دُکا گاڑی یا مسافر لگژری کوچز گزر جاتیں۔ دائیں بائیں دیودار اور چیڑ کے پیڑوں کا گھنا سلسلہ سڑک کے دور دور تک پھیلا نظر آتا تھا۔

دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ فضا میں گل بوٹوں کی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی۔

''تو کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ تمہاری نظروں میں درست ہے؟'' میں نے اس کی سرگیں آنکھوں میں اپنی مفروضہ کہانی کی ''اثر پذیری'' بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں.........'' اس نے ہولے سے کہا تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوا۔ وہ ایسی ہی فطرت کی مالک تھی۔

میں نے اسے اپنی کہانی کے اثر میں آتے دیکھا تو اچانک میرے دماغ میں ایک بہت ہی عجیب و غریب منصوبہ تشکیل پانے لگا۔ چنانچہ میں بولا۔

''لیکن میں جانتا ہوں، یہ طریقہ بہرحال غلط ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مم .... مگر .... میں بھی کیا کروں مس نگینہ! میں اپنی محبوبہ بیوی نگہت کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا......... نہیں دیکھ سکتا۔''

غم انگیز تاثر کو حقیقی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر نگینہ کا غم سمو لیا۔ میں نے ٹیکسی روک دی۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگی۔

ماحول میں آزردہ سی خاموشی طاری تھی۔ میری آنکھیں نگینہ کے غم میں بھیگنے لگی تھیں۔ میں نے آبدیدہ نگاہوں سے نگینہ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مس نگینہ! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ اور پلیز، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھا لوں، جو میرے ضمیر پر تمام عمر کا بوجھ بن جائے۔ مس نگینہ! تم اسی طرح میرے ساتھ تعاون کرتی رہیں تو تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ تمہارا دل سے احترام کروں گا۔ رقم مل جانے کے بعد جب میں نگہت کا علاج کروا لوں گا تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے پاس آ کر اپنا سر جھکا دوں گا۔ پھر چاہے تم اور تمہارے پپا مجھے جو چاہے سزا دیں، مجھے قبول ہو گی......... میری نگہت کو دوبارہ زندگی مل جائے، مجھے اور کیا چاہئے۔''

میں نے دیکھا، نگینہ کے چہرے پر کچھ عجیب سا ارتعاش ابھرا۔ وہ یک ٹک میرا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر متاثر کن لہجے میں بولی۔

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم واقعی اپنی بیوی نگہت سے سچی محبت کرتے ہو۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت ہے۔ اسے ہرگز نہیں مرنا چاہئے۔ لیکن نادر! تم نے یہ خطرناک قدم اٹھا کر پولیس کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ اس طرح تو تم نے خود کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم میرے پپا کو نہیں جانتے۔ وہ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔''

''تم نے میرے دکھ کا اندازہ کر کے ثابت کر دیا کہ تم واقعی ایک درد مند اور رحم دل لڑکی ہو۔ اب تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید میں واقعی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ میں تمہیں صرف خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ تم بلا چوں چرا میرا حکم مانتی چلی جاؤ۔ نگینہ! تمہیں کار چلانی آتی ہے؟'' میں نے اپنے ایک جذباتی قسم کے نئے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں.........'' وہ بولی تو میں نے کہا۔

''تم جا سکتی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اُبھری۔ ادھر میں دروازہ کھول کر باہر اتر گیا اور ایک طرف اُداس اور مغموم سا چل پڑا اور درخت کے تنے سے اپنی پیشانی ٹکائے رو پڑا۔ درحقیقت میرے اندر نگینہ سے جذباتی طور پر دوری کا غم جاگ اٹھا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی لیکن میری نہیں تھی۔ ایک گھناؤنی اور پراسرار سازش کے تحت اس کی لوحِ دل سے میری محبت، میرا نام، میرا اعتبار اور میری دیوانہ وار چاہت کو بڑی بے رحمی سے مٹا دیا گیا تھا کہ آج مجھے اس نقشِ محبت کو اور اس درسِ محبت کے متن کو دوبارہ رقم کرنے کے لئے یہ خطرناک قدم اٹھانا پڑا تھا۔ میں واقعی اور سچ مچ دل گرفتہ ہو کر رو رہا تھا۔ جبکہ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی نگینہ یہ سمجھ رہی تھی مجھے اپنی فرضی بیوی نگہت کا غم کھائے جا رہا تھا۔

تب پھر اچانک میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں قدرے چونک کر پلٹا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ تھی اور اس جھلملاہٹ میں مجھے نگینہ کا رخ روشن دکھائی دیا۔ میرا دلِ وحشی یکبارگی دھڑکا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے نگینہ کی نازک طبع اور رحم دلانہ فطرت کا جو بھرپور اندازہ لگایا تھا، وہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں یہ سب کچھ اسی کی خاطر تو کر رہا تھا۔

''تم ..... گئی نہیں نگینہ.........؟'' میں نے جلدی سے اپنے گرم سوئیٹر کی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ لیکن میں نے اس کے لہجے کی مضبوطی کا بھی احساس کیا تھا۔

''کیوں.........؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تم اپنی محبوب بیوی کا علاج نہیں کراؤ گے؟'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ لہرا رہی تھی۔

''لل.........لیکن.........تم.........؟''

''میری فکر چھوڑو۔ سچ پوچھو تو میں تمہاری دکھ بھری کہانی سے اس قدر امپریس ہو گئی ہوں کہ مجھے تمہارا ساتھ دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک بالکل ہی الگ تھلگ اور عجیب و غریب ایڈونچر ہے یہ میرے لئے۔'' وہ پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری دکھ بھری بپتا سن کر میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میں پپا سے خود ہی کسی طرح رقم کا بندوبست کر کے تمہارے حوالے کر دوں گی۔ لیکن میں اپنے پپا کی فطرت سے واقف ہوں۔ اوّل تو اتنی بڑی رقم شاید کبھی نہیں دیں گے۔ اگر دے بھی دیں تو یقیناً وہ مجھ سے سب سے پہلے یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں اتنی بڑی رقم کس لئے لینا چاہتی ہوں؟ اور میں شاید اس سلسلے میں اُنہیں مطمئن نہ کر سکوں۔ اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم وہی کرو، جو کر رہے ہو۔''

اس کی بات سن کر میرا دل مسرت سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ تاہم میں نے ذرا چپ ہی سادھے رکھی۔ پھر کھلنڈرے پن سے بولی۔ ''اب کیا ہوا؟.........اب تو تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہا؟''

''تم.........بہت عظیم ہو.........میں.........میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔''

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں اس کے قدموں کی طرف جھکنے لگا تو وہ بے اختیار ہو بولی۔

''ارے.........رے.........رے......... یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے میرے کاندھے کو ہلاتے ہوئے ملامت سے کہا۔ ''چلو آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بولی اور پھر ہم دونوں ٹیکسی میں آ بیٹھے۔

بالکل غیر متوقع طور پر حالات نے اچانک اور بڑے ہی عجیب و غریب انداز میں جذباتی طور پر پلٹا کھایا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اور نگینہ کے بیچ ''گم گشتہ تعلق خاطر کی ڈرامائی ''تجدید'' ہو رہی ہے۔ یہ جس قدر جذباتی صورتِ حال تھی اس سے زیادہ دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اب میرا کام مزید آسان ہو گیا تھا۔ گویا ''میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی'' والی بات تھی۔ میں بہ ظاہر نگینہ کو فریب دے رہا تھا۔ لیکن میرے اس فریب میں ہم دونوں کی بھلائی مضمر تھی۔

اس نے میری ''مشکل'' کو مزید آسان کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ ہم دونوں سب سے پہلے کسی دور کے شہر کا رخ کریں اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین پشاور کی طرف نکل جائیں۔ کیونکہ ایئرپورٹ اب ہمارے لئے ''فلیش پوائنٹ'' اختیار کر چکا تھا۔ وہاں سختی کے ساتھ چیکنگ ہو سکتی تھی۔ اس کا مشورہ صائب تھا جس پر عمل کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی۔

اب نگینہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا ''جنڈ'' نامی اسٹیشن سے ایک ایکسپریس ٹرین جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہی پشاور تک کا سفر ٹھیک رہے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ افراتفری کا عالم رہا تھا کہ ہمارے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے بعد آنے والے پٹرول پمپ سے میں نے ٹینکی فل کروائی۔ منرل واٹر کی بوتلیں اور کچھ جوس، بسکٹ اور چپس وغیرہ کے پیکٹ لئے۔ مجھے جنڈ کا راستہ معلوم تھا۔ کار چلاتے ہوئے میں نے نگینہ سے کہا۔

''نگینہ! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو۔'' اس نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''آپ جس طرح دو محبت کرنے والوں کی مدد کر رہی ہیں، ضرور آپ کے دل میں بھی کسی نے اس کی قدر و قیمت بٹھائی ہوگی۔ کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟'' یہ کہتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ میرے سوال پر اسے ایک پراسراری چپ لگ گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی جیسے اپنے اندر کو کھنگالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر گومگو سے لہجے میں بولی۔

''شاید نہیں۔''

''کیا مطلب؟.........شاید کہنے سے آپ کا جواب اثبات میں ہی محسوس ہوتا ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''ہاں.........کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے.........جیسے میں بھی کسی سے بہت شدید محبت کرتی تھی.........وہ محبت کہیں کھو گئی ہو۔'' اس کی آواز میں جتنی دوری تھی، اتنی ہی گہرائی بھی تھی۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ میں نے فوراً کہا۔

''محبت کھو گئی ہے؟.........تو کیا آپ کے ساتھ کسی نے بے وفائی کی ہے؟''

میری بات پر وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں.........شاید ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس کچھ ایسا لگتا ہے میرا کچھ کھو گیا ہو۔ کبھی کبھی میرے اندر سے ایک ہوک اُٹھتی ہے۔ میرے دماغ میں، میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانۂ دل میں کسی کی یاد تھی، جس پر دھند چھائی ہوئی ہے۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش سی ہو گئی۔ جبکہ اس کی بات پر میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ میرے جی میں آئی کہ اسے چیخ چیخ کر بتاؤں 'نگینہ! میری جان جاناں! تمہاری محبت کھوئی نہیں ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں .... نادر علی خان تمہاری پہلی اور آخری محبت جس نے اس سوئی ہوئی محبت کو دوبارہ جگانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔' لیکن میں ابھی اس سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا تاہم میں نے کہا۔

''مس نگینہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہو جس نے آپ کی یادداشت میرا مطلب ہے......... محبت والی یادداشت کا خانہ محو کر دیا ہو؟''

میری بات پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں جیسے کوئی چمک پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے اپنے سر کو پرسوچ انداز میں تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''ہاں .... کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔''

اس کے جواب نے میرے شوق کو بڑھاوا دیا۔ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''لیکن آپ جس سے محبت کرتی تھیں، اس کے ساتھ تو ظاہر ہے کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوگا۔ پھر......... پھر اس نے تو یقیناً آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی اور .... اور آپ کو اپنی اس محبت کی یاد دلانے کی بھی کوشش کی ہوگی؟''

''پتہ نہیں.........'' اس نے مختصراً کہا اور میری امیدوں پر اوس پڑنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ فوراً میری باتوں کا ذکر کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے دل و دماغ کو میری طرف سے اس قدر گہرائی کے ساتھ HYPNOTIC SLEEP کر کے MESMERIZE کر دیا گیا تھا کہ اسے مجھ سے متعلق ''پیش آمدہ'' اور موجودہ کے بارے میں کچھ یاد نہ رہا تھا۔ بہرطور میں نے دل کو مضبوط کر لیا۔ تقدیر نے میرا یہاں تک ساتھ دیا تھا۔ انشاء اللہ آئندہ بھی مجھے کامیابی ہی بخشے گی۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ میں نے اب موجودہ حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے بہت جلد نگینہ سے جان چھڑا لینی تھی۔ گھنٹے بھر بعد ہم جنڈ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچے۔ ٹیکسی میں نے ذرا دور ویرانے میں چھوڑی اور نگینہ کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ یہ بہت مختصر سا اسٹیشن تھا۔ ایک ٹرین روانگی کے لئے تیار کھڑی تھی۔

بکنگ آفس سے علم ہوا، یہی ٹرین پشاور جانے والی ہے۔ میں نے جلدی جلدی دو ٹکٹ خریدے۔ جیسے ہی ایک بوگی میں سوار ہوا، ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔ بوگی میں مسافروں کا رش کم تھا۔ میں اور نگینہ آمنے سامنے کی دو سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

راولپنڈی (اسلام آباد) سے پشاور 172 کلومیٹر یعنی 107 میل مغرب میں تھا۔ بذریعہ جہاز چند منٹ سے پشاور بہ مشکل نصف گھنٹہ لگتا تھا۔ جب ٹرین نے رفتار پکڑی تو مجھے ٹھیک ٹھاک اندازہ ہوا کہ یہ ٹرین تین ساڑھے تین گھنٹوں میں ہمیں پشاور پہنچا سکتی تھی۔ نگینہ میرے سامنے کی سیٹ پر خاموش بیٹھی ہوئی کھڑکی سے باہر کے بھاگتے ہوئے مناظر دیکھتی رہی، پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی اس کے چہرے سے اپنی پیاسی اور مجبور نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور تب میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے دکھ کا تاثر آنسو بن کر ٹپکا۔ اپنی محبت، جان جاناں......... اپنی نگینہ کو روتا دیکھ کر میرا اندر چھلنی ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر بے تابی سے پوچھا۔

''آ......... آپ .... رو رہی ہیں .... مس نگینہ!''

اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی بھی کوشش نہ کی، ایسے ہی بولی۔ ''ہاں......... مجھے لگتا ہے، میرے اندر کوئی خوشی نہیں۔ بس ایک اتھاہ خاموشی ہے، گمبھیر سناٹا ہے۔ میرے دل و دماغ میں کبھی کبھی اپنے اندر کچھ کھونے کا احساس ہوک بن کر اس قدر شدت کے ساتھ اٹھتا ہے کہ .... میرے آنسو اُمڈ پڑتے ہیں۔'' اس کے غم و اندوہ سے لبریز الفاظ نے میرے دل کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا وہ اپنے تئیں کسی نا معلوم غم کا شکار ہے۔ ایسے میں بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کے غموں سے چور وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں اور اس کا آنسو بن جاؤں۔

یاالٰہی! یہ کیا امتحان تھا؟ یہ کیسی عجیب و غریب اور بے چین کر دینے والی صورت حال تھی۔ میں نے کبھی ایسی صورت کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس قدر بے بسی میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی جس کا مجھے اس وقت سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پھر اپنے حلق میں اترنے والی رقت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ ''نگینہ صاحبہ! آپ کو کسی انجانے اور نہ معلوم دکھ میں پا کر خود میں بھی پریشان اور غم زدہ سا ہو رہا ہوں۔ پلیز! اگر آپ کا اب میرے ساتھ جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو میں آپ کو آپ کے پیا کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔''

میرے نرم اور التجائیہ لہجے پر وہ مسکرائی اور بولی۔

''پھر......... پھر تم اپنی محبوب بیوی کا کس طرح علاج کراؤ گے؟''

میں دانستہ لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔ مجھے چپکا پا کر وہ پھر بولی۔

''دیکھو نادر! جانے کیوں اب میرا دل بھی تمہاری مدد کرنے کو چاہ رہا ہے۔ اسے تم کچھ بھی معنی دو، مگر میں بہرحال نہیں چاہتی کہ تمہاری محبوب بیوی تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم خود کو کسی مشکل میں نہ پھنسا لو اور سب کیا کرایا دھرا رہ جائے، برباد ہو جائے۔''

میں نے اس کی بات پر کہا۔ ''نگینہ صاحبہ! میں آپ کے جذبہ ہمدردی کی قدر کرتا ہوں۔ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں نے شادی سے پہلے نگہت سے بہت طوفانی قسم کا عشق کیا تھا۔''

میں اتنا بتا کر ذرا رکا اور کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ وہ میری فرضی محبوب بیوی سے محبت کے متعلق باتوں کو بڑی غیر معمولی دلچسپی سے سنتی تھی۔

''آگے کہو نا .... تم رک کیوں گئے؟'' میری دانستہ ذرا طول پکڑتی خاموشی پر وہ عجیب سی بے تابی سے بولی۔ اس کے اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے اثر پذیرانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''میرا آبائی گاؤں چترال میں ہے۔ نگہت دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بہت ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مگر اس کے قبیلے سے ہماری بڑی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ ہمارا ایک ہونا ناممکن بن چکا تھا۔ لیکن ہم دونوں کی محبت نے اسے بالآخر ممکن کر دکھایا اور ہم نے شادی کر لی۔ اب دونوں طرف کے قبیلے ہماری جانوں کے دشمن ہو گئے۔ ہم ان سے بچتے رہے اور اس دوران بڑے کٹھن حالات و مصائب سے گزرے۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ بالآخر ہمارے قبیلے کے لوگوں نے تھک ہار کر ہماری تلاش ترک کر دی اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا۔ البتہ ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبیلے سے ہی نہیں بلکہ علاقے سے بھی بے دخل کر دیا۔ میں نے محنت مزدوری شروع کر دی۔ اور اب .... جب ذرا سکھ کے دن آئے تو .... تو وہ بے چاری اس موذی اور جان لیوا مرض کا شکار ہو گئی۔'' میں نے آخر میں دانستہ اپنے لہجے میں رقت سمو لی تھی اور یونہی آنسو پونچھنے لگا۔ اچانک نگینہ نے میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاندھے پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے قدرے چونک کر مغموم سی نظروں سے اسے دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ایک عزم کی سی چمک محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔

"نادر صاحب!.....آپ واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ اگرچہ تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے لیکن آپ نے تو اپنی تقدیر بھی پلٹ کر رکھ دی۔ میں آپ کی اپنی محبوب بیوی سے اس قدر بے لوث اور گہری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ آپ بہت عظیم ہیں۔"

"نہیں نگینہ صاحبہ!.....میں ایک خودغرض اور بے ضمیر انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "اپنی غرض کی خاطر میں نے آپ کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اگر میری نگہت کو یہ سب معلوم ہو جائے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔"

"ارے، وہ کیوں؟ اب تو میری اپنی بھی مرضی شامل ہو گئی ہے کہ تمہاری مدد کروں۔" وہ بولی۔

میں نے بھیگی مسکراہٹ سے کہا۔ "کچھ بھی سہی نگینہ صاحبہ! یہ غلط ہے۔ کسی کی محنت کی کمائی پر اس طرح ڈاکہ ڈالنا کہاں کا انصاف ہے؟"

میری بات پر نگینہ بولی۔ "پینتیس لاکھ کی رقم میرے پپا کے لئے بہت معمولی رقم ہے۔ اگر تم ان سے ایک کروڑ کا تاوان بھی لو تو میری خاطر وہ تمہیں بڑی آسانی سے دے دیں گے۔ کم از کم اس طرح ایک انسان کی جان تو بچ جائے گی۔"

میں نے اپنی گفتگو کو مزید اثر انگیز بناتے ہوئے اس سے کہا۔ "نگینہ صاحبہ! مجھے ایک کروڑ کی نہیں، صرف پینتیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ اور میں آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ زندگی رہی تو میں یہ رقم آپ کے پپا کو واپس لوٹانے کی بھی کوشش کروں گا جو مجھ پر ایک قرض ہو گی۔"

"اچھا....." وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم بھلا اتنی بڑی رقم کیسے لوٹا سکتے ہو؟"

"خود کو بیچ کر۔" میں نے کہا۔

"خود کو بیچ کر؟" اس نے چونک کر دہرایا۔

"ہاں نگینہ صاحبہ! ..... میں نے سنا ہے کہ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ جن کے گردے خراب ہوتے ہیں، وہ بڑے مہنگے داموں مجھ سے ایک گردہ تو خرید ہی لیں گے منہ مانگے داموں پر۔" میں نے درد بھرے لہجے میں کہا تو نگینہ نے اچانک میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نرم و نازک مخروطی انگلیوں کا لمس مجھے سرشار کر گیا۔ اگرچہ میں اس "محبوب" لمس سے واقف تھا مگر اس لمحے مجھے وہ لمس نہایت اجنبی اجنبی سا لگا۔ مجھے محسوس ہوا وہ اُدھار میں ملنے والا لمس تھا۔ پھر وہ میرے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا کر بولی۔

"ایسا مت کہو۔ بس اب تم وہی کرتے جاؤ جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

میں خاموش ہو گیا۔

ایکسپریس ٹرین دوپہر دو بجے تک پشاور پہنچ گئی۔ اسٹیشن کے اریب قریب بھی کئی اچھے ہوٹلز تھے لیکن میں کسی متوقع خطرے کے پیش نظر ریلوے اسٹیشن کے قریب والے ہوٹل میں کمرہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ یوں تو میرا ہوٹل میں باقاعدہ ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں تو محض نگینہ کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے کسی آرام دہ جگہ پر ذرا ستانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں فوراً چترال اور پھر وہاں کے قصبے "ایون" سے گزر کر وادی کیلاش میں داخل ہونا تھا۔ یہ ایک دشوار گزار مہم تھی۔ وہاں کلاشی آگرم نامی بستی میں اس کلاشی عامل عاروب کو تلاش کرنا مشکل نہ ہوتا۔ میں نے چترال اور وادی کیلاش سے متعلق خاصی تفصیلی معلومات

ہی حاصل کر رکھی تھیں۔ میرا ارادہ پشاور سے چترال بذریعہ جہاز جانے کا تھا جو محض پچاس منٹ کی واز پر تھا۔ میں نے اس بارے میں نگینہ کو آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ ہمیں یہ سفر بائی روڈ کرنا چاہئے۔ سفر نہایت تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ہوتا۔ اسے شاید فضائی سفر مہنگا لگ رہا تھا۔ جبکہ میرے چہ یہ خطیر رقم موجود تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ عاروب نامی عامل نگینہ کے علاج کے لئے کوئی بھی مطالبہ کر سکتا ں نگینہ کے ڈرامائی تعاون سے مہم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوا تھا۔ اس لئے مجھے اس کی طرف سے ئی فکر نہ تھی اور اسی لئے میری خواہش تھی کہ ہم جلد از جلد چترال روانہ ہو جائیں۔ اور اس مقصد کے ے فضائی سفر سب سے زیادہ مناسب تھا۔

ہم دونوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے۔ مسافروں کا خاصا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ عمارت کے باہر خاصی ل پہل تھی۔ میں نگینہ کا ہاتھ تھامے اپنے اطراف کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیتا ہوا ایک ٹیکسی کی طرف ھا اور ٹیکسی ڈرائیور سے یادگار چوک چلنے کا کہا۔ میرے اور نگینہ کے پنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی ٹیکسی چل ی۔ پشاور بڑا پُر رونق شہر ہے۔ ٹیکسی گورنمنٹ ہاؤس، کمپنی باغ سے گزرنے لگی۔ میرے لئے پشاور میں ی خطرہ تھا بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقے میں پولیس، انتظامیہ اور دشمنوں کا خطرہ بدستور ننگی تلوار کی طرح وجود تھا۔ کیونکہ شاہ میر کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ پھر سب سے اہم خطرہ کبیر کا ا جو میرے عزائم اور میری آئندہ کی "مہم" سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے مجھے ہر لحہ بے حد محتاط رہنے ی ضرورت تھی۔

ہماری ٹیکسی جوں ہی قصہ خوانی بازار کی طرف جانے والی سڑک سے مسجد مہابت خان کی طرف ڑنے لگی تو اچانک مجھے تعاقب کا احساس ہوا۔ کیونکہ جیسے ہی ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا تو مجھے اپنے عقب ں ایک گہرے سبز رنگ کی ہائی روف مڑتی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں اسے ھی دیر سے اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان میں سوار افراد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تب ں اپنے تعاقب کا یقین کرنے کی خاطر ٹیکسی ڈرائیور کو دانستہ مختلف شاہراہوں پر گھماتا رہا اور پھر ایک پُر ونق دکان کے سامنے اسے رکنے کا کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ میں نے عقب میں گردن گھما کر یکھا، سبز رنگ کی وہ ہائی روف غائب تھی۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور اتر کر سٹور میں داخل ہو گیا۔ نگینہ ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ میں نے جلدی جلدی نگینہ کے ناپ کے چند سوٹ خریدے اور باہر نکل ایک ہائی روف کے غائب ہونے سے مجھے خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً میرا وہم رہا ہو گا۔

یادگار چوک اتر کر ہم نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا۔ ٹیکسی سے اترتے وقت میں نے ایک بار پھر طراف کا جائزہ لیا مگر وہ سبز رنگ کی ہائی روف مجھے پھر دکھائی نہ دی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے تازہ دم ہونے کو کہا اور وہ ملحقہ غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے باہر سڑک ی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانکا تو میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ مجھے سبز رنگ کی وہی ہائی روف ڑی نظر آ گئی۔ پھر میں نے اس میں سے دو افراد کو نیچے اترتے دیکھا تو جیسے میں دوسرا سانس لینا بھول یا۔ دل جیسے یکبارگی میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں ان دو افراد کو ایک جھلک ھ کر ہی پہچان گیا تھا۔ وہ کبیر اور کالا ناگ تھے بلکہ کالا ناگ کو دیکھ کر تو جیسے میری رگوں میں ایکا ایکی لہو ا جگہ لاوا اُچھلنے لگا۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے مجھے ڈاج دیا تھا۔ انہیں شاید بروقت یہ احساس ہو گیا ا کہ مجھے اپنے تعاقب کا ادراک ہو چکا ہے۔ یوں انہوں نے عارضی طور پر خود کو میری نظروں سے جھل کر دیا تھا۔ لیکن میں اب بہ غور ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ کبیر نے فوراً

اپنے یار غار کالا ناگ سے رابطہ کیا تھا اور شاید ان دونوں نے ہی میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کالا ناگ لاہور کے گجر چوک کا معروف بدمعاش تھا۔ جبکہ کبیر میرے عزائم سے پوری طرح واقف تھا۔ یہی سبب تھا کہ دونوں کا یہاں پایا جانا اچنبھے کی بات نہ تھی۔

میں ابھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں؟ اس وقت وہ دونوں ہائی روف کے باہر کھڑے تھے اور کالا ناگ کان سے موبائل لگائے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ یہ دونوں ابھی تک ہوٹل کی عمارت کے اندر کیوں نہیں داخل ہوئے۔ تب ذرا دیر بعد کالا ناگ نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا۔ پھر وہ کبیر سے باتیں کرنے لگا۔ میں کسی قدر فاصلے کے باوجود واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ دونوں کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ دونوں ہوٹل سے باہر کیوں کھڑے تھے؟ انہیں تو اندر آ کر مجھ سے حساب کتاب نمٹانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کالا ناگ مقامی پولیس کو ہمارے بارے میں آگاہ کر رہا ہو؟......

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اسی وقت ایک کار تیزی کے ساتھ ان کے قریب پہنچ کر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ رکی۔ میں ٹھٹکا۔ میری نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کار میں سے چار تیم تحیم اور تنومند افراد برآمد ہوئے۔ اپنی سرخ و سفید رنگت کے باعث وہ مقامی دکھائی دے رہے تھے۔ کار سے اتر کر وہ کالا ناگ کی طرف بڑھ گئے۔ کالا ناگ انہیں ہوٹل کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ بتانے لگا۔ ان چاروں کے مؤدبانہ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کالا ناگ سے بخوبی واقف تھے اور یقیناً کسی مقامی بدمعاش کی ہدایت پر گجر چوک کے نامی گرامی کالا ناگ کی مدد کرنے یہاں پہنچے تھے۔

ان چاروں نے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض پہن رکھے تھے اور پیروں میں پشاوری چپلیں تھیں۔ ان کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران کبیر خاموشی سے کھڑا ہوٹل کی سمت دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ چاروں مؤدبانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف ہو گئے جبکہ کالا ناگ اور کبیر نے ہوٹل کے دروازے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ خون جیسے لاوے کی طرح میری رگوں میں سنسنا رہا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ملحق غسل خانے کی طرف نگاہ ڈالی۔ پانی گرنے کی ہلکی سی آواز اس کی مصروفیت کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ باہر کیا واقعات پیش آ رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے کس کیفیت میں، میں پلٹا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ خاصا معیاری ہوٹل تھا۔ قدرے طویل کوریڈور میں چند وردی پوش ملازمین کے سوا مجھے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ میں نے قمیض کے نیچے میگارد کی موجودگی کو محسوس کیا اور برق رفتاری سے زینوں کی طرف بڑھا۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور زینوں کا اختتام ہوٹل کی ریسپشن پر ہوتا تھا۔

میں بہ صد احتیاط زینے تک پہنچا اور ذرا نیچے اُتر کر میں ٹھٹک کر ریلنگ سے چپکا کھڑا رہ گیا۔ میں نے دیکھا کالا ناگ اور کبیر ریسپشن پر موجود تھے اور ریسپشنسٹ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ یقیناً ہمارے بارے میں ہی اس سے استفسار کر رہے تھے۔ اچانک میرے دل میں خیال اُبھرا اور پھر یکدم واپس پلٹا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کیا مگر اندر سے چٹخنی نہیں چڑھائی۔ نگینہ اس دوران میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھی۔ نئے لباس میں اب وہ خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ تاہم مجھے پریشان پا کر وہ بھی چونک گئی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں پیش آمدہ خطرے سے آگاہ کیا تو وہ متوحش سی نظر آنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ کبیر ایک نامی گرامی غنڈے کالا ناگ کے ساتھ یہاں آن پہنچا ہے اور باہر اس کے چار مقامی بدمعاش بھی موجود ہیں۔" یہ کہہ کر میں جلدی سے کھڑکی کی طرف لایا اور نیچے موجود ان چاروں مقامی تیم تحیم افراد کی جھلک دکھائی۔

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں رکنے کے بجائے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر تم نہیں ..." وہ بولی۔

تاہم میں نے اسے تسلی دی۔ "میں ان پر قابو پا لوں گا۔ آپ اتنا کریں کہ باتھ روم میں چلی جائیں۔ ...م ہے۔"

وہ حیران پریشان سی باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اسی وقت مجھے بیرونی کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں کسی زخمی چیتے کی طرح دروازے کے قریب لپکا اور سانس روک کر دائیں جانب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ ایک دھاکے سے کھلا اور کالا ناگ دھڑ سے اندر داخل ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا اس لئے اس نے غالباً دروازے کو لات مارنے میں پوری قوت صرف کر دی تھی۔ مگر دروازہ کھلا ہونے کے باعث وہ اپنی جھونک میں اندر گھستا چلا آیا۔ میں نے پیچھے سے اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی جس کی وجہ سے وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ کبیر نے پلٹ کر جھپٹنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی اندر رگید لیا۔

میری پوزیشن چونکہ ایک اغواء کنندہ مجرم کی سی تھی اس لئے مجھے بہرحال یہ سب خاموشی سے نمٹانا تھا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

اب کمرے کا یہ محدود ماحول اکھاڑا بن سکتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ میری طرف بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے اپنا سائلنسر لگا میگارد نکال لیا۔ کبیر تو میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا جبکہ کالا ناگ کے چہرے پر کسی تشویش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بہ دستور شعلے برساتی نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ پھر دانت پیس کر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

"نادر! اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" اسے بھی شاید میری پوزیشن کا اندازہ تھا کہ میں اس وقت مجرم تھا اور پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔

میں نے اس کی یہ خوش فہمی رفع کرنے کی غرض سے غرا کر کہا۔ "کسی بھول میں نہ رہنا کالا ناگ! تمہاری موت تمہیں یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ میں اپنے ماموں کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہتے ہوئے میں پستول والا ہاتھ اٹھا کر اس کی مکروہ سیاہ پیشانی کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا چاہتا تھا کہ اس نے استہزائیہ مسکراہٹ سے جیسے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"نادر! مت بھولو کہ میرا تم پر جاں بخشی کا قرض ہے۔ تم تو دشمنی میں بھی ایک معیار کے قائل ہو۔ بھول گئے میری بات۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہماری دشمنی خالصتاً اپنے زور بازو پر ہو گی، اس آتشیں ہتھیار سے تو کوئی گیدڑ صفت بزدل بھی شیر جیسے بہادر کو با آسانی ہلاک کر سکتا ہے۔"

اس کی بات نے مجھے لمحہ بھر کو دم بخود کر دیا تھا۔ میں اس کی یہ بات جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ اس نے کشمکش والی مہم کے دوران جب میں اس کے پستول کی گولی کے رحم و کرم پر تھا، مجھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی دھمکی بھی دی تھی کہ وہ میرے اپنوں کی لاشوں کا منظر مجھے دکھانے کے بعد ہلاک کرے گا۔ یہ ایک طرح سے اس کی ایک قسم تھی۔ تاہم میں نے کہا۔

"کالا ناگ! ٹھیک ہے، آج میں تمہارا وہ قرض بھی اتارے دیتا ہوں۔ لیکن یہ بھی اب کان کھول کر

سن لو، آج کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا میگارد واپس اڑس لیا۔ ٹھیک اسی وقت کالا ناگ نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں اس کی خباثت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے جوں ہی اپنا پستول باہر نکالا، اس سے پہلے ہی میں نے میگارد سے اس کے پستول والے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ میرے "خاموش" پستول سے گولی نکلی اور کالا ناگ کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر پرے جا گرا۔

"میں اب تمہارا قرض اتار چکا ہوں۔" میں نے خونچکاں غراہٹ سے کہا۔ "اور ہاں ..... اگر تمہیں شیر بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو کتوں کے ساتھ میرے مقابلے پر نہ آنا۔ میں ان کے ساتھ تمہارا بھی برا حشر کروں گا۔ گجر چوک والے اڈے میں تمہیں بشیر چیرا کا انجام یاد ہو گا۔ اب تم ہوٹل کے باہر موجود ان چاروں کتوں کو لے کر دفعان ہو جاؤ۔"

"بس ..... اب تم اپنی بکواس بند کرو۔" یکایک کبیر کی سرد آواز ابھری۔ میں کالا ناگ سے الجھ کر اسے یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف پلٹا اور اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول نظر آ رہا تھا۔

"مجھے نگینہ ملے یا نہ ملے ..... مگر تم آج زندہ نہیں بچو گے۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا اور ٹرائیگر دبا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبیر کے تیور خطرناک تھے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی وحشیانہ چمک دکھائی دے رہی تھی جو شکار کو دیکھ کر درندوں کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ اس نے بلا توقف اپنے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ اس کا یہ عمل اس قدر غیر متوقع تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ کمرے کی فضا میں کھٹکے کی آواز گونجی مگر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ وہ اپنے اناڑی پن اور غیر معمولی جوش کے باعث پستول کا سیفٹی کیچ ہٹانا بھی بھول گیا تھا۔

میرے لئے بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میں زخمی درندے کی طرح اس کی طرف بڑھا اور وحشیانہ انداز میں اسے رگیدتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے سر کے عقبی حصے پر دیوار سے ٹکراؤ کے باعث لگنے والی ایک ہی شدید ضرب نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کے ساتھ میرے برستے مکوں اور لاتوں نے اس کا رہا سہا دم خم بھی نکال دیا۔ کبیر سے معرکہ آرائی کے دوران میں گجر چوک کے بدنام ہسٹری شیٹر کالا ناگ سے بھی غافل نہیں تھا۔ تاہم حیرت انگیز طور پر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہم دونوں کو باہم دست و گریبان دیکھتا رہ گیا۔ جوں ہی میں نے محسوس کیا، کبیر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں، میں پیچھے ہٹا اور ایک ہی جست میں کالا ناگ کے ہاتھ سے نکلے پستول پر جا گرا۔ کبیر کے پستول کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے رگیدنے کے دوران اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور ایک کونے میں جا گرا تھا جہاں تک ان دونوں کے لئے رسائی حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

وہ دونوں نہتے اور مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھے۔ میں نے اپنے میگارد کی نال کا رخ ان کی طرف کیا اور کہا۔

"دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔"

میں نے کالا ناگ کی آنکھوں سے غیظ کے شعلے نکلتے محسوس کئے تاہم اس نے میرے حکم کی تعمیل میں اپنا رخ موڑا تھا۔ کبیر بھی بری طرح کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کی ٹانگوں کی لرزش صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میری بے رحمانہ ضربوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تاہم اس کے ہاتھ سر تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لیا ہوا تھا ورنہ شاید وہ کھڑا بھی نہ ہو سکتا۔

میرے دل میں آئی، ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں۔ مگر فوری طور پر اپنے قریب مجھے ایسی کوئی شے نظر نہ آ سکی جسے اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا۔ وہ دونوں دیوار کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ اس لئے میری نگاہ غسل خانے کے دروازے کی طرف گئی۔ وہ با آواز کھل گیا تھا اور وہاں کھڑی حیران نظروں سے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کی ہدایت کی اور اشارے سے بلایا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے کوئی لفظ ادا کئے بغیر اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ایک لمحہ وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقیناً نگینہ کی نگاہ کبیر پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اسے پہچان کر میری مدد سے بھی دستبردار ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی کبیر ایک طرح سے اس کا عامل تھا، وہ اس کی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی تھی۔

نگینہ کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ بے شمار سوال تھے مگر وہ خاموش رہی۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور نگینہ کو لئے عقبی زینے کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ کالا ناگ فوراً موبائل پر نیچے موجود اپنے ساتھیوں کو خبردار کر سکتا تھا اس لئے میں گراؤنڈ فلور پر پہنچتے ہی بیرونی دروازے کی بجائے عقبی سمت کی ایک راہداری میں بڑھ گیا اور ہوٹل کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ یہ انڈر گراؤنڈ کار پارکنگ تھی۔ میں نگینہ کو لئے عقب کی ایک ذیلی سڑک پر آ گیا اور دائیں بائیں ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ٹیکسی کہیں دکھائی نہ دی۔ میں ایک طرف دوڑ پڑا۔ دفعتہً مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے گردن گھما کر دیکھا۔ کالا ناگ کے دو بدمعاش ہاتھوں میں پستول تھامے ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔

''رُک جاؤ.....ورنہ گولی مار دی جائے گی۔'' ایک نے چلا کر مجھے دھمکی دی۔ جواب میں، میں نے دیوار کی آڑ لے کر میگارد سے ان پر فائر جھونک دیا۔ میرے میگارد نے خاموش گولی اُگلی۔ میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اسی اثناء میں اس کے دوسرے ساتھی نے فائر کر دیا۔ گولی میرے چہرے کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے شست باندھی اور اس کی طرف بھی خاموش گولی ارسال کر دی۔ اس کے بعد ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نگینہ کو ساتھ لے کر دوڑتا چلا گیا۔

فوراً ہی ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور نگینہ کو اندر دھکیلنے کے بعد خود بھی عقبی نشست پر سوار ہو گیا۔ میگارد میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بلا توقف اسے ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیا۔

''ٹیکسی دوڑاؤ.....جلدی کرو۔'' میں نے غرا کر کہا۔ وہ بھی کوئی ضدی پٹھان تھا۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھانے کی بجائے غصیلے لہجے میں کہا۔

''یہ کھلونا جیب میں رکھ لو۔ کرایہ دو گے تو میں تمہیں دنیا کے آخری کنارے پر لے جاؤں گا۔''

میں نے اس کی نفسیات سمجھتے ہوئے اس کی فطرت کے مطابق نرمی سے کہا۔ ''اچھا، اچھا خان صاحب! آپ کی مہربانی، ہمارے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ کی قسم، یہاں سے فوراً نکل چلیں۔ میں آپ کو پورا کرایہ دوں گا۔''

''یہ ہوا نا بات خوچہ!'' اس نے مسرت انگیز انداز میں کہا۔ ''اب تم ہمارا کمال دیکھنا.....ہمارا ٹیکسی دیکھنا.....اس کا رفتار دیکھنا.....'' وہ تو جانے کیا کیا دکھانے پر آمادہ تھا مگر میں نے ہلکی سی تھپکی دی تو اس نے زبان کے جوہر دکھانا بند کر کے گیئر لگایا اور جھٹکے سے کلچ چھوڑ دیا۔ اس دوران میں وہ ایکسیلیٹر کو خاصا سے کچھ زیادہ دبا چکا تھا۔ نتیجتاً ایک تیز چرچراہٹ کے ساتھ ٹیکسی آگے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

''کیا کوئی عشک مشک (عشق مشق) کا چکر ہے؟'' ذرا آگے بڑھنے کے بعد اس نے گردن گھما کر ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں مجھے کھلنڈرے پن کی جھلک محسوس ہوئی۔

''ہاں لالہ!.....ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے اس کی جرح سے بچنے کے لئے اس کی تائید کر ضروری سمجھا۔

''خوچہ.....فکر ماکوا (فکر نہ کرو) ام تمارے ساتھ ہے۔ ام نے بی گل بدن سے ایسا ہی مارا مار عشق کیا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے توصیفی انداز میں بولا۔ ''پھر تو لالہ! تم ضرور کامیاب ہوا ہو گا اپنے عشق میں۔ اس لئے ہم پر یہ مہربانی کر رہے ہو۔''

''ہاں.....ہاں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ گل بدن شاید اس کی کوئی محبوبہ تھی جو اب اس کی بیوی بن چکی تھی۔ وہ ٹیکسی دوڑانے لگا۔ میں بار بار عقب میں دیکھے جا رہا تھا۔ تب پھر اچانک میں نے اسی سبز رنگ کی ہائی روف کو تعاقب میں آتے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ پھر خان ڈرائیور سے کہا۔

''لالہ! دشمن ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ سبز رنگ کی گاڑی میں۔''

''خوچہ! سبز رنگ کیا ہوتا ہے؟'' اس نے اُلجھ کر پوچھا۔

''سواری رنگ کا گاڑی بابا!''

''او.....اچھا، اچھا۔ ایسا بولو نا.....پر تم بے فکر رہو، امارا سائے تک بی نہیں پہنچے گا۔'' اس نے کہا اور ٹیکسی کی رفتار بڑھائی۔ اب وہ بھی گاہے گاہے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے ٹیکسی دوڑائے جا رہا تھا۔

''لالہ! تم بہت بہادر اور خدا ترس آدمی نظر آتے ہو۔ ہمارے دشمن بہت خطرناک اور چالاک ہیں۔ کہیں تم انہیں چکر دے سکو گے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔ بصورتِ دیگر خود میرا ارادہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا تھا۔ اس کی رگ پھر پھڑک اُٹھی۔

''او خدائی خوار! تم ام کو بالکل ہی پھٹیچر سمجھتا ہے۔ ام نے تمہیں بتایا نہیں کہ ام بھی گل بدن کے ہاتھ ایسا ہی مارا ماری والے حالات سے گزر چکا ہے۔''

''اچھا، اچھا لالہ! تمہاری مہربانی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ٹیکسی ہی نہ روک دے۔ اچانک عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ٹیکسی اس وقت مین شاہراہ کی طرف موڑ رہی تھی۔ ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ٹیکسی کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ ٹیکسی قابو ہو کر سڑک کے کنارے بنے اوپن ایئر ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ میزوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ فائرنگ اور ٹائر برسٹ کے دھماکوں پر ہماری طرف متوجہ ہوئے، پھر ٹیکسی بے قابو اپنی طرف آتے دیکھ کر اٹھ دوڑے۔ شکر تھا کہ خردماغ ڈرائیور نے فوراً اسٹیئرنگ پر قابو پاتے ہوئے ٹیکسی روک دی۔ میں نگینہ کا ہاتھ پکڑے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر لپکا۔ گولیوں کی اک بوچھاڑ نے ہمارا ناکام تعاقب کیا تھا۔ میں جھکا جھکا دوڑتا ہوا ہوٹل کے احاطے سے دوسری طرف آ گیا۔ ہمارے آس پاس راہ گیروں کی چیخ پکار پھیل گئی تھی۔ بڑی زبردست ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ دشمن نگینہ کی بجائے صرف مجھے ہی نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میں اندرون شہر مصروف بازار کی طرف آیا۔ یہ ''یادگار چوک'' کا بہت معروف اور مصروف بازار تھا۔ دوپہر میں بھی یہاں خاصا رش نظر آتا تھا۔

میں ایک دکان میں گھس کر دوسری طرف نکل آیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ سامنے سے کالا ناگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ان کا رخ میری ہی طرف تھا۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ مجھے تو ہتھیار بند کالا ناگ اور کبیر سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ نہتا نظر آ رہا تھا لہٰذا میرا حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ تاہم میں اس موقع پر اس سے براہِ راست ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ نگینہ کا میرے ساتھ ہونا تھا۔ میں نے اسے بچا دینے کے لئے اطراف میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار شخص موٹر سائیکل سے اتر کر اسے اسٹینڈ کرنے والا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے طوفانی دھکا دیا۔ اس اچانک افتاد نے اس کے اوسان خطا کر دیئے اور وہ بے خبری کے عالم میں زمین پر لڑھکنیاں کھانے لگا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے کک لگائی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔ اس وقت تک نگینہ میرے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھا دی۔

راہ گیروں کو راہ سے ہٹانے کی غرض سے میں مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کلچ لیور اور ایکسیلیٹر کے ماہرانہ استعمال کے باعث موٹر سائیکل کے انجن کی تیز، کرخت اور بھیانک آواز بھی وہاں موجود لوگوں کو دہلا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر دائیں بائیں ہوتے جا رہے تھے۔ میں تیزی کے ساتھ مین شاہراہ پر آ گیا تو سامنے سے سبز رنگ کی ہائی روف کو آتے دیکھا۔ ڈرائیونگ کالا ناگ اور کبیر کے گرگے کے ہاتھوں میں تھی جبکہ پسنجر سیٹ پر کبیر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے چلا کر نگینہ کو مضبوطی سے سیٹ پر جمے رہنے کی تاکید کی اور ایک پاؤں سڑک پر رکھ کر بائیک کے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ بائیک کا پچھلا پہیہ جام ہوا اور وہ تیزی سے گھوم گئی۔ میں نے دوبارہ ایکسیلیٹر کو گھمایا اور بائیک پچھلے ٹائر پر الٹ ہو گئی مگر میں نے مضبوطی سے ہینڈل پر قابو پائے رکھا۔ بائیک گرجتی ہوئی آگے کو دوڑی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں سن ہو کر رہ گیا۔ سڑک کے عین بیچوں بیچ مردود کالا ناگ اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ ٹانگیں مضبوطی سے سڑک پر جمائے ہاتھوں میں پستول تھامے کھڑا تھا۔ پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ بد ہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں نے بھی اپنی بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے ارادے دیکھ کر اس پر بدحواسی طاری ہو گئی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے گولی چلا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور مجھے اپنے دائیں شانے میں دہکتی ہوئی سلاخ پیوست ہوتی محسوس ہوئی۔ میرے حلق سے غیر ارادی کراہ خارج ہو گئی۔ میرے عقب میں بیٹھی ہوئی نگینہ نے بھی ہراساں ہو کر چیخ ماری تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور کالا ناگ کے قریب سے ''زن'' سے گزر گیا۔ میرا دایاں شانہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس میں گولی پیوست تھی۔ تکلیف کی شدت سے دائیں بازو کی طاقت سلب ہونے لگی تھی لیکن میں نے بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے زخمی شانے سے خون بہہ رہا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ میں تو صرف نگینہ کو لے کر اس ''ڈینجر اسپاٹ'' سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''نادر!..... تم..... تم بہت زخمی ہو۔'' اچانک نگینہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ اس نے مجھے مضبوطی سے تھامے رکھا تھا اس لئے اسے بھی خون کی چپچپاہٹ محسوس ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اس نے گولی چلنے اور میری کراہ کی آواز سن لی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

بائیک اب مین شاہراہ سے نکل کر بیرون شہر نکلنے والی جی ٹی روڈ پر آ گئی تھی۔

''نادر!..... تم..... بہت زخمی ہو۔ پلیز اپنے بارے میں کچھ سوچو۔'' نگینہ نے دوبارہ کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی اور حد درجے کی تشویش تھی۔ اسے اپنے بارے میں اس قدر متفکر پا کر جیسے میرے مضروب شانے کی اذیت کا احساس ہوا ہو چلا تھا۔ تاہم اسے سمجھانا ضروری تھا، لہٰذا بولا۔

''نگینہ صاحبہ! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ کبیر نے پولیس کا سہارا لینے کی بجائے ایک بدنام زمانہ گینگسٹر کالا ناگ اور اس کے گرگوں کا سہارا لیا تھا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری نگہت بستر علالت پر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور میں اس کی اس مختصر ہوتی زندگی کی ان گھڑیوں کو ہر ممکن طریقے سے طویل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مت روکیں نگینہ صاحبہ! اس وقت میرے سر پر صرف اور صرف

محبوب بیوی کی زندگی بچانے کی دُھن سوار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی نہیں بھولا۔ آپ کی حفاظت بھی میرا اولین فرض ہے۔ میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر آپ پر ذرا بھی کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ نگینہ صاحبہ! میری نظروں میں آپ کی حیثیت ایک عظیم محسن کی سی ہے۔ اگر..... اگر بالفرض آپ کو ذرا بھی کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مجھے اپنے عقب میں بیٹھی نگینہ کی رقت آمیز سسکاری سنائی دی۔

''کیا ہوا؟..... کیا آپ رو رہی ہیں؟'' میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک نگینہ نے چلا کر مجھے خبردار کیا۔

''نادر! دشمن کی گاڑی تعاقب میں آ رہی ہے۔''

میں سناٹے میں آ گیا اور موٹر سائیکل کے عقب نما میں دیکھا۔ سبز رنگ کی ہائی روف فل اسپیڈ سے میری طرف چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا میں نے اندازہ لگایا کہ ہائی روف میں اس وقت صرف تین ہی افراد ہو سکتے تھے۔ کالا ناگ، کبیر اور ان کا ایک اور گرگا۔

ہائی وے مضافات کی طرف جا رہی تھی۔ دشمنوں سے پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑی سلسلہ تھا۔ آگے ٹول پلازہ تھا۔ مگر اس سے ذرا پہلے ہی سڑک کے پہلو سے ایک تنگ سی بل کھاتی ہوئی سڑک پہاڑی سلسلے کی طرف جاتی دکھائی دی۔ میں نے فوراً اسی ذیلی سڑک کی طرف بائیک موڑ دی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بائیک میں کتنا فیول باقی تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میری بائیک ان کی فور وہیل کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وسط شہر کی بات کچھ اور تھی۔ چنانچہ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ ہائی روف میں کبیر کی متوقع موجودگی سے مجھے اس بات کی مطلق تشویش نہ تھی کہ یہ لوگ ہم پر فائرنگ کریں گے۔ البتہ دوسری حقیقت کا انہیں بھی بہ خوبی اندازہ ہو گا کہ اب اس طویل اور ویران سڑک پر یہ مجھے کسی بھی ''چھاپ'' سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اب ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لمبا تنگ موڑ کاٹتے ہی میں نے بائیک روک دی اور نگینہ کو لئے ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا اور اس سے بولا۔ ''نگینہ صاحبہ! آپ ادھر ہی موجود رہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے اور کالا ناگ سے چھینے ہوئے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ہائی روف غراتی ہوئی تیزی سے قریب آنے لگی۔ میرے شانے سے بہتا ہوا خون جمنے لگا تھا۔ میں نے سنگی آڑ سے نزدیک ہوتی ہوئی ہائی روف کی ونڈ اسکرین کے پار دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر ان کا گرگا تھا۔ برابر میں کالا ناگ اور پچھلی نشست پر مجھے کبیر کی بھی جھلک دکھائی دے گئی۔ ہائی روف نے موڑ کاٹا اور ''زن'' سے آگے نکل گئی۔ میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ پھر دوسرے ہی لمحے پلٹا، نگینہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے پہاڑی سلسلے کے تنگ دروں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ایک ویران کھوہ دیکھ کر میں فوراً اس میں داخل ہو گیا۔ کھوہ اندر سے زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں اندر جا کر بے دم سا ہو کر پتھریلی زمین پر گر گیا۔ شانے کی تکلیف اور جریانِ خون نے مجھ پر نقاہت طاری کر دی تھی۔ میں پشت کے بل لیٹ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے یہ ڈر بھی پیدا ہونے لگا کہ کہیں وہ ان حالات کی کشاکش سے گھبرا کر واپسی کا فیصلہ نہ کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی زیادہ سے زیادہ ''ہمدردی'' حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب یہی ایک طریقہ تھا اسے رام رکھنے کا۔ اس کی نگاہوں میں رشک تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب اسی کی وجہ سے تو کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی محبت کو بچانے کے لئے یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔

دشمنوں کا خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ذرا آگے جا کر انہیں جب میری بائیک کی آواز سنائی نہ دے گی تو وہ فوراً گاڑی روک کر بھوکے کتوں کی طرح میری تلاش میں پیدل ہی نکل پڑیں گے۔ مجھے شانے کی تکلیف نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ دفعتہً مجھے اپنی پیشانی پر نرم و گداز ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ ہاتھ کیا تھا، کیا جاں فزا احساس تھا۔ وہ میرے درد اور درد دل کی دوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ نگینہ نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کسی دور ویران جنگل کے تالاب کی سطح پر اُبھرتے اُداس چاند کا سا عکس جھلملاتا محسوس ہوا۔ چہرے پر ایک نامعلوم جذباتی سا ارتعاش تھا اور نرم و گداز لبوں پر بن کہے لفظوں کی موہوم سی تھرتھراہٹ۔

''نادر.....!'' بے اختیار اس نے مجھے پکارا۔ ''تمہارا زخم.....''

''میرا زخم بہت گہرا ہے نگینہ صاحبہ!'' میں نے مضروب شانے کی اذیت کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے ہولے سے کہا۔ جانے کیوں اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''آ.....آپ.....آپ رو کیوں رہی ہیں نگینہ صاحبہ؟'' میں نے بے اختیار تڑپ کر پوچھا۔

وہ گویا زخم پر جیسے اپنے ہاتھ کی ملائمت آمیزی کا تریاق رکھتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم بہت زخمی ہو۔ پلیز، لوٹ چلو۔ میں تمہاری بیمار بیوی کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

اس کی بات پر میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''نہیں نگینہ صاحبہ! محبت کرنے والے آگے ہی آگے جاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو پتھر کے بن جائیں گے۔''

''مگر یہ دیوانگی ہے۔'' نگینہ نے کہا۔

''محبت کا دوسرا نام دیوانگی ہی تو ہے نن.....نگینہ صاحبہ!'' میری آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''لل.....لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تم زندہ نہیں رہے تو تمہاری بیمار بیوی کا کیا ہوگا؟.....وہ تو بے چاری پھر زندہ بھی نہ رہ پائے گی۔'' نگینہ سسکتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''کوئی غم نہیں نگینہ صاحبہ! اگلے جہاں میں تو ہم دونوں مل جائیں گے نا۔ اور پھر میں اپنی نگہت کے سامنے سرخرو تو رہوں گا، میں اس کی جان بچانے کی خاطر کسی بھی مشکل سے پیچھے نہیں ہٹا۔''

اب تو نگینہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اسے اس حد تک متاثر کروں کہ وہ میرا ساتھ نہ چھوڑے۔ پھر یہی وہ لمحہ تھا، جب نگینہ کی یاسیت زدہ اور غم آگیں کیفیات کو بھانپتے ہوئے میرے ذہن میں یکبارگی ایک نہایت عجیب اور بالکل انوکھا خیال اُبھرا تھا اور یہ عجیب اور انوکھا خیال اس لئے میرے دل میں اُبھرا تھا کہ میں نے اب تک محسوس کیا تھا کہ نگینہ جب بھی میری فرضی کہانی کے ٹرانس میں آتی تو اداس سی ہو جاتی تھی۔ وہ کھو جاتی تھی۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے دل و دماغ کو کریدنے کے عمل سے گزرتی تھی۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جذبہ محبت میں اتنی بھی قوت نہیں ہے کہ وہ اپنی سوئی ہوئی محبت کو نہ جگا سکے؟.....کیا محبت کا جذبہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ایک خاص عمل کے ذریعے سلا دیا جائے جیسا کہ اس مردود و ملعون شیطان کیلاشی عامل عاروب نے نگینہ کے ساتھ کیا تھا۔ جبکہ یہ الوہی جذبہ تو خود ایک مسمریزم ہے، ایک عمل ہے، ایک سحر ہے۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، عین اسی طرح سحر سے سحر کو کاٹا جا سکتا ہے۔ اس مردود کیلاشی عامل نے یقیناً نگینہ پر اس طرح کی ہپناٹک تکنیک آزمائی تھی۔ مجھے مسمریزم یا ہپناٹزم کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات تو نہ تھیں تاہم جہاں تک مجھے علم تھا، اس کے مطابق کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ بھلا

کوئی آخر کب تک اس عمل کے فریب میں رہ سکتا ہے؟ مجھے محبت کی قوت سے اس سحر کو توڑنے کی پیہم کوشش کرنا ہوگی۔ اس خیال نے مجھے اس لئے مہمیز کیا تھا کہ نگینہ خود بھی اپنی کچھ گم گشتہ یادوں کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے اس طرح اس کی خود کو کریدتی ہوئی سوچوں کو مزید تحریک دینا چاہئے تھی۔ بہ صورت دیگر مجھے ایک طویل اور کٹھن آزمائش سے گزرنا پڑتا۔ یہاں تک تو مسئلہ خود ہی حل ہو چکا تھا کہ نگینہ میری فرضی کہانی سے متاثر ہو کر جذبہ ہمدردی سے میرا ساتھ دینے پر مجبور ہوگئی تھی مگر اس سے آگے اہم مرحلہ ابھی باقی تھا یعنی کیلاش وادی میں داخل ہو کر اس کیلاشی عامل عاروب کا پتہ لگانا، پھر اسے اس پر مجبور کرنا کہ وہ نگینہ پر دوبارہ عمل کر کے اس کے دل و دماغ میں سوئی ہوئی ''میرے حصے'' کی یاد کو دوبارہ تازہ کر ڈالے۔ یہ کوئی آسان کام تو نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس لمحے یہ اٹل اور مستحکم فیصلہ کر لیا کہ میں خود بھی نگینہ کو SUGEST کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیا معلوم اس کیلاشی عامل کا سحر ٹوٹ جائے اور نگینہ مجھے، میری دیوانہ وار چاہت کو پہچان لے۔ ایک امید تھی اور شاید کسی معجزے کا آسرا تھا۔

بہرطور میں نے اسے اپنی فرضی داستانِ غم کے اس قدر ٹرانس میں لے لیا تھا کہ میں جب بھی اس کا ذکر کرتا یا وہ پوچھتی ایسا ہی ہوتا تھا تاہم میں نے اسے آبدیدہ پا کر اس سے کچھ نہ کہا۔ میرے شانے کی تکلیف بڑھنے لگی تھی۔

ذرا ٹھہراؤ آیا تو زخم نے سرد ہو کر درد کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر نقاہت کے باعث غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ مگر اس وقت میری جان بلکہ میری محبت سُولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل پر تکلیف اور کمزوری کے بڑھتے ہوئے غلبے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ میری آنکھیں شدید نقاہت سے بوجھل ہو رہی تھیں مگر میں نے انہیں بند نہیں ہونے دیا۔ میں ڈھیلا پڑ کر خود کو بے ہوشی کی بھیانک وادیوں میں اترنے سے بچانے کی خاطر خود کو مصروف کرنا چاہتا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی قمیض اُتاری اور زخم کا جائزہ لیا۔ دائیں شانے پر ہنسلی کی ہڈی کے ذرا نیچے گوشت میں گولی پیوست تھی اور وہاں سرخ گاڑھا نشان موجود تھا۔ ایک قدرتی پروسس کے تحت خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا جس کی وجہ سے خون بہنا از خود بند ہو گیا تھا۔ نگینہ نے میرا زخم دیکھ کر سسکاری لی تھی۔ پھر یکدم اپنے دوپٹے کو اتار کر اسے میرے زخم پر باندھنے کے لئے جھکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ دوپٹہ اسے اوڑھاتے ہوئے بولا۔

''نہیں نگینہ صاحبہ!.....اس کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ یہ زخم سوکھ چکا ہے۔ اسے باندھنے کی ضرورت نہیں۔''

''مگر.....'' وہ یک دم بولی تو میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اس پر اگر اب پٹی باندھوں گا تو زخم پھر سے رسنا شروع کر دے گا۔ کوئی موقع دیکھ کر میں اس کی باقاعدہ مرہم پٹی کرواؤں گا۔ ابھی میں دشمنوں کے گھیرے میں ہوں۔'' میں نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونک اٹھا۔ یہ بہت ہلکی آواز تھی۔ نگینہ نے شاید نہیں سنی تھی تاہم میرے چہرے پر چونکنے کے آثار دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا.....؟''

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ہاتھ میں کالا ناگ کا ہتھول پکڑ لیا۔ اس کے پستول میں ابھی کافی گولیاں تھیں۔ میرے میگارد میں دو تین ہی گولیاں باقی بچی تھیں جبکہ میرے کلیمر کے پستول کے فاضل راؤنڈز میرے پاس موجود تھے۔

میں نے قمیض پہن لی اور کالا ناگ سے چھینا ہوا پستول دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ اس کے بعد نگینہ کو اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جگہ پر رہنے کی تاکید کر کے گپھاہ سے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھائے تھے کہ اچانک وہ آواز دوبارہ اُبھری۔ اسی وقت میرے زخم میں بھی شدید ٹیس اُبھری جس نے مجھے اندر تک بلبلا کر رکھ دیا۔ میں ایک بار پھر وہیں پتھریلی زمین پر بے سدھ سا لڑھک گیا۔ میری قوتِ ارادی جواب دینے لگی۔ نقاہت نے اس بار شدت سے حملہ کیا تھا۔ نگینہ میری طرف بڑھی۔ میرا دل و دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میں بے ہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دشمن آس پاس منڈلا رہے تھے۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چبا ڈالے مگر بے سود۔ مجھ پر شدید غنودگی کا حملہ ہو چکا تھا۔ پہلے میرے ہاتھ سے پستول لڑھکا تھا، اس کے بعد شاید سر بھی ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔ میں شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

❄❄❄

بے ہوش ہونے سے ایک لمحہ قبل مجھے یوں لگا تھا جیسے اب میری آنکھ عالمِ بالا میں ہی کھلے گی۔ کیونکہ کبیر اور کالا ناگ میرے لہو کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوشی کے عالم میں گولی مار کر ہلاک کر سکتے تھے۔ لیکن نہیں، مارنے والے سے تو بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے ابھی میری زندگی عزیز تھی۔ اس نے ابھی مجھے انسان دشمن بھیڑیوں کے لئے موت بنانا تھا۔ اسے ابھی میری پاکباز محبت کی تکمیل منظور تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے گرد نیم تاریکی محسوس کی۔ مجھے گھٹن کا بھی احساس ہونے لگا۔ چند ثانیے تک تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے عاری ہی رہا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یکلخت میرے نیم غنودہ ذہن کی اسکرین پر ایک جھماکا ہوا اور گزرے واقعات کی پوری فلم ''فاسٹ فارورڈ'' کی طرح گھوم گئی۔ میں نے سب سے پہلے نگینہ کو پکارا۔ وہ میرے سرہانے ہی موجود تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' اس کی تشویش زدہ مگر مدھر آواز نے جیسے مجھے سرشار کر دیا۔ طمانیت کی لہر سی میرے پارہ پارہ وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے اسے دیکھا اور مضطربانہ بے چینی سے کہا۔

''نن..... نگینہ صاحبہ! آ..... آپ خیریت سے تو ہیں نا؟ ..... یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں آنکھیں پھاڑے نیم تاریکی میں گھورنے لگا۔

مجھے اپنے زخم میں بھی اب جلن کی بجائے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرا اُوپری جسم برہنہ تھا اور میرے دائیں شانے کے زخم پر کوئی عجیب و غریب مرہم لگایا گیا تھا۔ یہ شاید کوئی دیسی طریقہ تھا۔

ہم دونوں ایک پھونس کے جھونپڑے میں تھے۔ جس کے وسط میں چھت کو سہارا دیتے بدنما بانس سے مدھم لو کی حامل لالٹین جھول رہی تھی۔ دروازے پر پوسیدہ سا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ باہر شام جھک آئی تھی۔ جھونپڑی کے محدود ماحول میں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، یہ سب کیا تھا..... ہم کہاں تھے؟

تاہم مجھے نگینہ نے بتایا کہ میرے بے ہوش ہوتے ہی وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ وہ میرے دشمنوں کے ڈر سے باہر کسی مدد وغیرہ کی تلاش میں بھی گپھاہ سے نہیں نکل سکتی تھی۔ لیکن پھر جب اس نے دیکھا کہ میرے زخم کا منہ ایک بار پھر کھل گیا تھا اور اس میں سے خون رسنے لگا تو اسے مدد کے لئے باہر نکلنے کا رسک لینا پڑا۔ تب اسے اتفاق سے ایک خانہ بدوشوں کا مختصر سا قافلہ جاتا دکھائی دیا اور نگینہ نے ان سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔ پھر وہ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے اور ایک بوڑھے طبیب نے دیسی نسخے کے تحت میرے زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ نگینہ نے بحالتِ مجبوری انہیں یہی بتایا کہ ہم دونوں

میاں بیوی تھے اور اپنے دشمنوں سے جان بچانے اس علاقے میں آئے تھے اور اس تگ و دو میں مجھے گولی لگی تھی۔ بوڑھے طبیب نے اپنی مہارت سے گولی نکال دی تھی اور اب ہم اس کے مہمان تھے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں رقم کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد نگینہ سے بولا۔ ''میرا خیال ہے، میرے دشمن بھٹک گئے ہیں۔ ہمیں فوراً نکل جانا چاہئے۔''

میری بات پر نگینہ قدرے پریشانی سے بولی۔ ''ابھی ہمارا نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ تمہارا زخم ایک بار پھر تازہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر کیا خبر باہر پہاڑی وادی کی بھول بھلیوں میں دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ اب تو اندھیرا بھی پھیلنے لگا ہے۔''

''ہمیں اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن نادر! ..... میں ابھی باہر نکلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ صبح تو ہو لینے دو کم از کم۔ ہم تو اب دوبارہ شہر بھی نہیں جا سکتے۔'' وہ بولی۔ پھر باہر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ اس کے بعد ٹاٹ ہٹا، ایک تنومند شخص اندر داخل ہوا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ نگینہ نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ طبیب کا بیٹا زوار تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بہ غور عجیب نظروں سے میرے سرہانے بیٹھی نگینہ کو چند ثانیے گھورتا رہا۔ مجھے اس کا یہ انداز انتہائی ناگوار گزرا۔ پھر میرے ذرا قریب آ کر بے تاثر مسکراہٹ سے بولا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' لہجہ مقامی اور خاصا اکھڑ سا تھا۔ تاہم اس نے اردو میں ہی بات کی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں اب ..... تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہارے بابا کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے میرا علاج کیا۔ وہ کہاں ہیں؟''

میری بات پر اس نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے نگینہ کو گھورا، پھر مجھ سے بولا۔

''شکریے کی کیا بات ہے؟ یہ ہمارا فرض تھا۔ بابا اس وقت سو رہا ہے۔ مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیریت معلوم کرتا رہوں۔''

وہ ذرا رُکا تو میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مہربانی۔ کیا تم ہماری کچھ اور مدد کر سکتے ہو؟''

''ہاں ..... بولو۔''

''ہم یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔''

''اس وقت کہاں جاؤ گے؟'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس نے ایک بار پھر نگینہ کی طرف دیکھا۔ جس کا یوں بار بار نگینہ کو گھورتے رہنا بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''تم کسی سواری کا بندوبست کر دو۔ ہم کسی ایسے قصبے کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں جہاں سے ہمیں ٹرین مل سکے۔''

وہ کچھ سوچنے کے انداز میں مستفسر ہوا۔ ''تمہارا منزل کون سا ہے؟''

''چترال۔'' بے اختیار میں نے کہا۔ ''ہم چترال کی طرف روانہ ہونا چاہتے ہیں۔''

''اچھا.....'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، ابھی تم آرام کرو۔ میں صبح منہ اندھیرے یہاں آؤں گا۔ ایک خچر گاڑی بھی ساتھ لاؤں گا۔ یہاں سے پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں سے تم کو بس تو نہیں البتہ کوئی جیپ مل جائے گی، جو تمہیں اس علاقے سے نکال کر وادی چترال تک پہنچا دے گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہاری بہت مہربانی۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ پھر اس نے نگینہ کی طرف ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد وہ نگینہ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے دوبارہ بولا۔ ''اگر تمہاری یہ زنانی چاہے تو میری بیوی کے پاس سو سکتی ہے۔''

''نہیں .....اس کی ضرورت نہیں۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔'' اس کی بات پر نگینہ نے فوراً اس سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ جانے کے لئے پلٹا۔ پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ رک گیا۔ پھر اس مرتبہ میری بجائے نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم لوگوں کا کن سے دشمنی چل رہی ہے؟''

نگینہ اس کے سوال پر ذرا گڑبڑا سی گئی مگر میں نے جواباً کہا۔ ''ہمارا اپنا قبیلہ ہی ہماری جان کا دشمن بن گیا ہے۔''

''اوہ .....اچھا۔ ویسے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ اس وادی میں تمہارا دشمن تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔'' اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے دشمن یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔

''مجھے اس کے ارادے کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے۔'' اس کے جانے کے بعد نگینہ نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ میں اس کی بات جھٹلا کے اسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے محتاط رہنے کی خاطر تائید کہا۔

''ہاں..... مجھے بھی اس خانہ بدوش کی آنکھوں میں خباثت محسوس ہوئی ہے۔ لیکن نگینہ صاحبہ! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں اس سے ایک پل کے لئے بھی غافل نہیں رہوں گا۔ اگر اس نے آپ کے ساتھ غلط حرکت کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو اس کا بہت برا حشر کروں گا۔''

میرے جوشِ غیظ سے لبریز لہجے پر نگینہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ پھر اس کے گداز لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ اُبھری اور بولی۔

''پھر تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بھروسہ کیا جائے کہ کل صبح منہ اندھیرے یہ ہمیں ایک خچر گاڑی میں کسی مطلوبہ قصبے تک چھوڑ دے گا؟''

''دیکھتے ہیں..... صبح تو ہو لینے دیں۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کے تاثرات بھانپ کر بولا۔ ''آپ ایسا کریں، تھوڑا سا آرام کر لیں۔ میری تو شاید طویل بے ہوشی میں نیند پوری ہو گئی ہے۔''

اسے شاید سردی لگ رہی تھی۔ میں نے گرم سوئیٹر پہن رکھا تھا، وہ میں نے اسے پہنا دیا۔ سوکھی پیال پر ایک ہی بستر تھا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اس لئے میں نے نگینہ کو اس پر آ جانے کا کہا اور اسے ڈھانپنے کے لئے چادر تھما دی۔ وہ جھجک رہی تھی۔ میں نے اس کے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مضبوط اور مستحکم لہجے میں اس سے کہا۔

''نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے باہر آ گیا اور دروازے کے قریب سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دور پہاڑیوں پر سرد شام اُتر رہی تھی اور وادی میں سناٹا چھانے لگا تھا۔ مجھے چند اور جھونپڑیاں بھی دکھائی دی تھیں مگر وہ ہماری جھونپڑی سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ یہ جھونپڑی الگ تھلگ مقام پر ایک ہموار قطع پر تھی۔ آسمان صاف تھا۔ وقت گزرنے

کے ساتھ نگینہ اندر گہری نیند سو رہی تھی۔

سرد شام اب ٹھٹھرتی رات کی تاریکی میں بدل گئی تھی۔ شفاف آسمان پر ننھے منے تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ میرے عین سامنے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر دمکتا چاند کسی پہاڑی دوشیزہ کے کنوارے اور نوخیز کھڑے کی طرح جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ دور کہیں وادی میں پہاڑی پرندے ''بو بو'' کی سوگوار سی ''بنکار'' ہوک بن کر اُبھری۔ رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ بھاری سل کی طرح گزرنے والا ہر پل ٹھٹکتے ہوئے دل و دماغ پر آنے والے وقت کے اندیشوں کی اسرار بھری دھمک دیتا ہوا گزر رہا تھا۔

اچانک مجھے کہیں قریب ہی آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر آہٹ کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے بلا تاخیر اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غالباً اس پراسرار سائے نے بھی مجھے ٹھٹکتے دیکھ لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ یکدم ایک طرف چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''کون ہے.....؟''

وہ رک گیا۔ اس نے گرم اور موٹی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ میرے پکارنے پر وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ اس کی طرف کر دیا۔ وہ قریب آیا تو میں اسے پہچان گیا۔

وہ خانہ بدوش طبیب کا بیٹا زوار ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔

تب پھر اچانک میں نے اپنے قدموں کے سامنے پتھریلی زمین پر چاند کی روشنی میں ایک اور سایہ متحرک ہوتے دیکھا۔

'کوئی میرے عقب میں تھا' میرے اندر کوئی چیخا۔ میں یک لخت پلٹا مگر مجھ پر چھلانگ لگا دی گئی۔ سب سے پہلے مجھے میرے پستول سے محروم کر دیا گیا اور ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ پر رسید کر دی گئی۔ میں اس اچانک حملے پر بلبلا کر رہ گیا۔ وہ دو لحیم شحیم افراد تھے جن کا تعلق یقینی طور پر انہی خانہ بدوشوں سے تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ زوار خان اپنی کسی ناپاک سازش کے تحت ہی دو ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ بہرطور پیٹ پر پڑنے والی ٹھوکر کی شدید تکلیف کو دانتوں تلے دباتے ہوئے میں نے سنبھلنے کی کوشش کی اور رکوع کے بل جھک کر ٹھوکر مارنے والے کے پیٹ پر سر کی زوردار ٹکر رسید کر دی۔ وہ تنومند ہونے کے باوجود پیٹ پر پڑنے والی میری سر کی ٹھوکر پر ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا کئی قدم پیچھے جا پڑا۔ ادھر زوار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بیک وقت مجھ پر چھلانگیں لگا دیں۔ شانے کی تکلیف کے باوجود میں نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ میرے پاس میرا میگارد موجود تھا۔ وہ دونوں جیسے اپنی ہی جھونک میں آگے نکلے۔ میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر میگارد نکال لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے تیز کراہ سی خارج ہو گئی۔ پہلے والے نے، جسے سر کی ٹکر میں نے ماری تھی، اس نے ایک نوکیلا پہاڑی پتھر میرے پستول والے ہاتھ پر دے مارا تھا۔ نتیجتاً میرے ہاتھ سے میگارد بھی نکل گیا۔

اچانک مجھے نگینہ کی چیخ سنائی دی۔ میں نے جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں مجھے وہ جھونپڑی کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس ہنگامے سے وہ جاگ گئی تھی لیکن اس نے باہر نکلنے کی سخت بے وقوفی کی تھی۔ زوار خان اور اس کا دوسرا ساتھی نگینہ کی طرف جھپٹے۔ میں اپنے دونوں پستولوں سے محروم ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میں ناہموار پتھریلی زمین پر پستول تلاش کرنا وقت طلب کام تھا۔

تب پھر اچانک میں نے زوار خان اور اس کے ساتھی کو نگینہ کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ نگینہ نے خوف زدہ ہو کر چیخنے کے لئے منہ کھولا تو زوار خان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے سر پر جیسے خون سوار ہو

گیا۔ نگینہ کو خبیث زوار خان اور اس کے بدخصلت ساتھی کے قبضے میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتا دیکھ کر میرے رگ و پے میں آتش غیظ و جنوں کی نفرت انگیز سنسناہٹیں دوڑ گئیں۔

''کتے!.....کمینے!'' میں حلق کے بل چیخا اور جیسے ہی قدم بڑھائے تھے کہ دوسرے ساتھی نے میرا راستہ روک کر میرے چہرے پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ اس کے بھاری بھرکم مکے کی زوردار ضرب سے مجھے اپنا جبڑا ہلتا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ پھر میرے کانوں سے زوار خان کی پُر غیظ آواز ٹکرائی۔ وہ میرے مقابل سے بولا۔

''شودلک! اسے سنبھالو اور ختم کر کے کسی گہری کھائی میں پھینک کر آجاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ ہراساں نگینہ کو گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔ میرے اندر کا آتش فشاں غضب ناک لاوا اگلنے لگا تھا اور نگینہ سے کہے ہوئے اپنے الفاظ میرے دل و دماغ میں گونجنے لگے۔ 'نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ پر آنچ تک نہیں آنے دوں گا۔'

بس تو پھر جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے اپنے ان الفاظ کی لاج رکھنا تھی، اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر۔ میں زوار خان اور اس کے بدخصلت ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاید مجھے ترنوالہ سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس کا علم پاتے ہی وہ جوں ہی میری جانب بڑھا تو میں نے اچھل کر زوردار فلائنگ کک اس کے سینے کی بجائے چہرے پر جڑ دی۔ اس فلائنگ کک میں وہ غیر معمولی قوت تھی کہ وہ کئی قدم دور جا کر پتھریلی زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں اب کہاں رکنے والا تھا۔ میں نے ذرا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد میں وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ زوار خان اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے فوراً اپنی قمیض کے اندر سے ایک قرولی نکال لی۔ زوار خان نگینہ کو دبوچے کھڑا ہو گیا۔ نگینہ اس کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے قرولی اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پھیلا کر میرے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ میں نے بھی یہی انداز اختیار کر لیا تھا۔ ادھر زوار خان دوبارہ نگینہ کو دبوچے ایک طرف کھسکنا شروع ہوا تو میں نے قرولی بدست کو چھوڑ کر زوار خان کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ میرے اس ڈاج میں آ گیا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ میرا راستہ روکنے کے لئے میری طرف حملے کی پہل کرتے ہوئے جھپٹا، میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ راستہ کاٹتے ہوئے جھکائی دی اور اس کے قرولی والے ہاتھ کی کلائی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ وہ دبی دبی کراہ کے ساتھ جیسے ہی رکوع کی حالت میں جھکا، میں نے اس کی جھکی ہوئی ناک پر کہنی کی زوردار ضرب رسید کر دی اور اس کا ہاتھ مروڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ پہاڑی جوان تھا تو میری پرورش بھی انہی علاقوں میں ہوئی تھی۔ قد و قامت اور ڈیل ڈول میں کسی طرح بھی ان سے کم نہ تھا۔ میرے مدمقابل کی کلائی والی ہڈی ٹوٹنے کا کڑاکا اُبھرا تھا۔ میں نے جیسے ہی قرولی چھین کر اپنے قبضے میں کی تو زوار خان نگینہ کو چھوڑ کر مجھ پر جھپٹا، اس کی یہ حرکت میرے لئے اچانک اور بالکل غیر متوقع تھی۔ یہی سبب تھا، وہ میرے زخم پر گھونسا رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مارے اذیت کے میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اس نے میرا قرولی والا ہاتھ دبوچ لیا۔ میرا زخم کھل گیا تھا اور اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ ظالم نے بڑی نازک جگہ پر وار کر کے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ اس نے قرولی میرے ہاتھ سے چھین لی اور بڑی نفرت خیز غراہٹ کے ساتھ میرے پیٹ میں گھونپنا چاہی تو نگینہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے بروقت ایک طرف ہونے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی مگر میں زخم کھلنے کی وجہ سے کچھ زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کر پایا اور قرولی کے ظالم وار نے میرے پہلو میں جاں کشیدہ چرکا لگا ہی دیا۔ میرے حلق سے کرب انگیز کراہ خارج ہو گئی۔ میرا دایاں پہلو اُدھڑ سا گیا تھا۔ اس نے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر قرولی سے وار کرنا چاہا۔ مگر اب مجھے نگینہ اور اس کی عزت کی حفاظت کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے قرولی والے ہاتھ کو دبوچتے ہی دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ چند ثانیے کے لئے جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔ اس کی زخمی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس لمحاتی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور قرولی پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی میں نے قرولی اس کے ہاتھ سے چھینی اور اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ وہ کریہہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ نگینہ میری طرف لپکی۔

''چلو نگینہ!..... یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔'' میں نے زخموں سے چور ہانپتی آواز میں اس سے کہا۔

''للل.....لیکن نادر! تت.....تم بہت زخمی ہو گئے ہو۔'' وہ آنسو بھری آنکھوں اور درد سے لبریز لہجے میں بولی۔

''میں ٹھیک ہوں.....چلو.....جلدی۔''

''ٹھہرو..... میں ابھی آئی۔'' اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ استفسار کرتا، وہ دوڑتی ہوئی جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئی۔ میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ جھونپڑی کے اندر سے کیا لینے گئی تھی۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد وہ پلٹی تو میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی شے پکڑی ہوئی دیکھی، وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں اپنے ہتھیاروں سے محروم ہو چکا تھا، جنہیں تلاش کرنا بے حد ضروری تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرا میگارد مجھے نظر آ گیا جسے میں نے لپک کر اٹھا لیا۔ میرے دشمنوں کی کراہیں بدستور گونج رہی تھیں۔ قبیلے والے جاگ جاتے تو معاملہ سنگین ہو سکتا تھا۔ میں اور نگینہ ہر طرف پھیلی چاندنی میں نامعلوم سمت کی طرف بڑھ گئے۔

نگینہ نے مجھے بتایا تھا کہ بوڑھے طبیب نے مرہم کی بقیہ مقدار وہیں جھونپڑی میں رہنے دی تھی۔ وہ وہی اٹھانے کے لئے لپکی تھی۔ تھوڑی دور نکل آنے کے بعد ہم ایک تنگ درے سے نکلے اور ایک قدرتی طور پر بنے چٹائی چھجے تلے بیٹھ گئے۔

میں پتھریلی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ نگینہ جلدی جلدی مرہم کی پوٹلی کھولنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''نن.....نگینہ صاحبہ!.....آ.....آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

میری بات پر اس کے پوٹلی کو کھولتے ہوئے ہاتھ تھم گئے۔ وہ کسک زدہ نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ پھر چھلنی لہجے میں بولی۔

''تم.....تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ تمہاری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم بار بار میری خیریت پوچھتے رہتے ہو۔ تم زندہ رہو گے تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو گے نا۔''

''لیکن نگینہ صاحبہ! میرے ذمے آپ کی بھی حفاظت فرض ہے۔''

''میری فکر نہ کرو.....صرف اپنے مقصد اور مفاد کی فکر کرو۔'' وہ بولی تو بے اختیار میرے لبوں سے بھی نکل گیا۔

''میرا مقصد اور میرا مفاد صرف تم ہو۔''

''میں.....؟'' وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بے شک، ایک طرح سے میرا مفاد آپ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ تاکہ میں آپ کے باپ سے تاوان کے طور پر ایک خطیر رقم حاصل کر سکوں۔ مگر مجھ پر یہ بھی تو لازم ہے کہ میں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہونے دوں۔ کیونکہ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ کمینہ زوار خان اور اس کے دونوں بدخصلت ساتھی آپ کو جان سے مارنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن آپ کی عزت پر بھی میں ذرا آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"کیوں؟..... تمہیں میری عزت سے کیا لینا دینا؟" وہ چلا کر بولی۔ "اگر وہ تمہیں ہلاک کر دیتے تو..... تمہاری بیوی کا علاج کس طرح ممکن ہوتا؟ وہ تو بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔ اگر وہ بدخصلت زوار خان میری عزت سے کھیل کر مجھے چھوڑ دیتا تو کیا برا تھا۔ میں زندہ تو رہتی نا۔ مگر تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر....." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ رات کے سکتے ہوئے سناٹے میں "چٹاخ" کی آواز اُبھری اور نگینہ دم بہ خود میرا چہرہ تکنے لگی۔

"تت..... تم نے ایسا کیوں کہا؟" میں اسے گھورتے ہوئے فرطِ جوش سے سرخ ہو کر بولا۔ "مجھے تمہاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کیوں کہا تم نے ایسا؟..... جواب دو مجھے نگینہ! تم نے میری محبت کو اتنا لاوارث کیوں سمجھا؟"

مجھ پر گویا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور نگینہ..... وہ مارے حیرت کے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے کچھ احساس ہوا، میں نے فوراً اپنی جلتی سلگتی کیفیات پر قابو پایا اور اپنا سر چٹانی چھجے کی پتھریلی ناہموار دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر میں چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے وجود میں دہکتے اُبال پر قابو پاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نگینہ صاحبہ! مم..... مجھے معاف کر دینا۔ مجھے آپ پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق نہ تھا۔ کوئی حق نہ تھا مجھے۔" یہ کہہ کر میں اپنے دائیں ہاتھ کا مُکا بنا کر چٹانی چھجے کی سنگی دیوار پر مارنے لگا۔ یہاں تک کہ اس میں خراشیں پڑ گئیں۔ مگر نگینہ نے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟..... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔ چلو چھوڑو۔ اپنی قمیض اتارو۔ میں یہ مرہم لگا دوں۔"

پھر اس نے قمیض اتارنے میں میری مدد کی۔ میرا اوپری مضبوط جسم برہنہ ہو چکا تھا اور نگینہ چند ثانیے میرے کشادہ سینے کو گھورتی رہی۔ پھر جیسے میرا دل بہلانے کی غرض سے مسکرا کر بولی۔

"تم خاصے ہینڈسم اور خوبرو ہو۔ تمہاری بیوی نگہت یقیناً بہت خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسا جری، غیرت مند، بہادر اور مضبوط شوہر ملا۔" نگینہ کی تعریف نے میرا سیروں خون بڑھا دیا اور میرے جی میں آئی کہ میں اسے کہہ دوں۔ 'نگینہ! میری جانِ جاناں! پنجاب کی زرخیز زمین کا یہ پہاڑی نوجوان، تمہاری ہی تو ملکیت ہے۔ خدارا اسے پہچانو۔ اپنی محبت کو پہچانو۔' مگر میں ابھی یہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اسے چترال اپنے ٹھکانے پر لے جاؤں گا اور بعد میں اس کے باپ سے تاوان طلب کروں گا۔

اس نے مرہم نکالا۔ جبکہ میرا مرہم تو وہ تھی۔ اس نے میرے زخموں پر آہستہ آہستہ مرہم لگانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے زخموں کی ٹیسوں پر ٹھنڈی اُترتی محسوس ہونے لگی۔ مرہم لگانے کے بعد مجھے ذرا سکون ملا تو دبی ہوئی بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ نگینہ نے تو شاید کچھ کھا پی لیا ہوگا مگر میں نے طویل بے ہوشی کی وجہ سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔

"تمہیں بھوک اور پیاس تو لگی ہوگی۔" اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے تو ان لوگوں نے دودھ فیرہ پلا دیا تھا مگر تم.....؟" اس نے جیسے بھانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں....." میں نے جھوٹ بولا۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے مزید کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں لنا چاہیے۔ خانہ بدوشوں کے تین آدمی میرے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں ے کوئی ایک آدھ مر بھی گیا ہو۔ ایسا نہ ہو اب ان کی بھی دشمنی بھگتنا پڑے۔"

نگینہ کے چہرے پر پھر تشویش کے آثار اُبھرے۔ تاہم وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ایک بات سمجھ ہی نہیں آ رہی۔"

"کون سی بات؟"

"کبیر اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟"

میں اسے کیا بتاتا کہ کبیر اور کالا ناگ میری جان کے دشمن تھے۔ پولیس کو شامل کر کے وہ میرا تحفظ کیوں چاہتے۔ یوں تو میں بیک وقت دو محاذوں پر برسرِ پیکار تھا۔ ایک طرف دشمن میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے اور دوسری طرف پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ کبیر اور کالا ناگ جیسے مکار اور ظرناک دشمنوں سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وقت پڑنے پر پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا سکتے ہیں۔ لیکن میں نگینہ کو اصل بات ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لہٰذا بولا۔

"شاید وہ خود سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔"

معاً رات کے پہر اور دم بہ خود سناٹے میں کہیں قریب ریل کی مخصوص "چھکا چھک..... چھکا چھک" سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ گویا ریلوے لائن کہیں قریب ہی تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھا۔ نگینہ کو لے کر آواز کی سمت بڑھ گیا۔ سنگلاخ پہاڑی سلسلے کا یہ وسطی علاقہ نہ ہونے کی وجہ سے شاید یہاں کھائیاں کم تھیں۔ تاہم میں نگینہ کو لئے پہاڑی دروں اور تنگ دراڑوں سے ہوتا ہوا دوسری سمت نکلا تو مجھے سامنے ٹھنڈی چاندنی میں قوس کی صورت چمکتی ہوئی ریلوے لائن دکھائی دی۔ جو بل کھا کر ایک طرف سنگلاخ اور تاریک سرنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سرنگ کے اندر روشنی ہونے لگی۔

میں رکا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریل کا دخانی سیاہ انجن اپنی چمنی سے گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں اُگلتا ہوا سرنگ سے باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کے اوپر تیز سرچ لائٹ نما بلب روشن تھا۔ رفتار سست تھی۔ وہ مال گاڑی تھی اور خاصی طویل بھی۔ اس کا رخ مضافات کی طرف تھا۔ مال گاڑیاں یوں بھی سست رفتار سے ہی چلتی تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی تھی۔ شاید سگنل کلیئر نہ تھا۔ بالآخر وہ رک گئی۔ رات کے پہر سناٹے میں انجنوں کی مخصوص گھر..... گھر..... گھر..... عجیب سی لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال اُبھرا۔ میں نے نگینہ کو ساتھ لیا اور ذرا تیز تیز قدموں سے سرنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ انجن سرنگ کی حدود سے کافی دور نکل آیا تھا جبکہ بوگیاں ابھی سرنگ کے اندر تک ہی تھیں۔ مال گاڑیاں یوں بھی طویل ہوتی ہیں۔

میں نگینہ کے ساتھ سرنگ کے قریب پہنچا۔ میرا ارادہ مال گاڑی کی کسی بوگی میں سوار ہونے کا تھا۔ لیکن جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا، بوگیوں کے دروازے بند اور سیل تھے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور پٹری کے ساتھ ساتھ بوگیاں دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ایک بوگی پر مجھے سیل نظر نہ آئی مگر بوگی کے دروازے کو آہنی کنڈا چڑھا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور کنڈا کھول دیا۔ ٹھیک اس وقت گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں دروازہ کھول چکا تھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر نگینہ کے نرم و نازک وجود کو بازوؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اٹھا کر بوگی کے اندر داخل کیا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔

بوگی میں اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک خالی جگہ پر میں اور نگینہ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی نے معمول کی رفتار پکڑ لی تھی۔

میری پہلی منزل چترال تھی جو انتہائی شمالی کنارے پر تھی۔ اس کے بعد کیلاش وادی، چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر (25 میل) کے فاصلے پر تھی۔ لیکن اس سست رفتار مال گاڑی پر چترال تک کا سفر محال اور عبث تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ یہ کم از کم مجھے یہاں دشمنوں کے نادیدہ ٹھکانوں سے کوسوں دور لے جا سکتی تھی۔

خانہ بدوشوں کے بوڑھے طبیب کا مرہم جادو اثر ثابت ہوا تھا۔ نگینہ نے بھی میرے زخموں پر سارے ہی مرہم کا لیپ کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زخم تھے ہی نہیں۔ ٹیسوں کی بجائے اب ٹھنڈک سی پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری توقع کے برخلاف مال گاڑی معمول سے زیادہ رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ بوگی کا دروازہ میں نے ذرا کھلا رہنے دیا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی اندر کی تاریکی کو کسی قدر دور کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ مال گاڑی کہاں جا رہی تھی۔ تاہم اتنی تسلی تھی کہ یہ مجھے کسی نہ کسی بڑے اسٹیشن پر تو اُتار ہی سکتی تھی۔

مال گاڑی کا سفر جاری تھا۔ وہ اس وقت وسطی پہاڑی سلسلے، گہری کھائیوں، تاریک سرنگوں میں تیزی سے گامزن تھی۔ ایک دو اسٹیشن بھی آئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے جھری بنا کر جھانکا بھی کہ شاید کسی بڑے اسٹیشن پر رکے تو میں نگینہ کو لے کر اتر جاؤں۔ بالآخر پوہ پھٹے ٹرین ''کلپلانہ'' کے اسٹیشن پر رکی۔ مال گاڑیوں کو عموماً پلیٹ فارم کی بجائے ''لوپ لائن'' پر روکا جاتا تھا۔ میں نے یہاں پوچھ گچھ کرنا ضروری سمجھا اور نگینہ کو اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے احتیاط سے نیچے اُترا۔ ہماری ''مال بوگی'' اسٹیشن سے ذرا دور تھی۔ میں نے بوگی کا نمبر ذہن نشین کیا اور تیز تیز قدموں سے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ وہاں ایک پسنجر ٹرین موجود تھی۔ پتہ چلا کہ یہ پسنجر ٹرین مردان اور درگئی تک جاتی ہے۔ درگئی اس کا ٹرمنس (آخری اسٹیشن) تھا۔ مال گاڑی جانے کتنی دیر یہاں کھڑی ہوتی، اس لئے میں جلدی سے واپس لوٹا اور نگینہ کو اتار کر مذکورہ ایکسپریس ٹرین کا ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔

درگئی پہنچ کر ہم اتر گئے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ بذریعہ ٹرین چترال کا سفر ناممکن اور مشکل تھا۔ البتہ تیز رفتار لگژری مسافر کوچز چلتی تھیں جو ضلع ''دیر'' کے علاقہ ''چلارہ'' سے ہوتی ہوئی مین سٹی ''دیر'' تک جاتی تھی۔ وہاں سے ہمیں دوسری کوچ چترال کی مل سکتی تھی۔ میں نے کوچ کے دو ٹکٹ لئے اور اس میں سوار ہو گیا۔ ہم دونوں پہلے ہی مشکلات کے ستائے ہوئے تھے۔ اس لئے کوچ کی آرام دہ سیٹوں اور پُرسکون ماحول نے کافی اطمینان بخشا۔ سفر شروع ہو گیا۔ ناشتہ وغیرہ ہم نے درگئی میں کر لیا تھا۔

''دیر'' اترنے کے بعد وہاں سے ہم چترال کی کوچ میں سوار ہو گئے۔ سہ پہر تک ہم چترال پہنچ چکے تھے۔ یہاں ہم نے ایک اچھے سے ہوٹل میں لنچ کیا۔ نگینہ نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنے لئے کچھ پین کلر اینٹی انفلامیٹری میڈیسن اور اینٹی بائیوٹک لے لینی چاہئیں۔ میں ڈاکٹروں کے مشورے کے بغیر سیلف میڈیکیشن کا استعمال اچھا نہیں سمجھتا تھا مگر مجبوری تھی۔ ورنہ لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑ سکتا تھا۔

ہلکی پھلکی روزمرہ کی ادویات مجھے یاد تھیں۔ اس کے توجہ دلانے پر میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ادویات خریدیں۔ چونکہ ''ناشاء اللہ'' ہمارے ملک میں سیلف میڈیکیشن کا چلن عام ہے اور بالخصوص میڈیکل سٹورز کے حضرات اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں چنانچہ میڈیکل سٹور والے نے

مجھے اپنی تجویز کردہ ادویات دے دیں۔ جب میں نے قیام کے لئے ہوٹل کا رخ کیا تو نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا اس ہوٹل میں رہتے ہوئے تمہیں تاوان درکار ہے؟''

اسے اب قائل کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھیں نگینہ صاحبہ! آپ کے چچا اور کبیر میرے سب ٹھکانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہرحال اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔''

وہ اُلجھ سی گئی۔ اس کے حلق میں ایک بار پھر یہ بات شاید اٹکنے لگی تھی کہ آخر مجھے تاوان کی رقم حاصل کرنے کے لئے اتنے لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی اور میں اسے قائل کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا تھا۔ مگر اب چترال سے بھی آگے نکلنے پر وہ ایک بار پھر اُلجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔ تب میں نے اسے ایک اور جواب گھڑ کر بتایا کہ وہ صرف میرا علاقہ تھا۔ وہاں میں اسے (نگینہ کو) اپنوں میں چھوڑ کر اس کے باپ سے تاوان کی خطیر رقم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ حالات کچھ ایسے گزرے تھے کہ نگینہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اصل ماجرا کیا تھا۔ تاہم جیسے جیسے یہ معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا، نگینہ کو شبہ ہونے لگا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا اور اب اس نے کھل کر اس کا اظہار کر دیا تھا۔

''نادر صاحب!..... مجھے تو یہ کچھ اور ہی چکر نظر آتا ہے۔ کوئی ایسا پراسرار اور گہرا چکر جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہو۔''

میں چونک سا گیا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے اب میں زیادہ دیر تک اسے اپنی فرضی کہانی سے بہلا نہ پاؤں گا۔ تاہم ہنس کر بولا۔ ''آپ تو پتہ نہیں کیا سوچنے لگیں؟''

''میری طرف دیکھو.....!'' اس نے اچانک عجیب سے لہجے میں مجھ سے کہا اور میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ بھی بغور میری آنکھوں کی گہرائیوں کے راستے دلِ مہجور کی عمیق گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں کیوں نادر! مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم یہ سب تکلیفیں، مصائب و آلام اور کٹھنائیاں اپنی بہار کی خاطر نہیں بلکہ میری خاطر برداشت کر رہے ہو۔''

میرے اندر جھماکا ہوا مگر میں کچھ بولے اور بغیر پلک جھپکائے اسے تکتا رہا۔ اسے بولنے کا موقع دیتا رہا۔ وہ جیسے اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ ''ہاں نادر! تمہارا میرا احترام کرنے کا انداز ایک عجیب سا والہانہ پن لگتا ہے۔ ان چند دنوں کے دوران تم خود کس قدر تکلیف میں رہے لیکن..... لیکن تم نے مجھ پر آنچ بھی نہ آنے دی۔ ان کٹھنائیوں اور جاں گسل حالات میں تم نے پل پل میرا اتنا خیال رکھا۔ اور پھر جب بھی عزت پر حرف آنے لگا تو اس وقت بھی تم بالکل مختلف نظر آنے لگے۔ تمہارے چہرے اور آنکھوں سے جوش آمیز جنوں کا جو لاوا اُبلنے لگا، اس کی تپش مجھے اپنے سینے میں چھائی ہوئی کسی پراسراری دھند کو صاف کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر تمہارا اس بدخصلت زوار خان پر جھپٹنا..... یہ سب کیا تھا نادر؟ یہ سب کیا ہے؟..... مم..... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم یہ ساری صعوبتیں، یہ تکلیفیں، یہ خون ریز معاملے اپنی بیمار بیوی نگہت کو بچانے کی خاطر نہیں بلکہ..... بلکہ میری خاطر کر رہے ہو۔ مجھے جواب دو..... میرے دل و دماغ تمہاری طرف اتنا بے اختیار کیوں کھنچنے لگتے ہیں؟ مجھے ایسا آخر کیوں لگتا ہے تمہاری ذات سے میری ذات کا کوئی گہرا، صدیوں پرانا تعلق ہے؟ پلیز! مجھے حقیقت بتاؤ نادر! یہ سب کیا ہے؟''

وہ اتنا کہہ کر ہانپنے لگی۔ فرطِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ آنکھوں سے نمی ایک ازلی پیاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی صورت جھلملانے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے حقیقت بتا دوں۔ کیونکہ اب وہ خود ذہنی طور پر یہ پراسرار حقیقت جاننے پر مائل ہے۔ شاید اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی دھند سے مجھے دیکھ کر ''اپنے پن'' کی صدائے غیب اُبھرنے لگی تھی۔ ایسے میں مجھے برمحل شعر یاد آ گیا۔ تب میں نے اس بار اسے ''نگینہ صاحبہ'' کے لاحقے سے پکارنے کی بجائے اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

''نگینہ! میں تمہیں پہلے ایک شعر سناؤں .... یہ شعر شاید میرے دل کی، میرے حصولِ مقصد کی، میری پیہم کوششوں کی ترجمانی کر دے۔ یہ جتنا سادہ اور آسان شعر ہے، اتنی ہی اپنے اندر گہری معنویت بھی رکھتا ہے۔''

''ہاں .... سناؤ۔'' اس کی آواز مرتعش لبوں سے نہیں، جیسے دل کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔

تب میں اسے وہ چند شعر سنانے لگا جو موجودہ حالات کے عین مطابق اور برمحل تھے۔

''نئی طرح سے نبھانے کی دل نے ٹھانی ہے
وگرنہ اس سے محبت بہت پرانی ہے
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں کسی سے سنوں
کہ تُو نے بھی غمِ دنیا سے ہار مانی ہے
میں کتنی دیر اسے سوچتا ہوں محسن
کہ جیسے اس کا بدلنا کوئی کہانی ہے''

مجھے یہی چند اشعار یاد تھے۔ میں خاموش ہو گیا۔ وہ یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگی۔ وہ درونِ خانہ ایک زبردست کشاکش سے گزر رہی تھی۔ ان برمحل اشعار نے جیسے اس کے اندر ہلچل سی مچا دی تھی۔ اس کے چہرے پر ارتعاش کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کے لب متحرک ہوئے اور اس کی لرزیدہ آواز اُبھری۔

''نادر! تم .... تم کس کرب سے گزر رہے ہو؟ مجھ سے مت چھپاؤ۔ میں ان اشعار کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ مجھے بتاؤ، آخر تم کون سی جستجو میں ہو؟ .... تم جب بھی میری طرف دیکھتے ہو تو مجھے تمہاری آنکھوں سے ایک گہرا کرب چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک غمِ نہاں کی کیفیت تمہارے چہرے سے مترشح سی نظر آتی ہے۔''

پھر جیسے میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ میرے اندر کا درد، ان کہا دکھ خس و خاشاک کی طرح اس روانی سے مجھے بہا لے گیا کہ میں نے اسے حقیقت بتا دی۔ وہ جیسے پتھر کی مورت بن گئی۔ کئی سوچتی، دھڑکتی ساعتیں خاموشی سے گزر گئیں۔ کئی دم بہ خود لمحات کسی اپنے پن کی تشنہ آرزو اور کے ساتھ پیاس بن کر بیت چلے۔ میری پُر امید نظریں نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں آس و یاس کی دھڑکتی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ نگینہ کو حقیقت بتانے پر یہ دھڑکا بھی تھا کہ وہ میری من گھڑت کہانی (پیار بیوی والی کہانی) کا بھانڈا پھوٹتے دیکھ کر مجھ سے پہلے کی طرح بدظن نہ ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے میرے ساتھ جو لمحات گزارے تھے، کم از کم ان کی سچائیوں کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اور پھر بقول اس کے خود اس کے اپنے دل نے بھی ''اپنے پن'' کی گواہی دی تھی اور اس نے خود مجھ سے حقیقت بتانے کی درخواست کی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر کپکپاہٹ ابھری۔

''نن .... نادر! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں نگینہ! ہاں .... یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے کہ میری یہ ساری جستجو اور تگ و تاز صرف اور صرف تمہارے لئے اور تمہاری وجہ سے ہے۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''نگینہ! میری بات کا یقین

رو۔ میں .... میں تمہیں اپنی بے لوث محبت کو قصرِ فنا میں گرنے سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں یقت کیلاش وادی لے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس بدبخت کیلاشی عامل عاروب کے ذریعے تمہارے اندر ی دھند کو صاف کر سکوں جو مجھے .... مجھے تم سے ذہنی اور دلی طور سے دور کرنے کی ایک گھناؤنی ازش کے تحت تمہارے اندر پھیلا دی گئی ہے۔ ہاں نگینہ! اس بدبخت کیلاشی عامل عاروب کے ذریعے پپا اور کالا ناگ نے تم پر یہ خاص عمل کروایا ہے۔ وہ عامل مجھے ٹیلی پیتھی کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ اب ید وہی تمہارے دل و دماغ سے میری گم گشتہ یادوں کو دوبارہ تازہ کر سکتا ہے۔''

''حیرت انگیز! .... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا وہ عامل پراسرار علوم کا ماہر ہے؟'' نگینہ نے حیرت ے پوچھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''نہیں .... وہ پراسرار علوم کا ماہر نہیں ہے مگر لگتا ہے وہ ٹیلی پیتھی کی خاصی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ں نے تمہارا Partialy برین واش کر دیا ہے۔ یعنی تمہارے خانہ دل و دماغ سے صرف اور صرف مجھ ے متعلق یادداشت کو صاف کر ڈالا ہے۔ جبکہ تم اپنے پپا اور دیگر عزیزوں کو پہچان سکتی ہو۔''

''لیکن تم اب آخر کس طرح اس کیلاشی عامل عاروب کو مجبور کرو گے کہ وہ مجھ پر عمل کر کے میرے ر تمہارے حصے کی یادوں کو دوبارہ ابھار سکے؟'' نگینہ نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا تو میں نے زہریلی کراہٹ سے کہا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو نگینہ! میں اسے مجبور کر کے ہی رہوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اس کی جان کیوں نہ لینی پڑے۔'' میرے مضبوط اور مستحکم لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عجیب سی کشمکش سے دوچار نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے ری بات ماننے میں تامل تھا۔

پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی اور ہولے سے مسکرائی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ کیونکہ میں اس کے چہرے پر ایک خاص اور معنی خیز چمک دیکھی۔

''نادر! اگر یہ سچ ہے تو یقیناً میرے لئے ایک حیرت انگیز ٹریجڈی ہے۔ جو نا قابل یقین بھی ہے۔''

''یہ سچ ہے نگینہ! یہ سچ ہے۔'' میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا نظر آتی تھی۔ مانے ہولے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے نگینہ؟''

''نادر! میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سچ ہے تو .... تو کیوں نہ ہم واپس اپنے گھروں کو لوٹ چلیں۔ ن پھر میں سوچتی ہوں کہ تمہاری یادوں کا، تمہاری باتوں کا سرمایہ میرے دل و دماغ میں یقیناً کسی انے، کسی سرمایہ حیات سے کم تو نہ ہوگا۔ تب اپنے واپس جانے کا ارادہ یہ سوچ کر ترک کر لیتی ہوں اس بدبخت کیلاشی عامل نے مجھے اپنی چھینی ہوئی متاعِ یادِ دلداری واپس لینی چاہئے۔''

''ایسا ہوگا نگینہ! .... یقیناً ایک دن ایسا ہوگا۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو اور میرے ساتھ اسی طرح تعاون تی رہو۔'' میں جوشِ مسرت سے بولا۔

''ہاں نادر! اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تمہاری شرافت، بہادری اور بردباری نے بہت متاثر کیا ہے وہ جیسے ''ابھی'' سے ''کبھی'' میں کھوتے ہوئے بولی۔ میں اس مژدۂ جان فزا پر خوشی سے جھوم اٹھا۔

نگینہ اب ذہنی طور پر میرا بھرپور ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ اسے بھی اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ں کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے جو اسے ہر وقت اُداس، رنجور اور کسی نامعلوم سے ''غمِ دروں'' میں مبتلا تا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا خیال تھا کہ پشاور کی طرح یہاں چترال میں بھی ہمیں دشمنوں سے خطرہ تھا بلکہ جیسے جیسے ہم اپنی منزل سے قریب ہوتے جا رہے تھے، یہ خطرہ مزید بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی شام ہونے لگی تھی۔ نگینہ کا خیال تھا کہ ہمیں یہ مہنگا ہوٹل چھوڑ کر کسی اوسط درجے کے بلکہ کسی سستے ہوٹل میں یہ رات گزارنی چاہئے تھی۔ کیونکہ پشاور کی طرح یہاں کے ہر اچھے اور اوسط درجے کے ہوٹل ہمارے دشمنوں کا ٹارگٹ بن سکتے تھے۔ میں نے اس کی تجویز پر صاد کیا اور ذرا ستانے کے بعد ریسپشن پر ایک دن کا کرایہ ایڈوانس چھوڑ کر ہم وہاں سے نکل پڑے۔

ملک کا انتہائی شمالی حصہ ہونے کی وجہ سے یہاں زیادہ زیادہ سردی پڑ رہی تھی۔ اور پھر اگلے دن علی الصباح ہم نے وادی کیلاش کی طرف روانہ ہونا تھا اس لئے ہم نے بازار میں گرم کپڑوں کی ہلکی پھلکی شاپنگ کی اور ایک سستا سا ہوٹل تلاش کر کے اس میں ڈبل بیڈ کا کمرہ لے لیا۔ نگینہ کو بصد اصرار میں نے بیڈ پر لٹا دیا اور خود رات زمین پر بیڈ کے قریب ٹیک لگائے گزار دی۔

صبح ہم نے ناشتہ کیا اور کوچ کے اڈے پر جا پہنچے۔ مجھے ہر پل دشمنوں کا خطرہ تھا۔ تاہم گرم شالوں نے ہمارے چہرے چھپانے کا کام مؤثر انداز میں کیا تھا۔

اگرچہ وادی کیلاش سے متعلق میری معلومات خاصی محدود تھیں لیکن میں نے چترال کے کچھ مقامی سلجھے ہوئے لوگوں سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی تھیں جس کے مطابق چترال سے جیپ کے ذریعے کسی بھی کیلاشی وادی میں جانے کے لئے دو سے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ جیپ فی سواری کرایہ کے حساب سے بھی ملتی ہے۔ لیکن عموماً جیپ کی بکنگ کروانی پڑتی ہے اور کرایہ طے کرنے کے لئے خاصی تگ و دو بھی کرنی پڑتی ہے۔ عموماً آٹھ سو سے ایک ہزار ہی ڈرائیور حضرات طلب کر لیتے ہیں۔

چترال سے وادی کیلاش تک کا راستہ خاصا پیچیدہ اور دشوار گزار ہے اس لئے اگر آپ اپنی گاڑی پر جانا چاہیں تو صرف فور وہیل ڈرائیو ہی مناسب رہے گی۔ لیکن اب تیز رفتار فلائنگ کوچز بھی چلنے لگی ہیں۔

وادی کیلاش تین دیہات ''ریمبور، بمبریت اور بریر'' پر مشتمل ہے۔ اگر چترال پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع ہے تو وادی کیلاش چترال کے جنوب مغربی سمت میں ہے جس کو چاروں طرف سے ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلے نے گھیر رکھا ہے۔ وادی کیلاش کے ان مذکورہ تین دیہاتوں میں صرف بمبریت میں رہائش اختیار کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں ہر معیار کے ہوٹل مل جاتے ہیں۔ تین سو روپے سے لے کر ہزار روپے تک۔ بلکہ سیزن میں بسا اوقات اس سے بھی زیادہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بمبریت میں پختون اور بعض چترالی لوگوں کے آنے کی وجہ سے وہاں حقیقی کیلاشی کلچر میں کچھ کمی دکھائی دیتی ہے لیکن دوسرے دونوں کیلاشی دیہات ریمبور اور بریر نسبتاً زیادہ نمایاں کیلاشی کلچر کی تصویر پیش کرتے ہیں لیکن وہاں ہوٹل کم ہیں اور زیادہ اچھی رہائش نہیں ملتی۔

کوہ ہندوکش میں موجود یہ پہاڑی قبیلہ قریباً تین سے چار ہزار کیلاشیوں پر مشتمل ہے جو عظیم فاتح سکندر اعظم کی یاد دلاتا ہے۔ کیلاشی کھوور (KHOWER) اور کالاور (KALAHWAR) زبانیں بولتے ہیں۔ ان زبانوں کا کوئی رسم الخط نہیں۔ کیلاشیوں کا مذہب کچھ خاص حدود و قیود کا پابند نہیں ہے۔ لیکن ان کے ہاں دیوی اور دیوتا کی پرستش کا تصور بڑا نمایاں ہے۔ ڈی زاؤ (DE ZAO) سب کا خالق دیوتا، ساجیگور (SAJIGOR) چوپایوں اور مال مویشی کا دیوتا، ماہن ڈوئی (MAHAN DOE) شہد کی مکھی کا دیوتا، جیستک (JASTAK) گھر اور خاندان کا دیوتا ہے۔ ان کی اپنی داستانیں، رسم و رواج، مختلف تہوار کی مناسبت سے پہناوے اور ان کے اپنے نام ہیں۔ کیلاشیوں کے تہواروں میں (CHAOMAS)

چاموس'' کا تہوار سب سے بڑا تہوار ہے۔ اس کو (BALOMAIN) دیوتا کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں کیلاشی کالے کپڑے پہننے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ان کی عبادت گاہ یا کمیونٹی ہال کو ''بتک'' کہتے ہیں۔

بہرطور میں اور نگینہ فلائنگ کوچ میں بیٹھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد بمبریت پہنچے۔ یہاں بڑی سخت کی سردی تھی۔ ہم نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں کی اکثر مقامی عورتوں کو دیکھا نے ہمیشہ کالے رنگ کے روایتی کپڑوں میں ملفوف دیکھا۔ جن پر سیپیوں، گھونگھوں، سکوں اور بٹنوں کو انتہائی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ٹانک کر دلفریب بنایا گیا تھا۔ ان وادیوں میں جہاں گھنے ات کے ساتھ ساتھ مکئی اور گندم کے سرسبز کھیت دکھائی دیتے ہیں، وہاں سیب، خوبانی، ناشپاتی اور ٹ کے جھنڈ بھی نظر آتے ہیں۔ میں اور نگینہ باوجود دگرگوں حالات کے اس حسین وطلسماتی وادی کے میں کھو سے گئے تھے۔ نگینہ نے مجھے ایک گائیڈ رکھنے کی تجویز دی تھی۔

میں نے تگ و دو کی تو ایک نوجوان چترالی لڑکا داور خان مجھے مل گیا۔ داور خان کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک یتیم، بے سہارا لڑکا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ مگر اسے یہاں کے بارے میں ت انگیز معلومات حاصل تھیں۔ میں نے اسے مستقل طور پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی خوش ہو گیا۔ اب مسئلہ اس کیلاشی عائل عاروب کو تلاش کرنے کا تھا جسے بہرحال راز رکھنا تھا۔ میں نے داور خان کو بتایا کہ ہم دونوں میاں بیوی (میں اور نگینہ) ایک اخبار سے تعلق رکھتے ہیں اور کیلاشی وادی کی سیر بھی چاہتے ہیں اور سیر حاصل معلومات بھی۔

وہ بڑی مستعدی اور جوش سے بولا۔ ''صیب جی! میں آپ کو پوری کیلاشی وادی کی سیر کراؤں گا۔ آپ بے غم ہو جاؤ۔'' ..... ''بے غم ہو جاؤ' اس کا تکیہ کلام تھا جسے وہ بار بار استعمال کر رہا تھا۔ ''کیونکہ ی پیدا ہی ادھر ہوا ہوں۔ چلو پھر میں سب سے پہلے آپ لوگوں کو بمبریت کی سیر کراتا ہوں، اس بعد ریمبور اور بریر لے چلوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی ہم بمبریت تو گھوم ہی چکے ہیں۔ تم ایسا کرو ہمیں ریمبور لے چلو۔ وہاں رہائش کا انتظام تو ہو گا نا؟''

''ہاں، ہاں صیب جی! کیوں نہیں..... مگر.....'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکا تو میں نے پوچھا۔ ''مگر کیا.....؟''

''صیب جی! ریمبور اور بریر اس وادی کے اندرونی دیہات ہیں۔ وہاں رہائش کے لئے اچھے ہوٹل تو ہیں۔ لیکن رات پڑ گئی تو آپ لوگوں کو کسی ''مڑھی'' میں رہائش اختیار کرنا ہو گی۔''

''مڑھی؟..... یہ کیا ہوتی ہے؟''

''صیب جی! مڑھی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کو کہتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''باہر سے آنے والے کو وہاں کے مقامی لوگ رات بسر کرنے کے لئے کرائے پر دیتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا..... ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا ہمیشہ کے لئے رہنے آئے ہیں۔ اپنا کام کرنے کے بعد دو ایک روز میں لوٹ ہی جائیں گے۔ تم چلو۔'' میں نے کہا۔

ہم بمبریت سے روانہ ہوئے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم ایک خچر گاڑی میں بیٹھ کر پہنچے۔ استے میں داور خان نے بتایا کہ آج کل ''چاموس'' کا خاص تہوار منانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں اور اس موقع پر خصوصاً عورتوں نے مخصوص سیاہ لبادے پہن رکھے ہوتے ہیں جسے مقامی زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ''چھٹیو'' کہا جاتا ہے۔ بالوں کی چوٹیاں بناتی ہیں۔ گلے میں ڈھیروں مالائیں پہنتی ہیں اور سر پر ''کوپاس'' لیا جاتا ہے۔ یہ کوپاس اون کے کپڑے، موتیوں، پھولوں، گھنٹیوں وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔

خچر گاڑی سے اترے تو میں نے دانستہ داور سے مذہبی عبادت گاہوں کی سیر کرنے کا کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مردود کیلاشی عامل عاروب ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا بھی تھا۔ میں باتوں باتوں میں داور کے ذریعے اس کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ داور ہمیں عبادت گاہیں دکھانے چل پڑا۔ ان میں ڈی زاؤ، ساچی گور، ماہن ڈوئی، جیستک کے نام قابل ذکر تھے۔ مگر مجھے عاروب نامی وہ کیلاشی عامل کہیں دکھائی نہ دیا۔ اگرچہ میں اسے پہچانتا تو نہیں تھا مگر میں نے ابھی سوائے ان دیوتاؤں کے کسی روحانی پیشوا کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔ تب میں نے خود ہی داور خان سے پوچھا۔ ''ان لوگوں کا آخر کوئی روحانی پیشوا تو ہوگا؟''

''بہت کم۔'' داور بولا۔

''تمہیں ان سے واقفیت ہے؟''

''اگر آپ کو ان سے ملنا ہے تو ان کے جشن میں شامل ہونا پڑے گا۔'' وہ بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تہوار کے پہلے دن کی ابتداء ہو چکی تھی جو ''شیشاوسچک'' کہلاتا تھا۔ اس کے بعد جشن چلم جیش منایا جاتا۔ اب یہ اتفاق تھا یا ہماری خوش قسمتی کہ یہ دسمبر کا ہی مہینہ تھا اور ان کے تہوار اسی مہینے میں منائے جاتے تھے۔

ہمارے نوعمر گائیڈ داور کے کہنے کے مطابق یوں تو اپریل سے لے کر ستمبر وادی کیلاش میں رہنے کے لئے بہترین ہیں۔ البتہ ونٹر ٹریکنگ کے شائقین کی الگ بات ہے۔

ذرا شام ہوئی تو تہوار عروج پر پہنچ گیا۔ ایک تہوار کی تقریب ''کالاشی آگرم'' میں ہو رہی تھی۔ میرا ذہن ٹھنک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ عاروب اس وادی کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ کالاشی آگرم سب سے اونچا گاؤں تھا اور دریا کے ساتھ تھا۔ دورانِ تہوار مرد کھلی آگ پر ''شیشاؤ'' بناتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص انداز کی روٹی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی عورت نہیں ہوتی۔

نگینہ سحر زدہ سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میری طرح اسے بھی یہ بالکل ایک الگ تھلگ دنیا محسوس ہو رہی تھی۔ میں بہ غور ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران عورتیں اور لڑکیاں مخصوص گیت گاتی وہاں آ گئیں۔ تب میں نے ایک عمر رسیدہ کیلاشی کو دیکھا۔ وہ قبیلے کا بزرگ تھا۔ وہ ایک مخصوص لکڑی سے عورت کے سر کو تین بار چھوتا۔ چیڑ کی مشعلیں روشن تھیں۔ علاوہ ازیں بہت بڑا الاؤ بھی روشن تھا۔ میری نظریں اس عمر رسیدہ کیلاشی پر جمی ہوئی تھیں۔ اب خواتین کے ہاتھوں پر پانی ڈالا جا رہا تھا اور مرد اپنی پکی ہوئی روٹیاں دے رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ چھڑی چھوتے ہوئے بار بار ایک مخصوص لفظ ''سودو'' ادا کرتا جا رہا تھا۔ اس رات عورتوں نے بھی ایک مخصوص روٹی پکائی جسے ''جھاؤ'' کہا جاتا تھا۔ اس خصوصی روٹی میں پنیر اور کچلے ہوئے اخروٹ وغیرہ بھرے جاتے تھے۔ میں نے جب اس عمر رسیدہ آدمی کا پوچھا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کا نام عاروب نہ تھا۔

اگلا روز مردوں کے نہانے اور بالومین کے لئے تیاری کا تھا۔ داور خان کے کہنے پر ہم واپس ہو اور ایک مڑھی کرائے پر لے لی۔

اگلا دن بھی ان کا تہوار دیکھتے ہوئے گزرا۔ میں اب ''کالاشی آگرم'' سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ وقت ''چمانجن رات'' کی تقریب تھی۔ یہ رات مشعل بردار جلوس کی شکل میں تھی۔

ان کا روحانی پیشوا نظر آتا ہو۔ ایک کیلاشی عورت نے نگینہ سے مسکرا کر کہا۔

''ایش چھے بابا! یور لیتا تازہ۔'' نگینہ اس کی زبان نہ سمجھ پائی تو داور خان نے مسکرا کر اس کا ترجمہ کرتے ہوئے نگینہ سے کہا۔

''میڈم! یہ آپ سے پوچھ رہی ہیں کہ پیاری بہن! کیا حال ہیں؟''

تب نگینہ نے مسکرا کر اشاروں کی بین الاقوامی زبان میں اسے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ داور خان نے اسے بتایا کہ یہ لوگ آپ کو مخاطب کرنے کے لئے ''بابا'' یا ''بھایا'' کہیں گے۔

بہرطور وہ دن بھی یونہی ناکام گزر گیا۔

تیسرے دن جونہی سورج بلند ہوا، داور خان ہمیں ''جیستک'' عبادت گاہ لے گیا۔ کالاشی روایت کے مطابق جیستک، گھر اور خاندان کی دیوی ہے۔ یہ عبادت بالنگورہ میں ہوتی ہے۔ ہم وہاں جا پہنچے۔ یہاں داور نے مجھے ایک کام کی بات بتائی۔

اس نے جلوس میں موجود ایک گروہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ لوگ یہاں کے ایک مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا اپنا اندازِ عبادت اور دیوتا ہوتا ہے۔ ان کا ایک روحانی پیشوا بھی ہے۔

میرا ذہن بری طرح ٹھنکا۔ کبیر نے مجھے عاروب کے بارے میں بتایا تھا کہ عاروب نے وہاں کیلاشیوں کا ایک الگ تھلگ مخصوص گروہ بنایا ہوا ہے۔ میں نے اضطراب، جوش و بے چینی سے پوچھا۔

''ان کے روحانی پیشوا کا نام.....؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر میں نا امید نہ ہوا۔ داور خان بولا۔

''صیب جی! ویسے یہ گروہ بہت پراسرار سرگرمیوں کا حامل گروہ ہے۔ اگر آپ ان کا انداز دیکھنا چاہتے ہیں تو ابھی تھوڑی دیر بعد یہ لوگ الگ ہو کر اپنی عبادت گاہ لوٹ جائیں گے۔ وہیں ان کا روحانی پیشوا بھی ہوگا۔''

''چلو، پھر میں تیار ہوں۔'' میں نے فوراً کہا۔

پھر ذرا دیر بعد یہ مخصوص گروہ ان سے الگ ہو گیا۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ بیرونی دنیا سے یہاں آنے والے سیاحوں کا یہ معمول تھا۔ اس لئے کسی نے ہم پر خاص توجہ نہ دی تھی۔ ہم جس مخصوص گروہ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے، ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں جن میں اخروٹ، خشک میوہ جات اور پھل وغیرہ تھے۔ ہم ان کی عبادت گاہ میں پہنچے جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ میرے دل میں جانے کیوں بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ میری چھٹی حس بار بار خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

بہرطور ہم ان لوگوں کے ساتھ ان کی عبادت گاہ پہنچے۔ میں نے ان کے روحانی پیشوا کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ بار بار داور خان سے اس کے بارے میں استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب میں ہر کسی سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس عبادت گاہ میں آگ جلانے کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ لوگ باگ اپنے ساتھ لائی ہوئی خوراک کا ایک حصہ ایک بہت بڑی اجتماعی باسکٹ میں ڈال رہے تھے۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کی روحیں آ کر اسے قبول کر لیں گی۔ یہ عمل عبادت گاہ کے باہر ہوتا تھا۔

عبادت گاہ سے باہر مردوں نے چیڑ کی لکڑی سے ایک اہرام سا بنایا تھا جسے ''کونک'' کہا جا رہا تھا۔ شام گہری ہوئی تو وہ لوگ عبادت گاہ میں داخل ہونے لگے۔ میں نے بھی اندر جانا چاہا تو داور گھبرا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔ ''صیب جی! یہ بہت پراسرار اور جادوٹونا کرنے والے لوگ ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ لوگ ہمیں اندر داخل ہونے نہیں دیں گے؟''

''نہیں۔ یہ لوگ تو خوش ہوتے ہیں کہ کوئی اجنبی ان کے ساتھ اندر داخل ہو۔'' وہ بولا۔ ''اس سلسلے میں ان کے روحانی پیشوا کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کا گروہ بڑھے گا۔''

میں نے دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ میں ان کے رنگ میں رنگنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ لہٰذا داور تو اندر نہیں گیا، میں اور نگینہ اندر داخل ہو گئے۔

میں نے احتیاط کے پیش نظر بالخصوص نگینہ کا چہرہ ایک گرم شال میں چھپا رکھا تھا کہ اگر واقعی یہاں عاروب سے ٹکراؤ ہو جائے تو وہ نگینہ کو دیکھ کر ہماری طرف سے ٹھٹک نہ جائے۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ داور خان البتہ باہر حیران و پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔

جب سب اندر داخل ہو گئے تو عبادت گاہ کے دروازے پر موٹا سا پردہ ڈال دیا گیا جسے دو آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ سامنے ایک چبوترا تھا۔ چیڑ کی مشعلوں سے اندر کی فضا گرم تھی۔ ہمیں گرم کپڑوں میں اب گرمی سی محسوس ہونے لگی۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ کسی نے بھی ہم پر توجہ نہ دی تھی۔

یہ مخروطی چھت والی بڑی ہی عجیب وضع کی عبادت گاہ تھی۔ سامنے ایک اونچا چبوترا تھا جدھر ایک بڑی سی مورتی تھی۔ مورتی کی صورت بڑی خوف ناک تھی۔ عجیب طلسماتی اور دلوں پر نامعلوم سا خوف پیدا کر دینے والا ماحول تھا۔ نگینہ نے گرمی کے مارے شال اتار دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چبوترے پر ایک کبڑا، ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر گنجا تھا۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ چہرہ سیاہ اور آنکھوں میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی۔ بدہیئت، سیاہ چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ شاید یہی ان کا روحانی پیشوا تھا۔ اس کے سنگی چبوترے پر آتے ہی وہاں موجود اس کے پیروکاروں نے اپنے سر جھکا دیئے اور با آواز بلند اجنبی زبان میں کچھ پڑھنے لگے۔ میں اور نگینہ جوں کے توں کھڑے تھے۔ اس کبڑے، عمر رسیدہ شخص کی مقناطیسی نظریں ہم پر پڑیں اور پھر نگینہ پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اب سب لوگ سر جھکائے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ماحول کو جیسے ایکا ایکی سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ پراسرار کبڑا بدستور اب نگینہ کو ہی اپنی مقناطیسی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو دیکھا تو چونک گیا۔ وہ بھی یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ نگینہ نے آپوں آپ چبوترے کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ اس کا انداز تنویمی عمل کے زیر اثر کسی معمول کا سا تھا۔ میں جیسے سناٹے میں آ گیا۔

نگینہ کا یوں میکانکی انداز میں چبوترے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنا میرے لئے سخت حیرت کا باعث تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں تذبذب کا شکار تھا۔ ہال میں موجود سب لوگ دست بستہ خاموش اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماحول میں پراسرار سناٹا طاری تھا۔ چیڑ کی مشعلوں سے بلند ہوتے شعلے عجیب ہلکی ہلکی چرچراہٹ کی آواز بلند کر رہے تھے۔ میں کبھی دم بہ خود چبوترے کی طرف کشاں کشاں بڑھتی نگینہ کو دیکھنے لگتا تو کبھی چبوترے پر موجود اس سیاہ پوش کبڑے روبوٹ کو جس کی مقناطیسی آنکھیں مسلسل نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا گنجا سر مشعلوں کی روشنی میں تپتا ہوا نظر آ رہا تھا اور طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک کے نیچے بدہیئت ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ رقصاں تھی جس میں خباثت کا عنصر غالب تھا۔

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پا رکھا تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ مخصوص اور پراسرار گروہ کا یہ کبڑا روحانی پیشوا یقیناً وہی کیلاشی عاروب تھا جس نے کبیر اور کالا ناگ کے ایما پر میری نگینہ کی ذہنی رو اپ کر میری دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ آج میں طویل مسافت کے بعد بڑی شوریدہ سری کے عالم میں نگینہ کو لے کر یہاں اپنی دل کی دنیا کو بچانے کے عزم کے ساتھ آیا تھا۔

میں نے دیکھا، نگینہ چبوترے کے قریب پہنچ کر رک چکی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کبڑے گنجے نے نہایت دھیمی مگر پُرتاثر آواز میں اسے مخاطب کر کے کچھ کہا جسے میں نہ سن سکا۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ جملہ سننے کے بعد نگینہ کے ٹھہرے ہوئے قدم دوبارہ حرکت میں آ گئے تھے۔ وہ اسی طرح دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی چبوترے کی سیڑھیوں تک پہنچی اور ایک ایک سیڑھی چڑھ کر چبوترے کے اوپر پہنچ کر اس پیشوا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نگینہ اس کے ٹرانس میں تھی اور یقیناً یہی میرا مطلوبہ شخص کیلاشی عامل عاروب تھا۔ اب یہ نگینہ سے کیا بات کرنا چاہتا تھا، یہ سننے کے لئے میں نے بھی خاموش کھڑے مجمع کے درمیان دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے تھے۔ اور پھر قدرے قریب پہنچ کر میں بھی خاموش کھڑا ہو گیا۔ سینے میں میرا دل اس وقت کسی اور ہی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر کان پوری طرح عامل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ شاید اس لئے میں نے وہ منمناتی ہوئی آواز سن لی۔

''مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور آؤ گی۔ ہماری روحانی طاقت تمہیں ہمارے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کرتی رہے گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا.....نگینہ؟'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ اس کی زبان پر نگینہ کے نام نے میرے گمان کو حق الیقین میں تبدیل کر دیا۔ اس کی گفتگو سن کر میری رگوں میں خون کی گردش کھولتے ہوئے لاوے میں بدل گئی۔ تب مجھے نگینہ کی جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اس کیلاشی عامل عاروب سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں!..... مجھے واقعی کوئی ان دیکھی طاقت یہاں کھینچ لائی ہے.....تمہارے پاس..... میں اب یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔''

نگینہ کی آواز سن کر میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی بات پر کیلاشی عامل کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک اُبھری۔ پھر اس کے بدہیئت ہونٹ باچھوں تک پھیلے اس کے بعد اس خبیث نے مجمع پر نظر ڈالی اور اس کی متلاشی نظریں میرے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ نگینہ کی جوابی گفتگو نے مجھے پہلے ہی ہولا کر رکھ دیا تھا۔ اب جو کیلاشی عامل کی نظریں مجھ پر جم گئیں تو مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بدبخت مجھے بھی اپنے ٹرانس میں نہ لانا چاہتا ہو۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس گھورے جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کی مسلسل گھورتی ہوئی مقناطیسی نظروں میں ایک کھنچاؤ کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ اس کیلاشی عامل کی آنکھیں ایکا ایکی بے تاثر ہو چکی تھیں۔ جیسے اس کا جادو مجھ پر نہ چل سکا ہو۔ اس خیال نے مجھے یک گونہ تفاخر آمیز تسکین بخشی تھی۔ تب اس کیلاشی عامل نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا دیں اور اپنے روبرو کھڑی نگینہ کو تکتے ہوئے اس سے میرے بارے میں پوچھا۔

''تمہارے ساتھ آنے والا یہ شخص کون ہے؟''

''میں اسے نہیں جانتی .... میں اس معبد کے باہر کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میں .... میں صرف اپنے عامل یعنی تمہیں جانتی ہوں .... اور بس۔'' نگینہ نے جواباً خوابیدہ کیفیت میں کہا اور ایک بار پھر اس کیلاشی عامل کے بدہیئت ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری تھی۔

اب میرے لئے یوں خاموش تماشائی بنے کھڑے رہنا قطعاً ناممکن ہو چکا تھا۔ میں اپنی نگینہ کو ذہنی طور پر پانے کی خاطر مصائب و آلام جھیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور اس بدبخت خبیث عامل عاروب نے میری نگینہ کو جیسے ایک بار پھر مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟......... یہ مجھ سے کیسی بھیانک غلطی ہو گئی تھی؟......... ایک انتہائی کرب انگیز خیال، پچھتاوے کے خنجر کی صورت میرے سینۂ سوزاں میں پیوست ہو کر رہ گیا اور پھر جیسے میرے پورے وجود میں غیظ و غضب کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

میں نے تیزی سے حرکت کی اور آسمانی بجلی کی طرح چبوترے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت عامل عاروب نے میرے جارحانہ تیور بھانپ کر وہاں ہال میں موجود چیڑ کی مشعلیں تھامے اپنے تنومند خدام کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت غیر معمولی پھرتی سے حرکت میں آئے۔ میں ابھی چبوترے کی سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں اُبھرنے والے چار عدد تنومند خدام نے مجھے دبوچ لیا۔ جبکہ مزید دو خدام نے ماؤزر نکال کر ان کی مہیب نالوں کا رخ میرے چہرے کی طرف کر دیا۔

مجمع سے چند لوگوں نے مختصر سی ہونے والی کھڑ پڑ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے حلق کے بل چیخ کر نگینہ کو پکارا۔

''نگینہ!.........'' مگر جیسے نگینہ نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اچانک کیلاشی عامل عاروب کی تحکمانہ آواز ہال میں گونجی۔

''اسے باہر کا راستہ دکھا دو۔ اگر یہ نہ مانے تو اسے گولی مار دینا۔''

عاروب کے یہ مسلح پیروکار مجھے کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے آئے۔ پھر مجھے درشت لہجے میں وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ میں نے سردست ہوش و حواس سے کام لینے کا سوچا اور پھر بہ ظاہر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کی عبادت گاہ سے دور چلا گیا۔

یہ تو شکر تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا ورنہ یہ مجھے قید بھی کر سکتے تھے۔ اب کم از کم میں آزاد تو تھا۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے ہول اُٹھ رہے تھے۔ نگینہ ایک بار پھر اس کے ٹرانس میں آ چکی تھی لیکن میں نے یہ بات محسوس کی کہ عاروب نے شاید مجھے بھی اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے جرأت اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کر کے اسے شکست دے ڈالی تھی۔ جبکہ نگینہ کا اس کے ٹرانس میں آنا سمجھ میں آتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے پہلے ہی اس کے ٹرانس میں تھی۔ اگرچہ میں زورِ محبت سے کسی حد تک نگینہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ وہ کن پراسرار حالات و کیفیات کا شکار ہے مگر اب مجھے ان ساری کوششوں پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے اپنے منتشر ہوتے حواس پر قابو پایا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کی اس اچانک اور غیر متوقع کایا پلٹ کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ اپنی آزادی کو غنیمت جاننے کے بعد میں نے ایک مربوط لائحہ عمل تیار کیا۔ میں اب ان کی عبادت گاہ سے ذرا دور جا کر ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا تھا۔

میرا دوبارہ دیکھ لیا جانا، نہ صرف میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا بلکہ میرے مقصد میں رکاوٹ کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ اس لئے میرا سب سے پہلے حلیہ بدلنا لازم تھا۔ لیکن میں ان کی نظروں میں آئے بغیر پہلے اس مردود کیلاشی عامل عاروب کے ٹھکانے سے واقف ہونا چاہتا تھا، اس کے بعد ہی میں کوئی عملی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم اٹھانے کا متحمل ہو سکتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرے اندر کی تشویش آمیز بے چینی عروج پر پہنچنے لگی۔ پتہ نہیں اب مردود عامل عاروب نگینہ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟

آسمان پر بادل چھائے تھے جس کے باعث سہ پہر ہونے کے باوجود شام کا گمان ہو رہا تھا۔ مزید ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے چٹانی آڑ سے ذرا سا سر ابھار کر عبادت گاہ کی طرف دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ عامل عاروب کے مخصوص گروہ کے افراد اب باہر نکل رہے تھے۔ جب وہ سب کے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر ہو لئے تو میں نے دو خدام کو عبادت گاہ کے دروازے پر چوکنا کھڑے ہوئے دیکھا۔ تب اچانک میرے دل میں ایک خیال ابھرا کہ اس خبیث عامل عاروب کی کمین گاہ بھی اسی عبادت گاہ کے کسی گوشے میں ہو سکتی تھی۔

میں نے اندر داخل ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں عبادت گاہ کا طواف کر کے اس کے محل وقوع کا تنقیدی جائزہ لے لوں مگر دن کے وقت یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ درحقیقت میں اب دوسری بار عامل عاروب کے گرگوں کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ میری طرف سے محتاط ہو سکتے تھے۔ ابھی وہ میری طرف سے بہ زعم خود غافل اور بے پرواہ تھے، اس کا سبب یہی تھا کہ انہیں ابھی میری اصلیت کا علم نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے کوئی عام سا شخص سمجھے ہوئے تھے اور میں ان کی اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ذرا شام گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جب ٹھٹھرتی شام کی کجلاہٹ فضا میں گھلنے لگی اور ارد گرد قریب گہرا سناٹا چھا گیا تو میں چٹان کی آڑ سے نکل آیا۔ مطلع ہنوز ابر آلود تھا۔ میں انتہائی محتاط روی کے ساتھ عبادت گاہ کے ذرا قریب بڑھنے لگا۔

عبادت گاہ کی مخروطی عمارت کے آس پاس سناٹا اور ویرانی تھی۔ کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اندھیرے اور ویرانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبادت گاہ کا مکمل طواف کر ڈالا اور اس کے محل وقوع سے اچھی طرح آگاہی حاصل کرنے کے بعد ایک جگہ ذرا ٹھہر گیا۔

یہ عبادت گاہ کی شمالی دیوار کا حصہ تھا۔ یہاں اوک اور کنڈ باوری کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں نے دانستہ عبادت گاہ کے اس حصے کا انتخاب کر کے یہاں ٹھہرا تھا۔ کیونکہ یہاں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا تھا۔ یہ سنگل پٹ کا دروازہ تھا اور قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ یقیناً کسی سنگی زینے پر کھلتا تھا جو عبادت گاہ کی اوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ کیونکہ اس جانب ایسا ہی ابھار تھا جو کسی گردشی زینے کو ظاہر کرتا تھا تین تین فٹ کے فاصلے سے ایک دوسرے کے اوپر دریچے بنے ہوئے تھے۔ کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ خبیث عامل عاروب کا حجرہ نما ٹھکانہ اوپری منزل ہی کی طرف تھا اور اس کا ایک دروازہ اندر بھی کھلتا تھا لیکن عبادت گاہ کے باہر کھلنے والے اس مختصر سے سنگل پٹ والے دروازے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہ آیا لیکن ذہن طباع نے اسے ہی آزمانے کا طریقہ سوچ لیا تھا۔

فضا خاموش تھی۔ ماحول میں دھڑکتا ہوا سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں برف پوش پہاڑیوں سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں کبھی کبھی گونجتی سنائی دیتی تھیں اور پھر وہی آسیبی سناٹا منحوس گدھ کی طرح پنجے گاڑ لیتا تھا۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ میں نے گرم اُونی شال اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ مذکورہ دروازے کی طرف دبے پاؤں مگر تیز تیز قدموں سے بڑھنا شروع کیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں رکا اور دیوار سے پشت کے بل چپک کر دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیے توقف میں جائزہ لینے کے بعد میں نے سنگل پٹ والے دروازے کا جائزہ لیا۔ باہر سرے سے کنڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی غائب تھی۔ میں نے ہولے سے اسے اندر باہر دھکیلنے کی کوشش کی مگر عبث۔ وہ اندر سے بند تھا۔ لیکن ذرا ہلانے جلانے سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ سن رسیدگی کے باعث تختے کا پٹ کچھ کمزور ہو چلا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایک نظر گرد و پیش پر ڈالی، اس کے بعد مذکورہ کمزور تختے کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔ میرے ہلانے سے تختے کی مختصر سی چوبی چوکھٹ کے درمیان خاصی موٹی درز بن گئی۔ میں نے جھک کر فوراً اپنی آنکھ چپکا دی۔ اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی میں مجھے اندر ایک سنگی گردشی زینہ دکھائی دیا جو اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن مدھم روشنی زینے کے سامنے والی دیوار کے بغیر دروازے والی کھلی چوکھٹ سے آ رہی تھی جہاں سے ہال کا وہ چبوترا نظر آ رہا تھا جدھر کافی دیر قبل عاروب اور نگینہ کھڑے تھے۔ مگر اب وہاں اس خوف ناک صورت والی مورتی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

عاروب اور نگینہ کو اب وہاں نہ پا کر مجھے ایک محتاط سا اندازہ ہونے لگا کہ وہ دونوں یقیناً اس گردشی زینے سے اوپری منزل پر جا چکے تھے۔

میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر اپنے عقب اور گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔ پھر تختے کی موٹی درز کے اندر اپنی دو انگلیاں گھسیڑ کر تختے کو کھینچنے لگا۔ میری کوشش رنگ لائی اور دو تین بار زور لگانے کے بعد تختہ اُکھڑ گیا۔ اب سنگل پٹ والے دروازے میں اتنا خلا ہو گیا تھا کہ جس سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکے۔ لیکن میں نے کسی خیال کے تحت اپنا پورا بازو اس مختصر سی چوبی چوکھٹ کے اندر ڈال کر کنڈی تلاش کی۔ میرا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ کنڈی تک میرا ہاتھ با آسانی پہنچ چکا تھا اور اس پر تالا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے جلدی مگر آہستگی سے کنڈی کھولی اور دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے اُکھیڑا ہوا تختہ دوبارہ جما دیا تاکہ بعد میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ میں نے زینے پر کھڑے ہو کر ایک نظر ہال میں ڈالی۔ چند مشعلیں روشن تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ اس کے بعد میں نے سر اٹھا کر گردشی زینے کی طرف دیکھا۔ اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے میگارد کی موجودگی کی تسلی کی۔

میں نے میگارد کا چیمبر چیک کیا۔ چار گولیاں تھیں۔ میں نے مزید تین ڈال کر ساتوں کی تعداد مکمل کی اور پھر دھیرے دھیرے زینے طے کرنے لگا۔

زینے کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ہر چکر پر چھوٹا سا محرابی دریچہ تھا جس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ میں اوپر چڑھنے لگا۔ اندازاً آٹھویں چکر پر مجھے سامنے دائیں جانب قدرے چوڑے تختوں والا دروازہ نظر آیا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے میگارد نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے میں ذرا مزید آگے کھسکا اور دیوار سے چپکا ہوا آگے بڑھ کر اندر جھانکا تو جیسے میری کنپٹیاں سنسنا اُٹھیں۔ دس بائی بارہ کے کمرے کے بالکل وسط میں زمین پر بچھے دبیز قالین پر مجھے نگینہ دوزانو بیٹھی نظر آئی۔ اس کے سامنے عاروب بیٹھا تھا۔ دونوں کے وسط میں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ وہ کھانے میں مصروف تھے۔ اندر چیڑ کی مشعلوں سے خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ دو خدمت گار بھی موجود تھے۔

نگینہ کے چہرے پر اب اُلجھن آمیز پریشانی کے تاثرات تھے۔ صاف لگتا تھا جیسے اب وہ عامل عاروب کے ٹرانس سے باہر آ چکی تھی۔ وہ مخصوص تنویمی کیفیت جو پہلے نگینہ پر طاری تھی، اب عنقا ہو چکی تھی۔ شاید اس کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی۔

''مم..... مجھے بتاتے کیوں نہیں ..... مم ..... میرا وہ ساتھی کہاں گیا؟'' معاً نگینہ نے اس عامل عاروب سے ہراساں لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں ایک تڑپ تھی، ایک التجا تھی۔ وہ میرے بارے میں اس خبیث سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ تمہارا کیا لگتا تھا؟'' عاروب نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں، وہ میرا کیا لگتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟ ..... مجھے ایسا ہے جیسے میرے ذہن کی اسکرین رفتہ رفتہ صاف ہوتی جا رہی ہے۔ میرے دل و دماغ بالکل کورے ہے جا رہے ہیں۔ میں کون ہوں؟ ..... کیا ہوں؟ .....آہ!'' نگینہ جیسے بے خودی میں کہتی جا رہی اور اس کی اس حالت پر میرا جگر چھلنی ہونے لگا۔ میں خود پر بہ مشکل قابو پائے دم سادھے دیوار کی آڑ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''لڑکی!.....اب تمہیں اس دنیا سے کچھ نہیں لینا دینا۔ تم اب یہیں رہو گی ہمیشہ کے لئے۔ ساری میری کنیز بن کر۔ میری باندی بن کر۔'' عامل عاروب نے کھرکھراتی اور بارعب آواز میں کہا جس حکمانہ عنصر بھی غالب تھا۔ مجھے اس خبیث کے نگینہ کے متعلق مکروہ عزائم جان کر طیش چڑھ گیا۔ میرے میں آئی کہ اسی وقت اپنے میگارد کی ساتوں گولیاں اس مردود کبڑے کے ناپاک وجود میں اُتار دوں۔

''نہیں ..... میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے جانے دو۔'' نگینہ نے یکدم تڑپ کر کہا تو میں نے دیکھا، عامل عاروب نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور بلند تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''میری طرف دیکھو.....'' نگینہ نے آبدیدہ نگاہیں اس کے چہرے پر ڈال دیں۔ عامل عاروب بغیر پلک جھپکائے گھورتا رہا۔ میرے دماغ میں جیسے آتش فشاں چنگھاڑنے لگا اور میں غیظ و غضب سے پاگل ہو گیا۔ پھر جیسے ہی میں نے درانہ اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا، اچانک میرے سر پر جیسے چوٹ پڑی اور میرے حلق سے ایک کرب انگیز کراہ خارج ہوئی۔ اس کے بعد میں ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

❄❄❄

آنکھ کھلی تو اندھیرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے سر کو دو تین بار جھٹکا تو تاریکی کا پردہ چاک ہوا اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ایک اذیت ناک ٹیس کا بھی احساس ہوا اور میرے حلق سے کراہ سی خارج ہو گئی۔

میں ایک خستہ حال، ننگے فرش پر رسن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کمرہ چھوٹا اور میرے سوا ہر شے سے خالی تھا۔ دیواریں پتھریلی تھیں۔ چھت البتہ خاصی بلند اور ڈھلوان تھی۔ کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ البتہ ایک دریچے سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کے باعث کچھ اُجالا ہو رہا تھا۔ باہر شاید مطلع صاف ہو چکا تھا اور کہیں دور برف پوش پہاڑیوں سے چاند سر اُبھار رہا تھا۔ میری دونوں ٹانگوں کو نائلون کے مضبوط رسیوں سے جکڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ شکر ہے میرا ذہن اچھی طرح کام کر رہا تھا۔

میں نگینہ اور عاروب کی باتوں میں کھو کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے پرواہ ہو گیا تھا اور یہی سب سے بڑی اور فاش غلطی تھی۔ کسی خادم نے اچانک کسی کند شے سے میرے سر پر وار کر کے مجھے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی۔ ایک غلطی تھی۔ میری یہ انتہائی کوشش بری طرح ناکام ہو گئی تھی کہ میں دوبارہ عامل عاروب اور اس کے کارپرداز کی نظروں میں نہ آؤں۔ میں ان کا ہدف بن چکا تھا اور ان کی نظروں میں آ چکا تھا۔ مجھ سے عجلت آمیزی میں بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ نگینہ کو بھی شاید پا کر پھر کھو چکا تھا اور خود کو بھی اب جیسے کھونے لگا تھا۔ صورتِ حال نازک اور گمبھیر ہو گئی اور خطرناک

بھی۔ مگر ہمت ہارنا میں نے کبھی نہیں سیکھا تھا۔

میں نے پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور لکیر پیٹنے کی بجائے آگے کے حالات پر غور کرنے لگا۔ یقیناً مجھے میرے مرغوب ہتھیار میگارد سے بھی محروم کر دیا گیا ہوگا۔

بہرطور میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کے گرد بندھی رسّی پر زور آزمائی شروع کر دی لیکن نائیلون کی باریک اور مضبوط رسّی کیا ٹوٹنی تھی، الٹا میرے ہاتھ پاؤں چھل گئے۔ اس لاحاصل کوشش سے میں ہانپ کر رہ گیا۔ بے بسی، پچھتاوے اور جھنجلاہٹ کے مارے میرا دماغ الٹنے لگا اور کسی جال میں پھنسے وحشی درندے کے مانند میرے میرے منہ سے غراہٹیں بھی برآمد ہوئیں۔

کافی دیر اس بے بسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے گزر گئے۔ میں یونہی رسن بستہ گٹھری کی مانند ننگے فرش پر پڑا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں نے چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ میری آواز بیٹھ گئی۔ گلا دُکھنے لگا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ ناچار میں نے اپنی تنی ہوئی گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور ننگی اینٹوں والے فرش پر سر رکھ دیا۔

کسی نے سچ ہی کہا، نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اچانک کسی نے میرے منہ پر پانی پھینکا تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے دو خدام کھڑے تھے۔ لانبے تڑنگے، تنومند۔ جن کے بائیں کانوں میں بڑے بڑے بالے جھول رہے تھے اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ماؤزر تھے۔ جبکہ ایک کے دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی جسے میرے ہوش میں آنے کے بعد اس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ ذرا ہی دیر گزری تو دروازے پر مجھے دنیا کا منحوس و ملعون ترین شخص نظر آیا۔

لمبے سیاہ چغے میں ملبوس کبڑا شیطان، عامل عاروب میرے سامنے تھا۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں بلا کی خباثت تیر رہی تھی اور پتلے پتلے سیاہ رو بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ اور اسرار بھری مسکراہٹ۔

''لگتا ہے تم ہی اس لڑکی کے وہ عاشق بے مراد ہو جسے وہ بھلا بیٹھی ہے۔'' وہ تخم خنزیر میری طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

میں اسے خوں ناک نظروں سے گھور کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''ہاں.........شیطان کی اولاد! میں ہی وہ تیری موت ہوں جس کے خلاف تُو نے میرے دشمنوں کے کہنے پر اس معصوم لڑکی کی ذہنی رو پلٹ دی ہے۔''

''اوہ......... چچ، چچ.........تمہارے ساتھ میں نے بڑا ظلم کر دیا۔'' وہ جیسے میری بے بسی سے حظ اٹھاتے ہوئے پچکار کر بولا۔ پھر جیسے ایکا ایکی اس کی چھچھوندر جیسی آنکھوں میں معاندانہ چمک اُبھری اور اسی لہجے میں غرا کر بولا۔ ''مگر اب تمہیں اس لڑکی کو ہمیشہ کے لئے بھلانا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے قریب کھڑے اپنے مسلح کارپردازوں سے تحکمانہ کہا۔ ''اسے اسی حالت میں لے جا کر کسی گہری کھائی میں پھینک دو۔'' یہ بے رحمانہ حکم صادر کر کے وہ واپس لوٹ گیا۔ میرے منہ سے اس کے لئے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا۔

اس کے دونوں کارپردازوں نے مجھے بوری کی طرح اٹھا لیا اور زینے طے کرتے ہوئے نیچے پہنچے۔ پھر اس کے بعد مجھے ایک خچر گاڑی میں ڈال کر دور برف پوش پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں خچر گاڑی کے چوبی تختے پر بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں ایسی بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تن بہ تقدیر ہونے کے سوا چارہ ہی کیا تھا میرے پاس؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو اور بات تھی۔ بندشوں میں جکڑا میں ہاتھ ہلانے تک سے بھی ...ر تھا۔ سفر ....گویا موت کا سفر جاری رہا۔

موسم کے تیور پھر بدلنے لگے تھے۔ ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہو چکی تھی۔ انتہائی شمالی علاقہ ہونے کی ...ے یہاں بارش اور پل کے پل برف باری میں کہاں دیر لگتی تھی۔ خچر گاڑی ایک دشوار گزار کھائی کے ...یب آ کر رک گئی۔

میرا دل کانپنے لگا۔ موت کے تصور سے نہیں، اس ہولناک تصور سے کہ میرے بعد نگینہ کا کیا بنے گا؟ ...یا وہ ساری عمر اس مردود و ملعون عامل عاروب کی باندی بن کر زندگی گزارے گی؟......... کیا وہ ...ھیروں میں گم ہو جائے گی؟......... 'نہیں نادر علی! نہیں .... تم نے آج تک دلیری اور بہادری ...ے ان کڑے اور نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کچھ کرو .... کچھ کرو۔ بہادروں کی زندگی ...ہردوں کے لئے ہوتی ہے۔ نگینہ کو اس شیطان سے بچا لو۔' میرے ذہن نے اب تیزی سے بقا کی جنگ ...روع کر دی۔

خچر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بونداباندی سے میں شرابور ہو چکا تھا۔ ...ں نے اپنے دونوں پشت کی طرف بندھے ہوئے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دینا شروع کر دی۔ بارش ...ے پانی سے رسّی ذرا پھسلواں ہونا شروع ہو گئی تھی مگر ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے خچر گاڑی ...ے چوبی تختے پر لیٹے لیٹے زور آزمائی شروع کر دی مگر عبث۔ مجھے فوراً ان دونوں کارپردازوں نے کھینچ ...ر اٹھا لیا۔ نیچے گہری برف سے ڈھکی کھائی تھی۔ چشم زدن میں انہوں نے مجھے نیچے لڑھکا دیا......... بے ...یار میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ میں کسی گیند کی طرح برفیلی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میرا ذہن ...اریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر اچانک میرا سر کسی نوکیلی برفیلی چٹان سے ٹکرایا اور میں ہوش و خرد سے بیگانہ ...ا چلا گیا۔

ہوش آیا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میں جیسے برف کے گولے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے سر ...دو تین بار جھٹکے دیئے۔ چہرے سے برف جھٹکی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں بہت گہرائی میں جا ...را تھا۔ شاید برف سے ڈھکی ہوئی کھائی کی وجہ سے مجھے کچھ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ البتہ چہرے اور ...م کے دوسرے حصوں میں خراشیں ضرور پڑ گئی تھیں۔ میں نے زندگی بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر ...ا یہاں ادھ موئی حالت میں پڑا رہا۔ میرا جسم بری طرح دُکھنے لگا تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو ...ل گیا۔ یہ کھائی کا کوئی مسطح قطعہ تھا۔ ایک بالکل کم رقبے والا گوشہ۔ ورنہ تو اب بھی دائیں بائیں اس سے ...یادہ اور بھی کھائیاں تھیں۔ یعنی میں ابھی کم گہرائی میں گرا تھا اور یہ بھی خوش قسمتی کہ برفیلی کھائی کے ...وانی چھجے پر پڑا تھا۔ میں نے اپنی تگ و دو تیز کر دی۔ اچانک مجھے اپنی پشت پر ایک تیز چبھن کا ...ساس ہوا۔ میں نے بہ مشکل اپنے رسن بستہ وجود کا زاویہ بدلا اور مڑ کر دیکھا تو ایک نوکیلا اور کند چٹانی ...ار تھا جسے دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً ایک خیال اُبھرا۔ اگر میں دونوں ہاتھوں کی رسّی کو نوکیلے پتھریلے ...ار پر مسلسل رگڑتا تو میری یہ پیہم کوشش رنگ لا سکتی تھی۔ میں نے ذرا سرک کر پشت کو اس نوکیلے ابھار ...طرف کیا اور پھر ہاتھوں کی رسّی کو اس پر زور زور سے رگڑنے لگا۔ پہلے پہل تو مجھے یہ سہل کام محسوس ...تھا لیکن کچھ دیر بعد مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔ مگر میں نے بھی کوشش ترک نہ کی اور تھوڑے تھوڑے ...قفے سے یہی عمل پیہم دہراتا رہا۔ حتیٰ کہ رسّی ادھیڑ ڈالی اور پھر میں نے دونوں رسن بستہ ہاتھوں کو اور زور ...ا جھٹکے دینا شروع کر دیئے۔ بالآخر رسّی ٹوٹ گئی۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے بے اختیار آسودہ

سی گہری سانس خارج کی۔ اپنی کلائیوں پر پڑے نیل کا جائزہ لیا اور پھر دونوں پیروں کی رسّی کھول ڈالی۔

اب میرا دوسرا مسئلہ کھائی سے باہر نکلنا تھا۔ میں نے برفیلی بلندیوں کی سمت سر اٹھا کر دیکھا، پھر اطراف کا ایک بار پھر اچھی طرح گہری نظروں سے جائزہ لیا تو مجھے ایک ڈھلوان پر درز سی نظر آئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ درز زیادہ چوڑی نہیں تھی اور قدرے عمودی تھی۔ یعنی اوپر سے نیچے آ رہی تھی۔

چونکہ درز بہت تنگ تھی اور میرے لئے یہی سود مند تھا لہٰذا میں نے اس کی دونوں دیواروں پر ہاتھ پھنسائے دھیرے دھیرے اوپر کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔

بوندا باندی اگرچہ بند ہو گئی تھی لیکن برف باری اور بوندا باندی سے پھسلن سی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے اپنی کوشش ترک نہ کی۔ تھوڑی ہی اونچائی پر پہنچا تھا کہ میری سانس بری طرح پھول گئی۔ میں نے چند ثانیے رک کر پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ کم و بیش مجھے اوپر تک آنے کے لئے ایک گھنٹے سے زائد کا عرصہ لگا تھا۔

کھائی سے زندہ سلامت باہر آنے کے بعد میں پتھریلی زمین پر بے سدھ ہو کر گر پڑا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ جب حواس اور جسمانی تکان قدرے دور ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے نکلا اور آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

اب میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے سب سے پہلے اپنی مڑھی میں آیا۔ وہاں میرا نوجوان گائیڈ داور موجود نہ تھا۔ وہ شاید چلا گیا تھا۔ البتہ مڑھی کے مالک سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کرایہ مانگنے لگا۔ شکر تھا کہ میں نے تھوڑے بہت پیسے اپنے مختصر سے سامان میں چھپا رکھے تھے۔ میں نے اسے تین دنوں کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا۔ مجھے ریمبور (کالاش آگرم) میں آج کم و بیش چوتھا روز تھا۔ میں اپنے ہدف تک پہنچ تو گیا تھا اور اس بدبخت عامل عاروب سے بھی میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا مگر کامیابی سے ابھی دور تھا۔

عامل عاروب نے نگینہ کو اب ایک طرح سے یرغمال بنا لیا تھا۔ بے شک وہ پہلے اس کے ٹرانس میں آ کر اس کی طرف از خود کھنچی چلی گئی تھی لیکن بعد میں جب میں نے اس کے کمرے میں نقب لگا کر دونوں کی باتیں سنی تھیں تو نگینہ اس کے ٹرانس سے نکل چکی تھی۔ لیکن عاروب کی باتوں سے اس کے مکروہ عزائم کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ وہ رذیل اور تخم خنزیر شخص اب اس کے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے گم گشتہ کر دینا چاہتا تھا اور اسے اپنی کنیز بنانے کی گھناؤنی سازش کر رہا تھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر میرا دماغ جلنے لگا۔ دماغ کی شریانوں میں مجھے خون کا شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔ میں اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہوں گا کہ نگینہ کو میں بڑی مشکلوں اور بڑے کٹھن حالات میں یہاں تک لایا تھا کہ اس کیلاشی عامل عاروب کے ٹرانس سے اسے نجات دلاؤں گا۔ مگر یہاں پہنچ کر حالات اس کے برعکس ہو چکے تھے۔

میں نگینہ کے معاملے میں اب پولیس وغیرہ سے بھی مدد نہیں لے سکتا تھا کہ وہ خود میری تلاش میں تھی۔ کیونکہ میرے ازلی رقیب کبیر نے نگینہ کے اچانک غیاب پر اس کے باپ شاہ میر وغیرہ کو یہی بتایا ہو گا کہ نگینہ کو میں نے ہی اغواء کیا تھا۔ لیکن بہرحال اس نے انہیں یہ بتانے سے احتراز ہی برتا ہو گا کہ میں نگینہ کو درحقیقت کیلاش وادی میں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ بات صرف وہ اور اس کا یار غار کالا ناگ ہی جانتے تھے اس لئے ان دونوں نے اپنے گماشتوں کے ساتھ میرے تعاقب کی راہ اختیار کی تھی جس کی ایک مثال پشاور کے ہوٹل میں سامنے آ چکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گویا اب کسی وقت بھی میرا ان سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ ابھی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک ...ی مڑھی میں داور خان داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ذرا چونک سا گیا۔

"ارے داور! .... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر پوچھا تو وہ ...ر اُدھر دیکھنے کے بعد بولا۔

"صیب جی! آپ کے ساتھ وہ لڑکی تھی۔ کہاں چلی گئی وہ؟" اس کے نگینہ کے بارے میں استفسار کو ...فطری تجسس سمجھا تھا لہٰذا میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور کہا۔

"وہ بھی ادھر ہی ہے۔ تم بتاؤ .... کیسے آنا ہوا؟"

اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات اُبھرے۔ پھر وہ بولا۔

"صیب! مجھے کچھ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"تمہیں؟ .... مگر کیوں؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"صیب! کسی نے انہیں بتایا کہ پشاور سے آنے والے ایک مرد اور عورت کے لئے گائیڈ کی خدمات ...نے پیش کی ہیں۔ پھر وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آن پہنچے۔ میں واپس چترال نہیں گیا تھا، ادھر ...نے دور پار کے عزیزوں کے ہاں مقیم تھا۔ پھر وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے۔ مگر ...ب! درحقیقت وہ آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔" اس نے آخر میں جیسے ایک دھماکا کیا اور میں اس کی بات پر ...ی طرح ٹھٹکا۔ تب پھر اچانک مڑھی کا ٹاٹ ہٹا کر یکدم دو افراد اندر داخل ہو گئے .... میں انہیں ...کر جیسے سکتے میں آ گیا۔

...وہ دونوں میرے ازلی اور خون کے پیاسے دشمن کبیر اور کالا ناگ تھے۔ مگر دونوں غیر مسلح تھے اور ...ری طرف خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھ سے آ ٹکرائے ...ے۔ جبکہ وہ چترالی لڑکا داور خان گھبرا کر وہاں سے کھسک چکا تھا۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا نادر!" کالا ناگ نے درشت لہجے میں مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

"نگینہ کہاں ہے؟" اس بار کبیر نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے فوراً خود کو سنبھالا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے خوف زدہ ہوئے بغیر دانت پیس کر ...لا۔ "وہ تمہارا کیا بگاڑ رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتا دی جسے سن کر چند لمحوں کے ...لئے اس کے چہرے پر بھی گہری تشویش آمیز اُلجھن کے تاثرات عیاں ہونے لگے۔

"تمہیں اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ .... وہ بھی زبردستی۔ جواب دو؟" معاً کبیر نے ...لخ لہجے میں کہا۔

میں بھی اس سے مرعوب ہوئے بغیر درشت لہجے میں بولا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے نگینہ کو ...ہاں کیوں لانا پڑا۔ البتہ اب یہ فضول سوال بار بار مجھ سے مت پوچھنا۔" میری بے خوفی نے کبیر کے ...اتھ کھڑے میرے ماموں حیدر گل کے قاتل کالا ناگ کو بری طرح تلملا کر رکھ دیا اور وہ باؤلے کتے کی ...رح خونخوار لہجے میں بولا۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھے تم۔ اور تم نے جو بکواس کی ہے، ہمیں اس پر ...ل بھروسہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے لہو رنگ نظروں سے گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔ "کالا ناگ! میں تجھ جیسے رذیل ...لوں کے معاملے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہتا۔ جو سیدھی اور دوٹوک بات تھی، وہ میں نے بتا دی۔

تم لوگوں میں اگر ہمت ہے تو جا کر اس خنزیر صفت عامل عاروب سے مل لو۔ آخر کو وہ تم دونوں کا دوست ہے۔ ہوسکتا ہے وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے۔''

''زبان سنبھال کر بات کرنا در!..... میں چاہوں تو اسی وقت تیرا قصہ نمٹا سکتا ہوں۔'' میری جوابی کارروائی نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا۔

''خاطر جمع رکھو۔ ابھی تو تم نے میرا قرض چکانا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو کبیر یکدم جھنجلا کر کالا ناگ سے بولا۔

''یار! بس اب تم اپنی بحث چھوڑو۔ مجھے تو نگینہ کی فکر ہو رہی ہے۔ نادر جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ ورنہ نگینہ اس وقت یہاں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے پھر۔ میں اس کا ابھی خاتمہ کئے دیتا ہوں۔'' کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور پھر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ کبیر نے فوراً اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔

''یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟..... اب ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نے نادر کی بات نہیں سنی؟ وہ حرام زادہ عامل عاروب نگینہ کو اپنے ٹرانس میں لے کر زبردستی اپنی باندی بنانا چاہتا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے کبیر!'' کالا ناگ نے غرا کر کہا۔ ''مجھے اس کا قصہ نمٹانے دو۔ یہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ مجھے دو پستول۔''

''خود پر قابو رکھو کالا ناگ! یہ وقت آپس کے قضیئے نمٹانے کا نہیں ہے۔'' کبیر نے اسے ذرا تیز لہجے میں سرزنش کی۔ ''نادر علی نگینہ کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ گہری متانت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''نادر! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو یہ نگینہ کے ساتھ یقیناً اچھا نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بدبخت عامل عاروب نے نگینہ کا مکمل برین واش کر ڈالا تو یہ ہم سب کے لئے بہت برا ثابت ہوگا۔ اور خود نگینہ کے لئے بھی۔''

''میں نگینہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کبیر! کہ میں نے جو کہا، سچ کہا ہے۔'' کبیر کا رویہ چاہے مصلحتاً ہی سہی، بدلتا دیکھ کر میں نے معقول مگر مستحکم لہجے میں کہا تو کبیر کے چہرے کی تشویش مزید گہری ہوگئی۔ میں نے مزید کہا۔ ''کبیر! عاروب پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ یہاں اس کے پیروکاروں کی کمی نہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے مسلح غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ ہمیں نگینہ کی خاطر ہی سہی، آپس کا جھگڑا فراموش کر کے اسے عاروب کے شیطانی پنجے سے بچانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر یہ اہم کام ہمیں مل جل کر کرنا ہوگا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' کالا ناگ نے فوراً درشت لہجے میں کہا جو پہلے ہی کبیر کے میرے ساتھ مصلحت آمیز رویے پر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ ''یہ میرا جانی دشمن ہے۔ دھوکے سے ہمیں ہلاک بھی کر سکتا ہے۔''

''ہمیں ایک معاہدہ کرنا ہوگا۔'' کبیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''کیسا معاہدہ؟'' کالا ناگ بولا تو کبیر اس سے مخاطب ہونے کی بجائے مجھ سے بولا۔

''نادر! میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مل کر نگینہ کو اس عامل عاروب کی قید سے چھڑاتے ہیں تو تمہیں نگینہ کی آزادی اور سلامتی تک یہ لڑائی بھولنی ہوگی۔ کیا تمہیں یہ معاہدہ قبول ہے؟''

میں نے ایک نظر کالا ناگ کی طرف دیکھا پھر کبیر سے بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس پلے کو یہ سمجھا دو۔ اگر اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں معاہدہ فراموش کر ڈالوں گا۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' کبیر نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میرے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اپنی بات کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم دونوں کو ہی دھوکا دینے کی کوشش کرو۔''

''میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں خود یہی چاہتا ہوں کہ ہمیں مل کر نگینہ سے متعلق یہ نازک معاملہ حل کرنا چاہئے۔'' میں نے کہا تو کبیر کالا ناگ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کالا ناگ! تم نے سن لیا..... اب ہم کام کی بات کریں؟''

''ٹھیک ہے..... تمہیں منظور ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ چاہے عارضی طور پر ہی سہی، مجھے اسے برداشت کرنا پڑے گا۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن مجھے اس کے لہجے سے منافقت اور جھوٹ کی بُو صاف محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشیانہ تناؤ اور بغض کی چمک صاف عیاں تھی۔ میں بھی اس سے غافل ہو کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

''چلو..... اب آرام سے کہیں بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔'' کبیر نے کہا تو میں بولا۔

''میں عاروب کے غنڈوں کی نظروں میں آچکا ہوں۔ پھر وہ تم دونوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے۔ وہ ہمارے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں ادھر ہی بیٹھ کر کوئی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔''

''چلو ٹھیک ہے..... بیٹھو!'' وہ رضامند ہوتے ہوئے بولا۔ پھر فرش پر بچھی دری پر پالتھی مار کر بیٹھ گیا۔ کالا ناگ بھی ناک بھوں چڑھاتے وہیں براجمان ہوگیا۔ میں بھی ان کے سامنے دری پر بیٹھا تو اچانک ایک لڑکا ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ٹرے پر تین چھوٹی چھوٹی گرما گرم قہوے کی دھواں اُگلتی پیالیاں دھری تھیں۔

یہ مڑھی کے مالک کا بیٹا تھا اور یہ مہمان نوازی اسی نے کی تھی۔ بہرطور میں نے شکریہ کہہ کر لڑکے سے ٹرے لے لی اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ہم قہوے کی پیالی تھامے ہلکی ہلکی چسکی لینے لگے۔

یہ صورت حال جتنی عجیب تھی، اتنی ہی دلچسپ بھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر ایک مشترکہ مفاد نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ تاہم مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میں ایک حد تک ہی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کبیر اور کالا ناگ نگینہ کو قبضے میں کرتے ہی میرا کام تمام کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کریں گے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم ایک دوسرے سے محتاط تھے۔ میرا ان سے مصالحت کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ مجھے نگینہ کے سلسلے میں کبیر یا کالا ناگ کی مدد درکار تھی، تاہم یہ بھی درست تھا کہ میں نے محض نگینہ کی بھلائی کی خاطر ان وحشیوں سے مصالحت کی تھی۔ البتہ حقیقت یہ بھی تھی کہ نگینہ اس وقت واقعتاً نہایت خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھی اور میں اپنی تمام تر توجہ اسے صرف اور صرف اس کٹڑے عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانے پر ہی مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ سے ٹکراؤ کی صورت میں میری توجہ بٹ جاتی جس کا فائدہ یقیناً شیطان عاروب کو ہوتا۔ اس میں ہم دونوں کا ہی نقصان تھا۔

جہاں تک ہمارے مشترکہ مفاد کا تعلق تھا تو وہ صرف میرے اور کبیر کے درمیان تھا۔ کالا ناگ اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا، مجھ سے انتقام۔ اور یہی سبب تھا کہ اسے میری اور کبیر کی یہ ''وقتی مصالحت'' ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کالا ناگ کبیر اور اس کے باپ نظر حیات کا ایک زرخرید کتا بن چکا تھا اور وہ یہ ''کڑوا گھونٹ'' پینے پر مجبور تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی بھی تھی۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ نگینہ کو اپنی عبادت گاہ میں دیکھنے کے بعد اس کٹڑے عامل عاروب کی نیت اچانک بدل گئی۔ وہ اب اس کا مکمل برین واش کر کے سب کی طرف سے بالکل کورا کر دینا چاہتا تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ نگینہ اس کے ساتھ اس کے عمل سے بھی چھٹکارا حاصل کر کے ٹرانس سے آؤٹ ہو جائے۔ جبکہ یہ بات کبیر کے مفاد میں ہرگز نہیں تھی۔ وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ نگینہ پر کیا گیا عمل ختم ہو اور وہ میری طرف ملتفت ہو جائے۔ تاہم نگینہ کا کلی برین واش اس کے لئے بھی نقصان دہ تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچ کر الجھنے کے باوجود قسمت کی ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا کہ کس طرح ہم دو جانی دشمن ایک مفاد کی خاطر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

''کیا سوچنے لگے؟'' کبیر کی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے واپس کھینچ لیا۔ وہ دونوں اپنی قہوے کی پیالیاں ختم کر چکے تھے جبکہ میری پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں وہ خوش ذائقہ اور تروتازہ کر دینے والا نفیس قہوہ ختم کرنے کے بعد پیالی سامنے دری پر رکھ دی، پھر کبیر سے بولا۔

''میرے ذہن میں ایک لائحہ عمل آ رہا ہے۔'' کبیر غور سے میری بات سننے لگا۔ جبکہ کالا ناگ کے انداز و اطوار سے بیزاری اور بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

''ہمارا مقصد صرف نگینہ کو ہی عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں عامل عاروب کو بےغمال بھی بنانا ہوگا۔ کیونکہ نگینہ یقیناً اب تک اس کے کلی ٹرانس میں آ چکی ہوگی اور اس کے اس ٹیلی پیتھک عمل کو صرف عاروب ہی ختم کر سکتا ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ خبیث ہمیں بھی اپنے شیطانی ٹرانس میں لے لے۔'' کبیر نے اپنی دانست میں زوردار نکتہ نکالا تھا مگر میرے پاس اس کا جواب موجود تھا۔

''وہ ہمارے قابو میں ہوگا۔ لہٰذا اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلی بار جب میرا اس کا سامنا ہوا تھا تو اس نے مجھے بھی ٹرانس میں لانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے فوراً اس کے

چہرے سے اپنی نظریں ہٹا لی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، اس کا ٹیلی پیتھی یا ٹرانس میں لانے کا عمل قوتِ ارادی سے کمزور بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے باآسانی ناکام بنا دیں گے۔''

''لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم اسے نگینہ کے بارے میں کیسے مجبور کریں گے؟.....وہ اگر اس پر اپنا عمل کرنے پر رضامند نہ ہوا تو پھر؟'' کبیر نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔

''اس کے لئے ہمیں اس پر جبر کرنا ہوگا۔ ویسے بھی وہ ہمارے قبضے میں ہوگا اور اسے بتا دیا جائے گا کہ ہم سے اس کی جان صرف اسی صورت میں چھوٹ سکے گی اگر وہ نگینہ کی یادداشت بحال کر دے وگرنہ.....!'' میں نے اس کے خدشے کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....سب سے پہلے نگینہ کو اس عامل عاروب سمیت اپنے قبضے میں لینا ہوگا۔ اس کے بعد.....'' کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کالا ناگ نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔

''تم لوگ نہ جانے کن چکروں میں ہو۔ میرے پاس اس مسئلے کا آسان حل موجود ہے۔''

اس کی مداخلت پر ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کبیر نے بے ساختہ پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''عاروب کو گولی سے اُڑا دیا جائے۔ سارا قصہ خود ہی نمٹ جائے گا۔'' ہم دونوں اس کی بات پر مزید چونک اٹھے۔ یہ ایسی بات تھی جس کا کبیر تو کیا، خود مجھے بھی خیال نہ آیا تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟'' کبیر نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں پُرجوش ارتعاش تھا۔

''یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اگر خدانخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو ہم ساری عمر کے لئے نگینہ کو کھو دیں گے۔''

''نہیں.....پھر ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہئے۔'' کبیر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ ''ہم نگینہ کے معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتے۔'' درحقیقت خود مجھے بھی عاروب کے اس پراسرار عمل کی نوعیت کا ٹھیک طرح سے علم نہ تھا۔ کیا خبر اس کے مرنے کے بعد نگینہ ساری عمر کے لئے ہم سے بیگانہ ہو جاتی۔ آخر کسی حادثاتی واقعے میں بھی تو انسان اپنی یادداشت گنوا دیتا ہے اور کسی کو نہیں پہچان پاتا۔ عین ممکن تھا کہ نگینہ کے لئے عاروب کا وہ عمل سائنسی نوعیت کا کوئی ایسا ہی حادثہ بن جاتا۔ چنانچہ ہم دونوں نے ہی کالا ناگ کے خیال کو رد کر دیا۔

''یہ کام ہمیں نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ اس کے بدمعاش حواری اور پیروکار ہماری جانوں کے دشمن بن جائیں گے۔'' میں نے کہا تو کبیر تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''تو پھر یہ کام ہمیں رات کی تاریکی میں ہی انجام دینا ہوگا۔''

''یہ مناسب رہے گا۔'' میں نے تائید کی۔

ان لوگوں کے ساتھ چار مسلح ساتھی بھی تھے جو یقیناً کالا ناگ کے گروہ کے ارکان ہوں گے۔ میرا دل جانے کیوں کالا ناگ کی طرف سے عجیب سی بےچینی کا شکار تھا۔ اس کے گم صم سے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ہمارے خلاف کوئی گل کھلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میری سوچ غلط ہوتی مگر موجودہ صورتِ حال میں میرا اس طرح سوچنا فطری تھا۔ اگرچہ حقیقت یہی نہیں تھی کہ مجھے نہ صرف کالا ناگ بلکہ کبیر لوگوں سے ہی محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ کالا ناگ کی طرح کبیر بھی میرا ہرگز خیر خواہ نہیں تھا۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے باپ کا جانی دشمن تھا اور وہ میرا مسلمہ رقیب تھا۔

رات ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ سارے معاملات طے ہو چکے تھے اور اب ہمیں کارروائی کے وقت کا انتظار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کالا ناگ کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی زبردست ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کی یہ کیفیت کبیر کی نظروں سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ تاہم ہم دونوں نے اسے مخاطب کئے بغیر پیش آمدہ مہم پر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے بہ مشکل ایک گھنٹہ گزارا ہوگا کہ اچانک کالا ناگ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چونکے۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اسرار بھرے سناٹے اترے ہوئے تھے۔ وہ میری جانب ہی سنسناتی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خاصی دیر کی اپنی اندرونی کشمکش کے بعد اچانک ہی کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ یہ محسوس کرتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کبیر نے بے اختیار اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''کبیر! میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' معاً کالا ناگ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟..... یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گیا؟'' کبیر کے لہجے میں پریشانی اور حیرت تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں بھی انجانا خطرہ محسوس کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔

''بس مجھے اس مہم میں دشمن کا ساتھ پسند نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کبیر سے بولا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ''کبیر! میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا، نادر علی سے الگ ہو جاؤ۔ ہم خود ہی یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟..... اس وقت ہم آپس کے جھگڑوں میں پڑ کر اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں گے اور یہ حقیقت نادر بھی اچھی طرح جانتا ہے۔'' کبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے پہلے ایک بات کا جواب دو کبیر!'' کالا ناگ جس بات پر کافی دیر سے اندرونی کشمکش میں مبتلا تھا، بالآخر اس کا اظہار کرتے ہوئے کبیر سے بولا۔ ''بالفرض ہم نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑا لیتے ہیں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ نگینہ کس کی ملکیت ہوگی؟..... تمہاری یا نادر کی؟''

اس کی بات پر کبیر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میری سوچ کے مطابق کالا ناگ واقعی کالا ناگ تھا۔ زہر کو زہر ہی جانتا تھا۔ وہ میرا جانی دشمن تھا اور وہ مجھ سے نباہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کبیر کی بات دوسری تھی۔ دشمن وہ بھی تھا لیکن چونکہ ہمارے بیچ نگینہ تھی اس لئے وہ مجھ سے مفاہمت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

کبیر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کالا ناگ نے گویا گرم لوہے پر ایک اور چوٹ لگائی۔

''کبیر! نادر علی ہمارے ساتھ بہت بڑی چال چل رہا ہے۔ ہمارے کاندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تم خود سوچو، عاروب کے عمل سے نجات پاتے ہی نگینہ اس کی طرف ملتفت ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھ ہرگز جانا نہیں چاہے گی۔''

اس کی بات پر میں نے بھی لب کشائی کرنا ضروری سمجھا۔

''مجھے کسی کی مدد کی پرواہ ہے نہ ضرورت۔ رہی بات نگینہ کے میری طرف ملتفت ہونے کی تو اب تک وہ اس خبیث عامل عاروب کے ٹرانس میں آ کر ہم سب کو ہی فراموش کر چکی ہوگی۔''

میری بات پر کالا ناگ کے بدہیئت سیاہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی اور وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر زہر خند سے بولا۔

''نادر علی! تم بات کو گھما پھرا کر اُلجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا

ہدف صرف نگینہ کو عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے بلکہ اس کے ٹرانس سے اسے ذہنی طور پر آزاد بھی کرنا ہے۔ چلو، ہم کسی طرح عاروب کو گن پوائنٹ پر مجبور کر کے یہ کام کرا لیں گے۔ لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ظاہر ہے، نگینہ عاروب کے ٹرانس سے نکلنے کے بعد خود بخود تمہاری طرف ملتفت ہو جائے گی۔'' پھر وہ کبیر کی طرف مُڑا۔ ''اب تم خود ہی سوچو کبیر! کہ سارے کھٹ راگ میں کس کا فائدہ ہوا؟ تمہارا یا نادر علی کا؟''

کالا ناگ کو آج تک میں نے صرف دھواں دھار گولیاں برسانے والا، سفاک دشمن ہی جانا تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ حد درجہ زود فہم اور مکار انسان تھا۔ اس نے دور اندیشی سے کام لے کر موجودہ صورتِ حال کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا۔ کبیر اُلجھ کر رہ گیا تھا، تاہم وہ بولا۔

''ہم عاروب کو مجبور کریں گے کہ وہ اسی حالت میں نگینہ کو ہمارے ساتھ کر دے۔''

''اب تم میری بات سمجھے ہو۔'' کالا ناگ نے پُرجوش مکاری سے کہا۔ ''یہ یقیناً نادر علی کے مفاد میں نہ ہو گا اور عین وقت پر یہ کوئی اڑچن پیدا کر دے گا۔ تو کیوں نہ ہم اسے ادھر ہی جہنم واصل کر کے خود ہی یہ مہم سر کر لیں؟'' اس کی سفاکانہ دلیل پر میری رگوں میں خون کی گردش یکدم تیز ہوگئی۔ صورت حال کی اچانک تبدیلی نے مجھے یکلخت محتاط کر دیا تھا۔ اس کے ارادے کو بھانپتے ہی میں نے اپنا وفادار میگارد باہر نکال لیا۔ کالا ناگ اور اس کے چاروں ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان لیں۔ میری کنپٹیوں میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی۔ مڑھی کی محدود فضا یکدم ہی کشیدہ ہوگئی تھی۔

''کالا ناگ!..... رک جاؤ۔ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟..... ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔'' کبیر نے اسے روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''خود کو سنبھالو کالا ناگ! ہم اس وقت بہت ہی حساس مقام پر موجود ہیں۔ اس طرح سب کی نظروں میں آ جائیں گے۔''

''تو پھر اس سے حساب کس طرح بے باق کیا جائے؟'' کالا ناگ نے بہ دستور پُرغیظ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کبیر سے کہا۔

''کر لیں گے اس سے حساب اپنا بے باق۔ یہ ابھی ادھر ہی ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔'' کبیر نے بالآخر جھلا کر کہا۔ چند لمحے تک کچھ سوچنے کے بعد وہ ایک کمی ہمکاری کرتے ہوئے کالا ناگ سے بولا۔ ''تمہاری اگر یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم نادر کو اپنے ساتھ اس مہم میں شامل نہیں کریں گے۔ یہ اپنی کوشش کرے گا اور ہم اپنی۔'' یہ کہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''نادر! ہمارے درمیان طے پانے والا معاہدہ اسی لمحے منسوخ سمجھو۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اس مہم کے دوران اگر ہمارا ٹکراؤ ہوا، جو لازماً ہوگا تو تمہاری زندگی کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے..... پھر میں بھی تم لوگوں سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔'' میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ کالا ناگ کی آنکھوں میں خونخوار چمک مزید گہری ہوگئی۔

اس کے بعد وہ دونوں اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ مڑھی سے نکل گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بھی مڑھی سے باہر نکل آیا اور انہیں وہاں سے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ وادی میں شام کی کجلاہٹ دھیرے دھیرے اُترنے لگی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں واپس مڑھی کے اندر آ گیا۔

بدبخت کالا ناگ کے اچانک رائے بدلنے سے سارا کھیل بگڑ گیا تھا جس سے صورتِ احوال مخدوش بلکہ مزید گمبھیر ہوگئی تھی۔ میں نے کبیر سے یہ عارضی مفاہمت صرف نگینہ کے لئے مجبور ہو کر کی تھی اور کبیر کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کالا ناگ کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دو مخالف گروپوں کی صورت میں ہمارا عامل عاروب سے ٹکرانا خود نگینہ کے لئے ازحد خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ بہت خطرناک

صورتِ حال تھی اور مجھے اس پر قابو پاتے ہی نگینہ کے لئے کچھ کرنا تھا اور ان مردودوں کا بھی سامنا کرنا تھا۔ گویا میرے لئے یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ میں خاصی دیر تک اسی پریشانی میں بیٹھا رہا۔ پھر ارادہ کر کے اٹھا اور عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مذکورہ عبادت گاہ آبادی کے جنوبی مضافات میں تھی۔ یہ علاقہ خاصا ویران اور سنسان تھا۔ میں اپنی دُھن میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ چند مقامی لوگوں کے درمیان مجھے دو ایسے افراد کی جھلک اس وقت نظر آئی تھی جب میں نے یونہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بظاہر یونہی اِدھر اُدھر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سیدھا چلنا شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں کو میں بہر حال پہچان چکا تھا۔ وہ دونوں کالا ناگ کے ان چار ساتھیوں میں سے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً ہی ایک منصوبے نے سر اُبھارا۔ میں بظاہر بے پرواہانہ انداز میں اپنی ہی دُھن میں مگن تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ آبادی سے قدرے دور نکل آنے کے بعد میں اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اچانک ہی ایک طرف مڑا اور فوراً ہی چٹان کی آڑ لیتے ہوئے گھات لگا کر دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ دونوں اس وقت میرے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ یہ طے تھا کہ ان دونوں کو میرے پیچھے لگا کر کالا ناگ خود کبیر اور ان دونوں ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ کچھ دیر بعد میں نے تھوڑا سا سر اُبھارا تو چونک گیا۔ وہاں کوئی ذی نفس نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ دونوں میرے پیچھے آتے آتے کدھر نکل گئے تھے؟..... میں اسی اُلجھن میں تھا کہ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور مجھے ان کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دونوں مجھ پر بیک وقت پل پڑے تھے اور مجھے زمین پر گرا ڈالا۔ میں نے خود کو ان کی گرفت سے ایک جھٹکے سے آزاد کیا اور ایک حملہ آور کی ٹھوڑی پر بھرپور مُکا رسید کر دیا۔ وہ گھٹی گھٹی کراہ کے ساتھ اُلٹ گیا۔

دوسرے نے اپنی جیب سے پستول نکالنا چاہا مگر اس کے پیٹ پر پڑنے والی میری لات نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ڈکراتا ہوا چٹان سے ٹکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں پہلا والا اپنی جیب سے پستول نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے بلاتوقف مجھ پر گولی چلا دی مگر میں اس سے پہلے جھکائی دے چکا تھا۔ عین اسی وقت دوسرے ساتھی نے ایک بے وقوفانہ حرکت کر ڈالی۔ وہ یقیناً پیٹ پر لگنے والی ضرب کے نتیجے میں بری طرح بوکھلا چکا تھا اس لئے وہ ذرا سا سنبھالا لے کر بری طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں تو گویا اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے پھرتی سے اسے دبوچا اور دھکیلتا ہوا دوسرے ساتھی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم تینوں ہی گر پڑے۔ میں نے گرتے گرتے بھی پہلے والے کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں نے زمین پر گرتے ہی لوٹ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''خبردار!..... کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی سے اُڑا دوں گا۔'' میں نے کرخت آواز میں کہا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

''تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر لو۔ جلدی..... میرے پاس وقت کم ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں تحکمانہ انداز میں کہا تو دونوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لئے۔ میں نے انہیں دوسری طرف منہ پھیرنے کو کہا۔ اس کے بعد دونوں کی جیبوں کی تلاشی لی تو مزید ایک ایک خنجر اور کچھ فاضل راؤنڈ برآمد ہوئے۔ میں نے یہ ساری چیزیں قبضے میں لے کر ان دونوں کی ایک ایک ٹانگ پر باری باری گولی چلا دی۔ گولیوں کے دھماکوں کی آواز وادی میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ وہ کرب انگیز کراہ کے ساتھ زمین بوس ہوتے گئے اور میں بڑے آرام سے آگے بڑھ گیا۔ ان کے دہانوں سے برآمد ہونے والی مغلظات کی بازگشت مجھے دور تک سنائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتی رہی تھی۔ میں عبادت گاہ کے علاقے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اب کسی بھی وقت میرا عامل عاروب اور کالا ناگ وغیرہ سے ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

وادی میں شام گہری ہونے لگی تھی جو بتدریج رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر نگینہ کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ جانے کس حال میں ہو گی۔ خود سے بیگانی ہو گی یا پھر اپنے نصیبوں پر رو رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ وہ بڑے دردناک اور عذاب ناک لمحات سے گزر رہی تھی۔ اسے یاد کر کے میرے دل میں آرے سے چل رہے تھے۔ سینے کی ہلچل طوفانوں میں بدلنے لگی تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک میری نگاہ مشعل بردار جلوس پر پڑی جو مشرقی سمت سے آ رہا تھا۔ اس کا رخ عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف تھا۔ ان سب نے سیاہ لانبے چغے پہن رکھے تھے حتیٰ کہ سر اور چہرے بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً عاروب کے گروہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مگر یہ اس کے اور پیروکاروں سے وضع قطع میں ذرا مختلف نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ کوئی دوسرا گروپ تھا۔ کوئی خاص ٹولہ۔ ان کے ایک ہاتھ میں چیڑ کی مشعلیں تھیں تو دوسرے ہاتھ سے ایک ہڈی تھامی ہوئی تھی۔ یہ ہڈی خاصی بڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بڑے جانور کی ران اور پیڑو کی ہڈی تھی۔ یہ ٹولہ میرے محتاط اندازے کے مطابق بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ وہ لوگ فی الوقت عبادت گاہ سے ذرا دور تھے۔ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال اُبھرا اور میں چھپتا چھپاتا ان کے راستے پر آ کر ایک آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب یہ ٹولہ ادھر سے گزرنے والا تھا۔ پھر جب وہ میرے بالکل قریب سے گزرنے لگا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی ٹولے کا آخری فرد میرے قریب سے گزرنے لگا، میں چیتے کی سی مستعدی اور خاموشی سے عقب میں اُبھرا اور اسیگر دن سے جھپٹ کر یکدم آڑ میں کھینچ لایا۔ اس نے تلملا کر عجیب وضع کی ہی سے مجھ پر وار کرنا چاہا مگر میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے مخصوص شکنجے میں اس کی گردن جکڑ کر جھٹک دیا۔ کڑاکے کی آواز اُبھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے پر اس نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں نے جلدی جلدی اس کا سیاہ چغہ اُتارا اور خود پہن لیا۔ پھر زمین پر گری جلتی ہوئی مشعل اور وہ عجیب وضع کی ہڈی ہاتھوں میں اٹھا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے اس سیاہ پوش ٹولے میں شامل ہو گیا۔ اب میرا چہرہ سیاہ چغے کے ''گھونگھٹ'' میں چھپ گیا تھا۔ ذرا دیر بعد میں ٹولے سمیت عامل عاروب کی مخروطی چھت والی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں بڑی پکڑ دھکڑ مچی ہوئی تھی۔ قسمت سے عاروب کی شہ رگ تک پہنچنے کے لئے جو راستہ ملا تھا، میں اسے گھونا نہیں چاہتا تھا۔ عبادت گاہ میں داخل ہونے کے بعد یہ مخصوص ٹولہ چبوترے کے سامنے قطار اندر قطار مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ میں درمیانی صف میں کھڑا تھا۔ چغے کے گھونگھٹ سے سامنے چبوترے پر میری نظریں جمی ہوئی تھیں جہاں اسی عجیب و غریب اور بدوضع مورتی کے قریب منحوس عاروب کھڑا تھا۔ نگینہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ عاروب کے چھ لحیم شحیم خوفناک صورتوں والے خاص محافظ مستعدی کے ساتھ اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ معاً عاروب نے ایک نظر اس مخصوص سیاہ پوش ٹولے پر ڈالی اور اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے گونج دار آواز میں کہا۔

''مقدس ''دابولامینزی'' کے پجاریو! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم لوگوں کی خاص توجہ اور محنت سے ہمارے پیروکاروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ جب تک پوری وادی کیلاش کے لوگ مقدس دابولامینزی کے دائرے میں نہیں آ جاتے، ہمارا مشن جاری رہے گا۔ ہم جانتے ہیں، کیلاش وادی کا سردار آگر موشی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس نے ہمیں اس وادی سے بے دخل کرنے کی خاطر ہر قسم کی کوششیں کر کے دیکھ ڈالیں مگر مقدس دابولامینزی نے اس کی ہر سازش ناکام بنا دی ہے۔ اس لئے تم ذرا بھی نہ گھبرانا اور اسی طرح پوری وادی کے لوگوں کو مقدس دیوتا دابولامینزی کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آگاہ کرتے رہنا کہ وہ جلد از جلد اس کے پیروکار بن جائیں۔ ورنہ بہت جلد پوری وادی پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اس عذاب سے صرف مقدس دابولامینزی کے پیروکار ہی بچ پائیں گے۔ جو اس کے حلقہ اثر سے باہر ہوگا، وہ فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سرزمین پر صرف اور صرف مقدس دابولامینزی ہی کی حکمرانی ہے، جو طاقت کا دیوتا ہے۔''

وہ اپنی بکواس ختم کر کے خاموش ہوا تو مخصوص سیاہ پوش ٹولے میں سب سے اگلی قطار میں کھڑے ایک سیاہ پوش نے مؤدبانہ لہجے میں عامل عاروب سے کہا۔ ''کیلاشی سردار آگرموشی کی ہمارے خلاف چیرہ دستیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس نے اب باقاعدہ کچھ لوگ مخصوص کر دیئے ہیں جو کیلاشی وادی کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب ہماری کوششیں اگرچہ تیزی اختیار کر چکی ہیں لیکن افسوس کہ کیلاشی سردار آگرموشی کے مخصوص افراد نے ہماری ان کوششوں اور کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں بہ غور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ عامل عاروب نے غور سے اپنے پیروکار کی بات سنی، اس کے بعد وہ بلند آواز سے بولا۔

''ٹھیک ہے..... ہم آج مقدس دابولامینزی کے آگے ایک بھینٹ چڑھائیں گے اور اس سے کیلاشی سردار آگرموشی کو نیست و نابود کرنے کی التجا کریں گے۔''

''ہم بھینٹ دینے کو تیار ہیں اے مقدس دابولامینزی کے پیروکار! ہم تیار ہیں۔'' سیاہ پوش مخصوص ٹولے نے بیک زبان ہو کر بلند آواز سے کہا تھا۔

''نہیں۔'' عامل عاروب نے اچانک گونج دار آواز میں کہا۔ ''مقدس دابولامینزی ہماری بھلائی، کامیابی اور ہماری زندگیوں کے تحفظ کی خاطر تو ہماری اپنی قربانی یا بھینٹ قبول کرتا ہے لیکن کسی دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لئے اسے کسی باہر کے آدمی کی بھینٹ چڑھانا ہوگی۔''

''اے مقدس دابولامینزی کے پیروکار! ہمیں حکم کرو۔ ہم وادی سے باہر کا کوئی آدمی پکڑ لاتے ہیں۔'' اگلی صف میں کھڑے اسی سیاہ پوش پیروکار نے عاروب سے مؤدبانہ کہا۔

''نہیں..... یہ بھینٹ ایک خوبصورت اور جوان دوشیزہ کی ہو گی جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔'' عامل عاروب نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور میری کنپٹیاں بری طرح سنسنانے لگیں۔ میرا خیال فوراً نگینہ کی طرف چلا گیا تھا۔ معاً اس مردود عاروب کی دوبارہ آواز ابھری۔

''اور یہ بھینٹ ابھی اور اسی وقت چڑھائی جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ اس کے گرد کھڑے مستعد محافظوں میں سے دو فوراً حرکت میں آئے اور اوپری منزل تک جانے والے گردشی زینے کی چوکھٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچنا شروع ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں خبیث یقیناً نگینہ کو لینے کے لئے ہی گئے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ نگینہ کو دبوچے چبوترے پر لے آئے۔ نگینہ کو دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔

وہ بری طرح ہراساں نظر آ رہی تھی۔ مجھے ایک تسلی تو ہوئی تھی کہ وہ مکمل طور پر عاروب کے ٹرانس میں نہیں آئی تھی۔ میری نظریں چبوترے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، عامل عاروب یک ٹک نگینہ کے چہرے کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کے انداز پر ایک پُراندیش خیال سے میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کہیں یہ خبیث مکمل طور پر تو نگینہ کو اپنے ٹرانس میں نہیں لے رہا؟ تاکہ وہ بہ رضا و رغبت اپنی بھینٹ اس دابولامینزی کی مورتی کو دینے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے درانہ وار حملہ کرنے کا سوچا۔ میں اپنے میگارد اور کالاناگ کے ان دونوں

ہرکاروں سے چھینے ہوئے پستولوں سے پوری طرح مسلح تھا۔ فاضل راؤنڈز بھی میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ارتعاش پر قابو پایا اور دائیں ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ ابھی پستول والا ہاتھ میرے سیاہ چغے کے اندر ہی موجود تھا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، اچانک ہال میں نگینہ کی تیز چیخ ابھری اور وہ کھڑے کھڑے وہیں چبوترے پر گر پڑی۔ میں پوری جان سے لرز اٹھا۔ نگینہ کو یوں اچانک بے سدھ ہو کر چبوترے پر گرتا دیکھتے ہی میرے اندر ہولناک طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر مجھے مزاحمت کرنے سے روک رہا تھا۔ اسی وقت عامل عاروب کی آواز ابھری۔

''اس خوب صورت دوشیزہ کی قربانی مقدس دابولامینزی نے قبول کر لی ہے..... ہم نے اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا تاکہ یہ مکمل طور پر ایک عام اور معصوم دوشیزہ کی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔'' مجھے اس کی بات پر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کا یہ کہنا کہ 'ہم نے اب اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا' مجھے بری طرح چونکا گیا تھا۔ 'کیا اس مردود نے مجھ پر نادانستگی میں یہ احسان کر دیا تھا کہ نگینہ..... میری نگینہ اب اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے بھی آزاد ہو چکی تھی؟ یعنی یعنی کیا نگینہ کے دل و دماغ میں اب میری حکومت دوبارہ قائم ہو چکی ہے؟ اور..... اور کیا اب میری گم گشتہ دنیائے محبت مجھے مل گئی ہے؟'

ایسے کئی مسرت انگیز خیالوں اور خوش امیدیوں نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ نگینہ شاید اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے آزاد ہونے کے ردعمل میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں دم بہ خود کھڑا سامنے چبوترے پر بے سدھ پڑی نگینہ کو تکے جا رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ نگینہ کے وجود نے ہلکی سی جنبش کی تھی۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب آج سے کروڑوں سال پہلے والا ''بگ بینگ'' ہوگا اور میری کائنات، میری دنیا ''وفائے کن'' سے وجود میں آ جائے گی۔ اور پھر یہی ہوا۔

نگینہ نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے جو لفظ ادا کیا، وہ میرا نام تھا۔

''نادر!..... نادر!..... تت..... تم کہاں ہو؟'' وہ ہولے ہولے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ اس خوب صورت پکار نے میرے وجود کی گہرائیوں تک کو اک عجیب مسرت سے معمور کر دیا تھا۔ سرشاری، خوشی اور مسرت کے احساس نے جیسے میرے پورے وجود پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کیفیت نے میرے اندر کے ابلتے جوش کو بھی ہوش کی راہ دکھلا دی تھی۔ اب مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ اگرچہ حالات ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' کے مصداق تھے مگر اس کے باوجود میں ہوش و خرد سے کام لینا چاہتا تھا۔ نگینہ نے ہوش میں آتے ہی بے اختیار دل سے مجبور ہو کر مجھے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ عامل عاروب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ ادھر نگینہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اس کے قدم ڈگمگائے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی نیند سے جاگی ہو۔ عامل عاروب نے اپنے دو گرگوں کو خفیف سا اشارہ کیا۔ دونوں نے حرکت کی اور نگینہ کو ایک بار پھر بازوؤں سے پکڑ کر دبوچ لیا۔ نگینہ چیخنے چلانے لگی اور ہراساں نگاہوں سے اس ماحول کو تکنے لگی۔ اس کی نگاہ بدوضع مورتی پر پڑی۔

''میں کہاں ہوں؟..... تت..... تم لوگ کون ہو؟ مجھے بتاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔'' نگینہ ہسٹریائی انداز میں چلائی تو عامل عاروب سنگدلانہ نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

''خاموش ہو جاؤ لڑکی! تمہیں اب مقدس دیوتا دابولامینزی پر قربان کیا جانے والا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ مقدس دابولامینزی نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔''

نگینہ نے جو یہ سنا تو خوف و دہشت سے کانپ کر رہ گئی۔

"یہ..... یہ سب کیا ہے؟..... مم..... میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو..... آہ..... نادر!..... تم کہاں ہو؟" وہ پھر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

'نادر علی! تم کب تک خاموش تماشائی بنے کھڑے رہو گے؟..... تمہاری نگینہ، تمہاری محبت تمہیں پکار رہی ہے۔ جاؤ، اپنی نگینہ کو ان منحوس و مردود شیطانوں سے بچالو۔ بڑھو اور.....' میرے اندر کوئی چیخنے لگا۔

"اسے مقدس دابولا میزی کے قدموں میں لے آؤ اور زنجیروں سے جکڑ دو۔" عاروب نے حکم دیا۔

وہ دونوں گرگے نگینہ کو مورتی کی طرف گھسیٹنے لگے۔ میں غیر محسوس انداز سے دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف کھسکنے لگا۔ آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ وہاں سے چبوترہ نزدیک تھا۔ چبوترے پر میرے عین مقابل عاروب کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اسے ہی تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ دابولا میزی کے پیروکاروں کے روحانی پیشوا کو گن پوائنٹ پر لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اور جان لیوا حد تک خطرناک رسک تھا۔ مگر میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہ تھی۔ میں جست لگا کر با آسانی چبوترے پر چڑھ کر عامل عاروب کو گن پوائنٹ پر لے سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر چغہ اتار پھینکا اور چبوترے پر چھلانگ لگا کر عامل عاروب پر جھپٹا۔ کبڑا ہونے کے باعث اس کی گردن پہلے ہی جھکی ہوئی تھی اس لئے میں نے با آسانی اپنے بائیں بازو کے شکنجے میں اس کی گردن جکڑ کر پستول کی نال اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ یہ کام میں نے پل کے پل نمٹا دیا تھا۔ جواب میں کئی وحشیانہ چیخیں ابھریں۔ چبوترے پر موجود عاروب کے مستعد محافظ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ میں نے دھاڑ کر کہا۔

"خبردار!..... کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے عاروب کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ ڈالتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ محافظوں کو نگینہ کو چھوڑنے کا حکم دے۔ ادھر نگینہ مجھے دیکھ کر گویا کھل سی اٹھی تھی۔ عاروب کو میرے خونخوار ارادے کی خطرناکی کا احساس ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے پھنسی پھنسی آواز میں ان دونوں گرگوں کو حکم دیا کہ نگینہ کو چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے فوراً نگینہ کو چھوڑ دیا۔

نگینہ مسرت سے چیختی ہوئی میری جانب بڑھی۔ "نادر.....!" وہ میرے ساتھ آن لگی۔ ہال میں موجود عاروب کے پیروکاروں کے چہرے طیش اور غیظ و غضب سے سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرے اس ناقابل معافی جرم پر میری تکا بوٹی کر ڈالیں۔ لیکن اس وقت ان کے روحانی پیشوا کی جان خطرے میں تھی، جس نے انہیں اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اپنے اس روحانی پیشوا کی زندگی چاہتے ہو تو سب لوگ ایک دیوار سے لگ کر منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ سر سے بلند کر لو۔ میں باہر نکلتے ہی تمہارے اس روحانی پیشوا کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر کسی نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو پھر اس کی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔" میں نے گرج دار آواز کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی عاروب کی مرغی کی طرح دبوچی ہوئی گردن کو بھی ہولے سے جھٹکا دیا۔ درد کی شدت سے بے اختیار اس کے حلق سے ایک کراہ خارج ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے پھٹی پھٹی آواز کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے سامنے لفظ بہ لفظ میرا حکم دہرا دیا۔ وہ لوگ اندر ہی اندر بری طرح کھول رہے تھے مگر عاروب کی وجہ سے بے بس تھے۔ ناچار انہیں یہ حکم ماننا پڑا۔ ابھی میں نے نگینہ اور عاروب کو ساتھ لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک ایک خونخوار اور دھاڑتی ہوئی آواز ہال میں گونجی۔

"خبردار نادر!..... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔"

یہ دھاڑتی ہوئی آواز ہال کے بیرونی دروازے سے ابھری تھی۔ میں نے ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھ ڈری سہمی کھڑی نگینہ کے حلق سے بے ساختہ دبی دبی سی چیخ ابھری۔ ہال کے دروازے پر کالا ناگ اور کبیر کھڑے تھے۔ ان کے دونوں گرگے بھی ساتھ کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے جن کی نالوں کا رخ میری جانب تھا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور چلا کر کہا۔ "نگینہ کی جان خطرے میں ہے۔ یہ لوگ اسے اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ تمہاری کوئی بھی حماقت نگینہ کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے خطرناک ثابت ہو گی۔ کیونکہ ان کے پیروکار پل بھر میں ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔"

میری بات پر کالا ناگ اور کبیر وغیرہ نے قدم آگے بڑھائے۔ پھر ذرا قریب پہنچ کر کالا ناگ نے زہر خند کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "تم نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ نگینہ کو ہمارے حوالے کر دو اور خود جاؤ جہنم میں۔"

مردود کالا ناگ کی بات پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ اس سے خیر کی توقع فضول تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کبیر سے مخاطب ہو کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کبیر!..... اپنے زر خرید کتے کو سمجھاؤ۔ اس وقت ہم سب کی جانیں خطرے میں ہیں۔ ہمارا پہلا مسئلہ یہاں سے نگینہ کو با حفاظت لے کر نکلنا ہے۔ ورنہ یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ کبیر صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے میری بات مان لے گا۔ لیکن وہ بھلا اپنے دشمن کی بات کیونکر مان سکتا تھا۔

"نادر! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو..... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نگینہ ہمارے پاس بھی محفوظ ہی رہے گی۔ رہی بات تمہاری تو تم نگینہ کو ہمارے حوالے کر دینے کے بعد بھی کبڑے کو ڈھال بنا سکتے ہو۔"

میں بے بسی اور غصے کے مارے تلملا کر رہ گیا۔ تب نگینہ نے ہمت کی اور چلا کر کبیر سے بولی۔

"کبیر! ہوش کے ناخن لو۔ تمہاری نادر سے دشمنی میرے دل میں تمہاری نفرت میں اضافے ہی کا باعث بنے گی۔ تم نے اور اس بدمعاش کالا ناگ نے ہی مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میرے نادر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں ساری عمر معاف نہیں کروں گی۔" نگینہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کبیر ہکا بکا رہ گیا۔

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔ تم نے بالآخر اپنی منزل پا ہی لی۔"

"کبیر! اب نگینہ تو گئی تمہارے ہاتھ سے۔ کیوں نہ اس پر کی جوڑے کا ادھر ہی قصہ پاک کر دیں۔" اچانک کالا ناگ نے انتہائی سفاک لہجے میں کبیر سے کہا۔ اس کے لہجے کی سنسناہٹ پر مجھے اپنے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں ایک لمحے کے لئے اندر سے لرز سا گیا۔ وہ مردود مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ لیکن اب مجھے دیکھنا یہ تھا کہ کبیر کیا فیصلہ کرتا ہے؟

ہال میں اعصاب شکن سناٹا طاری تھا۔ عاروب کے پیروکار اور مسلح محافظ بدستور دیوار کی طرف منہ کئے خاموش کھڑے تھے۔ وہ اتنا تو سمجھ ہی گئے تھے کہ دو مخالف گروپوں کے درمیان بری طرح ٹھن چکی ہے۔ اب خاموشی سے فیصلے کے منتظر تھے۔ تاہم میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

"کالا ناگ.....!" اچانک کبیر کی عجیب سی آواز ابھری۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں سرد مہری اور سفاکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ "تم صحیح کہتے ہو۔ نگینہ اگر میری نہیں بنی تو کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اڑا دو گولیوں سے ان دونوں کو۔"

بدبخت اور کینہ پرور کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایکا ایکی ہال میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔

❄❄❄

زندگی اسی کا نام ہے۔ کبھی موت کی لپک اور کبھی زندگی کی جھپک۔ لیکن طاقت اور برتری کے دعوے دار

یہ بھول جاتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ کالا ناگ نے بڑے سفاکانہ لہجے میں اپنے جوڑی دار کبیر کو بھیانک رائے دی تھی۔ فیصلہ کبیر کے ہاتھ میں تھا جو یقیناً ہمارے حق میں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب نگینہ کو وہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے جیسے ہی کالا ناگ کے فیصلے پر صاد کیا، میں اپنے پستول کا رخ کالا ناگ اور کبیر وغیرہ کی طرف کر کے ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔

ہال میں ابھرنے والی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میرے ہی پستول کی نال سے برآمد ہوئی تھی۔ پہلی گولی کالا ناگ کی عین پیشانی پر لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ہی پل کے پل واصل جہنم ہو گیا۔ جبکہ دوسری گولی کبیر کو لگی۔ وہ کرب ناک چیخ کے ساتھ تیورا کر گرا تھا۔ باقی دونوں گرگے بھی زخمی ہو کر لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گئے تھے۔ میں نے خالی پستول پھینک کر دوسرا بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ ہال میں لوگوں کی وحشت ناک چیخیں اُبھر رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اپنے روحانی پیشوا عاروب کی جان کی فکر تھی۔ وہ خیریت جاننے کے لئے میری طرف مڑے تھے، مجھ پر اس وقت بری طرح خون سوار تھا۔ میں نے گرج دار آواز کے ساتھ انہیں دوبارہ دیوار سے چپکے رہنے کا حکم دیا۔ نگینہ کے حلق سے بھی ہذیانی چیخ اُبھری تھی۔ اب بظاہر میرے سامنے میدان صاف تھا۔ کیونکہ کالا ناگ کے دونوں گماشتے زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میں نے نگینہ کو ساتھ لیا اور عاروب کو ڈھال بنائے دروازے کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے چبوترے کے زینے والے اس سنگل پٹ کے دروازے کا خیال آیا جو میرے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب تھا۔ ہو سکتا تھا ہال کے بیرونی دروازے کے ابھر کالا ناگ کے وہ دونوں زخمی گماشتے میری گھات میں بیٹھے ہوں اور میرے بیرونی دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھ پر حملہ کر دیں۔ یہ سوچ کر میں نے زینے والے دروازے کا رخ کیا اور باہر نکل آیا۔

"نادر!.....ہوشیار۔" اچانک نگینہ چلائی اور مجھے دھکا دیا۔ گولی چلنے کی آواز اُبھری اور اس کے ساتھ ہی کبڑے اروب کے حلق سے کرب ناک چیخ نکلی۔ نگینہ کے دھکا دینے سے نامعلوم سمت سے چلنے والی گولی کبڑے عاروب کے بدن میں اتر گئی۔ میں نے سنبھلتے ہی آواز کی سمت دیکھا۔ وہ کالا ناگ کے ان دو زخمی گرگوں میں سے ایک تھا جس نے شاید کالا ناگ کا کچھ زیادہ نمک کھا لیا تھا اس لئے اسے حلال کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ بروقت نگینہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ عبادت گاہ کی جنوبی سمت کی دیوار کی آڑ سے اچانک ہی اُبھرا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ لگاتے ہی اس کے دوسری بار گولی چلانے سے پہلے اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ گرا تھا۔ کبڑا عاروب گولی کھا کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔

"بھاگو نگینہ!" میں زور سے چلایا اور اس کا ہاتھ پکڑے دور تاریکی میں دوڑتا چلا گیا۔ ترپ کا پتہ جو ہماری زندگیوں کی ضمانت تھا، وہ میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ یوں بھی میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مگر ہم ابھی خطرے میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔

میں اور نگینہ بے تحاشا دوڑے جا رہے تھے۔ ابھی ہم ذرا ہی دور گئے ہوں گے کہ ہمارے عقب میں ماؤزر کے دھماکے اُبھرے۔ میں نگینہ کو لے کر فوراً ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا۔ ہمارے سانس بری طرح پھولے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا رُک کر سر اُبھارا اور عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ مشعل بردار افراد کا پورا جلوس ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کالا ناگ کے اس "نمک حلال" کی چلائی ہوئی گولی نے کبڑے عاروب کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ زندہ بھی تھا یا جہنم رسید ہو چکا تھا؟ لیکن بہرحال اسے گولی لگی تھی۔ اس کے پیروکار مسلح محافظ ہماری تکا بوٹی کر ڈالنے کے لئے سخت مشتعل اور بے تاب تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاریک آسمان پر بادل چھائے ہونے کی وجہ سے آس پاس گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ اندھیرا ہمیں تحفظ بھی فراہم کر سکتا تھا اور قضا کے گھاٹ بھی اتار سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں آس پاس اندھی کھائیوں کی کمی نہ تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار میرا اور نگینہ کا پاؤں پھسلا مگر ہم نے خود کو سنبھال لیا۔ بلکہ ایک بار تو میں گرنے سے خود کو بچا ہی نہ پایا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ وہ تو شکر تھا، کھائی کم گہری تھی اس لئے بچ گیا۔

بہرطور میں اور نگینہ تاریکی کا حصہ بنے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ نگینہ کو پا لینے کے بعد جیسے اب میرے حوصلوں کے بادبان آسمان تک بلند ہو چکے تھے۔ میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ ہم ایک دوسرے سے کھل کر اور تفصیلاً گفتگو کرنے کو بے تاب تھے مگر ہمیں ابھی تک اس کا موقع ہی نہیں مل پایا تھا۔

شور کی آوازیں بتدریج قریب آتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی۔ میرا جرم معمولی نہ تھا۔ ان کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یقینی موت تھا۔ تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ یہ لوگ اس گنجلک اور پُرپیچ وادی کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی تاریکی میں ہمیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ جبکہ ہم کھلی آنکھوں سے راستہ تک نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ لیکن میں نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اور پھر اب تو میری نگینہ میرے ساتھ تھی۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔ میرا حوصلہ، میری دلیری، میرا عزم، سبھی کچھ۔ اور میں ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی اور نگینہ کی بقاء کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ دن کا اجالا شاید ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

کالا ناگ کا میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام حسب توقع تھا۔ وہ روز بہ روز میرے اور نگینہ کے لئے زہریلا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ماموں حیدر گل کا ایک طرح سے قاتل بھی تھا۔ میری ماں بھی اسی کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی تھی۔ کبیر بھی کم خطرناک نہ تھا۔ کالا ناگ کے ساتھ رہتے رہتے اس میں بھی زہر چڑھنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آخری لمحات میں جب اس نے دیکھا کہ نگینہ مکمل طور پر اس کبڑے عامل عاروب کے ٹرانس سے نکل کر مجھے پہچاننے لگی ہے تو اس نے ہم دونوں کا ہی قصہ پاک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر میرے جارحانہ اقدام نے اس کے گھناؤنے ارادوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ کالا ناگ تو یقیناً جہنم واصل ہو چکا تھا کیونکہ میرے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے اس کا بھیجہ اُڑا دیا تھا۔ جبکہ کبیر کے بارے میں حتمی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم وہ میری گولی سے زخمی ضرور ہوا تھا۔ یہی حال کبڑے عاروب کا تھا جو کالا ناگ کے ایک نمک خوار کی گولی کی زد میں آ گیا تھا۔

"نادر!.....وہ لوگ ہمارے قریب پہنچنے والے ہیں۔" اچانک نگینہ کی ہراساں آواز مجھے خیالوں سے باہر نکال لائی۔ "اوہ.....اب آگے بڑھنے کی بجائے ہمیں کہیں چھپنا ہوگا۔"

"یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ "مگر اس طرح ہم دھر لئے جائیں گے۔ کیونکہ وہ لوگ تو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ پھر ان کے پاس مشعلیں بھی ہیں اور ہم انجان ہیں۔ تم ہمت کرو، ہمارا چلتے رہنا ہی زیادہ سودمند ہے۔"

وہ میری بات پر چپ ہو گئی۔ پھر لمحے بھر بعد دوبارہ بولی۔ "نادر! آخر یہ سب کیا ہے؟.....یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟.....میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"نگینہ! اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ فی الوقت تو ہمیں ان سفاک لوگوں سے خود کو بچانا ہے۔"

"آہ....." اچانک نگینہ کے حلق سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ اس کے نرم و نازک وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ کسی اندھی کھائی میں گرنے ہی والی تھی۔ مگر چونکہ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس

لئے فوراً اسے گرنے سے بچاتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے سینے سے لگالیا۔

ان نامساعد حالات میں اس کے نرم گرم جسمانی قرب نے میرے اندر عجیب سی سرشاری گھول دی۔

"نادر! مجھے چھوڑنا مت۔" یہ جملہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"پاگل! بھلا اپنی روح اور اپنی زندگی کو بھی کوئی چھوڑتا ہے؟" میں نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ اپنے عقب میں آوازوں کا شور بہت قریب سے سنائی دینے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، روشنی کا سیلاب سا اُمڈ پڑا تھا۔ وہ لوگ یقیناً ہم سے بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی نظریں ہم پر پڑ گئی تھیں۔ اسی وقت وادی کا سکوت ماؤزر کی گرج دار آواز سے ٹوٹ گیا اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو نگینہ سمیت نیچے گرا دیا اور پھر جیسے ہم دونوں کسی گہری کھائی کی ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ نگینہ کے حلق سے اضطراری انداز میں ہسٹریائی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے لڑھکنے کے دوران خود پر قابو پانے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ ڈھلان زیادہ عمودی نہیں تھی بلکہ خاصی حد تک اُفقی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک جھاڑی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے دبوچ لیا۔ نگینہ میرے سر پر لڑھکتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس کے وجود کو دوسرے ہاتھ سے روک لیا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"نگینہ! ہمت مت ہارنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ کھائی زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمارے لئے پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

نگینہ نے میری بات پر ہولے سے سر ہلا دیا۔ میں نے ذرا اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ ہم خاصی گہرائی میں لڑھک آئے تھے۔ نیچے اتھاہ گہرائیاں ہولناک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ کھائی بہت وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ معاً مجھے بلندی پر شور سنائی دیا۔ میں اور نگینہ ڈھلان سے چپک گئے۔ میں نے دیکھا، کھائی کے سرے پر ان مشعل بردار افراد کے ہیولے متحرک تھے۔ ان میں کئی نیچے جھک کر مشعل کی روشنی ڈالنے لگے۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے نگینہ سے کہا۔ "نگینہ! اسی طرح چپکی پڑی رہو۔ حرکت مت کرنا۔ وہ لوگ بلندی سے جھانک رہے ہیں۔" وہ خاموش رہی۔ تاہم اس نے میری بات سن لی تھی۔ کئی لمحے ہم یونہی بے حس و حرکت گچھے دار جھاڑیاں اپنے ہاتھوں کی مٹھی میں پکڑے دم سادھے چپ رہے۔ تاہم میری نظریں بلندی پر کھائی کے سرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر معاً وہی ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ میں نے چار عدد مشعل برداروں کو ڈھلان میں اترتے دیکھا۔ وہ شاید ہمارے نیچے گرنے کی اچھی طرح تسلی کرنا چاہتے تھے۔ اب ہمارا اس مقام پر جمے رہنا مناسب نہ تھا۔ میرے پاس اگرچہ دو پستول تھے اور فاضل راؤنڈز بھی تھے مگر بہرحال ان کی تعداد محدود تھی جبکہ دشمنوں کی تعداد خاصی کثیر تھی۔ میں ان پر فائرنگ کر کے انہیں اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے نگینہ سے کہا۔

"نگینہ! دشمنوں کے چند آدمی نیچے آ رہے ہیں۔ ہمیں مزید گہرائی میں اُترنا ہوگا۔ تم ایسا کرو، اپنے دونوں پاؤں میرے کاندھوں پر ٹکا دو۔ ہاتھوں کی مدد سے میرے ساتھ ساتھ نیچے اُترنے کی کوشش کرو۔"

"لل......لیکن نادر!......تم......"

"نگینہ! یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ جلدی۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "وہ ابھی دور ہیں۔ ہم ان سے پہلے نیچے پہنچ جائیں گے۔"

نگینہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ڈھلان سے چپکے چپکے اپنے جسم کا زاویہ بدلا اور اپنے پاؤں میرے کاندھوں پر ٹکا دیئے۔ پھر میں نے ڈھلان کا سہارا لیتے ہوئے دھیرے دھیرے نیچے سرکنا شروع کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھلان کی سطح ناہموار تھی۔ میں اس کے رخنوں اور کہیں کہیں اُبھرے نوکیلے پتھروں پر اپنے پاؤں ٹکائے نیچے اتر رہا تھا۔ نگینہ بھی اپنے تئیں بڑی چابک دستی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اگر اسپورٹس مین تھا تو وہ بھی اسپورٹس ویمن تھی۔ اسے بھی حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا آتا تھا۔

نگینہ کو سہارا دینے کا مقصد ہی میرا یہ تھا کہ کہیں خوف و ہراس میں اپنا توازن ہی نہ بگاڑ لے اور خدانخواستہ نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

میں اب اوپری بلندی کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے ہلکی آواز میں نگینہ سے پوچھا کہ وہ ذرا اوپر دیکھ کر مجھے بتائے کہ ہمارے تعاقب میں نیچے اترنے والے ہم سے کتنی دوری پر ہیں۔ اس نے اوپر دیکھ کر مجھے بتا دیا۔ اگرچہ وہ ہم سے خاصے دور تھے لیکن ان کے نیچے آنے کی رفتار ہم سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں سن کر پریشان ہو گیا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے نیچے سرکنے کی رفتار تیز کر دی۔ اس کوشش میں دو تین مرتبہ میرا توازن بگڑنے بھی لگا تھا لیکن میں نے چابک دستی سے خود کو سنبھال لیا۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال تھی۔ نیچے کھائی میں گرنے کا خدشہ الگ تھا تو اوپر ان چاروں دشمنوں کی آمد کا دھڑکا الگ۔

ٹھٹھرا دینے والی سردی کے ساتھ اب تو لہو کو رگوں میں جما دینے والی کاٹ دار ہوائیں بھی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس جاں گسل کوشش میں میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے اور زخمی بھی۔ میرے چہرے اور جسم پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ اچانک میرے دونوں پاؤں خلا میں جھول گئے......میری روح فنا ہو گئی۔ میں اپنے دونوں پاؤں اب دوبارہ سکیڑ نہیں سکتا تھا۔ پیروں سے ڈھلان کی سطح نکلتے ہی مجھے اپنا وجود ہوا میں معلق سا محسوس ہونے لگا جس کی وجہ سے بوجھ کا احساس بڑھنے لگا۔ میری پیش قدمی رک گئی تھی۔

"کیا ہوا نادر؟......تم رک کیوں گئے؟......دشمن قریب آ رہے ہیں۔" مجھے رکتا محسوس کر کے نگینہ نے ہراساں لہجے میں کہا۔ میں نے اسے صورتِ حال کی نزاکت بتائی

"نگینہ تم ذرا میرے کاندھوں سے اپنے پاؤں ہٹا کر ڈھلان سے لگ جاؤ۔ میں ذرا اپنا زاویہ بدل کر دوسرا راستہ دیکھتا ہوں۔"

"نادر! اپنا خیال رکھنا......کہیں تم نیچے......" اس نے اپنا جملہ دانستہ ادھورا چھوڑا تو میں نے کہا۔

"اللہ سے دعا کرو......وہ ہمارے ساتھ ہے۔" یہ کہہ کر میں اور ذرا نیچے سرکا کہ اچانک میرا دل خوشی کے احساس سے بلیوں اُچھل پڑا۔ میرے دونوں پاؤں ڈھلانی سطح سے ٹکرائے تھے۔ تب مجھے ایک خوش آئند احساس ہوا کہ میرے پیر وہاں کسی غار کے دہانے میں تھے۔ میں ذرا سا مزید سرکا۔ میرے دونوں پیر اب ٹک چکے تھے۔ وہ واقعی کوئی اندھیری گپھا تھی۔ میں نے نگینہ کو ہولے سے آواز دے کر نیچے سرکنے کا کہا۔ وہ نیچے اترنے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ پھر جیسے ہی اس کی دونوں ٹانگیں فضا میں جھولنے لگیں، میں نے انہیں تھام لیا اور پھر دھیرے دھیرے نگینہ نے اپنا وجود میرے بازو پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے آہستگی سے اسے خلا میں اتارا اور اندھیری گپھا ٹٹول کر معائنہ کرنے لگا۔ گپھا زیادہ گہری نہیں تھی۔ اس کا دہانہ اگرچہ قدرے وسیع تھا مگر اندر سے چھ سات فٹ سے زیادہ گہرائی نہ تھی۔ میں نے نگینہ کو اندر ایک کونے میں آرام سے بٹھا دیا اور خود گپھا کے سرے پر آ کر اوپر بلندی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ چاروں مشعل بردار دشمن پہاڑی مکڑوں کی طرح تیزی سے نیچے آ رہے تھے۔ ان کا رخ بھی ہماری گپھا کی طرف تھا۔ میرا ذہن اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب یکبارگی میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور میں چوکنا ہو کر گپھا کے سرے میں کھڑا ہو گیا۔

روشنی قریب آتی جارہی تھی۔ اچانک پھر وہی ہوا جس کا میں منتظر تھا، گپھاہ کے خلا میں اوپر سے دو ٹانگیں نیچے جھولتی نظر آئیں۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ان دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے نیچے اس طرح کھینچا کہ دشمن چیختا چلاتا ہوا نیچے گہری تاریکی میں گرتا چلا گیا۔ باقی تینوں دشمنوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔ میں نے یہ کام اس قدر ہوشیاری اور چابکدستی سے کیا تھا کہ وہ الجھ کر ہی رہ گئے تھے کہ آخر ان کے ساتھی کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ پھر جیسے وہ اسے ایک اتفاقی حادثے پر محمول کر کے پھر نیچے سرکنے لگے۔

دو دشمن گپھاہ سے دور تھے جبکہ ایک گپھاہ کی بلندی کے سرے پر تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی جھولتی ہوئی ایک ٹانگ نظر آئی، میں نے بہ سرعت اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ وہ چیختا چلاتا ہوا نیچے تاریکی میں جا گرا۔ مگر اس بار کی میری حرکت چھپی نہ رہ سکی۔ گپھاہ کی داہنی جانب نیچے سرکنے والے دو مشعل بردار دشمنوں کو فوراً احساس ہوا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ دال میں کچھ کالا تھا۔ وہ ان دشوار گزار راستوں کے عادی تھے اور پُر پیچ گزرگاہوں سے آگاہی بھی رکھتے تھے۔ انہیں جیسے ہی میری سمت کا اندازہ ہوا، انہوں نے گپھاہ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ میں اب محتاط ہو گیا تھا اور ان سے دوسرے طریقے سے نمٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً پستول نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور گپھاہ کے دائیں سمت والی پتھریلی دیوار کی آڑ سے جا لگا۔ پھر ذرا سر ابھار کر دیکھا تو یکدم میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ میں نے ایک دشمن کو اپنی مشعل گپھاہ کی طرف پھینکتے دیکھا تھا۔ پہلے تو میں اس کی اس حرکت کا مطلب نہیں جان سکا۔ مشعل جب گپھاہ کے عین سرے پر گری اور پوری گپھاہ اندر تک روشنی میں نہا گئی تو میں اس کی چالاکی بھانپ کر سن ہو گیا۔ یقیناً ان کی نگاہوں میں ڈھلوانی گپھاہ آ چکی تھی۔ میں نے مشعل کی روشنی میں مڑ کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش پڑے رہنے کا اشارہ کیا اور پھر پستول پکڑے دم سادھے دیوار کی آڑ سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً ماؤزر چلنے کی گرج دار آواز اُبھری۔ میں بری طرح دہل کر رہ گیا۔ گولیوں کے شیل گپھاہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر گرے۔ نگینہ اضطراری انداز میں چلائی۔

اچانک سناٹا چھا گیا۔ میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ پھر معاً ہی ایک پُرغیظ، جوش بھری آواز میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"وہ دونوں اس گپھاہ میں موجود ہیں ....تم دوسری سمت سے آگے بڑھو۔" ایک دشمن نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا تھا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ وہ دونوں اطراف سے اب گپھاہ کے اندر داخل ہونے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرف پیش قدمی بھی شروع کر چکے ہوں۔ یہ سوچتے ہی میں پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ ایک دشمن کی پھینکی ہوئی مشعل گپھاہ کے سرے پر گری تھی اور محدود ماحول کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اب میں دیوار کی آڑ سے سر ابھار کر دشمنوں کی حرکات و سکنات کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح گپھاہ میں ہونے والی روشنی کی وجہ سے میں تو انہیں دیکھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ میری ذرا سی بھی جھلک واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ میں بری طرح محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے یہ گپھاہ ہمارے لئے چوہے دان بن گئی ہو۔ میں نے جلدی سے نگینہ کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ مجھ سے چمٹ گئی۔ خطرے کو محسوس کرتے ہی اس کا نرم و نازک جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اپنے عقب میں کر لیا۔ میں گپھاہ کے سرے پر رکھی جلتی ہوئی مشعل کو بھی اٹھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس طرح مجھے کھلے حصے کی طرف آنا پڑتا اور کوئی بعید نہیں، دشمن نے اسے اپنا ٹارگٹ بنا رکھا ہو۔ بہرطور ....اب میں گپھاہ کے ایک سرے پر کھڑا تھا اور دوسرے سرے پر بھی نظریں جما رکھی تھیں۔ اب مجھے دشمن کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ بیک وقت گپھاہ کے دونوں سروں پر ابھرے تو صورت حال ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ پھر بھی میں اپنے طور پر پوری طرح محتاط اور مستعد کھڑا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر اچانک مجھے سامنے والے سرے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سانس روک لی۔ ایسی ہی آہٹ مجھے اپنے ساتھ والی آڑ سے بھی سنائی دی۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ دونوں دشمن بہت مکاری اور چالاکی سے ہمیں گھیر کر گولیوں سے بھون ڈالنے کو بے تاب تھے۔ میں نے بھی ہونٹ بھینچ کر خود کو ان سے مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح سے تیار کر لیا تھا۔

میں نگینہ سمیت چند قدم ذرا پیچھے کو سرک گیا تھا۔ اب اگرچہ میں دونوں دشمنوں کے ٹارگٹ پر آ گیا تھا مگر اس طرح میں نے بیک وقت گپھاہ کے دونوں سروں پر اپنی نظریں بھی جما رکھی تھیں۔

پھر اچانک ہی مجھے سامنے والے سرے پر ماؤزر کی بھیانک نال نظر آئی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مہیب نال کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا.........گولی چلنے کا دھماکا اُبھرا اور میں نے ماؤزر کو تاریکی میں اُڑتے دیکھا۔

ٹھیک اسی وقت میرے ساتھ والی آڑ سے دشمن کا دوسرا مسلح ساتھی درانہ وار آگے بڑھا۔ نگینہ کی خوف سے چیخ نکل گئی۔ وہ جوشِ غیظ میں آ کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گولی چلاتا، میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ مکروہ چیخ کے ساتھ وادی کی تاریک گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ دوسرا دشمن نہتا تھا۔ میں جلدی سے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور ذرا اُبھر کر دوسرے دشمن کو دیکھنا چاہا۔ اچانک میرے پستول والے ہاتھ پر زور سے ایک پتھر لگا۔ مارے تکلیف کے میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی اور پستول نیچے کھائی میں جا گرا۔ پتھر یقیناً گھات میں بیٹھے ہوئے میرے دشمن نے ہی اچھالا تھا۔ اس نے بھی مجھے نہتا کر دیا تھا۔ میں نے اپنے میگارڈ کو نکالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میرا دشمن اچھل کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورے جا رہا تھا اور میں اسے جارحانہ نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ دانت کچکچا رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ میں نے فوراً جھکائی دی۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پھرتی سے اٹھا کر گپھاہ کی پتھریلی زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی۔ وہ وحشی انسان تھا۔ ضرور طاقت رکھتا تھا۔ مگر اس کا استعمال اسے نہیں آتا تھا۔ لہٰذا وہ میری چال سمجھے بغیر ایک بار پھر غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ گپھاہ کا یہ حصہ اتنا زیادہ کشادہ نہ تھا کہ میں پینترے بدلتا۔ مختصر حصے میں رہتے ہوئے ہی مجھے اس وحشی انسان پر قابو پانا تھا۔ یہ کبڑے عاروب کے مقربین خاص میں سے ایک تھا۔ مگر لگتا تھا کہ یہ لوگ صرف اسلحہ ہی چلانا جانتے تھے۔ دوبدو بھی کسی کے ساتھ پنجہ آزمائی نہ کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ایک بار مار کھانے کے باوجود دوبارہ اندھا دھند میری طرف لپکا تھا۔ اس بار میں نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کیا۔ پھر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا، میں اس سے بھڑ گیا اور سر کی زوردار ضرب اس کی ناک پر رسید کر دی اور ساتھ ہی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ وہ اوغ کی غراہٹ سے مشابہہ آواز کے ساتھ رکوع کے بل جھکا۔ اور میں نے وہی گھٹنا دوبارہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر اس کی گردن اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ کڑاکے کی آواز اُبھری اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جوں ہی اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے، میں نے بھی اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ دھب کی آواز سے گرا۔

میں جلدی سے گپھاہ کے سرے پر آیا اور بلندی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ مشعلوں کی روشنیاں ہنوز نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے تشویش نے آن گھیرا۔ وہ شاید اپنے ان چاروں ساتھیوں کے منتظر تھے جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ اب گپھاہ میں ہمارا زیادہ دیر موجود رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے مشعل اٹھا کر نیچے گہرائی میں جھانکا۔ گپھاہ کے نیچے کی ڈھلان خاصی سپاٹ تھی۔ میں نے نگینہ کو لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر دوبارہ پہلے کی طرح ہم دونوں دھیرے دھیرے نیچے گہرائی میں سرکنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ بلندی پر موجود کبڑے عاروب کے مشتعل پیروکار جب اپنے چاروں ساتھیوں کی واپسی سے مایوس ہو جائیں گے تو ضرور ان میں کوئی نیچے پیش قدمی کرے گا۔ بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ سارے ہی نیچے کو آنے لگتے۔

میں نے جلتی ہوئی مشعل نیچے پھینک دی۔ پھر اسے بہ غور نیچے لڑھکتے دیکھتا رہا۔ وہ محض ستر اسی فٹ کی گہرائی کے بعد کھائی کی پتھریلی ناہموار زمین سے ٹکرائی تو مجھے کھائی کی کم گہرائی کا اندازہ ہوا۔ نیچے خودرو جھاڑیوں کی خاصی بہتات تھی۔ جلتی ہوئی مشعل سے جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ اب کھائی کا اندرونی حصہ خاصا منور ہو گیا تھا۔ میں نے اور نگینہ نے اب تیزی سے نیچے سرکنا شروع کر دیا۔ خاصی دیر بعد ہم کھائی کی ناہموار پتھریلی زمین تک پہنچ گئے۔ ہم دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔

میں نے مشعل اٹھائی اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ کھائی خاصی طویل، کسی گہری نہر کی مانند آگے سے بل کھاتی جا رہی تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک کبھی چلنے اور کبھی ستانے کے بعد بالآخر مجھے ایک دراڑ سی نظر آ گئی۔ یہ ایک "آدم گزار" دراڑ تھی۔ خاصی چوڑی تھی۔ ایسی دراڑیں عموماً زلزلوں یا جغرافیائی فطری تغیر کا نتیجہ ہوتی ہیں جس سے از خود تنگ و تاریک گزرگاہیں بن جایا کرتی تھیں۔

یہ بھی ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دراڑ ہمیں کہاں پہنچاتی ہے؟......... ایک خیال یہ بھی آتا تھا کہ دراڑ آگے سے بند بھی ہو سکتی تھی۔

اچانک نگینہ نے ہراساں آواز میں کہا۔ "نادر! وہ......... وہ دیکھو، وہ لوگ نیچے آ رہے ہیں۔" اس کا اشارہ بلندی کی طرف تھا۔ میں نے اشارے کی سمت سر اٹھا کر دیکھا اور بری طرح ٹھٹکا۔ بلندی پر موجود مشعل برداروں کا پورا جلوس نیچے کھائی میں اتر رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور دراڑ کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ تو قبر کی طرح تاریک ہے نادر!......... اس میں کیسے داخل ہوں گے ہم؟" نگینہ نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے گویا میرا ارادہ بھانپ کر کہا۔

"نگینہ! اس وقت یہی قبر ہمیں پناہ دے سکتی ہے۔ ورنہ یہ ہمارا برا حشر کر کے رکھ دیں گے۔ آؤ چلو۔" میں نے کہا اور ہم دونوں دراڑ میں داخل ہو گئے۔ ذرا دور تک تو دراڑ سیدھی رہی، مگر پھر وہ ترچھی ہو گئی۔ بلکہ کہیں کہیں سے اس قدر تنگ ہو گئی کہ بہ مشکل میں اور نگینہ ایک ایک کر کے گزر پاتے۔ لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم دوسری جانب اُبھرے اور میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

سامنے بڑا دلفریب منظر تھا۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی پیالہ نما وادی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا جس پر ٹکے مکمل چاند کی روشنی نے پوری برف پوش وادی کو منور کر رکھا تھا۔ ہر سُو طلسماتی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہم وادی کے اندر موجود تھے۔ نگینہ بری طرح تھک کر چور ہو رہی تھی۔ خود مجھے بھی کافی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمیں اپنی منزل کا کچھ علم نہ تھا۔ بس ایک دُھن سر پر سوار تھی کہ کبڑے عاروب کے خون آشام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روکاروں کی پہنچ سے جس قدر ممکن ہو سکے، دور نکل جائیں۔

"نگینہ! پلیز، تھوڑی اور ہمت کر لو۔ ہمیں اس وادی سے نکلنا ہوگا۔" میں نے نگینہ کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

"نادر! تم نے میری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ لیکن پلیز! مجھے یہ تو بتا دو کہ آخر یہ سارا کیا بھید ہے؟" اس نے بڑے رسان سے ملتجیانہ لہجے میں کہا تو میں نے ایک گہری ہنکاری بھر کر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سحر زدہ سی یہ ساری کہانی سنتی رہی، پھر ایکا ایکی اس کے چہرے سے ساری تکان اور کٹھن مسافتوں کی صعوبتیں غائب ہو گئیں اور اس کی جگہ فطری شوخی اور زندہ دلی عود کر آئی۔

"ناقابل یقین......... حیرت انگیز........." وہ تحیر خیز لہجے میں بولی۔ "نادر! تم نے واقعی محبت کی لاج رکھ لی۔ اگر......... اگر تم آج میری خاطر یہ سب نہ کرتے تو میں......... میں شاید ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔ آہ، نادر!......... میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔ میں......... میں دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی ہوں کہ مجھے تم جیسے سچی محبت کرنے والے شخص کا ساتھ میسر آیا۔" وہ جیسے عالم سرشاری میں یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے لپٹ گئی۔

میں نے بھی جیسے اسے وفورِ جذبات سے بھینچ لیا۔

"نادر! آئی لو یو......... آئی لو یو ٹو مچ۔" وہ جیسے میرے اندر جذب ہو کر عالم بے خودی میں بولی۔

"آئی لو یو ٹو نگینہ!......... آئی لو یو ٹو۔" میں اس کے ریشمی گھنیرے بالوں پر اپنے لب ترساں رگڑتے ہوئے دل و جان کی گہرائی سے بولا۔ گہرائی سے نکلتے ہوئے الفاظ گہرائی میں ہی اترے تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ ہم دونوں خاصی دیر تک وہیں پتھریلی زمین پر باہم پیوست کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ نگینہ کی فطری بے باکی پوری شد و مد کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔ اس نے بے اختیار میرے ہونٹوں پر بوسہ دے ڈالا۔ میں اس کی حرکت دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا، پھر دھیرے سے بولا۔

"چلو اُٹھو!......... آگے بڑھتے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مڑ کر دراڑ کی طرف نظر ڈالی۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس بار دشمن کو جُل دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن باوجود اس کے میں اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ تاحدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے اس برف زار میں کوئی نہ کوئی آبادی مل ہی جائے گی اور میں وہاں سے کسی راستے کابل یا پشاور کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ میرے پاس اب برائے نام ہی رقم رہ گئی تھی لیکن یہ بعد کا تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں بھی میں نے کچھ سوچ رکھا تھا۔ خاصی دیر ستانے کے بعد ہماری توانائی لوٹ آئی تھی اور ہم دونوں تیز تیز قدموں سے ذرا سنبھل کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

تاحد نگاہ تک برف پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں روئیدگی اور خودرو جھاڑیاں بھی تھیں۔ سردی بھی کافی پڑ رہی تھی مگر اس میں کاٹ نہیں تھی، ایک خوشگواری تھی۔ میں اور نگینہ اسی طرح چلتے رہے۔ تنگ گھاٹیاں، گہری کھائیاں، چٹانی دروں اور دشوار گزار راستوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے اس پیالہ نما وادی کو بھی پار کر گئے۔ اب ہمارے اطراف میں سر بفلک برف پوش پہاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کی حدود سے نکل آنے کی تسلی تھی مگر مجھے اب ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ ہمیں جلد از جلد اس ویران اور سرد جہنم سے نکلنا تھا جہاں خوراک کا آسرا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی وسیلہ۔ کیونکہ اس برفیلے موسم میں چشمے اور جھرنے بھی برف بن جاتے تھے۔

کافی دور نکل آنے کے بعد ہم پھر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نگینہ کو بری طرح نیند نے ستایا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا تھا۔ رات بھی اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چاند بھی کہیں جھک چکا تھا۔ آسمان پر البتہ چمکتے تاروں کی فوج ظفر موج نظر آتی تھی جس سے کسی حد تک اردگرد کا منظر واضح ہوتا تھا۔ میں ایک گھنی خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ دیکھ کر وہاں رک گیا۔

یہ پہاڑی کے ساتھ والا ایک مختصر مسطح قطعہ اراضی تھا جہاں خودرو جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کی بہتات تھی۔ میں پہاڑی سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا تھا اور نگینہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے سلا دیا تھا۔ ہر سُو ٹھہرا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کا منظر پراسراری ویرانی اور سناٹے میں بہت ہولناک نظر آ رہا تھا۔ نگینہ میری گود میں اپنا سر رکھتے ہی سو گئی تھی۔ میں نے بھی اپنا سر چٹانی دیوار سے ٹکا کر ذرا دیر کو آنکھیں موند لی تھیں اور پھر اسی طرح پڑے پڑے مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔

❄❄❄

اچانک میری آنکھ ایک عجیب سی خرخراتی آواز پر کھلی اور نظریں ایک بھاری بارکم یاک (YALK) پر پڑیں جو ہمارے قریب ہی جھاڑیوں پر اپنا تھوتھنا دیئے بڑے مزے سے چر رہا تھا۔ میں اسی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ صبح ہو چکی تھی۔ بلکہ خاصا دن نکل آیا تھا۔ تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے شاید ہم کافی دیر تک سوئے رہے تھے۔ نگینہ بھی ابھی اسی طرح میرے زانو پر سر رکھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ دھوپ چاروں طرف اس برف زار میں پھیل چکی تھی۔

اپنے قریب ہی اس بھاری بھرکم یاک کو بے فکری سے چرتا ہوا دیکھ کر میرے ذہنِ طباع میں اچانک ایک خیال اُبھرا تھا۔ اس دشوار گزار وادی میں یہ ہمارے لئے بہترین ''سواری'' کا کام کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے بہت آہستگی سے نگینہ کا سر اپنے زانو سے اٹھا کر زمین پر ٹکایا، پھر ایک ہاتھ سے جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کا گچھا توڑ کر اس کا موٹھ بنایا اور یاک کی طرف کر کے اسے دھیرے سے پچکارا۔

میرے پچکارنے کی آواز سے وہ تھوڑا سا بدکا اور پھر ڈر کر ذرا دُور کھسک گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی مگر پھر اسے ذرا دور تھک کر دوبارہ کھڑے ہوئے دیکھ کر میرے اندر پھر اُمید جاگی۔ وہ شاید ابھی نکم سیر نہیں ہوا تھا۔ وہ گہرے سرمئی رنگ کا تھا اور اس کا بھاری بھرکم جسم گھنے لانبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پاؤں (کھر) اگر کے بہت پتلے پتلے تھے۔ وہ اپنی موٹی موٹی اُبھرواں ڈیلوں والی آنکھوں سے میری جانب یک ٹک تکے جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذرا حرکت کی اور پھر اپنے موٹے موٹے نتھنوں سے خرخراہٹ کی آوازیں نکالتا ہوا دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میرے قریب آ کر اس نے اپنا خرخراتا ہوا تھوتھنا بڑھا دیا اور میرے ہاتھ میں پکڑی موٹھ پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بھی ذرا جسارت کی اور اس کے تھوتھنے کو پیار سے سہلانے لگا اور کھڑا ہو گیا اور اسے جنگلی پتے اور جھاڑیاں توڑ توڑ کر کھلاتا رہا۔ اب میں اس کے بالوں سے ڈھکی ہوئی پشت کو بھی سہلانے لگا۔ وہ میری طرف سے اب بالکل بے فکر ہو کر چرنے لگا۔ میں نے ہولے سے نگینہ کو آواز دی۔ وہ بھی اس کھٹر پٹر سے جاگ سی گئی۔ پھر مجھ پر نگاہ پڑی تو میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرے قریب آئی۔ میں نے اسے سرگوشی میں اپنا مقصد سمجھایا، پھر اسے اٹھا کر بھاری بھرکم یاک کی پشت پر لاد دیا اور خود بھی اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ یاک تھوڑا سا کسمسایا تھا پھر میں نے اسے گردن پر ہلکی سی تھپکی دی تو وہ ازخود ایک طرف چل دیا۔

ماموں حیدر گل (مرحوم) کے ساتھ میں بارہا جنگل اور ایسے علاقوں میں شکار وغیرہ کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس لئے مجھے جنگلی جانوروں کی فطرت سے واقفیت تھی اور مجھے انہیں ''سدھارنا'' بھی آتا تھا۔ اس لئے

یاک کو سدھارنے میں چنداں دیر نہیں لگی۔ وہ بڑے آرام سے ہمیں اپنی پشت پر بٹھائے ایک راستے پر جا رہا تھا۔

''نادر! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' معاً نگینہ نے مجھ سے کہا۔ اسے یقیناً بھوک بھی لگی ہو گی۔ لیکن پیاس کی شدت نے شاید اسے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔

''ذرا برداشت کر لو.....شاید کوئی چشمہ یا ندی دکھائی دے جائے۔''

''نادر! مجھے تو اس جانور سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ اگر اس نے بدک کر ہمیں گرا دیا تو؟'' نگینہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''حوصلہ رکھو۔ ایسا نہیں ہو گا۔ یہ بہت امن پسند اور انسان دوست جانور ہے۔''

وہ میری تشفی پر چپ ہو گئی۔ میں یاک کی گردن کے لمبے لمبے بال پکڑے ہوئے اسے اپنی مرضی سے ایک راستے پر لئے جا رہا تھا۔ عموماً یہ جانور خاصی بلندی پر ہوتے ہیں۔ لیکن شاید بھوک اور رات بھر ہونے والی برف باری، خوراک کی کمیابی کا باعث بنی تھی جس نے اسے نیچے ترائیوں میں آنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

ہمارا یاک پر سفر جاری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے اطراف میں بھی نظریں دوڑائے جا رہا تھا کہ کوئی نظر آ جائے۔ یا پھر کسی آبادی کے آثار ہی دکھائی دے جائیں۔ مگر ہنوز کوئی امید بر نہ آئی۔ حتیٰ کہ ہمیں پر سفر کرتے کرتے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت بیت گیا۔ لیکن ان برف زاروں میں مجھے کسی بھی جا کے آثار تک نظر نہ آئے۔ میں ایک اندازے کے تحت یاک کو ہنکاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ پھر مزید گھنٹہ اور بیت گیا۔ اب تو ہمارے جسم بھی یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے شدید اکڑن کا شکار ہونے لگے بیزاری، کوفت اور مایوسی نے ہم پر شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہم کب تک مرتے ویرانوں میں دربدر پھرتے رہیں گے۔ یہ سرد جہنم تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا اور پہاڑوں سے برف رفتہ رفتہ پگھلنے لگی تھی۔ پانی کا مسئلہ حل ہوتا نظر آیا تو نے یاک کو روک دیا۔

ایک جانب بہتے جھرنے کا جلترنگ سا شور سنائی دیا۔ میں اور نگینہ یاک کی پشت سے اتر گئے۔ اچانک نے زور زور سے خرخرانا شروع کر دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ بھی بری طرح بے چین ہو رہا تھا۔ میرا دل ایک لرزہ خیز خیال سے کانپ اٹھا۔ پھر دفعتہً مجھے آس پاس کئی خونخوار غراہٹوں کی آواز سنائی دی۔ خوفناک غراہٹوں کی آواز قریب سے ہی سنائی دی تھی۔ اور شاید یاک کی بے چینی کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے مذکورہ سمت دیکھا، آوازیں میرے دائیں جانب سے آتی محسوس ہوئی تھیں۔ مذکورہ سمت ٹنڈ منڈ چاڑیوں کی اوٹ سے مجھے دو قد آور بھیڑیئے نظر آئے، جو اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہماری طرف بڑھے ہوئے غرا رہے تھے۔ ان کے بڑے بڑے دونوں کیلے شکاری دانتوں کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ وہ یوں ہوئے تھے جیسے کسی پل بھی ہم پر حملہ آور ہونے والے ہوں۔ نگینہ کے حلق سے متوحش چیخ سی خارج ہو ہا۔ میں نے نگینہ کو دھیمی سرگوشی میں خاموش رہنے کا کہا۔ میری شکاری حسیات یکدم بیدار ہو گئی تھیں۔ ک اپنی جگہ اسی مقام پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ میں اور نگینہ بدستور اس کی پشت پر سوار تھے۔ ان دونوں بھیڑیوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ دونوں نر، مادہ تھے اور غالباً ہماری ''دخل در نامعقولات'' نے ڈسٹرب'' کر ڈالا تھا۔ میں نے یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہولے سے ہاتھ پھیرا اور اس کا راستہ بدل سری سمت ہو لیا۔ میں نے اب ان دونوں بھیڑیوں کی طرف سے دانستہ نظریں ہٹا لی تھیں۔ تاہم ان کی غراہٹوں پر لگی ہوئی تھیں جو اب ہمیں سمت بدل کر جاتا دیکھ کر معدوم ہونے لگی تھیں۔

جب خاصی دور نکل آئے تو نگینہ نے بے اختیار جیسے اپنے سینے میں اٹکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے.....میں تو ڈر رہی گئی تھی۔''

''ہاں.....یہ بات ڈرنے کی تھی مگر خوف زدہ ہونے کی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، اب یہ عجیب وغریب اور فلسفیانہ گفتگو چھوڑو اور آگے کی سوچو.....آخر کدھر جا رہے ہیں ہم؟'' وہ بولی تو میں نے اپنے چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے برف زار کے سوا کچھ نظر نہ آیا تاہم میں نے نگینہ کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

''کہیں نہ کہیں آبادی نظر آ ہی جائے گی۔ وہاں کسی سے چترال کا راستہ پوچھ کر آگے نکل جائیں گے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ یاک اپنی مستانی چال سے چلا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک درے کو پار کیا تو ''اورے، ر.....رے'' کی آواز گونجی۔ یہ کسی جانور کو ''ہشکارا'' دینے کی آواز دی۔ یہی سبب تھا کہ یاک چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے ہشکارے والی آواز کی سمت دیکھا، وہ ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اس نے سمور پہن رکھا تھا۔ یاک نے اپنے حلق سے خرخر کی آواز نکالی اور نوعمر لڑکے کی طرف دوڑ پڑا۔ لڑکے کے قریب پہنچ کر یاک رک گیا۔ لڑکے کی رنگت سرخ وسپید تھی اور وہ حیران حیران اور اپنی موٹی کالی آنکھوں سے ہماری طرف تکے جا رہا تھا۔ میں یاک کی پشت سے اُترا اور پھر اس لڑکے کی طرف بڑھا۔ لڑکے کے چہرے پر اب حیرانی کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ نگینہ کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔

''اُترو نیچے.....اُترو میرے پولترو کی کمر سے۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا یہ ''پولترو'' یاک پالتو تھا۔ میں نے نگینہ کو نیچے اترنے کا کہا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ لڑکا آگے بڑھ کر اپنے ''پولترو'' کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے لڑکے کے ذرا قریب ہو کر پیار سے مسکراتے ہوئے پہلے معذرت کی، پھر پوچھا۔

''تمہارا یہ پولترو بہت اچھا ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ جیسے اس نے ہماری مدد کی ہے، یقیناً تم بھی ہماری مدد کرو گے۔''

لڑکا اپنی اور اپنے ''پولترو'' کی تعریف پر خاموش ہو گیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''بیٹا! ہم مسافر ہیں۔ راستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔ چترال جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟'' میری بات پر وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہنے کے بعد بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

میں اور نگینہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ تو خود اپنے ''پولترو'' پر سوار ہو گیا اور ہم دونوں پیدل اس کے عقب میں چل پڑے۔ جانے وہ ہمیں کہاں لے جا رہا تھا؟ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ ہمیں ایک ڈھلانی آبادی میں لے آیا۔ یہاں گوپے اور مڑھیوں کی طرز کے مخروطی چھپر نما جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ وہاں ہمیں عورتیں، بچے اور بوڑھے مرد دکھائی دیئے جنہوں نے فقط سمور پہن رکھے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے ہمیں اپنے کسی جھونپڑے میں لے جائے گا اور ہماری خاطر مدارات کرے گا لیکن وہ ہمیں آبادی کے بیچوں بیچ سے نکال لے گیا.....آگے چند فرلانگ کے بعد خچر گاڑیاں کھڑی دکھائی آئیں۔ لڑکے نے ایک بوڑھے خچر بان کے پاس ہمیں پہنچایا۔ جو ایک خچر کی پشت پر ''کھر کھرا'' پھیر رہا تھا۔ لڑکے نے اس خچر بان سے کچھ کہنے کی بجائے مجھ سے کہا۔ ''یہ تمہیں چترال جانے والی بسوں کے اڈے تک پہنچا دے گا۔'' یہ کہہ کر اس لڑکے نے ایک طرف کی راہ لی۔ لڑکا بڑا ہی خشک مزاج معلوم ہوتا تھا بہرطور اس کی یہی مہربانی کیا کم تھی کہ وہ ہمیں یہاں تک تو لے آیا تھا۔ بوڑھا خچر بان ہماری طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیئے بغیر کھر کھرا پھیرنے میں مگن تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پہلے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب تو نہ دیا البتہ اپنے خچر کی پشت پر کھر کھرا پھیرنا بند کر دیا اور میری طرف سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تم ہمیں چترال جانے والی بس تک پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے کہا تو اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے یک طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے میکانکی انداز میں اپنی گردن اشارے کی سمت موڑ دی تو مجھے ایک اور خچر ان نظر آیا جو اپنے خچر کی لگام درست کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نگینہ کو لے کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''عجیب خشک مزاج لوگ ہیں یہاں کے۔'' نگینہ نے بڑبڑاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''ہاں.....لیکن میرا خیال ہے، ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ خچر بان مجھے ضرورت مند لگا۔ میں نے اس سے وہی سوال کیا تو وہ بولا۔ ''پانچ سو روپے لوں گا۔''

میرے پچاس ہزار روپوں میں سے تیس ہزار کے لگ بھگ ختم ہو چکے تھے۔ باقی پندرہ بیس ہزار کے قریب رقم بچی تھی جو میں نے کیلاش والی جھونپڑی سے روانہ ہوتے وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں اور نگینہ اس پر سوار ہو گئے۔ خچر بان نے ایک چوبی تختے پر ٹکتے ہی لگامیں سنبھالیں اور اپنے خچر کو ٹخ ٹخا دیا۔ خچر گاڑی نے چوں چک، چوں چک کی آواز کے ساتھ رینگنا شروع کر دیا۔

''کتنی دور جانا پڑے گا بابا ہمیں؟'' میں نے خچر بان سے پوچھا۔

''صرف پندرہ کلومیٹر۔'' وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کیا کیلاش وادی کی طرف سے چلو گے؟''

میری بات پر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا وہاں تمہیں کوئی کام ہے؟''

''نہیں.....ایسے ہی میں نے پوچھ لیا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کیلاش وادی سے ہو کر نہ گزرے۔ کیونکہ مجھے وہاں اس مردود عامل عاروب کے خونخوار پیروکاروں سے مڈبھیڑ کا خدشہ تھا۔ تاہم خچر بان بولا۔

''وہاں سے اگر ہم چلیں گے تو پورے پچاس کلومیٹر کا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ میں اس وادی سے ہٹ کر چلوں گا تاکہ راستہ قریب پڑے۔''

''ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے بابا! یہی بہتر رہے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ پھر چند ثانیے بعد اس سے یونہی پوچھا۔ ''ویسے بابا! یہ کون سا علاقہ ہے؟ کیا یہ کیلاش وادی کا علاقہ نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ کیلاش وادی کا ہی علاقہ ہے۔ مگر نورستان کی سرحد کے قریب ہے اور کیلاش وادی سے دور۔''

''نورستان؟'' میں استفسار یہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہاں.....نورستان۔ درحقیقت یہ افغانستان کا ایک سرحدی علاقہ ہے۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''اچھا.....'' میں نے ہولے سے کہا۔

سفر جاری رہا۔ تنگ برفیلی گھاٹیوں، گہری کھائیوں اور گنجلک دروں سے گزرتے، راستہ پاٹتے ہوئے، بقول اس بوڑھے کے ہم ریمبور کے قریب قریب سے ہوتے ہوئے اس اڈے تک جا پہنچے۔ یہاں مقامی لوگوں کی خاصی چہل پہل نظر آتی تھی۔ میں اور نگینہ نیچے اتر آئے۔

اس سپاٹ اور تختہ دار جیسی خچر گاڑی میں ہمارے جسم کی چولیں تک ہل کر رہ گئی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ میں نے پانچ سو کا نوٹ خچر بان کو دے کر اسے فارغ کیا۔ پھر سب سے پہلے ہم نے ایک چھپر ہوٹل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوبی بینچوں پر بیٹھ کر تھوڑا بہت کھایا پیا، اس کے بعد ہم دونوں چترال جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔

نصف گھنٹے بعد بس نے رینگنا شروع کر دیا۔ مگر روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار پکڑ لی۔ بظاہر کالا ناگ والا قصہ اس کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے کے بعد نمٹ چکا تھا۔ رہا کبیر تو وہ اس مردود عاروب کی خانقاہ میں میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ گرتا پڑتا واپس آ سکتا تھا۔ میرا خیال تو یہی تھا کہ اب اس کے دستِ راست کالا ناگ کی ہلاکت کے بعد اس کے سارے کس بل نکل جانے چاہئے تھے اور اب وہ (کبیر) میرا دوبارہ راستہ کھوٹا کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

کیلاش وادی سے چترال تک چالیس کلومیٹر (پچیس میل) کی دوری کا یہ سفر ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ حالانکہ آتے ہوئے ایک گھنٹہ لگا تھا۔

بہرطور چترال سے ہم ایک تیز رفتار، نان اسٹاپ لگژری مسافر کوچ میں سوار ہو گئے جو پشاور روانہ ہونے والی تھی۔ ہم چترال سے تقریباً دو بجے رختِ سفر ہو کر تقریباً چار بجے سے پہلے پشاور پہنچ گئے تھے۔ کیلاش اور چترال سے جاتے وقت نہ جانے کیوں ڈیڑھ گھنٹے کے فرق سے تاخیر ہوئی تھی۔ حالانکہ قدرے نشیبی سفر تھا۔

بہرطور یہاں سے دوبارہ کسی لگژری مسافر کوچ میں سفر کی نگینہ میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بذریعہ ہوائی جہاز سفر کو ترجیح دیتے ہوئے ایک ایئر لائن کے قریبی بکنگ آفس سے اسلام آباد کی فلائٹ کا پتہ کیا۔ چھ بجے کی فلائٹ کی ساری سیٹیں بک تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ میں دو سیٹیں کنفرم ہوئیں۔ ابھی ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے باقی تھے اور ایئرپورٹ زیادہ دور بھی نہ تھا۔ تھوڑا سستانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور جیسے ہی ہم اس میں سوار ہوئے، اچانک میرے کانوں سے پولیس سائرن کی سمع خراش آواز ٹکرائی۔ ہم اس وقت تک ٹیکسی میں سوار ہو چکے تھے اور ٹیکسی آگے بڑھ چکی تھی۔ تاہم پولیس سائرن کی آواز سے نہ صرف میں اور نگینہ بلکہ ٹیکسی ڈرائیور بھی چونک گیا تھا۔ میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا تو ایک پولیس جیپ ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں بے چین اور مضطرب سا ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دانستہ رفتار ہلکی کر لی۔ پولیس جیپ ہمیں کراس کر کے ذرا آگے جا کر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہو گئی تو ٹیکسی ڈرائیور نے بھی گھبرا کر جلدی سے بریک لگا دیئے۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

"نادر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آگے میرا کام ہے۔ میں حالات کو سنبھال لوں گی۔" نگینہ نے گہری متانت سے کہا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں گھبراہٹ یا پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کی جگہ مجھے ایک جوش آمیز تمتماہٹ محسوس ہوئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور البتہ پریشان ہو گیا تھا۔ پولیس جیپ سے چند پولیس والے بڑی پھرتی کے ساتھ نیچے اترے اور ہماری ٹیکسی کی طرف بڑھے۔ ان میں ایک اپنی وردی سے انسپکٹر ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے سینے پر آویزاں نیم پلیٹ پر عارف علی بنگش کے الفاظ کندہ تھے۔ اس نے ٹیکسی کے قریب پہنچ کر ہمیں نیچے اترنے کا کہا۔ میں اور نگینہ خاموشی کے ساتھ نیچے اتر آئے۔

انسپکٹر نے جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی دو تصاویر نکالیں اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سموئے ہم سے نام پوچھے۔ ہم نے باری باری اپنے نام بتائے اور نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کا بھی نام بتایا۔ انسپکٹر نے میرے چہرے کی طرف تیز چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر کرخت لہجے میں بولا۔

"نادر علی خان! تمہیں نگینہ کو اغواء کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھ کھڑے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اسے ہتھکڑیاں پہنا دو۔"

"ٹھہریئے انسپکٹر صاحب!" اچانک نگینہ نے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا۔ میں تو اپنی مرضی سے نادر کے ساتھ گھومنے کے لئے نکلی تھی۔"

اس کی بات پر انسپکٹر کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تذبذب کے تاثرات اُبھرے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بی بی! آپ کے والد شاہ میر نے نادر علی کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔ وہ خود بھی اس وقت یہاں ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔ آپ کو تو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے..... ہم تیار ہیں۔ لیکن اگر نادر صاحب کو کسی نے ہتھکڑیاں لگانے کی کوشش کی تو میں یک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گی۔" نگینہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو انسپکٹر کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ ایک گہری ہنکاری لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے..... تم لوگوں کو ہماری جیپ پر سوار ہونا پڑے گا۔"

یوں چند سپاہی تو ٹیکسی میں سوار ہو گئے جبکہ تین مسلح سپاہیوں کے ساتھ مجھے اور نگینہ کو پولیس جیپ میں سوار کر دیا گیا۔

تھانے پہنچ کر ٹیکسی والے کو میں نے ہی کرایہ دے کر فارغ کیا۔ ہمیں ایک شاہانہ طرز کے آفس روم میں بٹھا دیا گیا۔ ذرا دیر بعد شاہ میر کو بھی ریسٹ ہاؤس میں مطلع کر کے وہاں بلا لیا گیا۔

شاہ میر اپنی بیٹی نگینہ کو بہ خیریت، زندہ سلامت پا کر بے تابانہ اس کی طرف بڑھا۔ "نگی!..... نگی بیٹا! تت..... تم ٹھیک تو ہو نا؟"

نگینہ باپ کے گلے لگ کر ملی۔ میں نے کن انکھیوں سے نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ صاف لگتا تھا وہ اپنے آنسو ضبط کئے ہوئے ہے۔

"گرفتار کرلو اس مردود کو انسپکٹر! اس نے میری بیٹی کو اغواء کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا ہے۔ یہی نادر علی خان ہے۔" بیٹی کو خود سے علیحدہ کرنے کے بعد شاہ میر نے مجھے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے انسپکٹر عارف علی بنگش سے کہا تو نگینہ نے باپ کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں پپا! نادر نے مجھے اغواء نہیں کیا۔ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔"

بیٹی کی بات سن کر شاہ میر کا دماغ بھک سے اُڑ گیا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے بیٹی کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں پپا!..... مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا۔" نگینہ نے بدستور سپاٹ متانت کے ساتھ اپنے باپ سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ اب تک چپ کیوں ہیں؟ اس بدبخت نادر نے میری بیٹی کو ورغلایا ہے۔ آپ فوراً اسے گرفتار کر لیں۔" شاہ میر نے دوبارہ انسپکٹر عارف علی بنگش سے کہا تو نگینہ نے چلا کر اپنے باپ سے کہا۔

"پپا! اگر نادر کو گرفتار کیا گیا تو میں بھی اس کے بغیر یہاں سے نہیں ہلوں گی۔"

انسپکٹر عارف علی بنگش کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ سی مسکراہٹ اُبھری۔ گویا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ معاملہ اغواء کا نہیں بلکہ دل کا تھا۔ لہٰذا وہ مسکرا کر شاہ میر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جناب! آپ ذرا تشریف رکھیں۔ اب یہ معاملہ اغواء کا نہیں رہا۔"

اس کی بات پر شاہ میر اپنے ہونٹ بھینچے میری طرف خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے ایک کرسی سنبھالے براجمان ہو گیا۔ پھر اس کے بعد انسپکٹر عارف علی نے نگینہ کی طرف دیکھ کر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

"مس نگینہ!..... آر یو شیور کہ نادر علی نے تمہیں اغواء نہیں کیا ہے؟"

"بالکل انسپکٹر صاحب!" نگینہ نے بلا تردد کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میرے پپا کو نادر علی سے جانے کیا پرخاش ہے، یہ ان کے خلاف سازشیں اور....."

"نگینہ!" میں نے جواب تک دانستہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا، اچانک نگینہ کی بات کاٹ کر اس سے کہا۔ "پلیز نگینہ! میرا مشورہ تمہیں یہی ہے کہ تم ابھی اپنے پپا کے ساتھ چلی جاؤ۔"

نگینہ نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر جیسے میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ چپ ہو رہی۔

انسپکٹر عارف علی بنگش ایک سمجھ دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ وہ ایک لمحے میں اصل معاملہ بلکہ "معاملہ دل" کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ وہ شاہ میر کو مخاطب کر کے مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

"شاہ میر صاحب! میں سردست اتنا کر سکتا ہوں کہ پنڈی پولیس انتظامیہ کو مطلع کر کے یہ معاملہ وہاں انہی کے سپرد کر دوں۔ ہمارا کام ختم ہوا۔ آپ لوگ وہیں مقیم ہیں۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اور نادر میاں! مجھے امید ہے تم وہاں بھی قانون سے پورا تعاون کرو گے۔ کیونکہ وہاں تمہاری وجہ سے نقصِ امن کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ تم مزید کوئی غیر قانونی حرکت کر کے اپنے جرم کو زیادہ سنگین بنانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اسے تم نہ صرف میری نصیحت سمجھو بلکہ ایک نہایت مخلصانہ مشورہ بھی۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب!.....آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"گڈ!"

شاہ میر جو کرسی پر بیٹھا بری طرح تلملا رہا تھا، بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے انسپکٹر سے بولا۔

"آپ کمال کرتے ہیں۔ اس نے میری بیٹی کو ورغلایا اور آپ اسے گرفتار کرنے کی بجائے اپنے مخلصانہ مشورے سے نواز رہے ہیں؟"

انسپکٹر عارف علی بنگش نے سنجیدہ نظروں سے شاہ میر کو گھورا اور بولا۔ "شاہ میر صاحب! آپ نے اپنی بیٹی نگینہ کا بیان سن لیا ہے۔ میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ نے نادر کے خلاف جو بھی قانونی کارروائی کرنی ہے، وہ اپنے علاقے کے متعلقہ تھانے اور عدالت میں ہی کریں۔ یہی آپ کے لئے مناسب بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے.....میں دیکھ لوں گا اسے بھی۔" اس کی بات پر شاہ میر نے میری طرف گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو نگینہ بیٹی!"

"پپا! آپ جائیں۔ میں نادر کے ساتھ ابھی ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں۔ ہماری سیٹیں کنفرم ہو چکی ہیں۔"

"خوب بیٹا!.....تم نے اپنے باپ کے دشمن کے سامنے میری خوب عزت کی۔ لیکن بیٹا! میں بھی تمہارا باپ ہوں اور تم میری لختِ جگر۔ تم مجھے پھر بھی قبول ہو۔ میں تمہارا گھر پر انتظار کروں گا۔" جواباً شاہ میر نے اپنے لہجے میں پدرانہ رقت سموتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اور نگینہ نے انسپکٹر عارف علی بنگش کا شکریہ ادا کیا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں اور نگینہ تھانے کی عمارت سے باہر آ گئے۔ میں آج پہلی بار خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ نگینہ بھی خود کو کافی فریش محسوس کر رہی تھی۔

مقررہ وقت پر ہم ایئرپورٹ پہنچے اور مطلوبہ فلائٹ کے ذریعے اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ میں اور نگینہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اُترے اور پھر وہاں سے ایک مسافر ویگن کے ذریعے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ے ہی پنڈی پہنچے، پولیس ہمارے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ان میں انسپکٹر اعجاز شمس کو دیکھ کر ری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ نگینہ نے چلا چلا کر میری بے گناہی کا ن دیا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ شاہ میر نے اسے ٹیلی فون کے ذریعے اپنی بیٹی نگینہ کے بیان سے متعلق گاہ کرتے ہوئے بریف کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انسپکٹر اعجاز شمس نے بڑی مکاری کے ساتھ میری گرفتاری ی وجہ کو نگینہ کے اغواء سے منتج نہیں کیا تھا بلکہ "نقصِ امن" کا جواز بنایا تھا۔ میں نے اس "نقصِ امن" لے اشارے سے ہی یہ اندازہ لگایا تھا کہ یقیناً شاہ میر نے ہی اس بنیاد پر زور دیتے ہوئے انسپکٹر اعجاز شمس د یہ راہ سجھائی ہوگی۔ بہرطور میں نے نگینہ کو تسلی دی اور پھر پولیس جیپ میں سوار ہو گیا۔

❄❄❄

مجھے ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس سے میرا پہلے بھی سامنا ہو چکا تھا۔ وہ بہت کینہ اور بغض رکھنے والا شخص تھا اور میرے لاف ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے مجھ پر کئی لین جرائم عائد کئے تھے، جو بعد میں جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ مگر اس بار ایسا کوئی سنگین جرم اس کے ہاتھ نہ آیا تھا البتہ نقصِ امن کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت تشویش تھی۔

میں نے نگینہ کے "اغواء" سے لے کر اب تک کے پیش آمدہ حالات پر باریک بینی سے غور کرنا شروع کیا کہ اپنا دفاع کر سکوں۔

نگینہ کو اغواء کرنے کی نیت سے میں نے پہلا قدم جو اٹھایا تھا، وہ یہ تھا کہ اس رات چوری چھپے شاہ میر کی وٹھی میں داخل ہوا تھا جہاں دو گارڈ متعین تھے۔ انہیں اس سے پہلے میں چابک دستی کے ساتھ بے ہوش کر چکا تھا۔ وہاں میں نے کوئی ثبوت چھوڑا تھا اور نہ ہی مجھے مسلح گارڈز نے دیکھا تھا۔

رہی بات نگینہ کو زبردستی وہاں سے ٹیکسی میں نکال لے جانے کی، اس دوران انسپکٹر اعجاز شمس نے پولیس گاڑی میں میرا تعاقب کیا تھا اور اس سے ذرا مارا ماری بھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر اعجاز شمس اس بات کو جواز بنا کر میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی عمل میں لا سکتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا، اس کے باوجود انسپکٹر اعجاز شمس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ اب یہ معاملہ "میاں بیوی راضی....." والا بن چکا تھا۔ میں نے بس اہم مقصد کی خاطر اس خطرناک مہم کا آغاز کیا تھا اس کا انجام کامیابی پر ہی منتج ہوا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ انسپکٹر اعجاز شمس جیسا بدطینت آدمی اس وقت میرے خلاف کس نوعیت کا جال بن سکتا تھا۔ نگینہ کو یقیناً اس کے باپ شاہ میر کے ہاں روانہ کر دیا گیا ہوگا۔

ذرا دیر بعد مجھے انسپکٹر اعجاز شمس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا معاندانہ نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور میرے قریب آ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "نادر! تم نے جس چالاکی اور عیاری سے نگینہ کو ورغلایا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور یقیناً تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گے کہ اب قانون تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن نادر! یہ خوش فہمی اپنے ذہن سے نکال پھینکو۔"

وہ خاموش ہوا، پھر پلٹ کر چند قدم پیچھے مڑا اور دوبارہ میری طرف گھوما۔ "ہو سکتا ہے نگینہ کے اغواء والا معاملہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ لیکن میں تم پر غفورے کو پولیس کی حراست سے فرار کروانے کا جرم ثابت کر سکتا ہوں۔"

میں جواب تک انسپکٹر اعجاز شمس کی بے بسی پر اندر ہی اندر حظ اٹھا رہا تھا، غفورے کی پولیس حراست سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرار پر بری طرح چونک اٹھا۔ غفورا صدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان مرڈر کیس کا ایک اہم مطلوبہ شخص تھا۔ غفورے کے ذکر پر کچھ عرصہ پہلے کا وہ اندوہناک منظر میری چشم تصور میں کسی ''ری وائنڈ'' کی ہوئی فلم کی طرح چلے ہوا۔ اس رات جب میں نگینہ کے مغالطے میں ملک سردار خان کو اس شک پر کہ اس نے ہی نگینہ کو اغواء کیا تھا، اسے گن پوائنٹ پر لے کر مری کے دور افتادہ ویران کاٹیج تک پہنچا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغویہ نگینہ نہیں بلکہ صدف تھی جسے ملک سردار خان کے ایماء پر اس غفورے نامی شخص نے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا تھا۔ میں نے مغلوب الغضب ہو کر ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی پیوست کر دی تھی۔ مجھے قتل کرتے ہوئے غفورے نے دیکھا تھا جو بعد میں راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔

پولیس غفورے کی تلاش میں سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کے خیال میں غفورا ہی وہ واحد شخص تھا جس کی گرفتاری کے بعد اس دہرے قتل کی واردات کا قضیہ نمٹ سکتا تھا۔

بالآخر پولیس نے اسے کچھ روز قبل تلاش کر کے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ بہرحال ہم تینوں یعنی میرے، ماں اور اعظم خان کے حق میں اچھا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ غفورا، اعظم خان کا ہی آدمی تھا جو بعد میں جانے کیوں اس سے متنفر ہو گیا تھا۔ یہ خبر مجھے ہمارے ایڈووکیٹ حامد صمدانی صاحب نے دی تھی اور ہم بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔

لیکن آج ..... اور ابھی یہاں انسپکٹر اعجاز شمسی کی زبانی یہ سن کر کہ غفورا پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اور بہ قول اس کے اس میں میرا ہی ہاتھ تھا، اس بات سے قطع نظر مجھے غفورے کے فرار نے ایک یک گونہ مسرت اور دلی سکون بخشا تھا۔

''کیا سوچنے لگے نادر!..... کہ مجھے اس کا کیوں کر علم ہوا؟'' میری طول پکڑتی پُر سوچ خاموشی کو جانے کس بات پر محمول کر کے انسپکٹر اعجاز شمسی نے احساسِ تفاخر سے اکڑ کر کہا تو میں نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''انسپکٹر! غفورا کب فرار ہوا تھا؟''

''یہ سوال کر کے تم کیا مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ میں یہ سمجھ لوں گا، تم نے اس کا فرار نہیں کروایا؟'' وہ زہر خند مسکراہٹ سے بولا تو میں نے کہا۔

''حقیقت یہی ہے کہ میں نے غفورے کو فرار نہیں کروایا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسے گرفتار کرنے کے بعد کہاں رکھا گیا تھا؟..... اور دوسری بات یہ کہ میں پچھلے کئی روز سے پنڈی یا مری میں تھا ہی نہیں۔''

''اوہ ..... تو اب تم مجھ سے یہ چالاکی چلو گے۔ تمہارے پاس اپنی غیر موجودگی کا کوئی ثبوت بھی ہے؟'' وہ زہریلے لہجے میں بولا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تر کی بہ تر کی کہا۔

''میں تو ثبوت پیش کر دوں گا انسپکٹر! مگر تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے ہی غفورے کو پولیس کی حراست سے فرار کروایا؟''

میری اس جچی تلی جوابی کارروائی پر انسپکٹر اعجاز شمسی کے چہرے پر جوشِ غیظ کی تندلہر اُبھری مگر وہ اسے گویا اپنے دانتوں تلے پیس کر بولا۔ ''غفورا بذاتِ خود ثبوت ہے، تمہارے اور تمہاری ماں کے گھناؤنے جرائم کا۔''

مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ وہ میرے سوال پر آئیں بائیں شائیں کر گیا تھا۔

بہرطور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''تو ٹھیک ہے پھر..... غفورے کو آپ ڈھونڈ کر میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کر دیں۔''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا نادر علی خان!'' میری بات پر وہ کھول کر رہ گیا تھا۔ درحقیقت وہ بے بس تھا اور کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر کوئی قانونی شق لگانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ یہ سب نگینہ کے میرے حق میں بیان دینے کی وجہ سے ہوا تھا اور نگینہ کا میرے حق میں اچانک بیان دینا انسپکٹر اعجاز شمس کے لئے ہی نہیں بلکہ نگینہ کے باپ شاہ میر کے لئے بھی غیر متوقع تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے نگینہ مجھے پہچاننے تک سے قاصر تھی۔ اب دونوں کو (شاہ میر اور انسپکٹر اعجاز شمس کو) کیا معلوم تھا کہ میں نے کس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک پُر خطر اور دشوار گزار مہم جوئی کے بعد نگینہ کی یادداشت اپنے حق میں لوٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

نگینہ نے بعد میں میری ماں کو اس تازہ صورتِ حال سے مطلع کر دیا تھا اور میری ماں نے فوراً ایڈووکیٹ حامد صمدانی اور اعظم خان کو اطلاع دی۔ وہ تینوں پنڈی کے اس تھانے آ گئے۔ یوں میری گلو خلاصی ہوئی۔ ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے تو اپنی راہ لی جبکہ میں، ماں اور اعظم خان کے ساتھ واپس مری گرین لاج آ گیا۔

ماں کے چہرے پر عجیب سی گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ناراض لگ رہی تھیں۔ تاہم اب میرے پاس ماں کو قائل کرنے کا جواز موجود تھا۔ لیکن اعظم خان صاحب کی موجودگی میں ماں نے نگینہ سے متعلق بحث نہیں چھیڑی تھی۔ سردست ہماری گفتگو کا روئے سخن غفورے کا پولیس کی حراست سے فرار تھا۔

''خان صاحب! غفورے کا پولیس کی حراست سے فرار ہونا ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ ورنہ تو میری نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہی وہ واحد شخص تھا جو میرے ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کی میرے خلاف سازش کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہو سکتا تھا۔

ماں نے کسی قدر خوش ہو کر اعظم خان سے کہا تو وہ ہولے سے کھنکھار کر معنی خیز مسکراہٹ سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

''ہاں ..... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً میں اور آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔''

''میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ شرارت آپ ہی کی ہو گی۔'' ماں نے تفاخر آمیز مسکراہٹ سے کہا تو میں نے بھی پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اعظم خان سے کہا۔

''لیکن انکل! اس کے باوجود غفورے کی تلوار خطرے کی صورت میں ہمارے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اسے آپ کسی طرح دور بھیج دیں یا پھر اس کی موت کا ڈرامہ رچانے کے بعد اسے کسی اور ملک کی طرف ہمیشہ کے لئے نکال دیں۔''

''نادر! تمہیں غفورے کی طرف سے جتنا خطرہ ہے، اس سے زیادہ مجھے نگینہ سے ہے۔'' دفعتہً ماں نے میری طرف دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولیں۔

''دشمن کا یہ نیا اور اوچھا ہتھکنڈا غفورے سے زیادہ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ غفورے کو تو ہم ٹھکانے بھی لگا سکتے ہیں..... مگر نگینہ.....''

''ماں! نگینہ بھلا ہمارے لئے کیا خطرہ بن سکتی ہے؟'' ماں نے جب یہ موضوع چھیڑ ہی دیا تھا تو میں بھی پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ میں مزید بھی ماں سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ماں نے اچانک درمیان میں یہ کہہ کر مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ اس موضوع پر بعد میں گفتگو ہو گی۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر اپنا روئے سخن غفورے کی طرف موڑتے ہوئے خان صاحب سے بولیں۔

''خان صاحب! غفورے کے موضوع پر پھر کبھی بات نہیں ہو گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات آؤٹ نہ ہو جائے۔ کیونکہ دشمن بڑے خوب صورت طریقے سے گرین لاج کی دیواروں میں نقب لگا چکا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری جملہ ماں نے میری طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا، ماں کا اشارہ نگینہ کی طرف تھا۔ ماں کے دل میں اب یہی غلط فہمی بیٹھی ہوئی تھی کہ شاہ میر اور نظر حیات کی ملی بھگت سے نگینہ کو دانستہ ایک ''خوب صورت'' ہتھیار کے طور پر ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ جبکہ یہ بات سرے سے غلط تھی۔ لیکن میرے دعوے کا ماں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر اعظم خان ماں کی بات کا ''اشارہ'' سمجھتے ہوئے غفورے سے متعلق مزید کوئی بحث کئے بغیر اٹھ کر چلے گئے تو ماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں ماں کو اٹھتا دیکھ کر بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ ''ماں! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی تم آرام کرو اور ٹال کے معاملات سنبھالو، تاکہ میں دوسری طرف بھی یکسوئی سے توجہ دے سکوں۔'' ماں نے ذرا رک کر میری طرف دیکھے بغیر سپاٹ، سرد لہجے میں کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ماں کی اس مسلسل سرد مزاجی نے میرا دل بری طرح مسوس کر رکھ دیا تھا۔ پھر جب میں بھی آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف اٹھ کر جانے لگا کہ اچانک قریب دھرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور سے کان لگایا اور ہیلو کہا۔

''نادر! تمہیں رہائی مل گئی ..... شکر ہے خدا کا۔'' دوسری جانب سے نگینہ کی پُرمسرت آواز اُبھری۔

نگینہ کی مترنم آواز پر میرا دل یکبارگی دھڑکا اور پھر میں نے کہا۔

''نگینہ! کیا تم نے میری گرفتاری سے متعلق ماں کو مطلع کیا تھا؟''

''ظاہر ہے ..... اور کسے انفارم کرتی میں؟'' نگینہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم سے ماں نے اور کوئی بات کی تھی؟'' ایک اچانک خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ انہوں نے بس مجھ سے شکریہ ہی کہا تھا اور فون رکھ دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''نادر! ایک بات تو بتاؤ۔'' دفعتہً نگینہ نے دوبارہ کہا۔

''ہاں ..... کہو۔''

''آنٹی کا لہجہ جانے کیوں مجھ سے بات کرتے وقت بہت اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ سے لمبی چوڑی اور پیار بھری باتیں کریں گی۔''

اس کی بات پر میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولا۔ ''شاید وہ میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گی۔ اس لئے فون بند کر کے انہوں نے مجھے تھانے سے رہائی دلانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری اور ماں کے درمیان کچھ عرصے سے ہونے والی سرد جنگ کے متعلق بتاؤں۔ وہ بے چاری دُکھی ہو سکتی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری ماں کے دل میں اس کے لئے کیا جذبات تھے۔ میں نے اسے عامل عاروب کے شکنجے سے تو چھڑا لیا تھا مگر اب اپنی ماں کو قائل کرنا مجھے قطعاً ناممکن لگ رہا تھا۔ میری قریب آتی منزل ایک مرتبہ پھر دور ہو رہی تھی۔

یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کیجئے